مفکر اسلام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

طبع اول

ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ

نام کتاب : سوانح مفکر اسلام (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

نام مرتب : بلال عبدالحی حسنی ندوی

کمپوزنگ : ایروج کمپیوٹرز (طارق) لکھنؤ فون : ۲۲۳۷۷۸

صفحات : ۵۵۵

تعداد اشاعت : ۳۰۰۰

قیمت : ۱۳۰ روپے

: ملنے کے پتے :

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆ مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ حرمین بکڈپو، کچہری روڈ، لکھنؤ

☆ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ

: ناشر :

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

فہرس

تیسرا باب

ولادت وطفولیت اور ابتدائی تعلیم وتربیت
(۸۰ - ۹۹)

چوتھا باب

عربی تعلیم، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دیوبند و لاہور کا قیام، حضرت خلیفہ صاحب سے بیعت اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی خدمت میں تعلیم سلوک
(۱۰۰ - ۱۳۷)

پانچواں باب

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں باضابطہ تدریس کے دس سال، اس دوران پیش آنے والے اہم حوادث وواقعات اور نصاب تعلیم کی از سر نو ترتیب

(۱۳۸ - ۱۷۰)

چھٹا باب

دعوتی واصلاحی کوششوں کا آغاز، دعوتِ فکر ونظر سے لیکر عملی جد وجہد تک

(١٧١ - ١٩٤)

ساتواں باب

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت سے تعلق وارتباط، تبلیغی مساعی اور حضرت مولانا کے بعد حضرت کا طرزِ فکر اور موقف

(١٩٥ - ٢٢٢)

آٹھواں باب

اسفار حج اور عربوں میں دعوت و تبلیغ کا باقاعدہ آغاز، اور اس کی کوششیں

(۲۲۳ - ۲۵۲)

نواں باب

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی محبت و شفقت، خدمت و اجازت، اندرون ملک دینی و ملی خدمات اور اس کیلئے حضرت کا درد و سوز۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۲ء تک کے اہم حوادث و واقعات

(۲۵۳ - ۲۸۷)

دسواں باب

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا قیام ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۵ء تک اہم اسفار وواقعات اور حوادث

(۲۸۸ - ۳۲۴)

گیارہواں باب

دار العلوم ندوۃ العلماء حضرتؒ کے چالیس سالہ دور نظامت میں اہم واقعات، تاریخی اجلاس اور ترقیات

(۳۲۵ - ۳۴۷)

بارہواں باب

۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک اہم حوادث و واقعات، اسفار و تقاریر

(۳۴۸ - ۳۸۴)

تیرھواں باب

۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۹ء تک اہم واقعات، اسفار، تحفظ ملت کی اہم کوششیں اور بعض اہم وفیات

(۳۸۵ - ۴۱۵)

چودھواں باب

۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء تک اہم واقعات، حوادث، اسفار اور ملی و دینی خدمات و اعزازات

(۴۱۶ - ۴۴۲)

پندرہواں باب

۱۹۹۶ء سے علالت تک اہم حالات و واقعات اور اسفار

(۴۴۳ - ۴۶۶)

سولہواں باب

علالت سے وفات تک

(۴۶۷ - ۴۹۷)

سترہواں باب

امتیازات و خصوصیات، اخلاق و صفات اور اصلاحی و تجدیدی کارناموں پر ایک نظر

(۴۹۸ - ۵۶۰)

پیش لفظ

مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہ
(معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد لله الحكم العدل، العلي الكبير، اللطيف الخبير، السميع البصير، خالق الانسان، منزل القرآن و مجرى الفلك و مالك الملك، لهٗ الحمد علىٰ نعمائه السابقة الظاهرة و الباطنة.

والصلوٰة والسلام علىٰ رسوله محمد الرحمة المهداة و النعمة المسداة بعثهٗ الله بالآيات البيّنات و الخوارق النيّرات فقام بتبليغ الرسالة و نهض بتبيين الوحي، فدلّ الناس علىٰ سبيل النجاة و تركهم على المحجّة البيضاء، و رضى الله عن آلهٖ الأطهار الأخيار و أصحابه أساتذة البشريّة الأبرار رهبان الليل فرسان بالنهار حملوا الرسالة و أدّوا الأمانة علىٰ الوجه الأكمل و النهج الأشمل.

ورحم الله علىٰ أتباعهم الأوفياء الصادقين فى الوفاء و الولاء الذين ضحّوا بكلّ رخيص و غالٍ فى خدمة دين الله الحنيف، ذوى الغيرة علىٰ الحق، الدعاة إلىٰ الإسلام الأحياء و الأتقياء و قد جعلهٗ الله من عبادهٖ الذين ارتضاهم لحبّهٖ و لحُبّ دينهٖ فوضع لهم القبول و الرضاء فى الأرض و السماء.

أمّا بعد :

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ خود اسکا وجود ہے، ورنہ دنیا کا کوئی مؤرخ جس کی نگاہ میں اقوام و مذاہب کا عروج و زوال ہے اور جس نے پر سین امپائر بازنطینی اور ساسانی شہنشاہیت کے عروج و اقبال اور انحطاط و زوال کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کا آوازہ جس روز پہلی مرتبہ اٹھا اسی وقت سے اس کی دشمنی اور مخالفت شروع ہو گئی، اور کڑی آزمائشوں اور سخت جفاکشیوں کے بعد یہ چراغ روشن ہوا، مگر اس دین کو لانے والے خاتم النبیین ﷺ کی آنکھ بند ہوتے ہی ارتداد کا ایک "پلیگ" وبائی شکل میں پھیل گیا اور پورے پورے علاقے بے دینی کا شکار ہو گئے، اس موقع پر ایک فرد فرید حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا جن سے ارتداد کے بادل چھٹ گئے، تاریخ گواہ ہے کہ اگر اس شخصیت کو اللہ نے نہ اٹھایا ہوتا تو اسلام قصہ ماضی بن چکا ہوتا۔ اس کے بعد منافقوں اور یہودیوں کی سازشیں صحابہ کرامؓ کی صف میں رخنہ انداز ہوئیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے خلفاء راشدین کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے عابد و زاہد انسان کو پیدا کیا، جنہوں نے خلفاء راشدین کے بعد اسلام کی صحیح روح کو قائم رکھنے میں ایسا کردار پیش کیا جس نے دین کی دیوار منہدم نہ ہونے دی۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک اس عالمگیر دین کو باقی رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد پیدا کئے جو ہر دور میں سامنے آتے رہے اور اپنی سیرت و کردار کا نقش دنیا کے لئے چھوڑ گئے، اور اسی کا نام معجزہ ہے، معجزہ کا مطلب یہ نہیں کہ آسمان سے فرشتے انسانوں کی شکل میں اتر آتے یا آسمان سے موتی برسنے لگتے، دشمنوں کے سر چیر دیئے جاتے، یہ سب کچھ نہ ہوا، معجزہ یہ ہے کہ اللہ کی صفت تکوینی میں کبھی فرق نہ آیا، جنگ احد میں حضور اکرم ﷺ کی پیشانی مبارک زخمی ہوئی، آپؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے، آپؐ کو فقر و فاقہ، مرض و قرض کی مشکلات سے اس طرح

گذارا گیا جس طرح کسی ایک بشر کو گذارا جاتا ہے، اسی بنا پر رسول کریم ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ "ما أنا إلا بشر مثلكم"۔ درجات بشریت ہمارے تصور سے لاکھوں درجہ بلند سہی لیکن "اسوۂ حسنہ" اسی ذات کا قابل عمل ہو سکتا تھا جو انسانوں کے لئے قابل عمل ہو اور جس کی راہ پر انسان چل سکے، یہی فرق ہے ایک پیغمبر اسلام میں اور دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں میں، دیوتاؤں کی کوئی نقل نہیں کر سکتا، ان کی طرح فضا میں اڑ نہیں سکتا، بے آب و دانا برسہا برس زندہ نہیں رہ سکتا، اس کو ضرورت تھی کہ ایک ایسا نمونہ اس کے سامنے آئے جس کی وہ اقتداء کر سکے، خاتم النبیین ﷺ کے بعد آپؐ کے صحابہ و تابعین و اولیاء دین اسی سنت کو باقی رکھنے اور دنیا کو اس کا نمونہ دکھلانے کے لئے پیدا ہوتے رہے، اور انشاء اللہ جب تک دنیا قائم ہے اس وقت تک ہر دور میں کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اس شان کا پیدا ہوگا جو کہ نبی نہیں ہوگا، رسالت کا مدعی نہیں ہوگا بلکہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوگا اور اپنے کردار سے ایسا نمونہ پیش کرے گا جو اللہ کے لاکھوں بندوں کے لئے ایک نمونہ چھوڑ جائے گا۔

میں اس ملک اور دوسرے ممالک میں پیدا ہونے والے بزرگان سلف کی عظمتوں سے واقف ہوں اور کسی کی غیرت و عزیمت میں ادنیٰ درجہ کی تنقیص گناہ سمجھتا ہوں اور نہ میری یہ حیثیت ہے کہ میں ان کے درمیان گروپ بندی کروں اور یہ کہوں کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور دوسرے حاملین شریعت میں کون بڑا تھا اور کون چھوٹا تھا۔ یہ بات بے ادبی کی بھی ہے اور بے عقلی کی بھی، بے عقلی کی اس لئے کہ وہی شخص ایک کو دوسرے سے افضل اور ممتاز بتا سکتا ہے جو ان دونوں سے یا ان سبھوں سے بلند ہو۔

ہمارے سامنے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک ایک صفحہ کھلا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں کس بندے کا کیا درجہ تھا اس کا فیصلہ ہم میں سے کوئی نہیں کر سکتا

لیکن اس صدی کے ایک نادر فرد کو جانتا ہوں جس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے اور برملا کہا جاسکتا ہے کہ "یعرفه البیت و الحل و الحرم" اور جس سے اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کا کام لیا ہے جس طرح ان کے پیش رو سلف صالحین سے لیا تھا، وہ شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جن کے لئے ہم بڑے بڑے القاب تجویز کر سکتے ہیں، مگر یہ ہماری زبان نہیں ہے۔ مولانا کی زندگی میں ان کی سیرت پر عربی اور دوسری زبانوں میں اتنے مضامین شائع ہوئے ہیں جنکو یکجا کرنے کیلئے خاصا وقت درکار ہے اور متعدد سوانح عربی اور اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ خود آپ نے اپنے قلم سے خود نوشت سوانح سات جلدوں میں تحریر فرمائی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ سوانح کا اطلاق جس کتاب پر ہو سکتا ہے وہ "کاروان زندگی" کا پہلا حصہ ہے، بقیہ حصوں میں اسلامیان ہند، عرب ممالک کی شخصیات اور پیدا ہونے والے حوادثات اور اہم مواقع پر آپ کے محاضرات نیز آپ کے ذریعہ مختلف ناموں سے جو تحریکیں اٹھیں یا آپ نے جن کی مدد کی ان کو کامل انکساری کے ساتھ بغیر کسی تعلّی وادعاء کے آپ نے لکھ دیا جس سے نہ صرف آپ کی ذات بلکہ متعدد وسائل کے خلاصے اور تحریکات کے رخ کا پتہ چلتا ہے۔

آپ کی وفات کے بعد عربی میں دو اور اردو میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، عربی میں ڈاکٹر محسن عثمانی کی کتاب "یحدثونك عن أبی الحسن الندوي" اور ڈاکٹر محمد اجتباء ندوی کی کتاب "ابوالحسن علی الحسنی الندوي الداعیة الحکیم و المربی الجلیل" اردو میں جناب محمد حسن انصاری کی کتاب "جناب مولانا سید الحسن علی ندوی -حیات اور کارنامے" اور ڈاکٹر محمد نفیس دہلوی کی کتاب "میری تمام سرگذشت" اور سلمان علی خاں

صاحب کی کتاب "حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی" شائع ہو چکی ہے، "رابطة الادب الاسلامی" کے موجودہ صدر، ڈاکٹر عبد القدوس ابو صالح نے "عام الحزن" کے عنوان سے بہت سے عربی قصائد و مضامین کا ذکر کیا ہے، تقریباً ۴۸ قصیدے عربی میں مرثیہ کے لکھے جاچکے ہیں، جن میں بعض قصائد ۴۰ شعروں کے ہیں جیسے علامہ عبد الرحمٰن بن حسن الحسبنکہ المیدانی کا قصیدہ ہے۔ ریاض سے نکلنے والے "رابطة الادب الاسلامی" کے خاص نمبر میں پچیس قصیدے ہیں جن کو انہوں نے ایک جگہ جمع کر کے اسکا نام "باب المراثی" رکھا ہے۔ خیر یہ سلسلہ ابھی چل رہا ہے اور بہتیرے خاص نمبر نکل چکے ہیں اور نکل رہے ہیں۔

پیش نظر کتاب حضرت کی مکمل سوانح ہے جس میں دل کو چھو جانے والے اور احساس و شعور کو متاثر کرنے والے جزئیات میں مزید وہ کلیات بھی ہیں جو کاروان زندگی میں آچکے ہیں۔

اس کو مرتب کرنے والے بلال میاں سلمہ اللہ تعالیٰ ہیں جن کو میں اس مختصر گھریلو نام سے یاد کر رہا ہوں کیونکہ میں ان سے پہلے پیدا ہوا ہوں اور ان کے والد (مولانا محمد الحسنیؒ) کی نوعمری بھی دیکھ چکا ہوں، ورنہ مجھے لکھنا چاہئے تھا مولانا .... دامت برکاتہم، جسکے وہ ابھی سے مستحق ہیں اور انشاء اللہ اس میں پختگی اور بڑھے گی۔ اگر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو اللہ تعالیٰ نے صلبی اولاد دی ہوتی تو ان میں یہ بلال میاں بھی ہوتے جن کی شکل و صورت دیکھ کر بے ساختہ وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے سبعة يظلهم الله فى ظله يوم لا ظلّ إلا ظلّه إمام عادلٌ و شابٌ نشأ فى طاعة الله إلى آخرہ اللہ کی طاعت پہ پروان چڑھنے والے اس نوخیز عالم دین کے اندر تواضع، چھوٹے بڑے کا لحاظ اس درجہ موجود ہے جس سے بڑی توقعات قائم ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ ہمارے

حضرت دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں مگر ان کا سایہ صاف اور گہرا، روشن و تابناک موجود ہے۔

خاکسار

عبداللہ عباس ندوی

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بروز جمعہ ۹ر صفر المظفر ۱۴۲۲ھ

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک عظیم علمی ودینی شخصیت تھے، ایک طرف خود ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہوا، اور دوسری طرف ان کو دین وملت کی تقویت ومدد کے لئے کام کی توفیق عطا فرما کر اللہ تعالیٰ نے پوری امت مسلمہ کے لئے اور خاص طور پر برصغیر ہندوستان وبلاد عرب کے لئے ان کو اپنا فضل خاص بنایا۔ ان کی تعلیم وتربیت اور ان کی شخصیت کی تشکیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات اور اسباب مہیا فرمائے جن سے ان کی یہ علمی شخصیت بنی، یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر فضل خاص ہوا، پھر شخصیت کی خصوصی تشکیل اور افادیت سے بھرپور صلاحیت ملنے کے بعد مولانا نے اپنی پوری زندگی دینی تعلیم کو مؤثر اور زیادہ سے زیادہ سودمند بنانے اور دعوتِ حق اور فکرِ اسلامی کو تقویت دینے اور نشرواشاعت کرنے میں صرف کی، مسلمانوں کے آپسی افتراق وگروہ بندی سے اپنے کو بلند رکھا اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور گروہوں کے ساتھ یکساں خیر خواہانہ تعلق رکھا، ایسا خیر خواہانہ تعلق ومحبت کہ اس میں ایک طرف تواضع اور کسر نفسی کی شان تھی، اور دوسری طرف حوصلہ مندی اور حق بات جرأت اور حکمت سے کہنے کا سلیقہ تھا، چنانچہ انہوں نے امت کے اہم موقعوں پر اپنے مخاطبین سے

اور جاہ و سلطنت کے مالک ذمہ داروں سے نتیجہ خیز گفتگو اور خطاب کیا، اور چونکہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بات دلنواز اور موثر ہوتی تھی، لہٰذا مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مشوروں کی اور مولانا کی تشخیص مرض کی ان کی طرف سے عموماً قدر بھی ہوتی رہی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو استغناء و حق پسندی کا جو مزاج ملا تھا، اور انہوں نے گروہی اور ذاتی مفادات و جذبات سے بلند ہو کر دعوت و خدمت ملت کا جو بیڑا اٹھایا تھا، اسکو انہوں نے تا حیات نبھایا، ملت کے تمام سنجیدہ افراد میں اس بات نے مولانا کو بلند مقام عطا کیا جس کا صاف ظہور آپ کی وفات پر رائے بریلی میں لوگوں کا بے تحاشا ہجوم اور دنیا کے مختلف اطراف کی مساجد میں اور خاص طور پر حرمین شریفین میں سال بھر کے سب سے زیادہ نمازیوں کے جمع ہو جانے کی شب میں نماز جنازہ ادا کئے جانے سے ہوا، پھر دنیا کے گوشے گوشے میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اعلیٰ پیمانہ کے سیمینار منعقد کئے گئے اور ان کے نام سے چند در چند رفاہی و تعلیمی و دعوتی ادارے قائم ہوئے، ذلك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم، یہ باتیں اس چیز کی علامت ہیں کہ امت کو مولانا کی خدمات اور خیر خواہی کا جو فائدہ حاصل ہوا وہ امت پر اللہ کا فضل خاص تھا۔

اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندہ پر اس طرح کا فضل فرماتا ہے اور اس کو اپنے بندوں کے درمیان شمس و قمر جیسا مقام عطا فرماتا ہے تو اس کے لئے شروع سے ایسے اسباب مہیا فرماتا ہے جن سے یہ نتیجہ برآمد ہو، چنانچہ حضرت مولانا کو عہدِ طفولیت سے ہی ایسے اسباب سے سابقہ پڑا، ماں کی گود اور اس کی خصوصی دلچسپی بچہ کے لئے سب سے پہلی اور سب سے زیادہ کارگر تربیت گاہ ہوتی ہے، اس میں بچہ کے اخلاق و سیرت کی اصلی بنیاد پڑتی ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ایسی ماں ملیں جو اپنے خاندان اور ماحول میں سب سے زیادہ دیندار اور سمجھدار تھیں اور علم و ادب کی صلاحیت بھی رکھتی تھیں، انہوں نے مولانا کے عہد طفولیت میں جبکہ مولانا ان کے عزیز ترین بیٹے تھے اور ان کو اپنے ان بیٹے سے بے حد لگاؤ اور تعلق تھا کبھی بیجا

شفقت ورعایت سے کام نہیں لیا، بلکہ غریبوں کی ہمدردی اور کمزوروں کی رعایت اور لغو کھیلوں اور بے فائدہ راحتوں سے اجتناب کی ہمیشہ تلقین کی، اور حوصلہ مندی کے کاموں سے کبھی نہیں روکا، چنانچہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی آغاز جوانی سے قبل تک مفید کھیلوں سے دلچسپی لیتے رہے مثلاً ہاکی، والی بال وغیرہ، اس کے سوا پیراکی اور بندوق سے شکار جیسی مشقوں کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہم عمر اور نو عمروں کے ساتھ اختیار کیا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ نے ان کو ان سے نہیں روکا۔ لیکن بے فائدہ اور لغو کاموں سے اور بے جا احساس برتری اور دوسرے کے ساتھ زیادتی وحق تلفی سے ہمیشہ بچایا، چنانچہ شروع ہی سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ کی اعلیٰ صفات کے حامل ہو گئے مثلاً ایک مرتبہ بچپنے میں گھر کے اپنے ہم عمر ایک بچہ کو جو گھر کی خادمہ کا تھا مولانا نے کسی بات سے ناخوش ہو کر مار دیا، اس کی ماں نے اس بات کی شکایت مولانا کی والدہ سے کی، مولانا کی والدہ نے ان کو طلب کیا اور تنبیہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ خادمہ کا بچہ انتقاماً مولانا کو مارے، خادمہ نے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرا یہ معمولی بچہ اس معزز بچہ کو مارے لیکن مولانا کی والدہ نے اپنی بات پر اصرار کیا اور جب خادمہ نے نہیں مانا تو مولانا کی والدہ نے خادمہ کے بچہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ہاتھ سے مولانا کو مارا۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل مولانا کے لئے ایسی تنبیہ بنا کہ پھر زندگی بھر کے لئے کسی کمزور وغریب کے ساتھ سختی کرنا مولانا کے مزاج سے خارج ہو گیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ معاشرہ میں ایک بڑے اور معزز فرد کے بیٹے اور معزز دادا کے پوتے تھے، مولانا کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ ایک عالم دین اور کامیاب حکیم تھے بلکہ تعلیمی ودینی کاموں میں آگے آگے رہنے والوں میں اور اہم شخصیت کے مالک تھے، اور مولانا کے دادا مولانا حکیم فخر الدین صاحب حسنیؒ کہنہ مشق شاعر ومصنف اور سربر آوردہ شخصیت تھے اور مولانا کے نانا صاحب حضرت شاہ سید ضیاء النبی حسنیؒ ایک صاحب نسبت

محترم بزرگ تھے جن سے دینی فیض حاصل کرنے دور دور سے لوگ آتے تھے، اور صلاح و تقویٰ کا توشہ لے کر جاتے تھے اور انہی کا خاص اثر تھا جو مولانا کی والدہ ماجدہ میں خاص طور پر آیا تھا جو ان کی چھوٹی صاحبزادی تھیں، اور یہی وہ اثر تھا جو مولانا کی تربیت میں ان کی ان صاحب خصوصیات والدہ کی فکر و توجہ سے ظاہر ہوا، اور یہ وہ سہ گوشہ جہات سے ملنے والی وراثتی خصوصیات تھیں جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں منتقل ہوئیں۔

ماحول کے دینی ہونے کے ساتھ علمی و ادبی ہونے نے بھی مولانا پر خصوصی اثر ڈالا، مولانا کو بچپنے سے ہی مطالعہ کا اور کتاب جمع کرنے کا شوق ہوا، اور یہ انکی اس عمر میں ہی شروع ہو گیا جو کہ کچی تھی اور بطور خاص علمی کتب کے لائق نہیں تھی، لیکن مولانا کا مطالعہ کا شوق اس سے بلند تھا، اور کوئی بھی پڑھی جانے کے لائق کتاب کا مطالعہ مولانا کا شوق بن گیا تھا، کسی اخبار میں رحمۃ للعالمین مصنفہ مولانا سلیمان منصور پوری کا اشتہار دیکھا وی۔پی (V.P.) طلب کر لیا، جب ڈاکیہ کتاب لے کر آیا تو وی۔پی چھڑانے کے پیسے نہیں تھے تو ماں سے اس کے لئے اصرار کیا، ماں اس وقت اس حال میں نہ تھیں لیکن مولانا کے بیقرار ہونے اور رونے سے مجبور ہو کر قرض لے کر وی پی چھڑانے کے لئے دے دیئے اور مولانا نے وہ کتاب حاصل کر لی، اور بہت جی لگا کر پڑھی، وہ زندگی بھر اس کتاب کی اثر پذیری اور اپنے اوپر اس کے اثر کا ذکر کرتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بچپنے کے زمانہ ہی سے اپنے گھر کے ماحول سے بطور خاص دینی جذبہ ابھارنے والے عوامل ملے، ان میں سے ایک تو یہ کہ والدہ صاحبہ قرآن مجید کی جید حافظ تھیں اور لکھنے پڑھنے کا دینی اور ستھرا ذوق رکھتی تھیں حتی کہ شعر گوئی کی صلاحیت بھی ان کو حاصل تھی، انہوں نے اپنے اشعار مناجاتوں اور دعاؤں کا ذریعہ بنائے، والدہ صاحبہ کے علاوہ خاندان کی دیگر متعدد خواتین بھی حافظ تھیں، ان کے ذریعہ گھر کے اندر کی زندگی میں تلاوت کا ذوق اور قرآن مجید

سے تعلق کی فضا بن گئی تھی، یہ وہ عہد تھا کہ انگریزی اقتدار کی چیرہ دستیوں کا عمل زیادہ تر مسلمانوں پر تھا، اس کے اثر سے مسلمانوں میں اپنے ماضی کی سربلندی اور عزت کی طلب بڑھ گئی تھی، خاندان ہی کے ایک بزرگ مولانا عبد الرزاق کلامی نے "فتوح الشام" کو اردو شعر کا جامہ پہنایا تھا، جو جہاد اور مسلمانوں کی سربلندی کی داستانوں پر مشتمل تھا، اس شاہنامہ کو خاندان کی عورتیں اپنی مخصوص مجالس میں جن میں بچے شریک ہوتے اور اثر لیتے مل کر پڑھنے کا رواج تھا، خاص طور پر خاندان میں پیش آنے والے حوادث کے موقع پر ایسا ہوا کرتا تھا، ان کیفیات کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ذہن و قلب میں جذب کیا، پھر ذرا ہوش سنبھالنے پر حضرت سید احمد شہیدؒ کے جو خاندان ہی کے اسلاف میں تھے جہاد کے واقعات اور اصلاح و تربیت کے حالات سے واقفیت ہوئی، اس سے دینی جذبہ اور دین کی سربلندی کے لئے کچھ کر سکنے کا احساس بڑھا۔

اسی دوران جبکہ مولانا کی عمر مشکل سے ۹؍ سال کی ہوگی مولانا کے والد کے اچانک انتقال کر جانے سے مولانا کو بڑے صدمہ اور دشواری سے سابقہ پڑ گیا۔ ایک تو یتیمی کا داغ لگا جو اس کم عمر کے دل کو توڑنے والی بات تھی، دوسرے مولانا کے خاندان کا معاشی دارومدار مولانا کے والد کی طبابت ہی پر تھا وہ دارومدار ختم ہو گیا، مولانا کے بڑے بھائی کی تعلیم کی ابھی تکمیل نہیں ہوئی تھی، ان دونوں باتوں نے جن میں سے ایک نفسیاتی، دوسری اقتصادی تھی خاندان پر اثر ڈالا، مولانا کی والدہ بڑی حوصلہ مند اور باہمت تھیں ان کے اپنے والدین کی طرف سے جائداد میں جو قدرے قلیل حصہ ملا تھا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے پوری اولوالعزمی سے مولانا کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی، بڑے بھائی نے بھی اولوالعزمی اور وسعت قلبی سے اپنے اس چھوٹے بھائی کے ساتھ شفقت و تربیت کا اہتمام کیا، اور علم و ادب کی ضروری شاخوں میں ان کے الگ الگ ماہرین سے تعلیم دلانے کا اہتمام کیا، چنانچہ عربی زبان وادب میں وقت کے ممتاز ترین عالم شیخ خلیل بن محمد یمانی سے، حدیث شریف میں

ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکیؒ سے اور بطور مزید دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے، اور علم تفسیر میں نیز تربیت باطنی میں لاہور کے مولانا احمد علی لاہوریؒ جیسے اہل علم واہل درس سے استفادہ کا انتظام کیا، اس وقت کے ہندوستان میں اس سے بہتر انتظام نہیں ہو سکتا تھا، مولانا کے برادر معظم نے مزید یہ توجہ کی کہ اسلامی فکر کے عظیم حاملین جیسے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیمؒ، امام غزالیؒ جیسے عظمائے اسلام کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف متوجہ کیا جن سے مولانا نے بہت فیض اٹھایا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے برادر معظم ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ نے اپنی تعلیم و نشو ونما کا تقریباً پورا زمانہ اپنے والد محترم جناب مولانا حکیم عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں ہی گزارا تھا، انہوں نے علوم دینیہ وشرعیہ کی تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء اور دار العلوم دیوبند دونوں جگہ رہ کر مکمل کی تھی اور اپنے اس عہد میں جبکہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے انگریزی تعلیم سے بالکل دور رہتے تھے انہوں نے انگریزی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی تھی اور سائنس کی پھر میڈیکل تعلیم کی تکمیل کی تھی، اس طرح انہوں نے علوم دینیہ میں کمال اور انگریزی زبان اور عصری مضامین میں اچھی دسترس حاصل کی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ اپنی عملی زندگی میں اپنے والد کی زیر سرپرستی صلاح و تقویٰ کی صفت کے پوری طرح پابند رہے۔ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج کی تعلیم میں ایک عالم دین کی مکمل وضع قطع کے ساتھ رہے، اور اپنی دینی و عملی زندگی میں اس عہد کی فیشن پسندی کا کوئی اثر نہیں لیا، ان کے والد موصوف ندوۃ العلماء کی جامع تعلیمی تحریک کے قائدین میں تھے، اس کے اثر سے ان کے صاحبزادہ کی زندگی میں اس کا پورا عملی عکس آگیا تھا، جس کے نتیجہ میں وہ ایک جامع علم وفکر کا عملی پیکر بنے، ادھر ان کے برادر خورد مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ابھی پختگی کے درجہ میں نہیں پہونچی تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا، اس کے نتیجہ میں اس نوعمر بھائی کی تعلیم و

تربیت کی وسیع ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آگئی۔ ان میں سے ایک کی عمر اس وقت صرف ۹ سال کی تھی، جبکہ دوسرے کی عمر ۱۳ سال کی ہو چکی تھی، اس طرح ایک طرح سے وہ ان کے صرف بڑے بھائی ہی نہ تھے بلکہ والد کے قائم مقام ہو گئے تھے، چنانچہ انہوں نے مولانا ابوالحسن علی صاحب حسنی ندویؒ کو علوم دینیہ کی تکمیل کے ساتھ ان مضامین میں بھی صاحب بصیرت اور صاحب صلاحیت بنانے کی طرف توجہ دی جن سے قدیم و جدید کے ٹکراؤ کے اس دور میں ایک تعلیم یافتہ مسلمان کو سابقہ پڑتا ہے، ساتھ ساتھ عملی زندگی میں صلاح و تقویٰ کی صفت کے پہلو کو بھی مد نظر رکھا، اس طرح مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک طرف اپنے علمی و عملی اوصاف کے حامل بھائی کی سرپرستی، دوسری طرف اپنے عہد کے بہترین اساتذہ کے ذریعہ تکمیل علم اور اپنے وقت کے اہل صلاح و تقویٰ بزرگوں سے وابستگی سے سہ طرفہ وسیع اور متنوع فائدہ حاصل ہوا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل خاص سے ایک متعدد الجہات علمی دینی اور عملی شخصیت بنے، یہ تھا اللہ تعالیٰ کا وہ فضل و کرم جو خود ان کی ذات کو حاصل ہوا۔

اس مذکورہ پس منظر کے ساتھ مولانا موصوف جب عملی زندگی کے میدان میں داخل ہوئے تو ان کے سامنے ایک طرف مغربی علم و تمدن کی یلغار اور اسکے مقابلہ میں مغرب کی استعماری طاقت کے سامنے شکست خوردہ اور پس ماندہ مشرق تھا، اور اس کے تناظر میں مسلمانوں کی بدحالی اور شکست خوردگی اور بے عملی تھی۔ دوسری طرف ان کے سامنے مسلمانوں کے ماضی کی تاریخ میں ان کی سیاسی و تمدنی سربلندی اور علم و تحقیق کی عظیم سرپرستی کا منظر نامہ تھا، اور اسی منظر نامہ کے ذیل میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مجددانہ کارنامہ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فکری و تعلیمی مصلحانہ کام اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی دینی و عملی سربلندی کی تحریک کی تاریخ کے کھلے ہوئے صفحات تھے، اسلام کے ماضی بعید کے شکوہ و عظمت اور ماضی قریب کے ان زریں صفحات اور پھر موجودہ بدحالی اور پستی کا المیہ ان پہلوؤں نے مولانا

کے قلب و دماغ کو جھنجھوڑ دیا اور انہوں نے اپنی عملی زندگی کو اپنے علم و دانش کی روشنی میں اس راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی جس سے وہ ایسی تبدیلی لا سکیں جس کے ذریعہ مسلمانوں کا عظیم ماضی ان کے پس ماندہ حال پر اثر انداز ہو سکے۔

تاریخ کا موضوع مولانا کا خاندانی موضوع تھا، یہ موضوع قوموں کے عروج وزوال اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے میں بڑا ممد و معاون ہوتا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طرف اس سے فائدہ اٹھایا، دوسری طرف اپنی علمی وادبی صلاحیت اور دعوتی فکر وجذبہ سے کام لیا جس کو ہم حضرت مولانا کے چھوڑے ہوئے تصنیفی وفکری سرمایہ میں نمایاں طریقہ سے دیکھ سکتے ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فکری ودعوتی جدوجہد میں عہد حاضر کی فن کارانہ اور مختلف الجہات زندگی کی نفسیات کو بھی سامنے رکھا اور اس کے لئے موزوں حکمت عملی اختیار کی، مولانا نے اصحاب اقتدار وسطوت سے مخاطبت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا طریقہ اپنانے کی کوشش کی، تعلیم وتربیت کے محاذ پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تفہیم وتشریح کا اسلوب اختیار کیا، اور فکر ودانش کے میدان میں مذکورہ بالا دونوں مجددین کے طریق فکر کے ساتھ قدماء میں سے ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور ابن جوزیؒ کے طریقۂ تحقیق و تفہیم کو اختیار کرنے کی کوشش کی، اور امت کی اصلاح اور اس کو سربلندی کی راہ اختیار کرانے کے لئے حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعت مصلحین کے اسلوب اصلاح کو اسوہ بنایا، مولانا نے اپنے عہد کے مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اختیار کردہ طریقۂ دعوت واصلاح کو قدر کی نظر سے دیکھا۔ اور اس کے ساتھ وابستگی بھی اختیار کی نیز اپنے عہد کے دوسری کوششوں کے مفید پہلوؤں کو بھی سراہا۔ اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے امت کی اصلاح وترقی کے لئے ہمہ جہت فکر وعمل کو اختیار کیا، اور اس بات کی کوشش کی کہ جبکہ امت کی احیاء وترقی کا مقصد پوری امت کا مشترکہ مقصد ہے تو امت کے تمام گروہوں اور جماعتوں کو اس کے حصول کے لئے اپنے فروعی اختلافات سے بالا

ہو کر کام کرنا چاہئے۔ مولانا نے اس کے لئے سب سے یکساں ربط و تعلق رکھتے ہوئے کم از کم اپنی ذات سے اس کا بہترین نمونہ پیش کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی ذات پر گروہی و جماعتی اختلافات سے بالا ہو کر سب نے علی العموم اتفاق کیا اور امت کے متعدد مشترکہ مقاصد میں مولانا کو سب نے اپنا سر گروہ بنایا اور پھر ان کی وفات پر پوری امت کا خسارہ اور نقصان ہونے کے احساس کا اظہار کیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غیر معمولی خصوصیت ان کی عربی زبان کی قابلیت تھی جس کی بنا پر عرب دانشور طبقہ کو انہوں نے نہ صرف متاثر کیا بلکہ اپنا گرویدہ بنا لیا تھا چنانچہ برصغیر ہند و پاک کے ساتھ ساتھ ممالک عربیہ میں بھی مولانا کی وفات کو ایک بڑا خسارہ سمجھا گیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کی شخصیت اور کارناموں پر متعدد اہل علم نے کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں اپنی اپنی معلومات اور اندازوں کے مطابق مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے کمالات پر روشنی ڈالی ہے اور وہ سب قابل استفادہ ہیں۔ ان تمام کتابوں کی قدر و منزلت تسلیم کرتے ہوئے زیر نظر کتاب جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے جو مولانا کے نامور بھتیجے سید محمد الحسنی کے چھوٹے صاحبزادہ ہیں مولوی بلال حسنی ندوی سلمہٗ نے ترتیب دی ہے یہ اپنی ایک الگ خصوصیت کی حامل قرار دی جانے کے قابل ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عمر کے آخری برسوں میں مولوی بلال حسنی سلمہٗ بہت ہی قرب و تعلق کے ساتھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ رہے، اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو اپنی شفقت و نظر عنایت سے نوازا۔

عزیز موصوف کو اللہ تعالیٰ نے علم و صلاح اور عاقلانہ نظر کی دولت عطا فرمائی ہے، عزیز موصوف نے اپنی انہی خصوصیات کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی حیات مبارکہ کا ایک مؤثر اور جامع مرقع تیار کیا ہے جو قارئین کے سامنے آرہا ہے، اس میں عزیز موصوف نے صحت معلومات، سہولت بیانی اور شگفتہ اسلوب کا پورا اہتمام

کیا ہے، اور وہ اس میں کامیاب رہے ہیں۔ اس کے ذریعہ انشاء اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دلنواز اور عظیم شخصیت کو سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔

والسلام

محمد رابع حسنی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں
رائے بریلی

سنیچر ۱۷ر صفر المظفر ۱۴۲۲ھ
۱۲ر مئی ۲۰۰۱ء

عرضِ مرتب

زمانہ کچھ زیادہ نہیں گذرا، سال ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ جب ملت اسلامیہ کا عظیم سپوت اس دنیا سے رخصت ہوا، تاریخ اصلاح و تجدید کا ایک سنہرا ورق الٹ گیا، دعوت و عزیمت کا ایک باب بند ہو گیا، بیسویں صدی کے غروب آفتاب کے ساتھ رشد و ہدایت کا آفتاب بھی غروب ہو گیا، ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء مطابق ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے وفات پائی، اس حادثہ کی چوٹ عرب و عجم میں محسوس کی گئی، اسکے بعد سے آج تک نہ جانے کتنے تعزیتی جلسے ہوئے، کتنے رسالوں کے خصوصی شمارے شائع کیے گئے اور نہ جانے کہاں کہاں ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کے لئے سیمینار ہوئے ؟!!

مفکر اسلام امام العصر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ نے اپنی بے پایاں خدمات سے اصلاح و تجدید کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا تھا، اپنی منفرد خصوصیات اور امتیازی کمالات کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں ان کو جو محبوبیت ملی تھی وہ خاصان بارگاہ الٰہی کا خاصہ ہے۔

ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

حضرت مولانا کی اصلاحی و دعوتی سرگرمیوں اور تجدیدی کارناموں کا سلسلہ ایک طرف زمانی اعتبار سے بیسویں صدی کے بڑے حصہ پر محیط ہے تو دوسری طرف اس کا مکانی رقبہ عالم اسلام کے اکثر حصوں پر مشتمل ہے۔ ان کو

تفصیل کے ساتھ کسی ایک جلد میں سمیٹنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، اس کے لئے کئی جلدوں کی ضرورت ہے اور یہ کام کسی ایک آدمی کا نہیں بلکہ مستقل اکیڈمی کا کام ہے، لیکن فوری طور پر کسی ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس میں اجمالی طور پر حضرتؒ کی سوانح حیات اور خصوصیات و امتیازات کو پیش کردیا گیا ہو تاکہ ایک ایسا مرقعہ تیار ہو جائے جس میں بڑی حد تک حالات زندگی کا احاطہ ہو جائے؛ پیش نظر کتاب اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے مرتب کی گئی ہے۔

راقم نے اس کتاب میں حضرتؒ کی خود نوشت سوانح حیات ''کاروان زندگی'' کی ساتوں جلدوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے کہ وہی حضرتؒ کے حالات کا سب سے بڑا اور مستند مآخذ ہے، اسکے علاوہ بھی بعض وہ واقعات اور حقائق پیش کردیئے ہیں جن کا حضرتؒ نے ازراہ تواضع ذکر نہیں فرمایا، وفات اور وفات کے بعد کا حال جو اس ناکارہ کی گنہگار آنکھوں نے خود دیکھا چشم دید گواہی کے طور پر شامل کتاب ہے۔ کتاب کے آخری باب میں حضرتؒ کی خصوصیات، امتیازات و کمالات اور خاص طور پر انکے بلند اخلاق کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ عمل کرنے والوں کیلئے ایک تحفہ ہے۔

حضرتؒ کی سوانح مرتب کرنے کا سب سے زیادہ حق حضرتؒ کے خواہر زادۂ اکبر مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کو تھا کہ وہ ایک صاحب نظر مؤرخ و سوانح نگار، صاحب ذوق ادیب اور خاندانی روایات کے امین تھے، طویل عرصہ انہوں نے حضرتؒ کے ساتھ گذارا تھا اور ابتدائی دور کے سفروں میں ساتھ رہے تھے۔ ان کے بعد یہ کام سب سے بہتر طریقہ پر حضرتؒ کے برادر زادہ مولانا سید محمد الحسنیؒ انجام دے سکتے تھے جن کو سوانح نگاری کا اچھا ذوق تھا، اپنی فکر و تحریر میں وہ حضرت کا مثنیٰ تھے، مگر یہ دونوں حضرات حضرتؒ کے سامنے اس عالم فانی سے

رخصت ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ حضرتؒ کے درجات بلند فرمائے کہ حضرتؒ نے خود ہی اپنی سرگذشت حیات قلمبند فرمادی جس میں حضرتؒ نے عالم اسلام کے حالات، اپنی معاصر تحریکات و شخصیات پر تبصرہ فرمایا ہے، اس سے اس دور کی اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب محفوظ ہو گیا، اور بہت سے وہ حقائق بین السطور آگئے ہیں جو عام طور پر تاریخ وسوانح کی بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتے، اس میں دعوت بھی ہے اور پیغام بھی۔ اپنی شخصیت سے زیادہ اس میں حضرتؒ نے اپنی فکر پیش فرمائی ہے۔ بلاشبہ یہ اسلامی دعوت و عزیمت کی تاریخ کا ایک ایسا اہم باب ہے جس کو کوئی داعی و مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا، پیش نظر کتاب میں ضروری اضافوں کے ساتھ اسی "کاروان زندگی" کے سوانحی حصوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ اس عمل کو قبول فرما کر راقم کیلئے باعث نجات و مغفرت بنادے۔

عم مخدوم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی نے مقدمہ تحریر فرما کر راقم کی ہمت افزائی فرمائی۔ مخدومی مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی مدظلہ العالی کے پیش لفظ نے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔ عم مخدوم مولانا واضح رشید ندوی نے پوری کتاب ملاحظہ فرمائی اور بیش قیمت اصلاحات فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کے سایہ کو تادیر سلامت رکھے۔

اخیر میں ان سب حضرات کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنھوں نے کتاب کی اشاعت و طباعت میں مدد کی: ان میں خاص طور پر محب گرامی مولوی دوست محمد صاحب ندوی اور رفیق مکرم مولوی محمد حسن صاحب ندوی (مدرسین مدرسہ ضیاء العلوم) شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے مسودہ کے بڑے حصہ کی تبییض کی، عزیز القدر محمد نفیس خاں رائے بریلوی سلمہٗ بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے کتاب کی طباعت

کے لیے تمک ودو کی۔ اللہ تعالی ان سب حضرات کو بہترین صلہ عطا فرمائے اور اس عمل کو خالص ومقبول فرمائے۔

وما توفیقی إلا باللہ علیہ توکلت وإلیہ أنیب.

بلال عبدالحی حسنی ندوی
گوشۂ مفکر اسلام دارِ عرفات
رائے بریلی

۱۷ر صفر المظفر ۱۴۳۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

اصلاح و تجدید کی مختصر تاریخ، مغربی تہذیب کی یلغار، اسکے دفاع کی ابتدائی کوششیں، حضرتؒ کا تجدیدی کارنامہ اور حضرتؒ کی سیرت کی تشکیل و تعمیر کے بنیادی عناصر

اصلاح و تجدید کی تاریخ پر ایک نگاہ

یہ اسلام کا نمایاں امتیاز، اس کی بنیادی خصوصیت بلکہ اس کی ابدیت و حقانیت کی ایک دلیل ہے کہ اس کا سدابہار درخت (شجرۂ طیبہ) ہمیشہ برگ و بار لاتا رہا ہے۔ اسلامی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ضرورت کے مطابق کوئی مصلح و مجدد نہ پیدا ہوا ہو، یہ اسلام کی تاریخ کا ایسا زریں باب ہے کہ جس میں کوئی دوسرا دین اس کا سہیم و شریک نہیں۔

شروع ہی سے اسلام کے قلب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے کہ کوئی دوسرا مذہب اس کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ دنیا کے دوسرے مذاہب جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کرلی تھی اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہار نہ سکے اور انھوں نے اپنی ہستی کو گم کردیا۔ لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا، تاریخ اسلام کے ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے تحریفات و تاویلات کا پردہ چاک کیا اور حقیقت اسلام اور "دین خالص"

کو اجاگر کیا، بدعات اور عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پرزور حمایت کی، عقائد باطلہ کی بے باکانہ تردید کی اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا۔

خلافت راشدہ کے دور کے بعد جب قدیم جاہلی رجحانات نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں ابھرنے لگے، تعیش و ترفہ کا دور دورہ ہوا اور عجمی اثرات اسلامی سوسائٹی پر پڑنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو پیدا فرمایا جنھوں نے حکومت کے رخ کو بدل دیا، لوگوں کے رجحانات بدل گئے اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ ان کا دوسرا تجدیدی کارنامہ سنت و حدیث کی تدوین کا ہے، ان ہی کی فکر و توجہ سے حدیث کے بڑے بڑے مجموعے مرتب ہوئے اور باقاعدہ اس کو مدون کیا گیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد ان کے جانشین (جن کو سلیمان نامزد کر گیا تھا) حکومت کو پھر اسی چول پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے دور میں تھی، پھر تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہوا، نفاق کے جراثیم پھیلنے لگے اور اسلامی معاشرہ خطرہ میں پڑ گیا تو حضرت حسن بصریؒ کی شخصیت وجود میں آئی جنھوں نے اپنی قوت ایمانی، سوز دروں، صحبت و تربیت، وعظ و نصیحت اور دعوت و تلقین سے لاکھوں آدمیوں کو مادیت کے اس طوفان میں تنکے کی طرح بہنے سے بچا لیا۔ اس تجدیدی عمل میں ان کے شریک حضرت سعید بن جبیر، محمد بن سیرین اور امام شعبی (رحمہم اللہ) بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جب حدیث و فقہ کی تدوین کا مسئلہ سامنے آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایسے اذکیاء اور محیر العقول حافظہ رکھنے والے ممتاز افراد پیدا فرمائے جنھوں نے کتب صحاح مرتب کیں اور اپنے استنباط و اجتہاد سے امت کے لئے دین پر عمل کو آسان کر دیا۔

فتنۂ خلق قرآن نے جب سر اٹھایا تو حضرت امام احمد بن حنبلؒ اس کے لئے سینہ

سپر ہو گئے، یہاں تک کہ حکومت کو جھکنا پڑا اور امام صاحبؒ کی شخصیت اہل حق کی علامت بن گئی۔ جب اعتزال کا فتنہ اٹھا تو امام ابوالحسن اشعریؒ سامنے آئے اور انہوں نے اپنی زبان و قلم سے اعتزال کے قلب و جگر پر وہ تیشے چلائے کہ اس کو پیچھے ہٹنا پڑا اور اپنا وجود باقی رکھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ پھر جب فلسفہ و باطنیت کا فروغ ہوا تو امام غزالیؒ جیسا متکلم اسلام پیدا ہوا جنھوں نے اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا نہ صرف یہ کہ مقابلہ کیا بلکہ اس کی بنیادوں پر حملہ کیا۔ ان کا دوسرا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ لیا، اور اس پر کھل کر تنقید کی اور اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کو پیدا فرمایا جن کی ذات سے دین کو بڑا نفع پہنچا اور انہوں نے مسلمانوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، اللہ نے ان کو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ اسلامی تاریخ میں کم لوگ اس صفت میں ان کے شریک ہوں گے۔ اسی زمانہ میں امام ابن جوزیؒ نے اپنے انقلاب انگیز مواعظ اور مجالس درس سے اصلاح امت کا فریضہ انجام دیا۔ صلیبی حملوں نے جب اسلام کے خطرہ پیدا کر دیا تو صلاح الدین ایوبیؒ اور نورالدین زنگیؒ نے اس کے چھکے چھڑا دیے، بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ذریعہ سے "بیت المقدس" صلیبیوں کے تسلط سے آزاد ہوا۔

جب تاتاریوں نے سر اٹھایا اور لگتا تھا کہ اب شاید دنیا میں اسلام کا کلمہ پڑھنے والے نہ رہیں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں محافظین اسلام پیدا فرما دیے۔ حاصل یہ کہ جب جب کوئی یورش سامنے آئی یا کسی فتنہ نے سر اٹھایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ کے لئے کسی ایک شخصیت یا افراد کو کھڑا کر دیا جنھوں نے مردانہ وار اس کا مقابلہ کیا۔ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام (م ۶۶۰ھ)، مولانا جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ)، شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ)، علامہ ابن قیم (م ۷۵۱ھ)، علامہ ابن رجب حنبلی (م ۷۹۵ھ)، پھر ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی (م ۶۲۷ھ)، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ)، شیخ شرف الدین

یحییٰ منیری (م ۷۸۶ھ)، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (م ۱۰۳۴ھ)، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) اور ان کے صاحبزادگان عالی مرتبت، حضرت سید احمد شہید (م ۱۲۴۶ھ) اور ان کے خلفاء (رحمہم اللہ) سب اسی سلسلہ اصلاح و تجدید کی کڑیاں ہیں جن سے اسلامی دعوت و عزیمت کی تاریخ روشن و تابناک ہے۔

امام العصر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات والا صفات بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اصلاح و تجدید کی تاریخ رقم کرنے والا کوئی مورخ ان کی شخصیت اور اصلاحی و تجدیدی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

عالم اسلام پر مغرب کی یلغار اور اسکے دفاع کی ابتدائی کوششیں

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں عالم اسلام پر مغرب کی یلغار ہوئی۔ صدیوں پہلے صلیبی جنگوں کا جو زخم کاری عیسائیوں کو لگا تھا وہ اس کا بدلہ لینے کی تاک میں تھے، ان کو موقع ہاتھ آیا اور انھوں نے اس کے لئے اپنی ساری توانائی صرف کر دی۔ دوسری طرف اسلامی ممالک اپنی اخلاقی بدحالی اور باہمی انتشار و افتراق سے زار و نزار ہو رہے تھے۔ ترکی بھی (جس کو ایک طویل عرصہ تک خلافت اسلامیہ کا مستقر ہونے کا شرف حاصل رہا تھا) مرور زمانہ کے ساتھ خود شناسی و خود اعتمادی کا جوہر کھو چکا تھا۔ اس کے بالمقابل مغربی تہذیب نئی زندگی نئی قوت سے معمور اور نئے جوش اور نئی امنگوں سے مخمور تھی، وہ اپنے ساتھ ایسا صنعتی، علمی و فکری انقلاب لائی تھی جس کے حدود روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتے جا رہے تھے، بالآخر اس نے اسلام کے قلب و جگر حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب میں پنجے گاڑنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ صورت حال اسلام اور مسلمانوں کے بڑی تشویشناک تھی مگر اس کا مقابلہ کرنے کیلئے جس وسعت فکر، دقت نظر اور قوت و جرأت کی ضرورت تھی اس وقت کے قائدین و مفکرین اور علماء میں اسکی کمی تھی۔

اس سلسلہ میں جن علماء و مفکرین نے فکر وسعی کی ان میں ایک نمایاں نام سید جمال الدین افغانی کا ہے۔ مگر وہ اپنی طاقتور شخصیت اور غیر معمولی ذہانت اور زور خطابت کے باوجود اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے، اور ان کی کوششوں پر سیاسی رنگ غالب رہا، ان کی زیادہ تر توجہ عالم اسلام کی سیاسی و تنظیمی ترقی اور مختلف مسلم ملکوں پر غیر مسلم اقتدار اور برطانوی استعمار کے خاتمہ پر صرف ہوئی، انکے شاگرد مفتی محمد عبدہؒ نے سیاسی کے بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کی اور سرسید احمد خاںؒ کی طرح اسلام کے بعض مسلمہ عقائد کی ایسی تاویلیں کیں جن کو علماء اہل حق کبھی قبول نہیں کر سکتے تھے۔

تحریک "الاخوان المسلمون" سے اس سلسلہ میں بڑی امیدیں وابستہ تھیں، اگر وہ اپنی صحیح اور طبعی رفتار سے چلتی رہتی تو یہ یقین کیا جاسکتا تھا کہ وہ کم از کم مشرق وسطٰی میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا کام کرسکے گی لیکن ایک طرف اس تحریک کے رہنماؤں کی عملی سیاست میں ذرا قبل از وقت شرکت کی وجہ سے دوسری طرف عرب نیشنلزم اور سوشلزم کے علمبرداروں کے برسر اقتدار آجانے اور اس تحریک کو پوری قوت کے ساتھ کچل دینے کی بنا پر عالم اسلام اس طاقتور اور وسیع تحریک سے محروم ہو گیا۔

برصغیر ہندوپاک میں جن لوگوں نے مغربی تہذیب پر نکتہ چینی کی ان میں اکبر الہ آبادی مرحوم کا نام بھی آتا ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص و معروف مزاحیہ انداز اور بلیغ و طاقتور اسلوب میں اس پر نشتر زنی کی اور اس کو اپنے دور میں مقبولیت بھی حاصل ہوئی، لیکن وہ اس تیز دھارے کو روک نہیں سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس ادب اور اصلاح کی بنیاد طنز و تعریض پر ہوتی ہے، اس کی عمر اور اثرات محدود ہوتے ہیں۔ برصغیر میں اس سلسلہ کا سب سے نمایاں نام ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا ہے جن کو جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا جاسکتا ہے، انھوں نے مغربی تہذیب و افکار کا بھرپور مطالعہ کیا اور پوری جرأت و قوت کے ساتھ اس پر تنقید کی۔ جدید تعلیم یافتہ نسل نے اس کا گہرا اثر قبول کیا، لیکن بہرحال ان کی یہ

کوشش برصغیر کی حد تک محدود رہی۔

طبقہ علماء میں سب سے پہلے جس شخصیت نے مدافعانہ اور معذرت آمیز لہجہ کے بجائے پوری جرأت کے ساتھ مغربی تہذیب و افکار پر تنقید کی وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ذات ہے، ان کی تحریریں اعتماد و قوت سے پر ہوتی تھیں۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں اسلامی مسائل اور متکلمانہ و سیاسی مباحث پر جو پرزور مضامین ورسائل لکھے انھوں نے ہندوستان کے اسلام پسند حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی، اگر وہ اسی طریقہ پر گامزن رہتے تو شاید معاملہ کچھ اور ہوتا، مگر انھوں نے بعد میں دین کی جدید تفہیم و تشریح کر کے اور وہ نئی تعبیرات اختیار کر کے جن میں وہ حدود سے تجاوز کر گئے تھے صورت حال بدل ڈالی اور خود ان کو اس سلسلہ میں ہدف ملامت بننا پڑا۔ علماء دیوبند نے جو برصغیر میں اہل حق کی شناخت سمجھے جاتے ہیں برملا ان پر نقد و احتساب کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی یہ تحریک اور فکر بھی محدود ہو کر رہ گئی، تاہم ان کی ابتدائی دور کی تحریروں نے بڑا اثر ڈالا اور عالم اسلام پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔

ایسی صورت حال میں عالم اسلام ایسی شخصیت کا منتظر تھا جو ایک طرف اپنی بالغ نظری و سعت مطالعہ، وسعت فکر، توازن واعتدال، پھر دلسوزی و دردمندی میں اعلیٰ مقام پر فائز ہو۔ عربی زبان پر اس کو پوری طرح قدرت حاصل ہو جو عالم اسلام کی سرکاری زبان ہے تو دوسری طرف وہ اخلاص وللّٰہیت اور زہد و اتقاء میں نمونۂ سلف ہو۔ ان صفات کا امتزاج اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ذات میں پیدا فرمایا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اصل تجدیدی کارنامہ

حضرت کا اصل تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کا نگاہ بصیرت سے مطالعہ کیا، سادہ دل مشرق اور شاطر و ہوشیار

مغرب کی کشاکش کو دیکھا اور سمجھا، اور زمانہ کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا۔

مغرب کی فکری، تہذیبی و تمدنی یلغار کا پورا عالم اسلام شکار ہو رہا تھا اور جزیرۃ العرب بھی اس کے حملوں سے چور چور تھا، اس کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی کھل کر اس کی خامیوں کی نشاندہی کرنے والا ہو۔

برطانوی سامراج اور مغربی استعمار جس نے تقریباً پورے عالم اسلام کو اپنے شکنجہ میں جکڑ رکھا تھا، اس کے اثرات اتنے وسیع اور عمیق پڑ رہے تھے کہ گذشتہ صدیوں اور بیسویں صدی میں اتنا بڑا فرق نظر آتا ہے کہ درمیان میں برسوں نہیں بلکہ صدیوں کی مسافت معلوم ہوتی ہے۔ حضرتؒ نے عالم اسلام کے مختلف ملکوں کے حالات کا جائزہ لیا، اور عالمی سطح پر اپنی پرزور تحریروں سے ایک ایک ملک کے مسلمانوں کو مخاطب فرمایا، ان ممالک کی خصوصیات کا اعتراف بھی کیا، اس کے ساتھ مغربی تہذیب کے جو مضر اور دین دشمن اثرات وہاں پڑ رہے تھے پوری قوت وجرأت کے ساتھ ان کی نشاندہی فرمائی اور ان کو ان ہی کی زبان میں ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر خطاب کیا، ان کے دھڑکتے ہوئے دلوں پر دستک دی اور ان کی خودی کو للکارا اور ان خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی سعی کی جو اس تہذیب کے ظاہری شکوہ و سطوت میں دب کر رہ گئی تھیں۔ حضرتؒ کی آواز ان حالات میں اگرچہ نامانوس تھی لیکن یہ ان کے دل کی آواز اور ضمیر کی للکار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی ملکوں میں خاص طور پر عرب ممالک میں جو مغرب کے دست نگر بنے ہوئے تھے اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اور ہر طبقہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ چیز ان میں اسلامی بیداری کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، لوگوں کا طرز فکر بدلنے لگا، مغربی تہذیب کے بادل چھٹنے لگے اور خود اہل مغرب کو محسوس ہونے لگا کہ اگر اس فکر کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو یہ مغربی تہذیب کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ اسی لئے برطانیہ کے بعض ماہرین فکر و ماہرین تعلیم نے وہاں حضرتؒ کی بعض کتابوں پر پابندی کا بھی مطالبہ کیا۔

حضرتؒ کے اس انداز خطاب نے پورے عالم اسلام پر اثر ڈالا، اسلام کا حقیقی چہرہ لوگوں کے سامنے آیا، اس کی روشنی و تابناکی سے مسلمانوں کے قلوب منور ہوئے اور یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ دنیا کے خانہ میں مسلمان ایک موثر عامل (Factor) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی ترقی میں دنیا کی ترقی مضمر ہے۔ اگر اسلامی تعلیمات یکسر فراموش کردی گئیں تو یہ دنیا اخلاقی انارکی اور انسانی قدروں کی پامالی میں اس حد تک جاسکتی ہے کہ اس کا دیوالیہ پن ظاہر ہو جائے۔ (۱)

حضرت کی اس فکر و دعوت نے خود اعتمادی کی فضا قائم کی۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت پیدا ہوئی اور حضرتؒ کی ذات کو عالم اسلام میں وہ مقبولیت و محبوبیت عطا ہوئی جو قریبی زمانہ میں شاید ہی کسی کے حصہ میں آئی ہو۔

عالم اسلام کے لئے مرکز اتصال و وحدت

عالم اسلام میں حضرتؒ کی مقبولیت و محبوبیت میں بنیادی حصہ اگرچہ حضرتؒ کے اسی تجدیدی کارنامہ کو ہے کہ وہ فکر پورے عالم اسلام کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی حضرتؒ کی جامعیت، اصابت فکر، زہد و استغنا اور اس اسلامی و ایمانی زندگی کو بھی اس میں بڑا دخل ہے جو حضرتؒ کو دوسرے معاصر مفکرین و علماء سے ممتاز کرتی ہے۔ حضرتؒ نے ہر طبقہ کے لوگوں کو مخاطب فرمایا، غریبوں کے دروازوں کو بھی کھٹکھٹایا، امراء کے دلوں پر بھی دستک دی اور خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کیا۔

حضرتؒ نے وہ کریمانہ اخلاق اپنائے جن کو اخلاق نبوی (علی صاحبہا الصلاۃ و السلام) کا پرتو کہا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ طبیعت کی نرمی، تواضع و انکسار، قوم و ملت کے لئے خیر خواہی و خیر طلبی، دلسوزی و دردمندی، حصول مقصد

(۱) حضرتؒ کے اس امتیازی وصف اور تجدیدی کارنامے کو تفصیل کے ساتھ واضح کرنے کے لئے مستقل تصنیف درکار ہے، جس کے لئے کسی ایسے وسیع المطالعہ اور صاحب بصیرت مصنف کی ضرورت ہے، جس کو حضرت کے ساتھ طویل رفاقت کا شرف حاصل رہا ہو، خدا کرے یہ کام بھی انجام پائے اور دعوت و عمل کے میدان میں اس سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

کے لئے لگن اور قربانی، والہانہ جذبۂ عمل، فہم و فراست اور مقصد کی بلندی جیسی ممتاز صفات ان کی خصوصیات ہیں۔ دوسروں کے لئے وسعت قلبی کا حال یہ تھا کہ دین وملت کی تعمیر میں حصہ لینے والے ہر ہر فرد اور جماعت کے لئے آپ کے دل میں جگہ تھی۔ اسی طرح کسی کی دل آزاری کرنا تو گویا آپ کے یہاں کفر تھا۔

وسعت فکر و نظر کے باوجود اس میں پورے طور پر سلامت روی اور دین میں پورا تصلب کہ طریقہ سلف سے ذرا بھی انحراف و شذوذ نہ ہو آپ کا امتیازی وصف ہے۔ آپ نے دین کو اس کی اصل شکل میں زمانہ اور حالات کی رعایت کرتے ہوئے اس طرح پیش فرمایا کہ اس کی ابدیت و حقانیت پر اعتماد بحال ہوا، یہ ایسی وسیع وہمہ گیر اور بنیادی فکر تھی کہ پورے عالم اسلام پر اس کی چھاپ پڑی۔

اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ ہوا کہ پورے عالم اسلام میں آپ کی حیثیت ایک مرکز اتصال و وحدت کی ہو گئی۔ ہر صحیح الفکر جماعت تنظیم اور ادارے میں آپ کی شرکت اور سرپرستی کو اس کے لئے قابل فخر سمجھا جانے لگا، وہ علمی اکیڈمیاں ہوں، دعوتی و فکری تحریکات ہوں یا طریقہائے تصوف و ارشاد ہوں، ان کا تعلق عرب سے ہو یا عجم سے ہر جگہ حضرتؒ کی ذات صرف رکن رکین ہی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر صدر نشین نظر آتی ہے۔

مقبولیت کا راز اور ظاہری طور پر اسکے تکوینی عناصر

مجددین و مصلحین کی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور ان کی زندگیوں کا جائزہ لینے سے صاف نظر آتا ہے کہ تین اوصاف ان کے اندر مشترک ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ یہی اوصاف اللہ کی طرف سے "انتخاب و اصطفاء" کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان میں پہلی چیز آبائی خصوصیات بالاخص ان کا تقویٰ و احتیاط اور حرام بلکہ مشتبہ مال سے بھی حد درجہ اجتناب ہے اس کا نسل پر اثر پڑنا ایک قدرتی امر ہے۔ دوسری چیز اصلاح و تربیت کے لئے مناسب ماحول کا ملنا اور ایسے تربیت کرنے والے معلمین و

اساتذہ کا میسر آنا ہے، جو خود بھی صاحب دردو فکر ہوں۔ تیسری چیز ذاتی محنت اور وہ طلب و ذوق ہے، جو ایک قوت محرکہ کی حیثیت رکھتا ہو۔

حضرتؒ کی زندگی ان تینوں چیزوں کی آئینہ دار نظر آتی ہے۔ آپ کے خاندان میں علم کے ساتھ ہمیشہ زہد و اتقاء اور تربیت نفس کا اہتمام رہا، خاص طور پر آپ کی جدی شاخ اس صفت میں ممتاز تھی۔ والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحیٔ صاحب حسنیؒ نے دو چیزوں کا غایت درجہ خیال رکھا؛ ایک دل آزاری سے اجتناب آخری درجہ میں تھا، دوسرے اس کا شدت کے ساتھ اہتمام تھا کہ مشتبہ و مشکوک مال کا ایک حبہ بھی گھر میں داخل نہ ہونے پائے۔ جد مادری حضرت شاہ ضیاء النبیؒ اپنے زمانے کے عارف کامل اور اپنے دور میں عظمت و بزرگی کی علامت تھے، خاندان میں ان کے اخلاص و استقامت کے چرچے تھے، حضرتؒ کے دل و دماغ پر قدرتی طور پر اس کا بھی اثر پڑا، اس کے علاوہ خاندان کی نمایاں شخصیات کی امتیازی صفات و خصوصیات جن کا چرچا ہونا ایک قدرتی امر ہے، نسلی طور پر حضرتؒ میں منتقل ہوئیں، خاص طور پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی ذات والا صفات نے ذہنی و فکری طور پر متاثر کیا، حضرتؒ نے اصلاح و تجدید کی جو کوششیں فرمائیں ان پر سید صاحبؒ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

دوسری چیز جو کسی بھی شخصیت کی تشکیل میں موثر کردار ادا کرتی ہے وہ سازگار ماحول کا ملنا اور صاحب ذوق و صاحب فکر معلم و مربی کا فراہم ہونا ہے۔ حضرتؒ کے والد ماجد کی اس وقت وفات ہوئی کہ حضرتؒ کی عمر صرف نو سال کی تھی مگر برادر معظم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ نے آپ کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو تعلیم و تربیت کا بڑا حکیمانہ ذوق عطا فرمایا تھا، ان کی نگاہ بڑی دور رس اور فکر بڑی وسیع تھی، پورا عالم اسلام گویا ان کی نگاہ میں تھا، کسی ملک میں اگر کسی مسلمان پر بحیثیت مسلم کے ضرب آتی تو وہ اس کی چوٹ اپنے دل پر محسوس کرتے تھے، وہ زمانہ کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر اور اس کے نبض

شناس تھے۔ دوسری طرف ان کو اشاعت اسلام کی ہمیشہ فکر رہا کرتی تھی۔ انھوں نے حضرتؒ کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا کہ وہ عالمی سطح پر اصلاح و تجدید کا فریضہ انجام دے سکیں، ان کے اندر وہ استعداد پیدا ہو کہ ہر طبقہ کے لوگوں سے آنکھیں ملا کر بات کر سکیں، ان میں فکر و نظر کی وسعت اور دعوت کی ایسی لگن اور اصلاح امت کا ایسا جذبہ اور درد پیدا ہو جو انبیاء کرام خاص طور پر نبی آخر الزماں ﷺ کی میراث ہے، اور ان کی زندگی خود نمونۂ سلف اور لائق تقلید و اتباع بن سکے۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے ذاتی طور پر تربیت اور ذہنی و فکری تشکیل کے علاوہ حضرتؒ کو اپنے اپنے فن کے ماہرین کے پاس بھیجا، عربی تعلیم کے لئے شیخ خلیل عرب صاحبؒ کا انتخاب کیا جو اس فن میں نادرہ روزگار تھے۔ حدیث کی تعلیم کے لئے علامہ حیدر حسن خاں صاحبؒ کے درس میں شریک کیا جو امام المحدثین شیخ حسین یمانیؒ کے شاگرد رشید تھے۔ تعلیم سلوک اور تربیت و تزکیہ کے لئے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی خدمت میں لاہور بھیجا۔ ضروری انگریزی تعلیم بھی دلوائی۔ دعوت و تبلیغ کے میدان میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی رفاقت اور ان کے ساتھ شرکت کو پسند فرمایا۔ پھر عالمی سطح پر دعوت و ارشاد کے لئے حضرت کو ذہنی و فکری غذا فراہم کرتے رہے اور ابتدائی دعوتی سفروں میں خطوط کے ذریعہ رہنمائی فرماتے رہے۔ حضرتؒ کی سیرت سازی میں بنیادی حصہ ڈاکٹر صاحبؒ کی اسی تعلیم و تربیت اور فکر و توجہ کا ہے۔

تیسری صفت جو شخصیت کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ ذاتی محنت اور شوق و طلب ہے، حضرتؒ کی پوری زندگی اس کی اعلیٰ مثال ہے، آپ نے کسی مقام پر پہنچ کر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنے والہانہ جذبۂ عمل اور لگن سے آگے بڑھتے رہے، درمیان میں بڑی دشوار گزار گھاٹیاں بھی آئیں، غیروں نے بھی ملامت کی۔ اپنوں نے بھی ساتھ چھوڑا لیکن مسافر کا سفر جاری رہا اور اپنی زندگی کے اخیر لمحہ تک اس میں کبھی توقف نہیں ہوا۔

ان تین بنیادی صفات و خصوصیات کے علاوہ ایک مزید نعمت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عطا ہوئی اور اس کا آپ کی زندگی پر گہرا اثر پڑا وہ والدہ ماجدہ کی وہ دعائیں ہیں جو انھوں نے آپ کے لئے دل کی گہرائیوں سے کیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صاحب دعا بنایا تھا، دعا ان کی دوا بھی تھی اور غذا بھی، اور ان کی ساری دعا حضرتؒ کے لئے تھی۔ دعا میں ان کے ناز و انداز اور گریہ و اضطراب کا ذکر ان کے تذکرہ میں تفصیل سے آئے گا۔ لیکن بہرحال حضرت کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اس عنصر کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

یہ چار وہ عناصر ہیں جو حضرت کی سیرت کی تشکیل و تعمیر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور انتخاب کا نتیجہ ہے، جب وہ اپنے کسی بندہ کو کسی کام کے لئے منتخب کرلیتا ہے تو اس کے لئے وہی ضروری اسباب اور سازگار ماحول بھی پیدا فرماتا ہے۔ وذالك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم. (۱)

---

(۱) خود حضرتؒ نے مجلس میں متعدد مرتبہ یہ بات فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ توفیق دی وہ سب والد کے اخلاص و صلاح، والدہ کی دعائیں، بھائی صاحب کی تربیت اور اساتذہ و مشائخ کی محبت و شفقت کا فیض ہے۔

دوسرا باب

خاندان، جدامجد، والد ماجد، والدہ صاحبہ اور برادر معظم

سیرت سازی میں خاندان اور قریبی اجداد کی اہمیت

"انسان کے مزاج ومذاق کی تشکیل، اسکے فطری جوہر چمکانے اور اکثر اوقات زندگی کا رخ متعین کرنے میں اسکے خاندان اور قریبی اجداد کا اثر علم الحیات اور علم النفس کی ایک مسلمہ حقیقت ہے جسکی تصدیق گذشتہ تاریخ نیز پے در پے مشاہدات وتجربات سے ہوتی رہتی ہے جسکا انکار ایک امر بدیہی کا انکار ہے۔

یہ اثر انسان پر دو راستوں سے ہوتا ہے، ایک نسلی طور پر کہ یہ خصائص (کمالات وکمزوریاں) باپ سے بیٹے کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ دوسرے ذہنی وفکری طور پر خاندانی روایات اور آباء واجداد کے قابل فخر کارناموں کا تذکرہ، ان کے اصول زندگی عقائد ومسلمات اور ان کے معیار واقدار کا چرچا جن کو وہ ہمیشہ سینے سے لگائے رہے، خاندان کی محبوب ومقتدر شخصیتوں کے نام، پھر ان مقاصد کا ذکر جن کے لئے انھوں نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا، بچپن سے کانوں میں پڑتے ہیں، اور وہ اس کے دل ودماغ کی تختی پر نقش کالحجر ہو جاتے ہیں، اور یہ سب چیزیں شعوری غیر شعوری طور پر اس کی شخصیت وسیرت کی تعمیر اور اسکی صورت گری کرتی ہیں۔" (۱)

---

(۱) حیات عبدالحئی ص ۱۹-۲۰

خاندان

مفکر اسلام امام العصر حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی قدس اللہ اسرارہم نے ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جو ایک طویل زمانہ سے علمی و دینی خدمات انجام دے رہا تھا، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی پوری تاریخ میں شاید کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں کوئی مصلح، مصنف اور داعی نہ پیدا ہوا ہو، درمیان میں اس میں ایسے ایسے مجددین اور حاملین دعوت بھی پیدا ہوئے جنھوں نے بعض مرتبہ صدیوں تک فکری قیادت کی، اور جن کی تجدید واصلاح کی فکرو دعوت کو لے کر عرصہ تک کام کرنے والے رہنمائی حاصل کرتے رہے۔

اس سلسلۃ الذہب کی سب سے پہلی کڑی جس نے ہجرت و جہاد اور اصلاح کے ارادے سے ہندوستان کا رخ کیا وہ امیر کبیر شیخ الاسلام قطب الدین محمد المدنیؒ کی ذات تھی جو چھٹی صدی کی ابتدا میں اپنے ہزاروں معتقدین کے ساتھ تشریف لائے اور "کڑہ مانک پور" کے نواح میں جہاد کر کے اس ظلمت کدہ کو نور اسلام سے منور کیا۔ امیر قطب الدین مدنیؒ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے بھانجے اور بیک واسطہ خلیفہ تھے، براہ راست بھی شیخ سے استفادہ کیا تھا، جلیل القدر اولیاء اللہ میں سے تھے، کڑہ ہی میں وفات پائی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ سلطان قطب الدین ایبک آپکا دست گرفتہ اور معتقد تھا۔

امیر قطب الدینؒ کی اولاد میں اتنے اولیاء، علماء اور مشائخ پیدا ہوئے کہ کم خاندانوں میں اس کی مثال ملے گی۔ ان کے حفید سعید قاضی سید رکن الدینؒ بڑے بلند پایہ تھے، پھر ان کی اولاد میں حضرت قاضی سید احمد نصیر آبادیؒ بڑے باحمیت اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ ان کے پوتے حضرت سید محمد فضیلؒ بھی زہد و ریاضت اور اتباع سنت میں مرتبہ عالی رکھتے تھے۔ دوسرے پوتے حضرت سید محمد اسحاقؒ بھی عارف کامل تھے۔ ان کے صاحبزادے دیوان خواجہ احمد نصیر آبادیؒ زبردست عالم

شجرۂ نسب
مولانا محمد معظم بن قاضی احمد بن قاضی محمود
بن عبد اللہ المحض بن حسن مثنی بن سیدنا حسن سبط النبی ﷺ
مولانا سید محمد اسحاق
مولانا سید محمد فضیل
دیوان خواجہ احمد صاحب
سید ہدایت اللہ
حضرت سید شاہ علم اللہ
جد امجد حضرت خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی
سید محمد ہدی
سید محمد تقی
شاہ ابو حنیفہ
شاہ آیت اللہ
سید عبد الرحیم شہید
قاضی سید امین اللہ
سید محمد نور
حضرت شاہ محمد عدل عرف شاہ لعل
خویش حضرت شاہ علم اللہ
سید محمد عرفان
سید محمد صابر
سید محمد ضیاء
مولانا محمد تقی
امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ
حضرت شاہ ابو سعید
جد مادری حضرت شہیدؒ
محمد شاہ
صلاح الدین
مولانا سید محمد واضح
اکبر شاہ
نور الدین
سید غلام جیلانی
علی محمد
زین العابدین
حضرت مولانا سید محمد ظاہر
سید سعید الدین صابر
جد مادری حکیم سید فخر الدین خیالی
مولانا حکیم سید عبد العلی
سید محمد طہٰ
حضرت شاہ ضیاء النبی
سید رشید الدین
مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی
جد مادری مفکر اسلام
سید خلیل الدین
حضرت مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی
سید رشید احمد
سید محمد صابر
مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی
امۃ اللہ تسنیم صاحبہ
سیدہ امۃ العزیز صاحبہ
زوجہ سید رشید احمد
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
مولانا حکیم ڈاکٹر عبد العلی صاحب حسنی
مولانا سید محمد واضح رشید ندوی
مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
مولانا سید محمد ثانی حسنی
(پانچ صاحبزادیاں)
مولانا سید محمد الحسنی

اور صاحب سلسلہ شیخ طریقت تھے۔ حضرت سید محمد فضیلؒ کے صاحبزادہ حضرت سید شاہ علم اللہؒ اس سلسلۃ الذہب میں اپنی ایک شان رکھتے ہیں، آپ حضرت سید آدم بنوریؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے، اتباع سنت میں دور دور ان کی نظیر ملنی مشکل ہے (۱)، شاہ صاحب کی اولاد میں حضرت مولانا سید محمد جیؒ حضرت شاہ العل صاحبؒ، حضرت مولانا سید محمد حیلہؒ، حضرت مولانا سید محمد صابرؒ، حضرت شاہ ابوسعید صاحبؒ، حضرت شاہ محمد واضح صاحبؒ، حضرت مولانا سید محمد قطب الہدیٰ محدثؒ، حضرت مولانا سید محمد ظاہرؒ اور حضرت شاہ ضیاء النبیؒ بڑے بلند پایہ گزرے ہیں، لیکن ان میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت سید احمد شہیدؒ کی ہے، جو حضرت شاہ صاحبؒ کی چوتھی پشت میں ہیں، ان کے انفاس قدسیہ سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہونچا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ان کی برکات سے وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں جو علم وعرفان کی روشنی سے فیضیاب نہیں۔ (۲)

حضرت سید محمد اسحاقؒ کے دوسرے صاحبزادے سید ہدایت اللہؒ بلند پایہ عالم تھے، عہد شاہجہانی میں امور مذہبی کے صدر الصدور تھے، ان کی چھٹی پشت میں مولانا سید عبد العلیٰ ایک درویش سیرت فاضل بزرگ گزرے ہیں، جو سید احمد شہیدؒ کے مرید ومجاز تھے، خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ جب ڈاک سامنے آتی تو نامۂ اعمال یاد کر کے گریہ طاری ہو جاتا، نقاشی وخوشخطی کا اعلیٰ ذوق تھا، زیادہ تر آمدنی مستحقین پر صرف کر دیتے، "دست بکار دل بیار" کا نمونہ تھے، اخلاقِ کریمانہ کے ساتھ زندگی گزار دی، اور صرف ۴۸ سال کی عمر میں فالج کے مرض میں انتقال فرمایا، آخری کلام جو زبان سے ادا ہوا وہ "ھو الرفیق الاعلیٰ" تھا۔

جد امجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ

حضرت کے جد امجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ انہیں مولانا عبد العلی

(۱) ملاحظہ ہو "تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ" از مولانا سید محمد الحسنیؒ

(۲) ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہید" (۱-۲) از حضرت والاؒ اور "سید احمد شہید" از مولانا غلام رسول مہر

صاحبؒ کے فرزند ہیں، دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ۱۲۵۶ھ کو ولادت ہوئی۔ والد محترم کا کم سنی میں انتقال ہو گیا، اپنے نانا مولانا محمد ظاہرؒ کے دامن تربیت میں پرورش پائی، تعلیم کی تکمیل مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ کے درس میں ہوئی، طب اور شاعری میں بھی رسوخ پیدا کیا، مزاج میں خاموشی، متانت، حلم اور عزلت پسندی انتہادرجہ کی تھی، صبر و قناعت کی صفت ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی، تمکنت اور غرور ان کو چھو کر نہیں گیا تھا۔

راجپوتانہ، حیدر آباد، بھوپال اور ٹونک میں ملازمت کی خاطر طویل قیام فرمایا، خاص طور پر حیدر آباد کے مختلف اضلاع میں آٹھ سال تک صدر مدرسی کرتے رہے لیکن ملازمت سے کبھی مناسبت نہیں رہی، اسی لئے کہیں مستقل قیام نہ ہو سکا، آخری سفر ٹونک کا ہوا، نواب ابراہیم علی خاں نے صیغۂ طبابت سے مشاہرہ مقرر کر دیا، ڈیڑھ سال قیام کے بعد پھر وطن چلے آئے اور ایسے آئے کہ پھر کہیں نہیں گئے، وطن کے گوشۂ عزلت میں پوری زندگی گزار دی۔

بیعت طریقت اپنے پھوپھا حضرت خواجہ احمد صاحبؒ سے کی تھی، اجازت سے بھی سرفراز کئے گئے، حضرت مولانا محمد ظاہر صاحبؒ نے بھی اجازت بیعت مرحمت فرمائی تھی، مگر کبھی پیری مریدی نہیں کی، ذکر و شغل طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق کرتے، کتب بینی اور تصنیف و تالیف سے خاص مناسبت تھی، تاریخ کا بڑا اچھا ذوق تھا، درس و تدریس کا بھی سلسلہ جاری رہتا۔ فارسی، اُردو میں متعدد تصانیف اور دیوان یادگار ہیں۔ عربی میں بھی بعض تصانیف موجود ہیں، اشعار بھی کبھی کبھی عربی میں رقم فرمایا کرتے تھے۔

تصانیف میں سب سے زیادہ اہم "مہر جہاں تاب" ہے، جو فارسی میں ہے، پہلی جلد فلسکیپ کی تقطیع میں تیرہ سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں تین دفتر ہیں، دفتر اول میں علوم و فنون، متعارف و غیر متعارف کے مسائل لکھے ہیں۔ دفتر دوم میں انبیاء کرام، اہل بیت، صحابہؓ، تابعین اور محدثین، علماء، حکماء اور مشائخ کے

حالات جدا جدا قلم بند فرمائے ہیں۔ تیسرے دفتر میں عربی، فارسی، اُردو اور بھاشا کے شاعروں کے حالات ہیں۔ دوسری جلد میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنی چاہی تھی، جس میں ایشیا کا بڑا حصہ ہو چکا تھا اور جلد آدھی ہو چکی تھی کہ ان کو یہ احساس ہوا کہ جس زبان میں وہ یہ کتاب لکھ رہے ہیں اس کا زمانہ نے ورق اُلٹ دیا ہے، اس سے ان کی ہمت پست ہو گئی، مگر پھر دوبارہ ہمت کر کے اردو میں از سر نو لکھنا شروع کیا، اس کے بارہ جزء ہوئے تھے کہ پیغام اجل آگیا۔

طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا، اظہار کمال سے سخت نفرت تھی، یہی وجہ تھی کہ زندگی میں ان کو کم کسی نے جانا، اور اپنے تمام تر علمی و عملی کمالات کے باوجود گوشہ گمنامی میں چھپے رہے۔ وفات کا حال خود صاحب حال کے باکمال فرزند مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنیؒ نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے:

"وفات کی رات کو نبض ساقط ہو گئی، سوائے سانس کی آمد و شد کے زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں رہی، رات کو دس بجے یک بیک جنبش پیدا ہوئی، دائیں پہلو کی طرف خود بخود جھک گئے، اور قلب جاری ہو گیا اور اس میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ سو قدم کے فاصلہ سے لفظ اللہ سنا جا سکتا تھا، ایک بجے رات تک یہ حال رہا، پھر اضمحلال پیدا ہو گیا، اس وقت فقیر نے حاضر الوقت اصحاب سے کہا کہ سورۂ یٰسین پڑھیں، اس کے شروع ہوتے ہی خاموشی اور سکون پیدا ہو گیا، پھر حاضرین نے تلقین شروع کی اور حضرت نے ذکر لسانی شروع فرمادیا، اور اسی حال میں جان جانِ آفریں کے سپرد کردی، یہ واقعہ ۱۰ر رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ کا ہے۔"(۱)

جد مادری حضرت سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ

حضرتؒ نے اگرچہ شاہ صاحب ممدوح کا زمانہ نہیں پایا، حضرت کی ولادت اور شاہ صاحب کی وفات میں پورے پانچ سال کا وقفہ ہے، لیکن چونکہ شاہ صاحب اس دور

(۱) انتخاب و تلخیص از حیات عبدالحئی، الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ۔

میں عظمت و بزرگی کی علامت اور پورے خاندان ہی نہیں بلکہ قرب وجوار کے اضلاع میں مرجعیت کے مقام پر فائز تھے، اسلئے وفات کے بعد بھی خاندان میں ان کے اتباع سنت کے اہتمام، نمازوں میں غایت درجہ خشوع و خضوع اور اخلاص و استقامت کے چرچے تھے۔ ایک نواسے کی حیثیت سے اور والدہ ماجدہ کی نسبت سے دل و دماغ پر اس کا اثر پڑنا لازمی اور قدرتی تھا کہ ماں کی گود انسان کی پہلی تربیت گاہ ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ دائرہ شاہ علم اللہ میں ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں حاصل کی، پھر دہلی پاپیادہ سفر کیا، خانقاہ مجددیہ میں قیام کیا، حضرت شاہ احمد سعید صاحبؒ اور مولانا شاہ عبد الغنی صاحبؒ کا زمانہ تھا۔ دو سال ٹھہر کر لکھنؤ واپس ہوئے اور مفتی سعد اللہ صاحب مراد آبادیؒ اور بعض دوسرے علماء سے استفادہ کیا، پھر وطن واپس ہوئے۔ حضرت خواجہ احمد صاحب نصیر آبادیؒ سے بیعت کی اور طریقت کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی وفات کے بعد خواجہ فیض اللہ صاحب اورنگ آبادیؒ سے تکمیل فرمائی اور مجاز ہوئے۔

۱۲۹۳ھ میں حج سے مشرف ہوئے، واپسی پر علماء و مشائخ کا بکثرت رجوع ہوا، جن میں مولانا ابوالخیر مکیؒ، مولانا ابراہیم صاحب آرویؒ اور مولانا محمد امین صاحب نصیر آبادیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اخلاص و استقامت، فرائض ادا کرنے کا اہتمام، عبادت میں خشوع و خضوع، نماز و تلاوت کا سچا عشق اور اس میں محویت و استغراق ان کا ایسا امتیاز تھا جس نے ان کو ابنائے زمانہ سے ممتاز کر دیا تھا۔ ان کے خشوع فی الصلاۃ کے واقعات سن کر اکابر سلف کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ تربیت سلوک اور فیض باطنی میں شیخ کامل تھے، نسبت اور توجہ بڑی موثر تھی، صاحب املاک و جائداد تھے مگر اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ۱۹۰۸ء میں انتقال فرمایا، دو صاحبزادے (سید احمد سعید صاحبؒ اور حافظ سید عبید اللہ صاحبؒ) اور پانچ صاحبزادیاں یادگار چھوڑیں، ان میں سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہؒ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ہیں۔

والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

حضرتؒ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی صاحبؒ ہندوستان کے مایہ ناز مورخ، صاحب ذوق محدث اور صاحب دل عالم تھے۔ ۱۸؍ رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ میں دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ولادت ہوئی۔ نانی صاحبہ حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت تھیں، اور بڑی عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، بچپن کا کچھ حصہ ان کی آغوش تربیت میں گزرا۔ خود مولانا فرماتے ہیں کہ "میری نانی صاحبہ مجھے لوری سناسنا کر سلاتی تھیں ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب (۱)

بچپن ہی سے نہایت سنجیدہ مزاج، خاموش اور متین تھے، نہ کسی کا دل دکھایا نہ لڑے جھگڑے۔

ابتدائی تعلیم ہنسوہ میں ہوئی جو آپ کا ننیہال تھا، فارسی منشی محمد طلیق سے پڑھی جو رشتہ کے ماموں مولانا شاہ عبد السلام صاحبؒ کے مرید تھے۔ ابتدائی عربی تعلیم خود شاہ صاحب ممدوح سے حاصل کی۔ پھر جب دادیہال قیام رہنے لگا تو حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ سے ابتدائی صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں، رائے بریلی کے قیام میں کچھ دن انگریزی بھی پڑھی پھر الہ آباد تشریف لے گئے اور مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ سے تعلیم حاصل کی، کچھ مہینوں کے لئے فتحپور میں رہ کر مولانا نور محمد صاحبؒ سے فقہ کی کوئی کتاب پڑھی، ۱۳۰۱ھ میں والد مرحوم کے پاس پھر بھوپال تشریف لے گئے، دو سال وہاں رہ کر مختلف علماء سے تحصیل علم میں مشغول رہے، ۱۳۰۳ھ کے وسط میں واپس تشریف لے آئے اور کچھ دن وطن میں رہ کر تحصیل علم کے لئے لکھنؤ روانہ ہوگئے۔

لکھنؤ میں آپ نے مولانا امیر علی صاحبؒ، مولوی الطاف حسین صاحبؒ،

(۱) حیات عبد الحی ص ۳۱۔

مولوی فتح محمد صاحب تائبؒ، مولانا فضل اللہ صاحبؒ اور مولانا محمد نعیم صاحبؒ فرنگی محلی سے کتب درسیہ پڑھی، فراغت کے بعد وطن تشریف لائے اور اسی دوران آپ کا نکاح ہوا اور اس کے بعد کچھ دن وطن میں قیام رہا پھر تعلیم کی تکمیل کے لئے بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں قاضی عبدالحق صاحبؒ سے باقی کتب درسیہ پڑھیں، مولانا سید احمد صاحب دیوبندیؒ سے ریاضی پڑھی اور شیخ محمد عربؒ سے ادب کی تکمیل کی، ان کے والد نامدار شیخ حسین بن محسن یمانیؒ سے حدیث پڑھی اور اجازت لی، شیخ کو آپ سے بڑی محبت تھی، آپ کی فرمائش پر شیخ نے بعض رسائل بھی تصنیف فرمائے۔

طب کی تعلیم حکیم عبدالعلی صاحبؒ اور حکیم عبدالعزیز صاحبؒ کے یہاں تکمیل ہوئی۔

طالب علمی ہی کے دور میں حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ سے بیعت کا تعلق قائم فرمایا اور حضرت نے خصوصی توجہ فرمائی لیکن ان سے زیادہ استفادہ کا موقع نہیں مل سکا، اس لئے منازل سلوک اپنے خسر حضرت شاہ ضیاء النبیؒ اور والد ماجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ کی خدمت میں طے کئے۔ شاہ عبدالسلامؒ کے خلفاء مولانا امین الدین کنتھویؒ اور جناب قدرت علی صاحبؒ سے بھی اس سلسلہ میں فیض حاصل کیا۔ مذکور الصدر تینوں بزرگوں نے آپ کو اجازت بیعت مرحمت فرمائی۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی مراسلت کے ذریعہ سے استفادہ کیا اور انھوں نے بھی اپنے ایک مکتوب میں آپ کو اجازت دی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حساس دل عطا فرمایا تھا، اصلاح و انقلاب کی جو کوششیں کی جاتیں دل و جان سے ان کا تعاون فرماتے، طالب علمی ہی کے دور میں دارالعلوم کے ابتدائی جلسوں میں شرکت فرمائی، پھر فارغ ہونے کے بعد وطن میں "انجمن آل ہاشم" کی بنیاد ڈالی، پھر شوال ۱۳۱۲ھ سے باقاعدہ دارالعلوم کی خدمت کا آغاز فرمایا اور ایک مدت تک بلا کسی معاوضہ کے صبر و استقلال کے ساتھ معاون ناظم کی

حیثیت سے کام کرتے رہے، بعد میں ارکان کے اصرار پر معاوضہ لینا قبول فرمالیا، اس دوران تعلیم ادب وافتاء کا کام بھی کرتے رہے، اپنی مسجد میں وعظ بھی فرماتے، دس سال تک یہی سلسلہ رہا پھر معاوضہ ترک فرمادیا اور حصولِ معاش کے لئے مطب شروع کیا، اس میں بھی خدمت ہی مقصود تھی۔

جب دارالعلوم میں انتشار شباب کو پہونچا تو بالاتفاق ۱۳راپریل ۱۹۱۵ء میں نظامت کے لئے آپ کا انتخاب ہوا۔ نظامت کا ابتدائی دور گذشتہ اختلافات کے اثرات کو دور کرنے، ملک میں ادارہ کا وقار بحال کرنے اور مالی بحران دور کرنے میں گذرا۔ پھر آپ نے تعلیم وتربیت کی طرف توجہ فرمائی لیکن پیغام اجل آگیا اور آپکو اس کا زیادہ موقع نہیں مل سکا۔

خلوت پسندی، وقار، کم گوئی، صبر، تواضع، فنائیت، تسلیم ورضا، جود وسخا، سلامت طبع جیسے اخلاق میں آپکو امتیاز حاصل تھا۔

والدین کے مطیع وفرمانبردار، اہل وعیال پر شفیق تھے، جو اعزہ واحباب حاجتمند ہوتے ان کے ساتھ سلوک وصلہ رحمی اس طرح فرماتے کہ گھر والوں کو بھی خبر نہ ہوتی۔ خاندان کے حقوق ادا کرنے کا بڑا خیال رہتا، آپ کی ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہونچی۔ دوسروں کا دل دکھانا گویا آپ کے مسلک میں کفر تھا۔ والد کے احباب اور ان سے تعلق رکھنے والوں کا آپ کو بہت خیال رہتا۔

دن بھر کی آمدنی رات تک خرچ کرنا ضروری سمجھتے اور رات کو روپیہ باقی رکھنا برا سمجھتے تھے۔

زیادہ وقت کتب بینی اور تصنیف وتالیف میں صرف ہوتا تھا۔ تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا، تفسیر وحدیث، ادب اور طب کا درس دیتے تھے، درس حدیث کا سلسلہ آخری دن تک جاری رہا اور وفات کے دن بھی اس میں ناغہ نہیں ہوا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے آپ سے مقامات کے کچھ حصے پڑھے ہیں۔

نوافل میں اقتصاد پسند فرماتے، اتباع سنت کا غایت درجہ اہتمام تھا، مشتبہ مال

سے حد درجہ اجتناب تھا، فکر میں بڑا توازن تھا، ذکاوت و ذہانت میں ممتاز تھے، طبیعت ایسی سلیم تھی کہ ہر چیز کی اہمیت اسی تناسب سے سمجھتے جس تناسب کو فطرت نے قائم کردیا ہے۔

اردو، فارسی اور عربی ادب میں بلند پایہ رکھتے تھے، تاریخ سے خاص لگاؤ تھا، اسلامیان ہند کی تاریخ میں امامت کا مرتبہ حاصل تھا، تفسیر و حدیث کا اچھا ذوق تھا، اخیر میں حدیث کی اتنی مزاولت بڑھ گئی تھی کہ تاریخ کا ذوق بھی ماند پڑ گیا تھا۔ اخیر میں یہ بھی تمنا تھی کہ فرزند اکبر ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ فارغ ہوں تو ان کو مطب میں بٹھا کر خود بقیہ زندگی درس حدیث میں مشغول رہ کر وطن میں گزار دیں۔ فقہی مسائل میں بھی فیصلہ کن رائے رکھتے تھے۔(۱)

۱۵ر جمادی الاخرۃ ۱۳۴۱ھ مطابق ۲ر فروری ۱۹۲۳ء میں اچانک رحلت فرمائی۔ بقول حضرتؒ کے وہ چراغ گل ہو گیا جس کی روشنی میں لوگوں نے اسلاف کے مٹے ہوئے نقش قدم اور کاروان رفتہ کے دھندلے نقوش، سلف صالحین و علماء متقدمین کے کتنے کارنامے جو تہہ بتہہ پردوں میں چھپے پڑے تھے، کاغذ کے صفحات پر دیکھے اور آئندہ نسلیں بھی ان کو دیکھتی رہیں گی، وہ چراغ جو ثلث صدی تک دلوں کو حرارت و نور سے بھرتا رہا اور حلقہ احباب ہی میں نہیں بزم علم و دین میں بھی شمع انجمن بنا رہا۔

آپ نے اپنے پیچھے متعدد شاہکار تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا جن میں ممتاز ترین کتاب "نزهة الخواطر" ہے جو آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں ہندوستان کے ساڑھے چار ہزار باکمال مشاہیر رجال کا تذکرہ ہے۔ کتاب اپنی وسعت و جامعیت، حسن انتخاب، مورخانہ دیدہ وری، پھر زبان کی حلاوت و چاشنی میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ممتاز کتابوں میں "الهند في العهد

---

(۱) انتخاب و تلخیص "ترجمہ مصنف" "یاد ایام" از مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب حسنی رحمۃ اللہ علیہ معمولی حذف و اضافہ کے ساتھ۔

الاسلامی" اور "الثقافة الاسلامية فی الهند" بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ حدیث میں "تلخیص الاخبار" کے نام سے ایک بہترین انتخاب فرمایا پھر اس کی دو جلدوں میں بڑی لطیف شرح فرمائی، "تلخیص الاخبار، تهذیب الاخلاق" کے نام سے بار بار شائع ہوئی اور داخل نصاب کی گئی۔ منتهی الافکار (شرح تلخیص الاخبار) بھی انشاء اللہ جلد ہی شائع کی جائے گی۔ غناء و سماع پر ایک بھرپور رسالہ تحریر فرمایا تھا جو "الغناء فی الاسلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد رسائل و تصنیفات یادگار ہیں۔

مولانا عبدالحی صاحبؒ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی اہلیہ مولانا سید عبدالعزیز صاحبؒ ہنسوی کی دختر مخدومہ سیدہ زینب صاحبہؒ تھیں ان سے صرف ایک فرزند مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنیؒ کی ولادت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر صرف پانچ سال کی تھی کہ ان کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد آپؒ نے والد ماجد کے حکم سے حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی صاحبزادی مخدومہ خیر النساء بہتر صاحبہؒ سے عقد فرمایا۔ ان سے دو صاحبزادیاں سیدہ امۃ العزیز صاحبہ (والدہ مولانا محمد ثانی حسنیؒ، مولانا محمد رابع حسنی، مولانا محمد واضح حسنی مدظلہما) اور سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ (مترجمہ زاد سفر) اور ایک فرزند حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

والدہ صاحبہ مرحومہ

حضرت والا کی والدہ ماجدہ مخدومہ سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہؒ اپنے زمانہ کی ممتاز ترین خواتین میں سے تھیں، زہد و عبادت، ورع و تقویٰ میں امتیازی شان رکھتی تھیں، دعاء و مناجات کا تو وہ ذوق تھا کہ کم ہی خواتین اس وصف میں ان کی شریک ہونگی۔

۱۲۹۵ھ بمطابق ۱۸۷۸ء میں ولادت ہوئی، والد بزرگوار اپنے زمانہ میں اسلاف کی زندہ یادگار اور زہد و تقویٰ کا نمونہ تھے۔ والدہ بھی بڑی عابدہ، زاہدہ اور

سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ والدین ہی کی تعلیم وتربیت میں رہیں، والد صاحب کو ان کی فطری استعداد اور عبادت کا ذوق دیکھ کر ان سے بڑی محبت تھی، والد صاحب ہی سے انھوں نے ترجمۂ قرآن پڑھا اور بعض ضروری کتابیں پڑھیں جو کتابیں زیادہ ان کے مطالعہ میں رہیں اور ان کا گہرا اثر پڑا، ان میں قصص الانبیاء، مقاصد الصالحین، مآثر الصالحین، طریق النجاۃ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ والد صاحب کے پاس جب کوئی کتاب ہدیہ میں آتی تو انہیں سے ذکر کرتے اور ان کو مطالعہ کے لئے دیتے۔

نواب سید صدیق حسن خاں صاحبؒ کی "الداء و الدواء" کو بھی انھوں نے مطالعہ میں رکھا، اس سے انکو مختلف آیاتِ قرآنی کے خواص اور اعمال قرآنی کا علم ہوا اور انھوں نے بہت سی چیزوں کو اپنا معمول بنالیا۔ محمد بن سیرینؒ کی "تعبیر الرؤیا" کو بھی بار بار پڑھا، اس سے انکو خوابوں کی تعبیر سے خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی۔

اس خاندان میں مردوں میں حفظ کا رواج تھا مگر عورتوں میں اس کی ابتداء حضرت کی والدہ صاحبہ نے فرمائی، اس سے ایسا ذوق پیدا ہوا کہ اسی زمانہ میں پانچ بیبیاں حفظ قرآن سے مشرف ہوئیں، جن میں ان کے علاوہ ان کی منجھلی بہن، ان کی بھانجی اور دو اور عزیز بہنیں تھیں، رمضان المبارک میں باقاعدہ ان کی الگ تراویح ہوتی تھی، عشاء کے بعد سے سحری تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ یہ سب قرآن مجید بہت اچھا اور صحت مخارج کے ساتھ پڑھتی تھیں، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ:

"ایک مرتبہ میں چھپ کر دیر تک والدہ صاحبہ کا قرآن کھڑا سنتا رہا، وہ تراویح پڑھا رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے بارش ہو رہی ہے، وہ لطف آج تک نہیں بھولتا، شادی ہونے کے بعد انھوں نے والد صاحب کو قرآن مجید سنایا اور اس میں مزید جلا پیدا ہوئی۔" مزید فرماتے ہیں:

"عبادت کا ذوق ان کو شروع ہی سے تھا، والد صاحب تہجد کے لئے مسجد تشریف لے جاتے تو وہ اپنی والدہ کے ساتھ تہجد میں مشغول ہو جاتیں،

پھر وہ دور آیا کہ ان کو دعاء و مناجات کا ذوق پیدا ہوا۔ فرماتی ہیں کہ "ایک مرتبہ میں قرآن شریف پڑھ رہی تھی، میں نے یہ آیت دیکھی"

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ، اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (البقرہ)

انھوں نے بارہا یہ آیت پڑھی ہوگی اور ممکن ہے کہ اس وقت حفظ بھی کر چکی ہوں گی لیکن وقت کی بات ایکدم سے آنکھیں کھل گئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کھوئی ہوئی چیز پالی، اور کوئی نئی حقیقت دریافت کی۔ کہتی تھیں کہ "معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے دل پر لکھ دیا ہو اور کوئی چیز دل کی تہہ میں بیٹھ گئی ہو"۔ بس کیا تھا جیسے کوئی خزانہ مل گیا اور سارے قفلوں کی کنجی ہاتھ آگئی، پس اسی وقت سے دعاء کا خاص ذوق پیدا ہو گیا۔"

ان کی عمر اب شادی کی ہو گئی تھی، سگے چچازاد بھائی سے رشتہ بھی آیا مگر شاہ صاحب کو تردد تھا کہ اس خاندان میں دین کا اعلیٰ ذوق یا اعلیٰ دینی تعلیم کی کمی تھی، اسی دوران مولانا عبد الحی صاحب کی اہلیہ محترمہ (والدہ مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ) کی اچانک وفات ہو گئی، یہ بی بی بڑی نیک، سلیقہ مند اور فرمانبردار تھیں، مولانا کی عمر اس وقت صرف ۳۳ سال تھی، ان کی حساس، محبت آشنا اور وفا شعار طبیعت پر قدرتاً اس کا بڑا اثر پڑا اور آپ نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے والد ماجد مولانا حکیم سید فخر الدین صاحبؒ اور حضرت شاہ ضیاء النبیؒ دونوں مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادیؒ کے دست گرفتہ و فیض یافتہ تھے، خاندانی قرابتیں بھی تھیں اور دونوں میں بڑی الفت و اتحاد تھا۔ اس حادثہ کے بعد مولانا فخر الدین صاحبؒ کے دل میں اس بات کا شدید تقاضا پیدا ہوا کہ وہ اپنے صاحبزادہ کی دوسری شادی حضرت شاہ ضیاء النبی صاحبؒ کی ان صاحبزادی سے کریں جو اپنی دینداری، سلیقہ مندی اور پڑھنے لکھنے کے ذوق کی وجہ سے ان کو نہایت عزیز تھیں، لیکن مولانا کی طبیعت شادی کی طرف بالکل راغب نہ تھی لیکن بالآخر والد صاحب

کی اطاعت اور تعمیل حکم کے خیال سے راضی ہو گئے، اور شاہ صاحب کے یہاں پیغام بھیج دیا گیا، والد صاحب ایک خط میں مولانا کو لکھتے ہیں "زنہار زنہار میرے خلاف مرضی کے نہ کرنا، میری پسند میں تمہارے دارین کی بہبود و فلاح مضمر ہے اور مجھ سے بڑھ کر تمہارا ابھی خواہ کون ہو گا؟!"

شاہ ضیاء النبیؒ کو مولانا سے بڑی محبت تھی انھوں نے شاہ صاحبؒ سے روحانی استفادہ بھی کیا تھا اور وہ ان کی علمیت وصلاحیت سے بھی واقف تھے، پیام آتے ہی انھوں نے منظور کر لیا لیکن چونکہ مولانا فخر الدین صاحبؒ بڑے قناعت پسند اور زاہد بزرگ تھے، گھر میں فاقہ ہونا کوئی نادر بات نہ تھی، اور مولانا عبد الحی صاحب کی زندگی بھی نہایت زاہدانہ تھی اور آمدنی کا کوئی خاطر خواہ یا قاعدہ ذریعہ نہیں تھا عورتیں ان معاملات میں بڑی حساس ہوتی ہیں، اس لئے شاہ صاحبؒ کی اہلیہ کو بڑا تردد تھا لیکن اسی تردد و کشمکش میں حضرتؒ کی والدہ نے متعدد خواب دیکھے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس "قران السعدین" سے خاندان ہی کا نہیں بلکہ پوری اسلامی برادری کا بخت بلند ہو گا۔ (۱) اس دوران انھوں نے ایک نہایت بشارت آمیز خواب دیکھا جس سے وہ زندگی بھر تسکین حاصل کرتی ہیں، اس کا تذکرہ کرتیں تو ان پر خاص کیفیت طاری ہو جاتی، "الدعاء و القدر" میں خود تحریر فرماتی ہیں:

"ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ خاص اس مالک کریم، رحمٰن ور حیم کی عنایت و مہربانی سے ایک آیت کریمہ مجھے حاصل ہوئی، صبح تک وہ زبان پر جاری تھی، مگر کچھ خوف ایسا تھا کہ میں بیان نہ کر سکی، منہ سے نکلنا دشوار تھا اور اس کے معنی بھی مجھے معلوم نہ تھے، جب معنوں پر غور کیا تو خوشی سے پھول گئی اور تمام فکر و غم بھول گئی، اپنی اس خوش نصیبی پر فخر کیا اور اس خواب کو بیان کیا، ہر شخص سن کر

---

(۱) ان خوابوں اور مبشرات کو انھوں نے "الدعاء و القدر" نامی رسالہ میں جمع فرمادیا ہے رسالہ مخطوطہ کتب خانہ ندوۃ العلماء کی زینت ہے۔

رشک کرتا، والد مرحوم خوشی میں رونے لگے۔ وہ آیت شریفہ یہ تھی :

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (السجدہ ۱۷)	سو کسی کو معلوم نہیں جو چھپا دھرا ہے، ان کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک بدلہ اس کا جو کرتے تھے۔

بالآخر شاہ صاحب کا فیصلہ غالب آیا اور بخیر و خوبی یہ رشتہ ہو گیا۔(۱) و ذلك تقدير العزيز العليم۔

حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں :

"والدہ صاحبہ اپنے نئے گھر میں آئیں تو اس کا انھوں نے وہی نقشہ دیکھا جس کو وہ سنا کرتی تھیں، تنگی ترشی کا زمانہ، کبھی فراغت کبھی فاقہ، گھر میں کئی کھانے والے اور دادا صاحب کی آمدنی برائے نام، ادھر نانی صاحبہ اپنی شفقت کی بناء پر اس ٹوہ میں رہتی تھیں کہ بیٹی کو کچھ تکلیف تو نہیں ہے؟ کبھی کسی ماما کو بھیجتیں کہ گھر میں کچھ پک رہا ہے یا نہیں؟ والدہ صاحبہ نے کئی بار سنایا کہ "جب میں کسی کو اپنے میکہ سے آتے دیکھتی تو چولھے پر ہانڈی رکھ دیتی اور آگ جلا دیتی تاکہ یہ معلوم ہو کہ کھانا پک رہا ہے، حالانکہ اس میں پانی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔" بعض اوقات نانی صاحبہ اپنی فراست سے تاڑ لیتیں اور کھانے کا خوان لگا کر بھیج دیتیں۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد والد صاحبؒ نے مطب شروع کرنے کا ارادہ کیا، والدہ صاحبہؒ کہتی تھیں کہ مجھ سے مشورہ لیا، میں نے اس کی بڑی تائید کی اور مطب کا سلسلہ شروع ہو گیا، مطب شروع ہوتے ہی وہ پریشانی دور ہو گئی، آمدنی کا سلسلہ شروع ہوا اور بہت جلد اتنی برکت اور ترقی ہوئی کہ گھر کا نقشہ ہی بدل گیا، گھر جس کا بڑا حصہ خام تھا، والدہ صاحبہ کی بلند ہمتی اور زندہ دلی سے اس کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا اور رفتہ رفتہ ایک پختہ حویلی بن گئی،

---

(۱) انتخاب و تلخیص از ذکر خیر، حیات عبدالحی۔

دونوں بہنوں اور بھائی صاحب (۱) کو اس طرح اپنی تربیت اور شفقت میں لیا کہ وہ ماں کو بھول گئے اور ساری عمر ان سب نے انہیں کو ماں سمجھا۔ جس گھر میں خود گھر والوں کو کبھی فاقہ کرنا پڑتا تھا اب وہاں ہر گھر سے زیادہ مہمانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، رائے بریلی و لکھنؤ میں اپنے پرایوں اور قریب و دور مہمانوں کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ (۲)

"انتظام خانہ داری کی ساری ذمہ داری ان پر تھی، مہمانوں کا وسیع سلسلہ تھا، خاندان کے کئی بچے تعلیم کے سلسلہ میں مستقل طور پر مقیم رہتے تھے، بھائی صاحب تعلیم حاصل کر رہے تھے، مختلف مہمانوں اور خاص طور پر عزیزوں کی خاطر داری اور ان کی حیثیتوں اور مزاجوں کی رعایت، سب کے حقوق کی ادائیگی بڑا نازک اور مشکل کام تھا، والدہ صاحبہؒ کی زندگی اس دور میں اس ایثار و قربانی کا نمونہ تھی جو ہندوستانی عورتوں کا طرۂ امتیاز اور دیندار و تربیت یافتہ مسلمان بیویوں کا شعار ہے، وہ والد صاحب کی اجازت کے بغیر باوجود اس کے کہ انھوں نے ان کو گھر کا مالک بنا رکھا تھا ان کی چیزوں میں بلا اجازت تصرف کرنا قریب قریب ناجائز سمجھتی تھیں، گھر میں موسم کے جو پھل اور باہر سے جو تحائف آتے جب تک کہ والد صاحبؒ کی اجازت اور صراحت نہ ہوتی وہ اپنے بھانجوں، بھتیجوں کو تو کیا اپنی اولاد کو بھی دینا گناہ سمجھتی تھیں۔" (۳)

"اس پورے عرصے میں جس میں زندگی اور خاندان میں بہت سے نشیب و فراز آئے، متعدد اولادیں ہوئیں، خوشیاں بھی اور پریشانیاں بھی پیش آئیں، ان کے معمولات، دعاء کا شغف، قرآن مجید کا دور برابر قائم رہا، رمضان المبارک میں قرآن مجید کا دور اور بعض اوقات اس کا تراویح میں ختم

---

(۱) ڈاکٹر عبد العلی صاحب (۲) ذکر خیر ص ۳۷-۳۸

(۳) ذکر خیر ص ۳۰-۳۱

کرنے کا سلسلہ بھی تھا، بھائی صاحبؒ کو والدہ صاحبہؒ سے اس وقت بھی اُنس تھا جب ان کی والدہ حیات تھیں اور بعد میں تو انھوں نے ان میں اور اپنی ماں میں فرق نہیں سمجھا، اور انھوں نے بھی ان کو ہمیشہ اپنی اولاد پر ترجیح دی، والد صاحبؒ کی دونوں بہنوں اور بھائی صاحب کی شادی بڑے شوق، خوش سلیقگی اور حسن انتظام سے کی۔

غرض یہ زمانہ ہر طرح سے فرحت و مسرت، خیر و برکت کے ساتھ گزر رہا تھا، اچانک ۵/ جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ (۲/ فروری ۱۹۲۳ء) کو والد صاحب کے انتقال کا واقعہ پیش آیا، پہلے سے طبیعت کچھ ناساز نہ تھی، میرے چچا مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحبؒ کو کچھ چوٹ آگئی تھی، والد صاحب نے والدہ صاحبہ کو ان کی عیادت کے لئے ان کے یہاں بھیج دیا، مغرب کے بعد تک کام کیا، لوگوں سے ملاقاتیں کیں، ندوہ کے کاغذات پر دستخط کئے پھر اچانک مرض موت پیش آگیا اور گھنٹہ دو گھنٹہ میں اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔

مجھے خوب یاد ہے میری عمر اس وقت نو سال کی تھی، میں والدہ صاحبہ کو لینے گیا، جب وہ آئیں اور ان کو واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ سجدہ میں گر گئیں، جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا، خود انکی زبان سے اس صدمہ اور اس پر صبر و رضا کا حال سنئے:

"جب خدمت کی مدت ختم ہونے کو آئی تو اس مالک حقیقی نے میرے حق میں بہتر سمجھ کر قسمت کا بہانہ پیش کر دیا، قسمت نے حکیم ایزدی پا کر فوراً ہی فیصلہ کر دیا، میں اپنے مالک حقیقی کی رضا پر راضی ہو گئی مگر یہ غم جدائی ایسا نہ تھا کہ برداشت کر لیتی، یہ بھی اسکی رحمت اور حکمت تھی جو مجھے اپنی خوشی پر راضی رکھا ورنہ جو بھی حالت ہو جاتی کم تھی، ایسے مونس و رفیق کا یک بیک نظر سے غائب ہو جانا قیامت سے کم نہ تھا، میں نہیں کہہ سکتی یہ دل پھر

دل کی صورت میں کیونکر رہ گیا، بس یہ کہنا چاہئے کہ یہ حکم میرے لئے ہلاکت و مصیبت نہیں تھا بلکہ سراسر رحمت اور ذریعۂ عنایت تھا کہ بجائے ہلاکت و بربادی کے مجھے اپنے سایۂ رحمت میں لے لیا اور میرا سچا مونس و غمخوار اور مددگار ہو کر ہر موقع پر ساتھ دینے لگا، سبحان اللہ کیا شان رحمت ہے اسکی، اٹھی غم کی گھٹا اور رحمت ہو کر برس گئی جس سے تمام کھیتی سرسبز و شاداب ہو گئی۔(۱)

"رائے بریلی میں عدت کی مدت میں اور اس کے بعد والدہ صاحبہؒ کے دو ہی مشغلے تھے ایک دینی کتابوں کا سننا جن کے پڑھنے کی سعادت اکثر مجھے حاصل ہوتی تھی، دوسرے ان کی زندگی بھر کا وظیفہ، دعاء اور عبادت۔

اس زمانہ میں ہمارے خاندان میں ایک بڑا اچھا دستور تھا کہ جہاں کوئی ایسا غمناک واقعہ پیش آتا، دل دکھے ہوئے ہوتے یا کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو "صمصام الاسلام" سنی جاتی۔ یہ مشہور مؤرخ واقدی کی ایک مشہور کتاب "فتوح الشام" کا پچیس ہزار اشعار میں ترجمہ ہے، یہ ترجمہ اور نظم ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ میرے والد صاحبؒ کے حقیقی پھوپھا منشی سید عبدالرزاق صاحبؒ کلامی کی لکھی ہوئی، جوش و خروش سے بھری ہوئی اور درد و اثر میں ڈوبی ہوئی، جنگ کا نقشہ ایسا کھینچے کہ دل جوش سے اچھلنے لگتے ہیں اور نبض تیز ہو جاتی ہے، شہادت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ خود راہِ خدا میں جان دینے کے لئے دل بیتاب ہو جاتا ہے، صحابہ کرامؓ اور مجاہدین کے غم کے سامنے اپنا غم بھول جاتا ہے۔

والدہ صاحبہ مناجاتیں اور نظمیں لکھ لکھ کر اپنا غم غلط کرتیں اور اپنے دل کو تسکین دیتیں، خاندان کی بچیوں کو اپنے پاس رکھ کر انکی تعلیم و تربیت میں مشغول رہ کر اپنا دل بہلاتیں، مناجاتوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ "باب رحمت"

---

(۱) ذکر خیر ص ۳۲ تا ۳۴

کے نام سے ۱۹۲۵ء میں بھائی صاحبؒ کی توجہ اور اہتمام سے شائع ہوا اور اس پر انھوں نے میرے نام سے ایک بہت مؤثر تعارفی مقدمہ لکھا۔ یہ کتاب بہت جلد گھر گھر پھیل گئی، بہت سی مسلمان بیبیوں اور دعاء و مناجات کا ذوق رکھنے والی مستورات نے اسکو پڑھ کر مناجات کا لطف اور دعاء کی لذت حاصل کی اور یہ مجموعہ نہایت مقبول ہوا۔

اپنے خاندان نیز دوسری مسلمان بچیوں کیلئے انھوں نے ایک دوسری کتاب لکھی جس میں دینی و اخلاقی ہدایات، اچھی اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے اصول و آداب اور حقوق و فرائض و امور خانہ داری کی تعلیم دی، یہ کتاب بھی چند سال کے بعد "حسن معاشرت" کے نام سے چھپی اور مقبول ہوئی۔ والدہ صاحبہ کھانے کی ترکیبوں اور نئے نئے نسخوں کی ایجاد میں بھی مجتہدانہ دماغ رکھتی تھیں، اس موضوع پر بھی انھوں نے ایک کتاب "ذائقہ" کے نام سے لکھی جو ۱۹۳۰ء میں "نامی پریس" لکھنؤ میں چھپی اور بہت پسند کی گئی۔ (۱)

والد صاحب کی وفات کے بعد والدہ صاحبہ کی شفقت و توجہ حضرت پر پوری طرح مرکوز ہوگئی، رائے بریلی کے قیام میں وہی حضرتؒ کی تربیت و نگہداشت فرماتیں، پھر حضرتؒ کے لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں بھی وہ سراپا توجہ و دعا بنی رہیں (۲) راقم کے والد ماجد مولانا سید محمد الحسنیؒ تحریر فرماتے ہیں :

"عم مخدوم و معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے لئے ان کی دعا کا کیا حال تھا اس کے لئے صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ ان کی ساری زندگی دعا تھی، اور ان کی ساری دعا چچا میاں کے لئے تھی، وہ جس وقت بھی دعا کرتیں اور جس کے لئے بھی دعا کرتیں وہ دراصل ان ہی کیلئے ہوتی۔" (۳)

---

(۱) ذکر خیر ص ۷۴ تا ۷۵

(۲) والدہ صاحبہ کی تربیت کے واقعات کا ذکر حضرت کے مستقل تذکرہ میں آئے گا۔

(۳) ذکر خیر ۱۱۶

حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"میرے لئے ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مجھ سے دین کی تقویت اور اسلام کی اشاعت ہو، کبھی کبھی مجھ سے پوچھتیں: علی! تمہارے ہاتھ پر کوئی مسلمان بھی ہوا ہے؟ میں کہتا ہاں اکادکا کسی نے کلمہ پڑھا ہے، فرمایا کہ یہ آرزو ہے کہ جماعتیں کی جماعتیں تمہارے ہاتھ پر مسلمان ہوں۔ ایک روز بڑی ٹھنڈی سانس لے رہی تھیں، چھوٹی ہمشیرہ نے کہا کہ آخر آپ کیا چاہتی ہیں؟ کیا آپ کی خواہش ہے کہ علی نبی ہو جائیں؟ فرمایا کیا میں نہیں جانتی نبوت ختم ہو گئی؟ میری آرزو ہے کہ ان کے ہاتھ پر جماعتوں کی جماعتیں اسلام لائیں اور دنیا میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک اسلام کا ڈنکا بج جائے۔(۱)

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دعا کا ایسا ذوق عطا فرمایا تھا کہ مردوں میں بھی کم ہی لوگ اس صفت میں ان کے شریک ہونگے، اپنا حال وہ خود بیان فرماتی ہیں:

"دعا گویا میری غذا تھی، بغیر دعا کیے ہوئے مجھے سیری نہ ہوتی، دعا کی مشغولیت اتنی بڑھی کہ تمام مشاغل چھوٹ گئے، اگر بات بھی کرتی تو دعا کے ساتھ کرتی، کوئی گھڑی دعا سے خالی نہ گزرتی، جمعہ گویا روز عید تھا اور فی الحقیقت عید کا دن بھی ہے۔ تمام دن دعا کرتی، خاص کر عصر سے غروب آفتاب تک تنہا بیٹھ کر دعا میں ایسی مشغول رہتی کہ کسی طرف آنکھ نہ اٹھاتی، مرغ کی ہر آواز پر اور ہر اذان کے ساتھ دعا کرتی، حتی الامکان کوئی وقت دعا کا ضائع نہ کرتی، یہ اس مالک حقیقی کی رحمت و عنایت تھی کہ جو جو معاملات زندگی میں پیش آنے والے تھے دعا کے وقت سب پیش نظر ہو جاتے اور اس قدر جوش پیدا ہو جاتا کہ بے خودی سی ہو جاتی اور تمام جگہ آنسوؤں سے تر ہو جاتی اور اس کی شان قدرت پر نظر کر کے تڑپ جاتی جس طرح مرغ تڑپتا

(۱) ذکر خیر ص ۷۰

ہے، مگر بے خودی میں دعا جاری رہتی، ہر وقت اپنے قیافہ پر نظر کرتی اور کہتی

ع جو عیب قسمت کے ہیں مٹا دے تیرا ہی عالم میں نام ہو گا

سجدہ سے سر ہرگز نہ اٹھاتی جب تک دل کو کچھ تسکین نہ ہو جاتی، دعا کے بعد مجھے اس قدر تسکین ہوتی کہ گویا رحمت کے دروازے کھل گئے ہیں اور میں خزانۂ رحمت لوٹ رہی ہوں، اس کی عنایت وشفقت پر مجھے اس قدر ناز تھا کہ یہ کہتی تھی یاارحم الراحمین اگر تو مجھے میری کوشش میں کامیاب نہیں کرے گا تو ایسی چیخ ماروں گی کہ آسمان وزمین ہل ہل جائیں گے اور تیرے در سے ہرگز سر نہ اٹھاؤں گی۔

نہ اٹھوں گی میں اس در سے کوئی مجھ کو اٹھا دیکھے
مجھے ہے آرزو جس کی اٹھوں گی میں وہی لے کر

یہ اس کی محبت اور عنایت ورحمت تھی کہ اتنی بڑی سرکار میں مجھے ایسا ڈھیٹ کر دیا تھا اور بے حجاب کہ میں کہتی اور کہہ کر اپنی بات پر اڑ جاتی اور اتنا بڑا بادشاہ، مالک الملک ہو کر مجھ ادنیٰ فقیر کی ناز برداری کرتا۔

یہ شان دیکھی تیری نرالی جو مانگے تجھ سے تو اس سے راضی
بلا کے دنیا کرم ہے تیرا یہ فضل بھی ہے کمال بھی ہے(۱)

مولانا عبد الحی حسنی کی زندگی میں ان کا زیادہ تر وقت ان کی اطاعت اور خدمت گزاری میں صرف ہوتا تھا، نمازوں کا اہتمام، تہجد کی پابندی اور تلاوت پر مداومت ہمیشہ رہی۔ رمضان مبارک میں تراویح سنانے کا بھی اہتمام رہتا۔

مولانا کی وفات کے بعد سراپا عبادت ودعا بن گئیں۔ گرمی میں ڈھائی بجے سے اور جاڑوں میں تین بجے سے جبکہ رمضان مبارک میں گرمی میں ایک بجے سے اور جاڑوں میں ڈیڑھ بجے سے تہجد کے لئے اٹھ جاتیں، اور طویل طویل سورتیں

---

(۱) ذکر خیر ص ۲۸-۳۱ باختصار

پڑھنے کا معمول تھا۔ اس قدر روتیں کہ آنسوؤں سے جانماز تر ہو جاتی، کبھی اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے دنیا کی خواہش نہیں کی، بس اللہ و رسولؐ کی محبت، دینی خوبیاں اور دینی خدمت کی توفیق مانگی۔

تہجد و دعا سے فارغ ہو کر فجر کی نماز تک ذکر میں مشغول رہتیں، پھر صبح کی نماز کے بعد تسبیحات میں مشغول ہو جاتیں تھیں، اشراق کی نماز پڑھ کر ناشتہ سے فارغ ہو کر کلام پاک کی تلاوت کرتیں اور کچھ گھر کے کام انجام دیتیں، پھر چاشت کی نماز کے بعد مناجاتیں لکھنا شروع کر دیتیں، پھر ظہر کے کھانے کا وقت آجاتا، کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتیں پھر اذان سے ایک گھنٹہ پہلے اٹھ جاتیں، اور جانماز پر بیٹھ کر تسبیح میں مشغول ہو جاتیں، جب ظہر کی اذان ہو جاتی تھی تو نماز پڑھ کر سورہ فتح اور سورہ نبا پڑھتی تھیں، پھر تسبیح پڑھنا شروع کر دیتی تھیں، حتیٰ کہ عصر کا وقت آجاتا تھا، عصر کی نماز پڑھ کر پھر کلام پاک کی سورتیں مغرب تک پڑھتی رہتی تھیں۔(۱)

تہجد، نوافل، دعا اور ذکر و مناجات کا یہ سلسلہ اخیر تک جاری رہا، عمر نوے (۹۰) سال سے تجاوز کر گئی تھی، بصارت ختم ہو گئی تھی لیکن معمولات جاری تھے، یہ صرف ایمان کی طاقت تھی ورنہ حیرت ہوتی تھی کہ اتنے ضعف و نقاہت کے باوجود وہ اپنے معمولات کیسے پورے کرتیں تھیں۔ اخیر میں مناجاتیں سننے کا شوق بہت بڑھ گیا تھا۔ دماغ پوری طرح حاضر تھا، وفات کے ایک یا دو روز قبل حضرتؒ کے لئے مقوی اعصاب و دماغ معجون کا نسخہ لکھوایا، مرض الوفات کی اس شدت میں کچھ آرام ہوا تھا، حضرتؒ کو بھوپال ایک دعوتی سفر پر جانا تھا حضرتؒ نے فرمایا ہم اپنے کو بالکل آپ کے حوالہ کرتے ہیں جو آپ فرمائیں گی وہی کریں گے۔ تمام تر محبت و شفقت کے باوجود فرمانے لگیں "علی! میں تم کو دینی کام سے بالکل نہیں روکتی، تم جاؤ اللہ حافظ و ناصر ہے۔" وفات سے دو تین روز پہلے حضرت واپس

---

(۱) یہ معمولات چھوٹی صاحبزادی امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے مضمون سے ماخوذ ہیں۔

تشریف لائے، ملتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ ساری طاقت عود کر آئی اور وہ اپنی ساری تکلیفیں بھول گئیں۔

وفات کے دن تک جب کہ بار بار غفلت ہو جاتی تھی، نمازوں کا پورا اہتمام رہا۔ وفات کے دن چاشت کے وقت تیمم کی مٹی تلاش کرنے لگیں، کہا گیا ظہر کا وقت ابھی نہیں آیا، کوئی جواب نہیں دیا، ادھر اُدھر ہاتھ بڑھاتی رہیں، تو تیمم کے لئے مٹی کا ڈھیلا دیا گیا، پورے اہتمام سے خود ہی تیمم فرمایا، پھر چاشت کی دو رکعت ادا کی اس کے بعد بیہوشی کی کیفیت ہو گئی، ظہر کے وقت جب تیمم کی مٹی دی گئی تو ہوش آ گیا، خود تیمم فرمایا اور چار رکعت ظہر کی ادا فرمائی پھر مکمل بیہوشی ہو گئی، تین بجے سے ذکر جاری ہو گیا اور مسلسل تین گھنٹہ اس زور سے ذکر جاری رہا کہ کمرے کے باہر آواز سنائی دیتی تھی، پونے چھ بجے آواز بند ہو گئی اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ ۶/ جمادی الآخر ۱۳۸۸ھ مطابق ۳۱/ اگست ۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے۔

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "پوری رات ایسی رحمتوں اور برکتوں کا شامیانہ تنا رہا کہ کم ایسی راتیں گذری ہوں گی۔" دوسرے دن صبح کو حضرتؒ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی اور روضہ شاہ علم اللہ میں اپنے باکمال رفیق زندگی کے پہلو میں حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ کے پائنتیں مدفون ہوئیں۔ رحمها الله رحمة واسعة

برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب حسنیؒ

برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ اپنے بہت سے کمالات و خصوصیات کی وجہ سے نادرۂ روزگار اور فرد فرید تھے۔ ان میں قدیم و جدید تہذیب و ثقافت اور مشرقی و مغربی علوم کا نہایت حسین و دل آویز امتزاج نظر آتا ہے، سنت و شریعت پر استقامت کے ساتھ فکر و نظر کی وسعت اور اس میں توازن و اعتدال ان کی وہ صفت ہے جس میں وہ اپنے ابنائے زمانہ میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ حضرتؒ کی

تربیت و نگہداشت میں چونکہ ان کا بنیادی حصہ ہے اس لئے ان کا تذکرہ یہاں قدرے تفصیل سے کیا جاتا ہے۔

۲۳؍ جمادی الاولی ۱۳۱۱ھ یکم دسمبر ۱۸۹۳ء میں اپنے نانیہال ہنسوہ ضلع فتح پور میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم ہنسوہ ہی میں ایک بابرکت بزرگ اور حقانی عالم مولوی عبدالحکیم صاحبؒ کے یہاں ہوئی جو حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے دست گرفتہ اور حضرت گنگوہی کے شاگرد تھے۔ آپ آٹھ ہی سال کے تھے کہ اچانک والدہ صاحبہؒ کی وفات کا حادثہ پیش آیا اور آپ اپنی نانی صاحبہ کی نگہداشت میں آگئے۔ پھر جب ۱۹۰۴ء میں والد صاحبؒ نے دوسرا عقد فرمالیا تو آپ انہیں دوسری والدہ کے سایۂ شفقت میں آگئے۔

ناظرہ قرآن مجید کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے خود اپنے شوق سے میزان شروع فرمادی تھی۔ والد صاحبؒ کے حکم پر دستور کے مطابق فارسی شروع کی پھر جب ۱۹۰۴ء سے باقاعدہ رائے بریلی میں قیام ہوا تو دادا صاحبؒ سے جو فارسی کے بڑے ادیب و شاعر تھے، فارسی پڑھنی شروع کی۔ والد صاحبؒ اس زمانہ میں زیادہ تر ندوہ کے امور میں مشغول رہتے، لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ تھی، خطوط کے ذریعہ آگاہ فرماتے رہتے، اور توجہ دلاتے۔ ادھر ڈاکٹر صاحبؒ نے دادا صاحبؒ کی صحبت سے پورا فائدہ اٹھایا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں وہ اس قابل ہوگئے تھے کہ والد صاحب ان کو فارسی میں خطوط لکھنے لگے، صرف و نحو کی تعلیم بھی رائے بریلی میں مولوی محمد احسن صاحبؒ سے حاصل کی۔ جب دارالعلوم کا دفتر شاہ جہاں پور سے لکھنؤ منتقل ہوا تو والد صاحبؒ نے ان کو اپنے پاس بلالیا اور انھوں نے وہیں رہ کر دارالعلوم کے فاضل اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ ادب عربی مولانا سید علی زینبیؒ، فقہ و اصول مولانا شبلی جیراجپوریؒ، ہیئت مولانا سلطان کابلیؒ اور اقلیدس مولانا شیر علی صاحبؒ سے نیز بعض درسیات اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔

دارالعلوم میں تکمیل ہی کے زمانہ میں شیخ حسین بن محسن یمانیؒ لکھنؤ تشریف لائے اور اپنے محبوب شاگرد مولانا سید عبدالحی صاحبؒ کے مکان پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اولیات سناکر ان سے اجازت حدیث حاصل کی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تکمیل کے بعد مولانا عبدالحی صاحبؒ نے حضرت شیخ الہندؒ سے استفادہ کے لئے ڈاکٹر صاحبؒ کو دارالعلوم دیوبند بھیجا۔ حضرت شیخ الہند نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت اور مولانا عبدالحی صاحبؒ کے تعلق کی وجہ سے خود اپنا مہمان بنایا، خود اپنے ہاتھ سے کھانا لیکر آتے، ان کا یہ تکلف اور تکلیف دیکھ کر ڈاکٹر صاحبؒ دارالاقامہ میں منتقل ہوگئے، ایک سال دیوبند میں قیام رہا۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ سے بخاری و ترمذی اور علامہ انور شاہ صاحبؒ سے ابوداؤد پڑھی۔ ان کی تقریروں کو ڈاکٹر صاحب نے عربی میں منضبط بھی فرمایا تھا۔ مولانا انور شاہ صاحب نے ان کو دیکھ کر پسند فرمایا لیکن افسوس کہ یہ مجموعہ محفوظ نہ رہ سکا اور ڈاکٹر صاحبؒ کو ساری عمر اس کا افسوس رہا۔

دیوبند سے واپسی کے بعد والد صاحبؒ سے طب کی متداول کتابیں پڑھیں۔ اور انہیں کے مطب میں نسخہ نویسی شروع کی۔ اسی زمانہ میں حقیقی ماموں زاد بہن سے عقد نکاح ہوا۔ والد صاحب نے تکمیل کے لئے حکیم اجمل خاں صاحبؒ کے پاس دہلی بھیجا۔ اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی فرمائی کہ ڈاکٹر مختار انصاری صاحب سے طب جدید کی معلومات بھی حاصل کریں۔ دہلی چھ مہینہ رہ کر واپس تشریف لائے تو آپ کو انگریزی میں کمال پیدا کرنے اور طب جدید کو حاصل کرنے کا شوق ہوا اور آپ نے والد صاحبؒ کی اجازت سے مکان کے قریب ہی ایک اسکول کے نویں درجہ میں داخلہ لیا، وہاں امتیازی کامیابی حاصل کی اور کرسچین کالج میں داخلہ لیا، وہاں انگلش لٹریچر کا آپ نے انتخاب کیا۔ وہیں سے ۱۹۱۷ء میں انٹرمیجیٹ پاس کیا، پھر اسی سال کینگ کالج میں داخل ہوئے اور بی ایس سی کے دو سال مکمل کر کے ۱۹۱۹ء میں فائنل امتحان اس امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ پورے کینگ کالج میں اول

اور پوری الہ آباد یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن آئی۔ اس پوری تعلیم کے دوران آپ کی وضع، لباس اور معمولات میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتا، شرعی کرتا پائجامہ، دوپلی، یا کشتی نما ٹوپی، پوری شرعی داڑھی، نمازوں کا اہتمام، اس وضع داری اور متانت کی وجہ سے اساتذہ بھی آپ کا احترام کرتے، ایک مرتبہ امتحان کے دوران نماز کا وقت ہو گیا تو وہیں شیروانی بچھا کر نماز شروع فرمادی، ایک انگریز پروفیسر نے کہا کہ مسٹر حسنی ہم کو معلوم ہوتا تو ہم جانماز کا انتظام کر دیتے۔

اس تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے والد صاحب کو ایک مفصل تاریخی خط لکھا، جو آپ کی دقت نظر، وسعت فکر اور دینی تفقہ و پختگی کی واضح دلیل ہے۔

۱۹۲۰ء میں طب جدید (میڈیسن) کے حصول و تکمیل کے لئے کنگ جارج میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اور دوران تعلیم ہی جبکہ وہ طلبہ کی ایک ٹیم کے ساتھ مدراس کے سفر پر تھے، والد صاحب کی وفات کا حادثہ پیش آیا۔ ان کو اس کی اچانک خبر ملی، واپسی میں سیدھے قبر پر گئے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "میں بھی ساتھ ہو گیا، ان کا قبر پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا میری آنکھوں کے سامنے ہے، سب سے زیادہ صدمہ انہیں اس بات کا ہوگا کہ وہ آخر وقت میں ان کے پاس نہ تھے اور آخری خدمت بھی انجام نہ دے سکے۔"

والد صاحبؒ کی وفات کے بعد اس کثیر المصارف تعلیم کا جاری رکھنا بہت دشوار تھا کہ گھر میں باقاعدہ آمدنی کا کوئی ذریعہ یا جائیداد وغیرہ نہیں تھی، مگر نواب نور الحسن صاحب مرحوم کے گھر والوں نے (جو والد صاحبؒ کے جاں نثار دوست تھے) اور منشی رحمت اللہ صاحبؒ نے بڑی محبت و اپنائیت کا معاملہ کیا۔ نواب صاحبؒ نے اپنی کوٹھی پر ٹھہر لیا اور اسباب راحت فراہم کئے۔ ۱۹۲۵ء کے اواخر میں میڈیکل کالج سے فراغت ہوئی اور ۱۹۲۶ء کے اوائل میں والد صاحب کے مطب کے قریب مطب کا آغاز کیا، اور قریب ہی ایک چھوٹا مکان کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے وسعت دی اور اتفاق سے وہ قدیم مکان خالی ہوا جس میں والد صاحبؒ کی وفات

ہوئی تھی تو اس کو کرایہ پر لے لیا، پھر ساری عمر اسی کرایہ کے مکان میں گزار دی، بہتر سے بہتر مکانات کی پیش کش ہوئی لیکن آپ کو کبھی اس طرف توجہ نہیں ہوئی۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ پھر ان کے بعد حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے بیعت کا ارادہ تھا، والد صاحب کے نام اپنے مکتوب میں اس کا اظہار بھی فرمایا تھا، مگر اس کی نوبت نہیں آسکی۔ بالآخر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تعلق قائم فرمایا۔ حضرت مدنیؒ کو بھی بہت جلد ڈاکٹر صاحبؒ سے خصوصی تعلق ہو گیا اور لکھنؤ میں ڈاکٹر صاحب کا مکان ان کی مستقل قیام گاہ بن گیا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کو حرمین شریفین سے تعلق ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ ۱۹۲۷ء میں اپنے دوست شیخ خلیل عرب صاحبؒ کے ہمراہ حج کیا، مدینہ طیبہ میں وہاں کے مشہور شیوخ حدیث سے حدیث کی سند و اجازت بھی حاصل کی۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۲۳ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی منتخب ہوئے۔ پھر ۱۹۲۸ء کو نائب ناظم اور ۱۹۳۱ء کو ناظم کی حیثیت سے انتخاب ہوا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۶۱ء تک مسلسل تیس سال اس عہدہ کو زینت بخشی۔ ان کے دور نظامت میں دار العلوم نے ہر لحاظ سے ترقی کی، مسجد کی تعمیر ہوئی، رواق شبلی کی دوسری منزل کی تکمیل ہوئی، ماہر اساتذہ فن رکھے گئے، انہیں کے دور میں شیخ تقی الدین ہلالیؒ تشریف لائے اور انہیں کے دور سے ندوہ میں دینی، دعوتی فضا بننا شروع ہوئی جس میں ان کی توجہ و سرپرستی اور حضرتؒ کی فکر و عمل اور جد و جہد کو خاص دخل تھا۔ دار العلوم کے علاوہ ان کو مدینہ طیبہ کے مدرسۃ العلوم الشرعیۃ سے بڑی دلچسپی تھی اور اس میں ان کی حرمین شریفین سے عقیدت و محبت بلکہ عشق و وارفتگی کو بڑا دخل تھا، اس کے لئے انہوں نے ”معین مدرسہ علوم شرعیہ“ کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی، جس کا کام ہی اہل خیر کو اس کی اعانت کی طرف متوجہ کرنا تھا، یہ کام وہ بڑی دلسوزی اور ذوق و شوق سے کرتے تھے۔

غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کا ان کو بڑا شوق تھا اور یہ ان کی زندگی کا بڑا محبوب

موضوع ومشغلہ تھا، ساری عمر اس کی فکر رہی اور کوشش کرتے رہے، ان کے اسی ذوق وشوق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے حضرتؒ کو ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوت اسلام دینے کے لئے بمبئی بھیجا۔

۱۹۵۸ء کو وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بنے اور ساری زندگی رہے، لیکن بڑی مصروفیت اور سفروں کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے کسی جلسہ میں شرکت کی نوبت نہیں آئی۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کے تبلیغی کام سے ان کو بڑا شغف تھا اور اس کی قدر افزائی فرماتے۔ ایک مرتبہ چند روز کے لئے نظام الدین بھی تشریف لے گئے، حضرت مولاناؒ ان کی غیر متوقع آمد سے بڑے مسرور ہوئے۔ حضرت تھانویؒ کے لکھنؤ کے زمانہ قیام میں ان کی مجالس میں حاضری دیتے اور حضرت کو اپنے ساتھ لے جاتے، ایک روز حضرت تھانویؒ از خود ڈاکٹر صاحبؒ کے گھر تشریف لائے۔ حضرت رائے پوریؒ کے زمانۂ قیام لکھنؤ میں بھی پابندی کے ساتھ ان کی مجلس میں شرکت فرماتے۔ حضرت رائے پوریؒ متعدد بار ان کے مکان پر تشریف لائے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ڈاکٹر صاحبؒ بڑے بابرکت آدمی ہیں۔ علماء فرنگی محل اور حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ سے بھی قدیم تعلقات کی بنا پر خصوصی تعلق تھا، یہ حضرات بھی احترام ومحبت کے ساتھ پیش آتے۔

۱۳ر اگست ۱۹۵۷ء میں اچانک اہلیہ صاحبہ کی وفات ہو گئی، اس کا طبیعت پر بڑا اثر ہوا، ادھر مولانا مدنیؒ کی طبیعت مسلسل ناساز رہنے لگی۔ ان کی عیادت کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، مولانا بہت مسرور ہوئے، نمازوں میں اہتمام تھا کہ وہ پہلو میں کھڑے ہوں۔ واپسی میں ایک روز کے لئے رائپور بھی تشریف لے گئے۔

۵۶، ۱۹۵۷ء سے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہو گئی تھی، اس کے نتیجہ میں قلب پر بھی اثر تھا۔ ۷ر مئی ۱۹۶۱ء کو قلب کا شدید دورہ پڑا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ حضرتؒ اس وقت سہارن پور کے سفر پر تھے، فوراً اطلاع کی گئی لیکن دوسرے

دن جب حضرتؒ تشریف لائے تو یہاں سب کچھ ہو چکا تھا۔ پہلی نماز جنازہ لکھنؤ میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ نے پڑھائی اور دوسری رائے بریلی میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے۔ روضہ شاہ علم اللہ میں تدفین عمل میں آئی۔

پسماندگان میں ایک صاحبزادہ مولانا محمد الحسنی صاحب (سابق مدیر البعث الاسلامی) اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑیں۔

ڈاکٹر صاحبؒ نہایت خوبصورت وحسین تھے۔ چہرہ سے معصومیت نمایاں تھی۔ ان کے فاضل ہم عصر دوستوں، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کی شہادت ہے کہ ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل میں گناہ کا شائبہ بھی نہیں گزرا۔ "إن هذا إلا ملك كريم" کے عنوان سے مولانا عبدالباریؒ صاحب نے ایک بڑا محبانہ ومعتقدانہ مضمون بھی تحریر فرمایا تھا۔

نہایت کم گو اور کم سخن تھے، ضرورت سے زائد بولنے کا گویا انھوں نے سبق ہی نہیں پڑھا تھا۔ لباس بہت سادہ پہنتے، کھانے میں عیب نکالنا گویا ان کے مذہب میں کفر تھا، بے مزہ سے بے مزہ چیز اس شوق اور سلیقہ سے کھاتے کہ دیکھنے والے کو رغبت پیدا ہو جائے، طبیعت ہمیشہ سے بڑی جفاکش واقع ہوئی تھی۔ جب تک صحت رہی، رات رات بھر جاگ کر عزیز مریضوں کی تیمار داری کرتے، اعزہ کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی میں بہت فائق تھے، نمود ونمائش اور جاہ طلبی سے طبعاً نفرت تھی۔ اجر وثواب ورضائے الٰہی کا خیال ان کے لئے اصل قوت محرکہ کی حیثیت رکھتا تھا، نیک نامی وبدنامی اور لوگوں کے کہنے سننے کی ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں تھی، ہر ایک سے شرعی حق اور مرتبہ کے مطابق سلوک کرتے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"وہ ہر چیز میں پختہ تھے، پختہ اعتقاد، پختہ دینداری، پختہ عملی استعداد، پختہ خیالات ونظریات، وہ اسلام کی ابدیت واسلامی تہذیب کی برتری وپاکیزگی اور اسلاف ومتقدمین کی اخلاقی وروحانی وانسانی عظمت کے شدت سے قائل

تھے۔ مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے اور اس کے نظام تعلیم کے سایہ میں برسوں رہنے کے باوجود وہ اس کے سخت ناقد تھے، لیکن ان کی تنقید جذباتی و سطحی نہیں تھی، وہ علم و مطالعہ پر مبنی تھی۔ راقم سطور کو ان کی مجلسوں سے جو فائدہ پہنچا، وہ مغربی تہذیب اور موجودہ نظام حیات پر درجنوں کتابیں پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔"(۱)

"اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں میں ان کی جو صفت بہت نمایاں تھی اور جس کا اقرار ان کے تمام جاننے والوں اور عزیزوں کو تھا وہ اپنے والد ماجد کی فرماں برداری اور ان کو راحت پہنچانے اور خدمت کا جذبہ تھا، اس میں وہ اپنے ساتھیوں میں ضرب المثل تھے، اس سلسلہ کا سب سے حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ وہ انگریزی کا کوئی بڑا سالانہ امتحان دے رہے تھے، خاندان میں کوئی تقریب تھی جس میں والد صاحب اپنے بجائے ان کو بھیجنا چاہتے تھے، والد صاحب کو اس کا علم نہیں تھا یا ذہول ہو گیا کہ وہ امتحان دے رہے ہیں اور ایک پرچہ چھوڑ دینے سے پورا تعلیمی سال برباد ہو جائے گا۔ انھوں نے ان کو بلایا اور اس تقریب میں شرکت کے لئے کانپور یا ہسوہ جانے کے لئے کہا، وہ فوراً آمادہ ہو گئے۔ بعد میں والد صاحب کے کسی دوست نے ان کو بتایا کہ ان کا امتحان ہو رہا ہے اور اس روز پرچہ ہے، اس وقت والد صاحب نے انہیں حکماً منع کیا، اور اس طرح وہ نقصان سے بچ گئے۔ مطب شروع کرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قابل کیا تو انھوں نے والد صاحب کا حج بدل کر لیا اور اس کے لئے انھوں نے خاندان کے ایک نہایت صالح بزرگ مولوی سید حسن مجتبیٰ صاحب مرحوم کا انتخاب کیا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں اور ان کے دوستوں کے صاحبزادوں کے ساتھ ہمیشہ خصوصیت برتتے۔ ان کا عمل گویا اس حدیث پر تھا إنّ من أبر البر بر الوجل اهل وُدّ

---

(۱) حیات عبدالحی ص ۳۸۹

أبيه (بڑی نیکی اور سعادت مندی یہ ہے کہ آدمی اپنے والد کے تعلق والوں سے حسن سلوک کرے) وہ بہت کم دعوت کرتے تھے لیکن جب والد صاحبؒ کے دوستوں میں یا دوستوں کے صاحبزادوں میں سے کوئی آجاتا تو ضرور پر تکلف دعوت کرتے اور اس موقع پر بہت خوش نظر آتے۔"(۱)

ان صفات و علمی کمالات کے ماسوا ان کی ایک بڑی صفت اور زندگی کا جوہر ان کی دینی حمیت، عالم اسلام کی فکر اور دعوت اسلام کا جذبہ اور ذوق ہے۔ میں نے گوشہ نشین زندگی اور انفرادی فرائض کی مشغولیت کے ساتھ عالم اسلام کی اتنی فکر مندی، اتنی وسیع اور گہری واقفیت اور اس کے حالات و تغیرات کے تتبع کا ایسا ذوق نہیں دیکھا۔

ان کا اس ارشاد نبوی پر یقین اور عمل تھا کہ "من لم يهتم بامر المسلمين فليس منهم" (جس کو مسلمانوں کے معاملہ کی فکر نہ ہو وہ ان میں سے نہیں ہے۔) فلسطین کا جہاد ہو یا الجزائر کی جنگ ان کا دل اس سے متعلق تھا اور ایک بعید الوطن مسلمان پر ان کے بارہ میں جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کرنے کی فکر تھی، عالم اسلام میں پیش آنے والے خوش کن یا رنج دہ حادثہ سے وہ اسی طرح متاثر ہوتے تھے جیسے وہاں رہنے والا دردمند و فکر مند مسلمان۔(۲)

اللہ تعالیٰ نے ان کو تربیت کا بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا، حضرتؒ کی انہوں نے جس طرح تربیت و نگہداشت کی وہ ایک مستقل موضوع ہے، انشاءاللہ اس کا کچھ تذکرہ حضرت کی اصل سوانح میں آئے گا۔ حضرت کے علاوہ صاحبزادہ گرامی منزلت مولانا سید محمد الحسنی اور خواہر زادگان، مولانا سید محمد ثانی صاحب، مولانا سید محمد رابع صاحب اور مولانا سید محمد واضح رشید صاحب بھی ڈاکٹر صاحب کے تربیت یافتہ ہیں، اپنی صاحبزادیوں کی تعلیم و تربیت کا بھی انہوں نے خصوصی خیال رکھا۔ ان کی تربیت

---

(۱) حیات عبدالحی ص ۳۹۳-۳۹۴ (۲) حیات عبدالحی ص ۳۹۵

واصلاح کے دسیوں ایسے واقعات ہیں جو اس باب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

اب اس مضمون (جو بعض ضروری اضافوں کے ساتھ حضرت ہی کے مضمون کی تلخیص ہے) کا اختتام حضرتؒ ہی کی اس تحریر پر کیا جاتا ہے، جس پر حضرتؒ نے اپنے مضمون کو ختم فرمایا ہے۔

حضرتؒ فرماتے ہیں:

۱۳۷۰ھ، ۱۹۵۱ء میں جب یہ راقم سطور حجاز و مصر و شام و فلسطین اور سوڈان کے طویل سفر سے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد واپس ہوا، تو طلبائے دارالعلوم کی "انجمن الاصلاح" نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں میں نے اس سفر کی مختصر روداد سنائی، مصر و شام کے بلند پایہ مفکرین اور مختلف مکاتب خیال کے نامور زعماء و قائدین سے جو تبادلۂ خیال ہوا، عربوں کو جو اس دعوت کے فطری علمبردار ہیں، ان کی ذمہ داریاں یاد لانے کی جو توفیق ہوئی اس کا مختصر تذکرہ کیا۔ حاضرین جلسہ کی پہلی صف میں وہ محبوب و نورانی چہرہ بھی تھا جس کی تعلیم و تربیت اور پدرانہ شفقت سے اس کی ٹوٹی پھوٹی اہلیت پیدا ہوئی، اور دہقانی اور عجمی کو عربوں کو ان کی زبان میں دین کا پیغام دینے اور انہیں سے پڑھا ہوا سبق ان کے سامنے دہرانے کی جرأت و صلاحیت پیدا ہوئی تو معاً فارسی کا یہ شعر یاد آگیا اور اس چہرہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اسی کی تعلیم و تربیت کا فیض ہے اور اب آپ کے اس مختصر سوانحی خاکہ کو اس پر ختم کیا جاتا ہے ؎

روح "پدرم" شاد کہ فرمود بہ استاد
فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ (۱)

(۱) حیات عبدالحی ص ۳۹۸

تیسرا باب

ولادت و طفولیت اور ابتدائی تعلیم و تربیت

ولادت

چودھویں صدی ہجری کے آغاز کو ۳۲ سال بیت رہے تھے کہ ۶؍ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۵؍ دسمبر ۱۹۱۳ء کو رائے بریلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں (جو دائرہ شاہ علم اللہ کے نام سے موسوم اور تکیہ کلاں کے نام سے مشہور ہے، جس کو کئی سو سال سے توحید و سنت اور تحریک جہاد کے مرکز ہونے کا شرف حاصل رہا ہے) حضرت کی ولادت ہوئی۔ ساتویں دن عقیقہ کی سنت ادا کی گئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام نامی پر "ابوالحسن علی" نام تجویز کیا گیا۔

بچپن کے واقعات

عمر کوئی ڈیڑھ سال رہی ہوگی کہ ۱۹۱۵ء کو وہ ہولناک طوفانی سیلاب آیا جس نے سب پچھلے ریکارڈ توڑ دیے، اسی سیلاب میں حضرتؒ کا آبائی مکان جو نیم پختہ نیم خام تھا گر گیا۔ اس کی تعمیر نو تک رائے بریلی میں حافظ سید عبید اللہ صاحب مرحوم کے مکان میں قیام رہتا جو بڑے شفیق ماموں تھے اور اس بستی (دائرہ شاہ علم اللہ) میں ان کی شخصیت بڑی دل آویز اور محبوب تھی، حضرتؒ سے ان کو بڑی محبت تھی، اپنی اولاد سے زیادہ حضرت کا خیال فرماتے۔ اسی زمانہ میں حضرت کی والدہ کے علاوہ خاندان میں کئی بیبیاں حافظہ تھیں اور علمائے فرنگی محل کے فتویٰ کے مطابق ان کی

باقاعدہ تراویح ہوتی تھی، خاندان کے بزرگ اس کا بڑا اہتمام کرتے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ "والدہ صاحبہ کے قرآن مجید سنانے کا سلسلہ میرے شعور کے بہت بعد تک جاری رہا، میں کبھی دروازہ میں کھڑا ہو کر سنتا، ایسا معلوم ہوتا کہ پانی برس رہا ہے، صحت مخارج کے ساتھ روانی پھر اس میں رقت و درد نسوانی نورٌ علیٰ نورٌ(۱)"۔

اس کے علاوہ بچپن کے بعض وہ واقعات ذکر کئے جاتے ہیں کہ جن سے اس وقت خاندان کے مزاج و مذاق کا بھی اندازہ ہوگا اور حضرتؒ کی جدی شاخ کے بعض امتیازات بھی معلوم ہوں گے۔

پہلا واقعہ تو حضرتؒ کے شعور سے پہلے کا ہے، یہ زمانہ انگریزی اقتدار اور اس کی تہذیب کے اقبال و عروج کا زمانہ تھا، ہر اس چیز کو عزت و مرعوبیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جس کا اس قوم و ملک سے انتساب ہو، یہ خارجی اثرات اس خاندان پر بھی مرتب ہو رہے تھے، حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی وفات کو کئی سال گزر چکے تھے، خاندان کا عمومی رجحان انگریزی تعلیم کی طرف ہونے لگا تھا، جن بچوں کو ذہین سمجھا جاتا ان کو انگریزی تعلیم دلوائی جاتی۔ اسی زمانہ میں حضرتؒ کے خالہ زاد بھائی سید محمد احمد صاحب بیرسٹر انگلستان تعلیم حاصل کرنے گئے اور فلسفہ میں "ایڈمبرا یونیورسٹی" سے ایم۔ اے کر کے آئے۔ اس وقت جس والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا گیا اس سے اس وقت خاندان کے ذہنی رجحانات و خیالات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"ان کی آمد پر اس چھوٹے سے خاندان اور چھوٹی سی بستی میں بڑا استقبال اور اہتمام کیا گیا تھا کہ اس وقت شاید پورے ضلع میں کم سے کم مسلمان شرفاء اور زمینداروں کے خاندانوں میں شاید ہی کوئی یہ اعزاز حاصل کر کے آیا ہو، یہ میرے شعور سے پہلے کی بات ہے، میں نے اس مسرت اور استقبال کے قصے سنے ہیں جو ان کے پہنچنے پر دیکھنے میں آئے۔(۲)"

(۱) کاروان زندگی ص ۳۶ (۲) کاروان زندگی ص ۵۱

اسی طرح حضرتؒ کے حقیقی ماموں زاد بھائی سید سراج النبی صاحب نے امریکہ کا سفر کیا اور نیویارک میں موٹر میکانک کی تربیت حاصل کی اور وہاں کے ایک کالج سے کامرس کی ڈگری لی، لیکن اس کے باوجود خاندان میں حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کے اثر سے اس وقت بھی عقیدہ پر تمسک اور نمازوں کا اہتمام باقی تھا۔ یورپ و امریکہ کے اس سفر کے باوجود دونوں کی اس ادا میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

دوسرا واقعہ جس سے حضرت کی جدی شاخ کی امتیازی صفت، اس کا دینی شعور اور حضرت سید احمد شہیدؒ سے اسکی وابستگی بلکہ وارفتگی کا اظہار ہوتا ہے، یہ ہے کہ ٹونک کے وہ اعزہ جو حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد وہاں مقیم ہو گئے تھے جب ان کو وہاں سے تحریک خلافت کے زمانہ میں ۱۹۲۱ء میں جلاوطن کیا گیا، وہ اپنے قدیم وطن رائے بریلی آئے تو عزیزوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، سید محمد اسماعیل صاحب جو حضرت سید صاحب کے حقیقی نواسہ کے صاحبزادہ تھے، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے گھر ٹھہرے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب ہم تکیہ آئے تو اچھے بھیا مرحوم (مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب) نے مجھ سے کہا "اسماعیل اگر تم ہمارے گھر ٹھہرو گے تو احسان کرو گے۔" اس میں وہی حضرت سید صاحب کی نسبت کا احترام اور ان سے محبت و عقیدت کا جذبہ کارفرما تھا جو خاندان کی اس شاخ کا امتیاز تھا۔

اکل حلال کا اس خاندان میں ہمیشہ اہتمام رہا، خاص طور پر حضرتؒ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کو اس کی ہمیشہ فکر رہتی تھی کہ ایک حبہ بھی مشتبہ مال کا گھر میں نہ آنے پائے، اس کا اثر پورے گھرانہ پر تھا، یہاں تک کہ کام کاج کرنے والوں کو بھی اس کا خیال رہتا تھا کہ خاندان کے بچوں کو مشتبہ مال سے محفوظ رکھا جائے۔ گھر کے اسی ماحول اور احتیاط کی اسی فضا کا نتیجہ تھا کہ ایک مرتبہ حضرت اپنے گھر کی بوڑھی لنا کے ساتھ تکیہ سے خالص ہاٹ (جہاں بعض عزیزوں کے مکانات تھے) جارہے تھے، اس وقت حضرت کی عمر مشکل سے تین، چار سال رہی

ہو گی، راستہ میں کہیں غریبوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا، بڑی بی نے کھانا لیا اور وہیں کھانے بیٹھ گئیں، حضرت فرماتے ہیں "میں بچہ تھا، میرے بھی منہ میں پانی بھر آیا اور میں نے شرکت کرنی چاہی، انھوں نے کہا کہ بیٹا یہ تمہارے کھانے کا نہیں اور انھوں نے کھانے نہیں دیا۔(۱)"

اس خاندان میں خالص حصول معاش کی جو کوششیں کی گئیں، وہ کامیاب نہیں ہو سکیں۔ جن لوگوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور امریکہ جرمنی، انگلینڈ کا سفر کیا اور بڑی بڑی ڈگریاں لے کر لوٹے وہ بھی اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ اس کے علاوہ زمینداری سے بھی جو اس زمانہ میں بڑی عزت و منفعت کا ایک ذریعہ تھا، خاطر خواہ مالی فائدہ حاصل نہ ہو سکا، اس لئے خاندان کے بزرگوں نے ذریعہ آمدنی کے لئے ایک مشترکہ بٹا لگایا جس کے ذمہ دار مولانا عزیز الرحمن صاحب قرار پائے، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحب کی جو فیسیں باقی رہ گئیں تھیں ان کو لے کر برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے بھی اس میں شرکت کی، اس کی کچھ آمدنی بھی ہوئی۔ حضرت فرماتے تھے کہ "میں نے اس کی آمدنی سے ایک ہوائی بندوق (Air-Gun) اور ایک گھڑی خریدی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد اسکو بھی بند کرنا پڑا۔ آمدنی کی ایسی کوششیں اس خاندان کو راس نہیں آئیں، اس لئے کہ تجارت کے لئے جو ذہنی صلاحیتیں اور تجربہ چاہئے اس کی خاندان میں کمی تھی۔"(۲)

والد صاحب کے ندوۃ العلماء سے تعلق اور مطب کی وجہ سے بچپن میں زیادہ تر لکھنؤ ہی قیام رہتا، درمیان میں کبھی کبھی رائے بریلی جانا ہوتا، رائے بریلی کے علاوہ سفر کی دوسری منزل قصبہ ہنسوہ ضلع فتح پور تھا، جہاں سادات حسینی واسطی کی ایک شاخ عرصہ سے مقیم تھی اور اس سے اس خاندان کی زمانہ سے قرابتیں چلی

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۸۲
(۲) کاروان زندگی اول ص ۵۴

آرہی تھیں، حضرت کے والد کا اس سے ننیہالی تعلق بھی تھا اور وہ ان کی سسرال بھی تھی، یہ خاندان دینی و دنیوی وجاہت رکھتا تھا، جس کا اصل سبب حضرت مولانا عبدالسلام صاحبؒ کی ذات گرامی تھی جو حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددیؒ کے اجل خلفاء میں تھے۔ اس کے علاوہ دنیوی وجاہت کا ایک بڑا سبب زمینداری بھی تھی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ قرابتوں کی وجہ سے والد صاحب گویا اس خاندان کے چشم و چراغ تھے اور قصبہ کا بچہ بچہ ان سے محبت کرتا تھا اور وہ وہاں جاکر بہت مسرور ہوتے۔ یہ بات ایسی نمایاں تھی کہ مجھے اپنی کمسنی کے باوجود اس کا احساس ہوا، اور میں نے ایک دن ان سے کہا کہ بابا آپ ہنسوہ جاکر اتنے خوش کیوں ہوتے ہیں، فرمایا کہ عبید اور احمد سعید تمہارے کون ہیں؟ میں نے کہا ماموں، فرمایا کہ تم وہاں جاکر خوش ہوتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا تکیہ تمہارے ماموں کا گھر ہے، ہنسوہ ہمارے ماموں کا گھر ہے؟

حضرت کے شعور کا آغاز ہی تھا کہ تحریک خلافت کا لاوہ پھوٹ پڑا اور پورے ملک میں اس کی صدائے بازگشت سنی گئی۔ حضرت اس زمانہ کی اپنی یادداشت تحریر فرماتے ہیں:

"شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت اٹھ گئی ہے اور علی برادران اور گاندھی جی ہی کی حکومت ہے۔ پرنس آف ویلز کا لکھنؤ آنا بھی یاد ہے۔ میں کسی ضرورت سے گھر سے نکلا، دیکھا تو شہر میں ہُو کا عالم ہے، بھرے بازار، چلتی ہوئی سڑکیں ویران پڑی ہیں، امین الدولہ پارک (جھنڈے والے پارک) میں ولایتی کپڑوں کو آگ لگائی جاتی تھی، جو لوگ ولایتی کپڑوں میں ملبوس ہوتے وہ راستہ چھوڑ کر چلتے۔ اس زمانہ میں میں نے مولانا محمد علی اور گاندھی جی کو دیکھا۔ ہمارے بھائی سید حبیب الرحمٰن امین آباد ہائی اسکول میں پڑھتے تھے، ترک موالات کے اثر سے اسکول سے نکل آئے اور کسی نیشنل اسکول میں داخلہ لیا۔ جن لوگوں کو اعزازی یا امتیازی تمغے

ملے تھے ان پر انگریزی حکام کے نام یا انگریزی لکھی ہوئی تھی ان کو پاؤں سے روندتے اپنے عزیزوں اور محلہ والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہزاروں آدمیوں نے انگریزی لباس بلکہ انگریزی معاشرت ترک کر کے دیسی لباس اور ہندوستانی معاشرت اختیار کر لی اور ان کی زندگی میں انقلاب آگیا۔

ہمارا خاندان بھی تحریک خلافت کا بالکل ہمنوا تھا اور یہ بات خاندانی روایات، اسلامی حمیت اور خاندان کی تاریخ جہاد و غزوات کے عین مطابق تھی۔ والد صاحب اگرچہ نہایت خاموش اور عزلت پسند تھے لیکن تحریک خلافت کی تائید و حمایت میں انھوں نے بھی ایک اپیل شائع کی جس کا مجھے اپنے بچپن میں دیکھنا یاد ہے، اسی جذبہ کے ماتحت انھوں نے اس زمانہ میں اس گورنمنٹ گرانٹ کو بند کرا دیا جو ندوہ کو ملتی تھی۔ مولانا محمد علی مرحوم کی والدہ محترمہ بی اماں جب اپنے دورہ کے سلسلہ میں رائے بریلی آئیں تو والدہ صاحبہ سے ملنے اور تعزیت کرنے (جو ایام عدت میں تھیں) تکیہ تشریف لائیں۔ خاندان کے بزرگوں کا ان کو تخت پر بٹھا کر اور خود اٹھا کر ہمارے گھر لانا ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔(۱)"

تعلیم کا آغاز

غالباً چار سال کی عمر میں رائے بریلی کے قیام میں تسمیہ خوانی ہوئی جو حضرت کے چچا مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب (۲) نے کرائی چونکہ زیادہ تر قیام لکھنؤ میں

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۷۲-۷۳

(۲) مولانا عزیز الرحمٰن صاحب، مولانا عبدالحی صاحب کے پھوپھی زاد بھائی تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء کے ابتدائی دور میں تعلیم پائی تھی، پھر دار العلوم میں مدرس ہوئے، ایک زمانہ تک بحیثیت نائب ناظر کتب خانہ بھی کام کیا، نہایت غیور، منتظم اور رعب داب کے بزرگ تھے۔ مولانا عبدالحی صاحب سے بڑی محبت و عقیدت تھی، حضرت مدنی سے بیعت کا تعلق تھا، نہایت خوش اوقات اور ذاکر و شاغل تھے، ۱۶ر شوال ۱۳۷۰ھ کو وفات پائی اور حظیرہ شاہ علم اللہ میں مدفون ہوئے۔ مولانا سید ابوبکر حسنی صاحب ایم اے ان ہی کے فرزند ہیں۔

ہی رہتا تھا، اسلئے باقاعدہ تعلیم کا آغاز وہیں سے ہوا۔ محلّہ کی مسجد نوازی کے ایک حجرہ میں مکتب لگتا تھا، اسی مکتب میں داخلہ ہوا، مسجد کے موذن وامام حافظ محمد سعید صاحب ہی اس مکتب کے مدرس تھے، حروف شناسی، قرآن مجید اور اردو کی ابتدائی تعلیم ان ہی کے پاس ہوئی۔ خاندان کے دستور کے مطابق تقریباً سات سال کی عمر میں قرآن مجید ختم ہوا، اس کی خوشی میں والد ماجد نے ہلکی سی ضیافت بھی کی۔ اس موقع پر یہ دلچسپ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت کے بھانجے سید محمد مسلم حسنی صاحب (جو حضرت کے ہم عمر اور بچپن کے دوست تھے، بعد میں حضرت کی سب سے بڑی بھتیجی سے ان کا عقد ہوا۔) اسی زمانہ میں لکھنؤ گئے، مولانا عبدالحی صاحب نے ان سے پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ انھوں نے غالباً پارہ عمّ بتایا تو مولانا بڑی خوشی میں کہنے لگے کہ "علی کا تو قرآن مجید ختم ہو گیا۔"

باقاعدہ تعلیم

اردو کی باقاعدہ تعلیم عم محترم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کے یہاں شروع ہوئی جو اس وقت دفتر ندوۃ العلماء میں کام کرتے تھے، اس زمانہ میں دار العلوم کا دفتر اور کتب خانہ گولہ گنج میں خاتون منزل کے قریب ایک عمارت میں واقع تھا، حضرت کے مکان سے اسکا فاصلہ کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ ہوگا جو اس عمر کے اعتبار سے خاصا تھا۔

اردو حروف شناسی تو قاعدہ بغدادی سے شروع ہوئی تھی، مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کے یہاں زیادہ تر مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی کی اردو کتابیں نصاب میں رہیں جن میں "سفینہ اردو" خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کے بارے میں حضرت نے لکھا ہے کہ "ہم بھائی بہنوں کے لئے گویا بیاض اور وظیفہ کی کتاب تھی اور جس کی بہت سی نظمیں ہم لوگوں کو زبانی یاد ہو گئی تھیں۔" (۱)

اردو بقدر ضرورت پڑھ لینے کے بعد خاندانی دستور کے مطابق فارسی شروع

(۱) کاروان زندگی اول ص ۷۰

ہوئی، سب سے پہلے انجمن حمایت الاسلام کی فارسی کی پہلی کتاب دی گئی اور تعلیم دینے کے لئے ایک کہنہ مشق استاد مولوی محمود علی صاحب کا انتخاب ہوا جن کے بارے میں حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ "وہ بڑے مہذب، شفیق اور دیرینہ سال معلم تھے۔" (۱) فارسی کے ساتھ اسی زمانہ میں والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب کی تصنیف کی ہوئی کتابیں "تعلیم الاسلام" اور "نور الایمان" پڑھی، خوش خطی کی مشق بھی اسی زمانہ میں کی جو تعلیم کا ایک اہم جزاور ضروری نصاب تھا۔

کتابی شوق اور خاندانی ذوق

اس عمر میں جو عام طور سے کھیل کود کی ہوتی ہے اور جس میں کتاب سے ایک توحش سا ہوتا ہے، حضرت کو کتابوں سے بڑا شغف تھا بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ وہی حضرت کا کھیل اور دلچسپی کا سامان تھا، اس میں گھر کے ماحول کو بھی بڑا دخل تھا۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"ہمارا گھرانہ علماء و مصنفین کا گھرانہ ہے، والد صاحب اپنے زمانہ کے مصنفوں میں تھے، خاندانی و موروثی اثرات بڑے طاقتور ہوتے ہیں، وہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں اور بچوں اور بچیوں سب میں ان کے اثرات کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ کچھ یہ آبائی اثر، کچھ والد صاحب کا ذوق و انہماک ہمارے سارے گھر پر یہ کتابی ذوق سایہ فگن تھا۔ کتب بینی کا یہ ذوق ذوق سے بڑھ کر لت اور بیماری کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ کوئی چھپی ہوئی چیز سامنے آجائے تو اس کو پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ہم بھائی بہنوں کو جو تھوڑے سے پیسے دست خرچ کے لئے ملتے یا خاندان کے کوئی بزرگ جاتے ہوئے (اس زمانہ کے خاندانی رواج کے مطابق) بچوں کو روپے دے جاتے اس کا ایک ہی محبوب مصرف تھا کہ اس سے کوئی کتاب خریدلی جائے۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۷۰

اس سلسلہ میں خود میری ایک دلچسپ کہانی سنتے چلئے کہ میرے پاس اس طرح کچھ پیسے آگئے وہ ایک دو آنے سے زیادہ نہ تھے۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کتب فروشوں ہی کے یہاں ملتی ہے اور ہر چیز کی دوکان الگ ہوتی ہے۔ میں امین آباد گیا، گھنٹہ گھر والے پارک کے سامنے بڑی دوکانوں کی جو قطار ہے اس میں کسی دوا فروش کی دوکان پر پہنچا، غالباً "سالومن" کمپنی تھی، میں نے پیسے بڑھائے کہ کتاب دے دیجئے۔ دکان پر کام کرنے والے صاحب نے سمجھا کہ کسی شریف گھرانہ کا بھولا بھالا بچہ ہے۔ کیمسٹ کی دوکان پر کتاب کیا ملتی، دواؤں کی فہرست اردو میں تھی انھوں نے وہی بڑھادی اور پیسے بھی واپس کردیئے، میں پھولے نہیں سماتا تھا کہ کتاب بھی مل گئی اور پیسے بھی واپس آگئے، خوش خوش گھر پہنچا اور اس سے اپنے چھوٹے سے اس کتب خانہ کو سجایا جو والد صاحب کے یہاں کی ان کتابوں سے بنایا تھا جو ان کے لئے بیکار تھیں اور وہ ردی میں ڈال دیتے تھے۔ یہی شوق میری دونوں بہنوں کا تھا کہ کتاب کے بغیر ان کو چین نہیں آتا تھا۔ اس زمانہ میں ایک کتاب فروش ہماری گلی میں آتے تھے اور صدا لگاتے تھے "ہرنی نامہ" "نور نامہ" "حلیمہ دائی کی کہانی" "معجزہ آل نبی" "میلاد نامہ" وغیرہ وغیرہ۔ ان کی صورت ابھی تک آنکھوں میں ہے۔ وہ ان کتابوں کے اشعار گا گا کر پڑھتے تھے۔ ادھر ان کی آواز کان میں آئی ادھر ان دونوں بہنوں کی طرف سے حکم ملا کہ فلاں کتاب لے آؤ، دوڑا دوڑا گیا اور کتاب خرید لایا۔ ہمارا گھرانہ عقائد و مسلک میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا سختی سے پیرو تھا اور ان کے اثرات ایسے رچ بس گئے تھے کہ بے اصل اور غیر مستند چیزیں جن سے عقائد میں خلل پڑتا ہو گھر میں بار نہیں پاتی تھیں، مردوں سے زیادہ عورتیں عقیدہ کے بارے میں سخت تھیں۔ اس لئے "معجزہ آل نبی" جیسی کتابوں کا تو یہاں گزر نہ تھا، البتہ سیرت بزرگوں کی حکایات

اور بے ضرر دلچسپ کتابیں خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں، ان کتابوں کی قیمت ہی کیا تھی، کسی کے دو پیسے، کسی کے چار پیسے، بہت قیمت ہوئی تو دو آنے، چار آنے، دونوں میں سے کسی نے ترنم کے ساتھ مزے لے لے کر پڑھنا شروع کیا، اور جب تک کتاب ختم نہ کرلی ان کو چین نہ آیا۔ اسی زمانہ کا سنا ہوا حضرت حلیمہ دائی کا قصہ آج تک دل پر نقش ہے۔ اس کے ابتدائی چار شعر یہ ہیں۔

ایک عاشق تھی حلیمہ دائی | جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی | اسکی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی
نور اللہ کو لائی گھر میں | یعنی اس شاہ کو لائی گھر میں
واہ! کیا طالع بیدار ملے | جس کو کونین کے سردار ملے

اس سیدھی سادی نظم نے جس کے کہنے والے کا نام بھی معروف نہیں اس پاک محبت کے دل کی نرم سرزمین میں ابتدائی بیج ڈالے، پھر جب "سیرۃ ابن ھشام" میں یہ عزیز و لذیذ حکایت پڑھی، جس میں راوی نے اپنے معمول سے زیادہ دراز نفسی سے کام لیا

ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

تو وہ معصوم زمانہ جس پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں یاد آگیا۔

کتابوں کی خریداری میں صرف اسی کتب فروش ہی کے ذخیرہ پر بس نہ تھی جس کی گٹھری وہ اپنے بغل میں داب کر لاتے تھے، بلکہ مجھے وقتاً فوقتاً حکم ملتا رہتا تھا، میں "صدیق بکڈپو" سے جو ہمارے قریب سب سے بڑی کتابوں کی دکان تھی ان کی انتخاب کی ہوئی کتابیں خرید لاؤں۔ یہ سب کتابیں جو کبھی نظم میں ہوتیں اور کبھی نثر میں، مشترک طور پر پڑھی جاتی تھیں، اسی زمانہ میں سیرت پاک پر اردو کے چھوٹے بڑے رسالے پڑھے گئے اور دل و دماغ میں پیوست ہو گئے، ان کے نام تو اب یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ ان کے

پڑھنے سے اس زمانہ کے رواج کے مطابق مجھے میلاد یا سیرت کا جلسہ کرنے کا شوق ہوا، اپنے ہم سن بچوں کو مدعو کیا اور ان کو دعوت دینے کے لئے خود گھر گھر گیا، انہیں بہنوں میں سے کسی نے میرے سر پر چھوٹی سی پگڑی باندھی، عمر یہی آٹھ نو برس کی رہی ہو گی، انہیں کتابوں میں سے میں نے کوئی کتاب لے کر پڑھنی شروع کی، قابلیت کا یہ حال تھا کہ حضورؐ کے دادا سردار قریش عبد المُطّلِب کو عبد المَطْلَب پڑھ رہا تھا۔ والد مرحوم خاموشی سے آکر ایک طرف اوٹ میں کھڑے ہو گئے تھے، ان کا دل یہ منظر دیکھ کر کتنا باغ باغ ہو رہا ہو گا، اللہ تعالیٰ نے عشق نبوی کا ان کو حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور اسی سے ان کی تحریروں میں آب و رنگ ہے۔ ان کے لئے کیا کم خوشی کی بات تھی کہ ان کا کم سن بچہ اس ذکر خیر میں مصروف ہے جو ہر خیر و برکت کا سرچشمہ ہے، اور اس طرح وہ خود اپنا طالع بلند اور اپنا بخت بیدار کر رہا ہے ؎

حکایت از قد آں یار دل نواز کنیم بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنیم

نعتوں میں سب سے زیادہ امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعتیں ان بہنوں کی زبان پر جاری تھیں، خاص طور سے حضرت محسن کی مشہور نظم

ع سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

بہت پڑھی جاتی تھی۔ کتابوں میں "مسدس حالی" گویا ورد زبان تھی اور اس کا بڑا حصہ ان دونوں بہنوں کو تقریباً حفظ تھا۔ اس زمانہ میں شرفاء اور پڑھے لکھے لوگوں کا کوئی گھر بھی اس کتاب کے مطالعہ اور نغمہ خوانی سے خالی نہ تھا۔" (۱)

والد صاحب کے اسی ذوق کا اثر تھا کہ جب ہنسوہ جانا ہوتا تو چونکہ لوگ والد صاحب سے خوب واقف تھے، اور ان سے عقیدت و محبت رکھتے تھے، اس لئے حضرت سے کوئی وعظ کی فرمائش کرتا، کوئی نبض دکھاتا اور نسخہ پوچھتا کہ والد

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۵۷-۶۰

صاحب عالم بھی تھے اور طبیب بھی۔ اس وقت حضرت کی عمر مشکل سے ۶-۷ سال کی تھی۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں :

"وعظ کی فرمائش پر میں قرآن شریف کی آیت 'یا أیھا الذین آمنوا قوآ أنفسکم و أھلیکم ناراً (سورہ تحریم-۶) اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے۔ پڑھ کر اس کا ترجمہ کرتا۔ پھر کوئی نبض دکھاتا اور کہتا حکیم جی نسخہ بتایئے، میں نسخہ بولتا گل بنفشہ، گاؤزبان، عناب ولایتی، تخم خبازی، تخم خطمی پرہیز پوچھنے پر "شوربا، پھلکا" بتاتا۔"(۲)

کون جانتا تھا کہ یہ نوخیز بچہ جو آج تقریر کی نقل کر رہا ہے، آگے چل کر صف اول کے مقررین میں شمار کیا جائے گا اور ہزاروں بندگان خدا کی صحیح رہنمائی کرنے والا اور ان کو راہ راست پر لانے والا ہوگا، اور آج نباض حکیم کی نقل کر کے نسخہ بتانے والا آگے چل کر امت کا نبض شناس اور اس کے امراض کا علاج کرنے والا اور اس کے درد کا درماں ہوگا۔

والد صاحبؒ کی شفقت و توجہ

حضرت نے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی شفقت کا زمانہ کم پایا۔ حضرت کی عمر دس سال سے بھی کم تھی کہ انھوں نے رحلت فرمائی مگر اس پورے زمانہ میں حضرت کو ان کی پوری شفقت و توجہ حاصل رہی۔ حضرت ہی کے الفاظ میں اس کو درج کیا جاتا ہے۔

"والد صاحب کا اصل انہماک تصنیف و تالیف میں تھا، مطب اور ندوہ کی نظامت کے ضروری کام سے جو کچھ وقت بچتا وہ سب "نزھۃ الخواطر" کی تصنیف میں صرف ہوتا، مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ہمارے مکان کے بالائی جنوبی مشرقی کمرہ میں جو سڑک کی طرف ہے ان کی مسہری تھی، اس کے پاس

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۶۵

آرام کرسی، اس آرام کرسی پر برابر وہ تحریر و تسوید میں مشغول رہتے، مجھے کم سنی کے باوجود ان کے ساتھ کھانا کھانے کا بہت شوق تھا، اس انتظار میں دیر تک بیٹھا رہتا، وہ غیر معمولی طریقہ پر کم خوراک تھے، لیکن غذا لطیف، سادہ مگر نفیس ہوتی۔ صبح ناشتہ میں شرکت کرتا جس میں صرف چائے، ایک آدھ بسکٹ اور تھوڑا سا دیسی مکھن ہوتا، پرانے دوستوں میں سے کوئی باہر سے آتا، تو اس کی پر تکلف دعوت کرتے، اور ہم لوگوں کی گویا موج ہو جاتی۔ والدہ صاحبہ کھانوں کی تیاری میں نہ صرف مشاق بلکہ اختراعی ذہن رکھتی تھیں۔ مجھے اس زمانہ میں معلوم نہیں کہ کہاں سے یہ شوق ہو گیا تھا کہ والد صاحب کسی مریض کو دیکھنے بھی جائیں تو میں ساتھ جاؤں، بعض اوقات تانگہ حرکت میں بھی آجاتا تو بھی میں سوار ہونے کی کوشش کرتا۔ شہر کے کسی رئیس یا ندوہ سے تعلق رکھنے والے معزز آدمی کے یہاں جانا ہوتا تو میں بھی اپنے انہیں کپڑوں میں ساتھ ہو جاتا اور والد صاحب بھی از راہ شفقت اور مظاہر و تکلفات سے بری ہونے کی بنا پر مجھے ساتھ بٹھا لیتے، ایک آدھ مرتبہ میری ٹوپی درست کرنے کا بھی خیال آتا ہے۔

شہر میں سب سے زیادہ آمد و رفت نواب سید نور الحسن خاں کی کوٹھی بھوپال ہاؤس گھسیاری منڈی میں تھی۔ نواب صاحب کا (جو امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم کے فرزند اکبر تھے) تعلق والد صاحب سے دوستانہ نہیں برادرانہ و عاشقانہ تھا، ہمارے گھر کے بڑے چھوٹے ان کو نور میاں کہتے تھے۔ شاید کوئی ہفتہ گزرتا ہو کہ والد صاحب یا والدہ صاحبہ کا کسی تقریب یا عنوان سے بڑی کوٹھی نہ جانا ہوتا۔ اس خاندان سے عزیز داری بھی تھی۔ نواب صاحب مرحوم کی بیگم صاحبہ ہم لوگوں سے ایسا تعلق رکھتی تھیں جیسی حقیقی پھوپھیوں یا خالاؤں کا ہوتا ہے۔

نواب صاحب کے علاوہ والد صاحب کے مخصوص دوستوں اور پیر

بھائیوں منشی سید محمد خلیل صاحب نہٹوری منشی رحمۃ اللہ صاحب اور شاہ محمد خاں صاحب اور شیخ محمد عرب صاحب کے یہاں بھی آنا جانا تھا۔

نور میاں کی کوٹھی کے قریب ہی ہمارے بڑے حقیقی خالہ زاد بھائی سید محمد احمد صاحب بیرسٹر کی کوٹھی تھی، ہم لوگ وہاں بھی جاتے رہتے تھے۔ مجھے اس کم سنی میں بھی جب ۶-۷ سال سے زائد عمر نہ تھی، پھولوں کا بڑا شوق تھا۔ میں ان کے چمن سے پھول توڑ کر لاتا، خوش ہوتا۔ ان چند گھروں کے علاوہ جن سے گوناگوں تعلقات تھے، والد صاحب کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلسہ سیرت میں جو سال میں ایک مرتبہ بڑے اہتمام سے ہوتا تھا اور مٹھائی تقسیم ہوتی تھی اور کسی اہم رکن بالخصوص نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کی آمد پر کسی استقبالیہ وغیرہ میں جانا یاد ہے۔ ایک مرتبہ والد صاحب کے ساتھ ہنسوہ جاتے یا آتے ہوئے تنگ وقت مولانا سید نجم الدین شاہ صاحب کی خانقاہ فتحپور میں جانا یاد ہے جو ایک ٹیلہ پر تھی، ابھی تک یاد ہے کہ انھوں نے کم سن بچہ کی تواضع مٹھائی سے کرنی چاہی، مٹھائی ایک نعمت خانہ میں تھی، اس میں تالا پڑا ہوا تھا اور کنجی ان کے گھر کے کسی آدمی کے پاس تھی، مجھے اس آدمی کا تلاش کرانا اور اپنی بے چینی کہ شاید وہ نہ ملے، ابھی تک یاد ہے، یہ یاد نہیں کہ اس میں کامیابی ہوئی یا نہیں لیکن اس کی خوشی ہے کہ ایک کامل بزرگ وصاحب نسبت ہستی کی زیارت ہو گئی۔ اس موقعہ پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ میں بچپن میں اکثر بیمار رہتا، پانی کسی برتن میں حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحب نقشبندی مجددی کی خدمت میں جاتا اور وہ دم کرتے، اس طرح میں نے ان کا دم کیا ہوا پانی بہت پیا ہے، کیا عجب ہے کہ انکے انفاس متبرکہ کا کوئی اثر حصہ میں آیا ہو۔

والد صاحب کا ماحول چونکہ بالکل علمی و تصنیفی تھا، وہ بکثرت اپنی

ضرورت سے کتابیں منگواتے تھے اور مصنفین بھی ان کو بھیجتے تھے۔ بہت سی کتابیں اور رسائل ایسے ہوتے تھے جن پر وہ ایک نظر ڈال کر ان کو وہ ایک طرف رکھ دیتے تھے۔ میں اس انبار سے (جو والد صاحب کے لئے بیکار تھا) رسالے، فہرستیں وغیرہ چھانٹ کر لے جاتا، صحن میں ایک کھلی الماری تھی، اس میں ان کو سجاتا۔ ایک چھوٹا سا بورڈ بنایا تھا جس پر لکھا تھا "کتب خانہ ابوالحسن علی" مجھے اب بھی یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں رو رہا تھا یا کسی بات پر ضد کر رہا تھا، والد صاحب نے اپنے پیش کار مولوی سید عبدالغفور صاحب شرر استھانوی ندوی مددگار ناظم ندوۃ العلماء کو بلایا تھا، وہ زینے پر کھڑے تھے، والد صاحب نے "گل رعنا" کا مسودہ جو اس وقت مکمل ہوا تھا، ان کے حوالہ کیا اور ہدایت کی کہ وہ مولوی سید سلیمان (مولانا سید سلیمان ندویؒ) کو اعظم گڑھ بھیج دیا جائے۔ مسودہ حوالہ کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ چپ ہو جاؤ، میں اس کتاب میں تمہارا نام چھپواؤں گا۔ خدا کی شان کہ آج ان کی وفات کے تقریباً ۶۰ برس کے بعد اسکی نوبت آرہی ہے کہ "گل رعنا" کے پانچویں ایڈیشن کی اشاعت پر (جو زیر تیاری ہے) میرا اس کتاب پر تبصرہ اور "آب حیات" سے موازنہ بطور مقدمہ کے شائع ہو۔

والد صاحب کے مطب میں آکر کبھی ان کے کوئی خاص دوست یا علماء و مشائخ میں سے کوئی ممتاز شخصیت آجاتی تو ان کی فرمائش یا والد صاحب کی خواہش پر مجھے بلایا یا بلو لیا جاتا۔ ایک مرتبہ مولانا سید تجمل حسین صاحب دیسنوی بہاری (جو حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے عشاق اور اس سلسلہ کے مشائخ میں تھے) تشریف لائے، غالباً انھوں نے خود مجھے بلوایا اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا پورا قرآن شریف مجھے عنایت فرمایا جو ابھی تک ذاتی کتب خانہ کی زینت و برکت ہے۔

۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء میں والد صاحب پر وجع مفاصل کا حملہ ہوا اور جب

وجع مفاصل کے حملہ کے بعد کچھ سنبھلے تو اس دوران نقاہت اور ضعف میں نواب صاحب کی کوٹھی گھسیاری منڈی میں رات گزارنے کے لئے جایا کرتے تھے، میں ساتھ جایا کرتا تھا، وہاں جانا اور وہاں کا نقشہ خوب یاد ہے، اسی زمانہ میں "گل رعنا" تصنیف فرمائی تھی۔" (۱)

والد صاحبؒ کی وفات اور برادر معظمؒ کے آغوش تربیت میں

۱۵ر جمادی الاخریٰ ۱۳۴۱ھ جمعہ کے دن والد ماجد نے معمولی علالت کے بعد رحلت فرمائی، اخیر وقت میں خدمت کی سعادت بھی حضرت کے حصہ میں آئی۔ تحریر فرماتے ہیں کہ "میری خوش قسمتی کہ میں نے بغیر کسی ہدایت یا ان کے اشارے کے پیر دابنے شروع کئے۔" (۲) اس میں بھی شاید کوئی حکمت تھی کہ والد صاحب نے وفات سے کچھ پہلے سنترے منگوائے اور فرمایا کہ علی کو دے دو، وفات کے وقت فرزند اکبر مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ ایک ہزار میل دور مدراس میں تھے۔ انھوں نے یہ خبر بمبئی میں سنی۔ جب لکھنؤ واپس ہوئے اور رائے بریلی پہنچے تو سیدھے قبر پر گئے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ میں بھی ساتھ ہو لیا، قبر پر پہنچ کر پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ بس اسی دن سے غیر معمولی تبدیلی ان کے اندر پیدا ہو گئی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ

"اسی وقت سے ان کے اندر ہم سب لوگوں نے ایک انقلاب محسوس کیا، اب وہ نرے بڑے بھائی نہ تھے جو اپنی تعلیم میں ہمہ تن مشغول یکسو اور گھر کے قصوں سے فارغ ہوں، اب وہ ہم چھوٹے بھائی بہنوں کے شفیق باپ اور والدہ صاحبہ کے ایک سعادت مند فرزند بلکہ خادم تھے۔ میں نے ان سے صرف شفقت پدری کا اظہار ہوتے نہیں دیکھا بلکہ شفقت مادری کا بھی صاف صاف ظہور ہوتا تھا۔" (۳)

---

(۱) کاروانِ زندگی اول ص ۶۶-۶۹ (۲) کاروانِ زندگی اول ص ۷۹
(۳) کاروانِ زندگی اول ص ۷۸، ۷۹

تکیہ کا عبوری قیام اور والدہ صاحبہ کی تربیت

والد صاحب کی وفات کے بعد لکھنؤ قیام کا مسئلہ ہی نہ تھا۔ برادر اکبر ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ زیر تعلیم تھے، گھر میں کوئی جائیداد یا دوسرا ذریعۂ آمدنی نہ تھا اسلئے عبوری طور پر تقریباً ڈیڑھ سال رائے بریلی ہی میں قیام رہا۔

فارسی کی ابتدا لکھنؤ میں مولوی محمود صاحب کے پاس ہو گئی تھی، ڈاکٹر صاحب کی ہدایت سے اس کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہا۔ سید محمد اسماعیل صاحب جو حضرت سید صاحبؒ کے نواسہ کے فرزند تھے، ان کو فارسی کا اچھا ملکہ تھا، ان سے اسی زمانہ میں "بوستاں" پڑھنی شروع کی۔ حساب سکھانے اور اردو عبارت نویسی کی مشق کے لئے ماسٹر محمد زماں صاحب کو متعین کیا گیا جو قریبی گاؤں لوہانی پور سے آتے تھے۔ حضرت کے چھوٹے ماموں مولوی حافظ عبید اللہ صاحب کو بڑی شفقت و محبت تھی، وہ بھی تعلیم کی فکر رکھتے لیکن اس زمانہ میں اصل تربیت والدہ صاحبہ نے فرمائی جن کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں:

"گھر میں کسی بڑے مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ ہی میری نگرانی، اخلاقی و دینی تربیت کی ذمہ دار تھیں۔ مجھے قرآن مجید کی بڑی بڑی سورتیں انھوں نے اسی زمانہ میں یاد کرائیں، باوجود اس کے کہ ان کی شفقت خاندان میں ضرب المثل تھی، اور والد صاحب کے انتقال کی وجہ سے وہ میری دل داری اور ایک حد تک ناز برداری قدرتاً دوسری ماؤں سے زیادہ کرتی تھیں۔ لیکن دو باتوں میں وہ بہت سخت تھیں، ایک تو نماز کے بارے میں مطلق تساہلی نہیں برتتی تھیں، میں عشاء کی نماز پڑھے بغیر پڑھے سو گیا، خواہ کیسی بھی گہری نیند ہو اٹھا کر نماز پڑھواتیں اور نماز پڑھے بغیر ہرگز نہ سونے دیتیں۔ اسی طرح فجر کی نماز کے وقت جگا دیتیں اور مسجد بھیجتیں اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بٹھا دیتیں۔ دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور اس میں ان کی غیر معمولی محبت و شفقت حارج نہ ہوتی،

یہ تھی کہ اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی، ناانصافی کرتا، یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا تو وہ نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جوڑواتیں، اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلت اور خفت محسوس ہوتی مگر وہ اسکے بغیر نہ مانتیں، اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہنچا اور ظلم، تکبر و غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا اور دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل کو کبیرہ گناہ سمجھنے لگا، اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کر لینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔"(۱)

والدہ صاحبہ کو حضرت کی بڑی فکر رہتی، وہی ان کے تنہا فرزند تھے، وہ چاہتی تھیں کہ ان کی ساری امیدیں حضرت ہی سے پوری ہوں۔ حضرت کو مخاطب کر کے ایک مکتوب میں لکھتی ہیں "اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو (۱۰۰) کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں۔" معمولی شکایت سے بھی ان کے دل کو ٹھیس لگتی، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ظاہری تربیت کے ساتھ ساتھ دعاؤں کا انہوں نے غیر معمولی اہتمام کیا اور دل کھول کر حضرت کی علمی و دینی ترقیات، بلند اقبالی، مقبولیت و محبوبیت اور مقام تجدید و امامت کے حصول کے لئے دعائیں مانگنے کو اپنا وظیفہ اور ورد بنا لیا۔

دعاؤں میں یہ اضطراب، گریہ و زاری اور پھر وہ یقین جس کے ساتھ وہ دعا کرتی تھیں، خاندان میں ضرب المثل تھا۔ روزآنہ گھنٹوں دعا میں صرف ہوتے، بعض بعض مرتبہ اس قدر روتیں کہ دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا، اس میں ان کے والد بزرگوار حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی نسبت و توجہ کو بھی دخل تھا جو اپنے وقت کے عارف کامل تھے، یقیناً یہ نسبت حضرت کی طرف بھی منتقل ہوئی اور حضرت کی زندگی میں زہد و قناعت، دنیا سے بے رغبتی، خوف آخرت اور معرفت الٰہی کی جو درخشانی ہے اس میں حضرت شاہ صاحب کا بھی موروثی اثر ہے جو والدہ صاحبہ کی

---

(۱) ذکر خیر ص ۳۷-۳۸ باختصار

وساطت سے منتقل ہوا۔
یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اسی فکر و پریشانی کے زمانہ میں انھوں نے حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کو خواب میں دیکھا کہ وہ اس پرانے خواب کو یاد دلا رہے ہیں، جس میں انھوں نے "فلا تعلم نفسٌ ما أُخفي لهم من قرة أعينٍ" کی بشارت سنی تھی اور فرما رہے ہیں کہ تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟!

لکھنؤ میں نواب نورالحسن خاں صاحب کی کوٹھی پر قیام

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کے انتقال کے بعد نواب نورالحسن خاں صاحب کی بیگم صاحبہ اور ان کے صاحبزادگان نواب سید ظہورالحسن صاحب و سید نجم الحسن صاحب نے اپنی کوٹھی پر قیام کی پیشکش کی تھی۔ لکھنؤ کا مکان جو شروع سے کرایہ پر تھا چھوڑ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی اس مخلصانہ و محبانہ پیش کش کو قبول کیا تھا لیکن حالات ایسے نہ تھے کہ پورا گھر وہاں قیام کر سکے اس لئے ڈیڑھ سال تک ڈاکٹر صاحب تنہا وہاں مقیم رہے پھر جب وہاں قیام میں اطمینان حاصل ہوا تو انھوں نے سب سے پہلے حضرت کو رائے بریلی سے وہاں بلوالیا تاکہ اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم کا نظم کر سکیں، یہاں آکر "بوستاں" پڑھنے کا سلسلہ چچا عبدالرحمن صاحب سے جاری ہو گیا جن کی اسی احاطہ میں کوٹھی تھی۔ تقریباً سال بھر فارسی ہی کی تعلیم جاری رہی اور اس کا اختتام مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کی کتاب "اصول فارسی" پر ہوا، جو ڈاکٹر صاحب کی پسندیدہ کتاب تھی۔

نواب نورالحسن خاں صاحب مرحوم کا حضرت کے والد ماجد سے بڑا ہی گہرا تعلق تھا جس میں عقیدت و محبت کی یکجائی تھی اگرچہ نواب صاحب وفات پاچکے تھے لیکن بیگم صاحبہ نے اس تعلق کا پورا پاس رکھا اور دونوں بھائیوں سے اسی طرح محبت کا معاملہ کیا جیسے وہ اپنے صاحبزادوں سے کرتی تھیں۔

تقریباً دو سال حضرت کا اس کوٹھی میں قیام رہا۔ حضرت فرماتے ہیں:

"اس کوٹھی میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ آنکھوں کے زنگار چھٹ گئے اور دولت وامارت سے کبھی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں، اسلئے کہ اس کا اعلیٰ سے اعلیٰ مظہر اس کوٹھی میں دیکھ لیا۔ میرے سامنے ہی ایک مرتبہ بیگم صاحبہ بھوپال نواب سلطان جہاں یہاں آئیں اور ہم بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا۔ نان پارہ کی رانی قمر زمانی بیگم اور دوسرے رئیس گھرانوں کی بیبیاں اور روساء آتے اور مہمان ہوتے۔ سید ظہور الحسن صاحب کا حلقہ احباب وسیع تھا، وہ ٹینس کے ممتاز پلیئر تھے اور اس رشتہ سے مسلم اور غیر مسلم لکھنؤ کے بعض پروفیسر صاحبان، وکلاء اور شہر کے روساء آتے، کوٹھی کے صحن ہی میں ٹینس کورٹ تھا اور کوٹھی کے ایک حصہ میں بلیرڈ روم تھا اسلئے نئے تعلیم یافتہ اور مرفۃ الحال طبقہ کے لوگوں کو بھی خوب دیکھا۔ اودھ کی تہذیب، لکھنؤ کے آداب، ریاست کی امارت وشوکت اور نوابوں کے ٹھاٹھ سب سامنے آئے اور کوئی چیز اجنبی نہیں رہی۔"(۱)

(۱) کاروانِ زندگی اول ۸۶-۸۷

چوتھا باب

عربی تعلیم، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دیوبند و لاہور کا قیام، حضرت خلیفہ صاحب سے بیعت اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی خدمت میں تعلیم سلوک

عربی تعلیم کی ابتدا اور شیخ خلیل عربؒ کی خدمت میں

ہندوستان میں عربی زبان کی تعلیم کا صرف یہی مقصد گردانا جاتا تھا کہ اس سے حدیث و فقہ اور علم کلام کی ضروری کتابیں سمجھ لی جائیں، اسکو گہرائی کے ساتھ پڑھنے اور مہارت پیدا کرنے کا اسوقت کا کوئی تصور نہیں تھا، اس کی جگہ فارسی ہی پر ساری محنتیں صرف کی جاتی تھیں اور عمومی طور پر شریف گھرانوں میں اسی پر سارا زور دیا جاتا تھا۔ حضرت کے خاندان میں بھی فارسی کا بڑا رواج تھا، جد امجد مولانا حکیم سید فخر الدین خیالیؒ فارسی کے ادیب و شاعر تھے، والد صاحبؒ کو بھی اس کا اچھا ذوق تھا، برادر اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی خود بھی فارسی میں مہارت رکھتے تھے اور بے تکلف گفتگو کر لیتے تھے، لیکن ان کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اب ہندوستان میں فارسی کا ورق الٹ رہا ہے اور قریبی زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اس کی اہمیت بالکل ختم ہو جائے گی، اور صرف اسی حد تک اس کی افادیت محدود ہو کر رہ جائے گی کہ بزرگوں کے ملفوظات و مکاتیب یا شعراء کے دواوین سے استفادہ ممکن ہو سکے۔ حضرتؒ کی فارسی تعلیم اس حد کو پہونچ رہی تھی، اس لئے

ڈاکٹر صاحبؒ نے فارسی کو وہیں روک دیا، اور ایک طرف انگریزی کی ایک ریڈر شروع کرائی، اور دوسری طرف انہوں نے عربی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ کی اور اس کا ایسا حکیمانہ انتظام کیا جس کو توفیق الٰہی کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ قرین قیاس تھا کہ وہ حضرتؒ کو دارالعلوم میں داخل کر دیتے جسکے وہ خود اہم ذمہ داروں میں سے تھے، اور بعد میں اسکے ناظم بنائے گئے لیکن یہ خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے ایک غیبی انتظام تھا، اور حضرتؒ کو عالمی سطح پر جو اصلاحی و تجدیدی خدمات انجام دینی تھیں اور جس طرح سے عربوں کو خطاب کر کے انکو ان کے فرائض یاد دلانے تھے اس کی قدرت کی طرف سے ایک غیبی صورت تھی کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرتؒ کو شیخ خلیل بن محمد عرب یمانیؒ کے سپرد کیا جو اس وقت عربی کے کامیاب ترین استاد اور بقول حضرتؒ کے "ا رکا ذوق ہی نہیں بلکہ ذائقہ رکھتے تھے،" ڈاکٹر صاحبؒ سے انکے دوستانہ تعلقات اور بے تکلفی تھی اور اسی محلہ میں انکی بھی سکونت تھی جس میں ایک طویل عرصہ مولانا عبدالحیؒ نے گزارا تھا اور پھر جلد ہی ڈاکٹر صاحب بھی اسی محلہ میں منتقل ہو گئے۔ عرب صاحبؒ کے درس میں حضرتؒ کے شریک صرف انکے حقیقی بھائی شیخ حسین عربؒ تھے، اسلئے عرب صاحبؒ کی توجہ اور قدرت تدریس کا بڑا حصہ حضرتؒ کو ملا جو عام طور پر بڑی جماعت کے طلباء کو میسر نہیں آتا، پھر حضرتؒ کے ذوق و شوق کو دیکھ کر عرب صاحبؒ نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔

حضرت کی عربی تعلیم پر خاندان کے بعض بزرگوں نے ڈاکٹر صاحبؒ پر نکتہ چینی بھی کی اور یہ مطالبہ کیا کہ انکو آئی سی ایس (I.C.S.) کے لئے تیار کرنا چاہیے، اور عصری تعلیم دلانی چاہیے، ڈاکٹر صاحب نے جو بڑے کم گو اور متین واقع ہوئے تھے برجستہ کہا کہ ہم علی کو وہی تعلیم دے رہے ہیں جو میاں (۱) ان کو دیتے، یہ ایسا دوٹوک جواب تھا کہ لوگوں کی زبانیں بند ہو گئیں، پھر زمانہ نے دیکھ لیا کہ یہ فیصلہ کیسا حکیمانہ اور دوراندیشی پر مبنی ثابت ہوا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعد

---

(۱) ڈاکٹر صاحب والد صاحب کو میاں کہتے تھے۔

میں جب حضرتؒ نے لاہور کا پہلا سفر کیا تو پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحبؒ نے ایک دن اورینٹل کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع صاحب سے ملوایا، اور ان سے رائے طلب کی کہ یہ بچہ کون سی لائن اختیار کرے، تو انھوں نے اس وقت کے بعض مضامین اور تحریریں دیکھنے کے بعد کہا کہ یہ عربی کو ہی اپنا مضمون بنائیں، اسی میں ترقی کریں اور کمال پیدا کریں۔

شیخ خلیل عربؒ کے درس کی خصوصیات اور حضرت سے انکا تعلق خاطر

موجودہ نظام تعلیم کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ ایک بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اس میں ایک ہی وقت میں مختلف مضامین شروع کرا دیے جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک طالب علم کا ذہن پورے طور پر ان کو قبول کرنے سے عام طور پر قاصر رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو اس کثرت و انتشار سے محفوظ رکھا، اور حضرتؒ نے ایک وقت میں ایک ہی مضمون اور فن کی تعلیم پائی۔ اس میں بڑا دخل شیخ خلیل عربؒ کا تھا جنکا خود اپنا "خانہ ساز" نصاب تھا جس میں وہ اپنی پسند کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ ان کے اصولِ تعلیم میں ایک ضابطہ یہ بھی تھا کہ وہ دو زبانوں کی تعلیم بلکہ عام اوقات میں دو علوم اور مضامین کی تعلیم کو بھی مخلوط نہیں کرتے تھے۔

شیخ کے خاندان کا حضرتؒ کے خاندان سے استاذی شاگردی کا تعلق کئی پشتوں کا تھا۔ شیخ کے دادا علامہ حسین بن محسن انصاریؒ حضرت کے والد مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ کے باقاعدہ استاذِ حدیث رہ چکے تھے۔ شیخ کے والد شیخ محمد بن حسینؒ سے بھی مولانا عبد الحی صاحبؒ نے عربی ادب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ نے بھی شیخ حسین سے سند حدیث لی تھی، اور شیخ محمد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ "میرا عرب صاحب پر، اور عرب صاحب کا مجھ پر تین پشتوں کا حق تھا، اور وہ اس بارے میں ایسے ہی حق شناس تھے جیسا کہ زمانہ قدیم کے علماء و شرفاء۔"

۱۹۲۴ء کے اواخر کا زمانہ تھا کہ حضرتؒ نے باقاعدہ شیخ سے عربی شروع کی، اور انھوں نے ایک کاپی پر فَعَلَ کی گردان لکھ کر یاد کرنے کو دی، پھر جلد ہی عربی زبان کی پہلی کتاب "المطالعة العربية" شروع کرادی، اس کے بعد انھوں نے "مدارج القراءة" کا دوسرا حصہ اور "الطريقة المبتكرة" کے تین حصے درساً درساً اور دو حصہ مطالعہ کے طور پر پڑھائے، حضرت اس درس کی خصوصیت بیان فرماتے ہیں:

"سبق سے ذرا بھی گرانی اور وحشت نہیں تھی، عرب صاحب کی پرلطف باتیں حوصلہ بڑھانے والی اور وحشت دور کرنے والی ظرافت، عملی مشق ان سب چیزوں نے اجنبی زبان کی وحشت اور درسی کتابوں کی ثقالت کو دور کردیا تھا۔"(۱)

"الطريقة المبتكرة" کے بعد انھوں نے اپنی پسندیدہ کتاب "كليلة و دمنة" شروع کرائی، اس کے طریق درس کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں کہ

"ہم دونوں رفیقوں کو دن بھر اس پر محنت کرنی پڑتی تھی، پورا سبق تیار کر کے اس طرح ان کے سامنے پیش کرنا ہوتا تھا جیسے آموختہ سنایا جاتا ہے، عبارت کا صحیح پڑھنا، اس کے صرفی و نحوی وجوہ کا جاننا، سوالات کا جواب دینا، عبارت کے مفہوم کو پورے طور پر اخذ کرلینا یہ سب ہمارے ذمہ تھا، دراصل یہی کتاب اور اس کا یہ طریقۂ تعلیم، ہماری استعداد اور قوت مطالعہ کی کلید تھی جس سے تعلیم کے ہر ہر مرحلہ میں (جہاں تک زبان کا تعلق ہے) ہر قفل کھلتا چلا گیا، دراصل پورے نصاب میں (قدیم نصاب تعلیم میں) ایک ہی دو کتابیں ایسی ہوتی تھیں جو قوت مطالعہ پیدا کردیتی تھی اور اخذ مطالعہ کے لئے کافی ہوجاتی تھیں۔ اس زمانہ میں عرب صاحب نے ایک چھوٹے سے رسالہ جو میرے ہی ہمنام "ابوالحسن علی الضریر" کی نسبت سے

---

(۱) پرانے چراغ اول ص ۲۱۳

"ضریری" کے نام سے مشہور ہے عربی کے کثیر الاستعمال اور عامۃ الورود قواعد کی مشق کرائی، ہم دونوں نے صرف و نحو کی مختلف کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک کی ساری کمائی اور عملی جمع خرچ اُسی چھوٹے سے رسالہ کا رہین منت ہے۔

"كليله و دمنه" ختم ہوئی تو عرب صاحب نے مصر کی عربی نصاب درس کی ایک کتاب جو وہاں کے مدارس میں رائج تھی، اور جس کا نام "مجموعة من النظم و النثر للحفظ و التسميع" تھا، شروع کرائی، اسکا پہلا حصہ منظوم ہے دوسرا نثر، لیکن عرب صاحب نے اپنے خداداد ذوق سلیم کی بنا پر نثر سے ابتدا کی، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے طلباء کیلئے اس کتاب کا زبانی یاد کرنا، اور سنانا ضروری ہے۔ ہم جو پڑھتے اس کو اگلے دن سناتے، اس کے بغیر نیا سبق نہ ہوتا۔ سب جانتے ہیں کہ تقریباً سب زبانوں بالخصوص عربی کے لئے زبان کا ایک معتد بہ حصہ اور اساتذہ و مستند اہل زبان کا کلام زبانی یاد ہونا اور حافظہ کا کسی نہ کسی طرح جزء بن جانا نہایت مفید ہے، غالباً اس طرح پورے حصہ نثر کو زبانی یاد کرنے کی نوبت تو نہ آئی، لیکن اسکا بہت سا حصہ زبانی یاد کرکے سنانا پڑا، وہ حصہ اگرچہ فراموش ہو گیا، لیکن حافظہ اور ذوق میں وہ اس طرح تحلیل ہو گیا تھا کہ اسکے اجزاء و اثرات جزء بدن ہو گئے اور تحریر و انشاء میں اسکا رنگ نمایاں ہوا، عرب صاحب کے طریقۂ تعلیم کی یہ خوبی تھی کہ وہ اچھے الفاظ، تعبیرات و محاورات کا اس طرح چٹخارہ لیتے، ان کی لذت و حلاوت کا اس طرح اظہار کرتے کہ وہ ہم لوگوں کے دل و دماغ پر مرتسم ہو جاتے اور ہم سمجھتے کہ ان الفاظ کا لطف لینا اور ان کی قدر ضروری ہے۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ ہم لوگوں کے ذہن پر یہ اثر قائم کرتے کہ یہ الفاظ و تعبیرات کسی کی ذاتی ملکیت نہیں اور نہ یہ سربمہر خزانہ ہے، یہ ہر اس شخص کی ملکیت ہے جو اسکو صحیح طریقہ پر استعمال کر سکے، بعض اوقات انھوں نے

ہماری انشاء کی کاپیوں میں کسی محاورہ، ضرب المثل یا جملہ کے صحیح استعمال پر اس طرح اپنی مسرت کا اظہار کیا، جیسے ہم لوگوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو، اور بعض اوقات اس پر انھوں نے انعام بھی عطا کیا۔"(۱)

ادب کی متوسط کتابوں کے ختم ہونے کے بعد انھوں نے قرآن مجید میں سے سورۂ زمر اور اس کے بعد کی چند سورتیں پڑھائیں۔ شیخ قرآن مجید کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، قرآن مجید پڑھتے تو قابو نہ رہتا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔ ان کے اندر درد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آواز بڑی دردناک اور لہجہ بڑا پر تاثیر تھا۔ فجر کی نماز میں وہ کوئی بڑی سورہ شروع فرماتے لیکن فرط تاثر اور شدت گریہ سے اسکو مکمل کرنے کی نوبت کم آتی۔ توحید کا بڑا غلبہ تھا، وہ بڑا کھرا اور صاف عقیدہ رکھتے تھے۔ سورۂ زمر جس میں توحید کی بڑی صاف اور طاقتور تعلیم ہے، ان کی محبوب اور منتخب سورہ تھی۔ حضرتؒ کی تعلیم قرآن کا آغاز انھوں نے اسی سورہ سے کیا۔ اس کے بعد سورہ مومن، سورہ شوریٰ پڑھائی۔ دوسری طرف صحیح مسلم میں سے انھوں نے "کتاب المغازی" پڑھانی شروع کی۔ ان دو سبقوں کے علاوہ زیادہ تر عربی ادب ہی کی کتابیں زیر درس رہیں لیکن تمام تر نثر۔ نظم نسبتاً کم اور ثانوی درجہ میں۔

عربی ادب کی ابتدائی اور متوسط کتابوں کے بعد قدیم معیاری کتابوں میں سے نہج البلاغۃ، مقامات حریری، دلائل الاعجاز اور عشر قصائد جیسی کتابیں زیر درس رہیں، حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"دلائل الاعجاز ان کی محبوب کتاب تھی اور وہ اس کے پڑھانے کا حق ادا کر دیتے تھے، جس شعر پر مصنف کو سرور آتا ان کو بھی وجد آتا اور وہ جھوم جھوم کر اسکو پڑھتے اور دیر تک اسکا مزہ لیتے رہتے۔ عربی قصائد پڑھتے تو سوق عکاظ کا نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا۔ وہ شعر پڑھتے وقت ہمہ تن تصویر بن جاتے اور انکے روئیں روئیں سے شعر اور نغمہ ابلتا ہوا نظر آتا۔"(۲)

---

(۱) پرانے چراغ اول ص ۲۱۵-۲۱۶ (۲) پرانے چراغ اول ص ۲۱۸ باختصار

اس میں ان کے عربی ذوق اور ادبی ذائقہ کو دخل تھا۔ اس کے علاوہ وہ بڑے رقیق القلب اور لطیف الحس واقع ہوئے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کے اس امتیاز کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ان کی اصل سند جس سے ہر جگہ انھوں نے عزت پائی اور اپنے اقران واماثل میں ممتاز و صدر نشیں رہے، وہ زبان وادب کا خداداد ذوق ان کی تعلیم کا فطری ملکہ، تعلیم میں جاں گدازی اور دلسوزی کی وہ کیفیت ہے جو مدتِ دراز سے تعلیمی و تدریسی حلقوں سے مفقود اور تاریخ کے اوراق میں مدفون ہو کر رہ گئی ہے۔ اپنے طلباو شاگردوں سے پدرانہ بلکہ مادرانہ محبت وانس، اپنے ذوق و نظر کو طلباء تک منتقل کر دینے اور انکے رگ وریشہ میں اتار دینے کی عجیب و غریب قابلیت زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے، فن کا صحیح ذوق پیدا کر دینے اور مصنف کا ہم زبان و ہم مذاق بنا دینے کی وہ بے نظیر قدرت ہے جو ہزاروں میں سے کسی ایک استاذ و ماہر فن میں ہوتی ہے۔"(۱)

اپنے محبوب شاگرد سے ان کو جو تعلق خاطر اور قلبی محبت تھی اس کا کچھ اندازہ ان کے ان مکاتیب سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے حضرتؒ کو ارسال فرمائے ہیں۔ ایک خط میں اس طرح خطاب فرماتے ہیں:

"میرے حقیقی بھائی اور اولاد سے زیادہ عزیز و محبوب! تمہاری مشغولیات اور دعوتی سرگرمیوں کا علم ہوا، اور دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش کہ تم جیسے بہت سے علی ہوتے۔" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کا لفافہ پڑھ کر شادمانی کا وہ عالم تھا جس کی مثال زندگی میں نہیں ملتی۔"

مختارات جب چھپ کر آئی تو اس پر انھوں نے اپنے قلبی تاثرات تحریر کیے اور اپنے محبوب شاگرد کو دل کھول کر داد دی۔ اخیر میں یہ جملہ بھی لکھا:

قليل ما كتبت و في القلب	میں نے کم لکھا دل میں تو بہت کچھ
كثير ملأ القلب لك حبا	ہے تمہارے لئے سراپا محبت دل

---

(۱) پرانے چراغ حصہ اول ص ۲۱۲

حضرتؒ کو مخاطب کر کے انھوں نے عربی میں چند اشعار بھی کہے تھے جو انکی محبت اور تعلق کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

توفیق الٰہی

توفیق الٰہی کے عنوان سے حضرتؒ نے جو واقعہ تحریر فرمایا ہے وہ استاذ کے ادب و احترام بلکہ عظمت و محبت کی ایک نادر مثال ہے، وہ بے کم و کاست یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"عرب صاحبؒ سے پڑھنے کے زمانہ میں ایک امتحان پیش آیا، جو دیکھنے میں تو معمولی واقعہ تھا، لیکن میرے کم سے کم عربی تعلیم اور زبان و ادب کے حصول میں کامیابی کے سلسلہ میں فیصلہ کن اثر رکھتا تھا؛ ہوا یہ کہ میرے انگریزی کے استاد خلیل الدین صاحب ہنسوی نے جن کا عرب صاحب بڑا لحاظ کرتے تھے، ان سے میرے ایک ایسے طرز عمل کی شکایت کی جس سے ان کو اپنی اہانت کا احساس ہوا تھا۔ یہ احساس محض غلط فہمی پر مبنی تھا کہ میں نے یہ کہنے کے بعد کہ آج فلاں عذر کی وجہ سے میرے لئے سبق پڑھنا مشکل ہے، دروازہ ذرا زور سے بند کیا۔ عرب صاحبؒ اس سے بہت متاثر ہوئے، اور انھوں نے بھائی صاحبؒ سے اجازت لی کہ آج وہ میری اچھی طرح تنبیہ کریں گے۔ ان کے مزاج میں و.... قدرے حدت بھی تھی۔ اس واقعہ نے ان کو مشتعل کر دیا، انھوں نے مجھے اس پر اتنا زدو کوب کیا جو اس جرم اور واقعہ کی نوعیت سے بہت بڑھ گیا۔ بعد میں ان کو اس کا احساس ہوا کہ اس میں کچھ بے اعتدالی ہو گئی، جس کے لئے مجھ سے معذرت بھی کی، شدہ شدہ یہ خبر والدہ صاحبہؒ کو رائے بریلی پہونچی، انھوں نے مجھ سے دریافت کیا اور کہا کہ معلوم ہوا ہے کہ عرب صاحب نے تم کو بہت مارا؟ اللہ تعالیٰ نے اس وقت توفیق دی، اور میں نے عرب صاحب کی پوری وکالت اور انکی طرف سے مدافعت کی اور انکو اس تنبیہ و تادیب میں بالکل حق بجانب قرار دیا۔ والدہ صاحبہ مطمئن ہو گئیں اور میری

تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس سعادتمندانہ رویہ نے جو محض توفیق الٰہی کا نتیجہ تھا، مستقبل میں میرے لئے عربی زبان وادب کا ذوق پیدا ہونے اور اس کے ذریعہ سے دین وعلم کی خدمت کرنے کا فیصلہ کرادیا۔ اگر صورتحال اسکے برعکس ہوتی اور میں اپنے کو بری اور مظلوم قرار دیتا اور اپنے محسن ومربی استاد کو حدود سے تجاوز کرنے والا۔ تو شاید معاملہ برعکس ہوتا اور میں ہمیشہ کے لئے ان کے فیض تعلیم اور عربی زبان وادب میں کامیابی سے محروم کردیا جاتا۔ ذلك من فضل ربي ليبلوني أأشكر أم أكفر"۔(۱)

بعض دوسرے اساتذہ سے استفادہ

شیخ خلیل عربؒ نے زبان وادب کی تعلیم کے ساتھ نحو کی ایک مختصر کتاب "الضریری" حضرتؒ کو پڑھائی تھی۔ اس کے علاوہ نحو کی بعض قدیم نصابی کتابیں میزان، منشعب، صرف میر، نحو میر، پنج گنج چچا مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحبؒ نے پڑھائیں۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "وہ بڑی محنت اور نگرانی سے ان کتابوں کو پڑھاتے تھے، ان کے یہاں تسامح یا تساہل کا کوئی خانہ نہ تھا۔"(۲) زیادہ دنوں اگر رائے بریلی ٹھہرنا ہوتا تو عرب صاحب کے یہاں زیر درس عربی کتاب بھی انہیں کے یہاں ہوتی تھی۔

مولانا سید عزیز الرحمٰنؒ کے علاوہ صرف ونحو کی مشق مولانا سید طلحہ صاحبؒ نے بھی کرائی جن کو اس میں بڑی مہارت تھی اور وہ صرف ونحو کے استاذ ہی نہیں بلکہ امام تھے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"صحیح عبارت پڑھنے اور صرف ونحو کے ضروری مسائل کے جزو دماغ بن جانے میں ان کا بڑا دخل ہے۔ وہ ادبی، نحوی، صرفی غلطی، عبارت کا غلط پڑھنا معاف نہیں کرتے تھے اور کئی کئی دن تک اس پر طنز فرماتے اور چٹکیاں لیتے رہتے، جسکی وجہ سے بڑا چوکنا اور ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ عربی زبان و

(۱) کاروان زندگی اول ص ۹۱-۹۲

(۲) کاروان زندگی اول ص ۹۰

صرف ونحو کے علاوہ ان سے اور بہت سے علمی فوائد حاصل ہوئے اور ذہنی تربیت ہوئی، تاریخی شعور پیدا ہوا، اور اس متنوع ثقافت میں سے کچھ حصہ ملا جس میں ان کو اپنے باکمال معاصرین میں بھی امتیاز حاصل تھا۔" (۱)

اسی زمانہ میں خواجہ عبدالحی صاحب فاروقیؒ سے استفادہ کی نوبت آئی جو مولانا عبیداللہ سندھی کے تلمیذ رشید اور برادر اکبر ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کے رفیق درس تھے، انکی دعوت پر وہ لکھنؤ آئے تھے، اور ان ہی کے گھر میں ٹھہرے، ڈاکٹر صاحبؒ ہی کے کہنے پر انھوں نے پارہ عم کی آخری چند سورتیں پڑھائیں، اسکے علاوہ بھی انکی صحبت و مجلس بڑی معلومات افزا اور مفید تھی، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "یہ میرا مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ کے طرز تفسیر وطرز فکر سے پہلا تعارف تھا جسکی وجہ سے میں نے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے درس میں اجنبیت محسوس نہیں کی۔" (۲)

اردو زبان وادب کا ذوق

عربی تعلیم کے آغاز ہی میں حضرتؒ نے اردو زبان وادب کی تعلیم مکمل کرلی، اور اس کی معیاری کتابیں پڑھ لیں، اسکی تفصیل حضرت کی زبانی درج کی جاتی ہے

"رائے بریلی کے قیام میں جو کبھی کبھی طویل ہو جاتا تھا، میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی 'الفاروق' آگئی، مطبع نامی کانپور کی چھپی ہوئی سراپا تصویر، پڑھی اور کئی بار پڑھی۔ عم محترم سید طلحہ صاحب کی صحبت اور مجلسوں میں "آب حیات" سے تعارف ہوا، سنی اور بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گئے جس طرح بچپن کی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔

"گل رعنا" گھر کی کتاب تھی اس کو اتنے بار پڑھا کہ اردو شاعری کی

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۰۱

(۲) ایضاً ص ۱۰۰

تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنے معلومات ہو گئے کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمان جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا، ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے، اور اردو میں تحریر و تقریر کے مقابلہ کرواتے، اس سلسلہ میں خاص طور پر مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتشؔ اور امیر مینائیؔ کے کام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی۔ شعر فہمی اور ذوق آفرینی میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابوالخیر برقؔ کا بھی حصہ ہے جو لکھنؤ کی زبان کے عاشق، محاورات اور الفاظ کی تذکیر و تانیث میں سند اور استاد کا درجہ رکھتے تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور اچھے کہتے تھے۔

اس زمانہ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحبؒ کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے بہت سختی سے روک دیا، اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرۂ کتب تھا جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی "نیرنگ خیال" بھی تھی، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر فنی کا ایک مرصع نمونہ ہے، بہت اثر پڑا، بہت دنوں تک "نیرنگ خیال" اور آب حیات کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کئے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدے سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، مولانا شبلی مرحوم، مولانا حالی اور مولوی نذیر احمد، شررؔ مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی بھی

چند کتابیں پڑھیں۔ میرے ماموں مولوی حافظ سید عبید اللہ صاحبؒ کے یہاں مولانا آزادؒ کے شہرۂ آفاق اخبار "الہلال" کے کئی سال کے فائل تھے، وہ بھی ذوق و شوق سے پڑھے، اور انکے زورِ قلم اور جوشِ بیان کا طبیعت نے پورا اثر قبول کیا، کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلادی جائے بیکار اور بے اثر نہیں رہتی، اپنا اچھا برا اثر ضرور کرتی ہے، اس لئے اسکا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب "یاد ایام" کا تھا، جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے، جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ زبان کا بانکپن بھی موجود ہے، جو میرے علم میں مصنف "گل رعنا" اور مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانیؒ کی تحریر کا مشترک جوہر ہے، اس طرز پر میرا پہلا مضمون جو اب یاد آتا ہے اندلس پر تھا۔

اس زمانہ کا یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ میں نے شبلی بک ڈپو (جو لکھنؤ میں اس وقت لاٹوش روڈ پر مولوی کلیم احمد صاحب بہرائچی ندوی کا تجارتی مکتبہ تھا) کی فہرست میں سیرت کی ایک کتاب "رحمۃ للعالمین مصنفہ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری" کا نام پڑھا، پڑھتے ہی طبیعت میں ایسا انجذاب ہوا کہ میں نے اس کا آرڈر دے دیا، کتاب آئی تو اس وقت والدہ صاحبہ کے پاس وی پی چھڑانے کے لئے پیسے نہ تھے، انھوں نے مجبوری کا اظہار کیا، میں نے اس پر رونا شروع کر دیا، والدہ صاحبہ نے مجبور ہو کر کہیں سے اس کا انتظام کیا اور وی پی چھڑالی۔ میں نے اس کتاب کو بڑے ذوق و شوق اور عقیدت و محویت کے ساتھ پڑھا، کم کتابوں نے دل و دماغ پر ایسا گہرا اثر ڈالا ہوگا، جتنا اس کتاب نے۔ مصنف کا اخلاص اور ان کی قوت ایمانی اور داعیانہ رنگ تھا اور سیرت کے واقعات کی سادگی اور اثر انگیزی کہ دل و دماغ میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا، اس کتاب کو اپنی محسن و مربی کتابوں میں

سمجھتا ہوں۔"(۱)

اس زمانہ کے بعض اہم واقعات اور دلچسپیاں

نومبر ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر صاحبؒ تعلیم سے فارغ ہوئے، اور جنوری ۱۹۲۶ء سے انہوں نے گوئن روڈ پر والد صاحبؒ کے قدیم مطب کے قریب ہی مطب کا آغاز کیا، اور قریب ہی بازار جھاؤلال کی اس گلی میں جسکے سرے پر لب سڑک قدیم مکان تھا جس میں والد صاحبؒ رہ چکے تھے اور اس میں ان کی وفات ہوئی تھی، ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا، اور کئی سال بھوپال ہاؤس میں رہنے کے بعد اس میں منتقل ہو گئے، یہ مکان عرب صاحب کے مکان کے بالکل بالمقابل اور متصل تھا، اس لئے حضرتؒ کو تعلیم کے لئے آنے جانے کی سہولت ہو گئی۔

بازار جھاؤلال کے اسی قیام میں حضرت کو ہاکی سے کچھ رغبت ہوئی اور کچھ دن دیکھنے اور کھیلنے کی بھی نوبت آئی، لیکن شعور بیدار ہو چکا تھا اس لئے جلد ہی اس کے مضر اثرات کا احساس ہونے لگا اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔ اس کے بارے میں حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں: "مجھے خوب اندازہ ہے کہ ایسے شوق، تعلیمی انہماک اور ذہنی یکسوئی پر کتنے اثر انداز ہوتے ہیں۔"(۲)

"اسی زمانہ میں مولانا ظفر علی خاں کے اخبار "زمیندار" سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ "اس کے سنڈے ایڈیشن کا ہفتہ بھر انتظار رہتا، مولانا کی نظم جو صفحہ اول پر ہوتی تھی مزے لے لے کر پڑھتا، اور ان کی قادر الکلامی، خوش نوائی اور جوشِ کلام سے مسحور ہوتا۔"(۳)

اسی زمانہ میں مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا آزادؒ کو دیکھنے اور سننے کی نوبت آئی کہ یہ دونوں اس زمانہ میں مختلف موقعوں پر لکھنؤ تشریف لاتے اور سیاسی اور قومی جلسوں کو خطاب کرتے۔

---

(۱) کاروانِ زندگی اول ص ۹۴-۹۶

(۲) کاروانِ زندگی ص ۱۰۱ (۳) کاروانِ زندگی اول ص ۱۰۰

ندوۃ العلماء کا اجلاس کانپور اور اس میں شرکت

۵/۶/۷/ نومبر ۱۹۲۶ء کی تاریخوں میں ندوہ کا سالانہ جلسہ کانپور میں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب جن کو حضرت کی تعلیم و تربیت کی بڑی فکر رہتی تھی، اس خیال سے حضرتؒ کو اپنے ساتھ لے گئے کہ وہاں اہم دینی و علمی شخصیات کی زیارت وملاقات ہوگی۔ تینوں دن حضرت کا شب و روز وہاں قیام رہا، سابق ناظم ندوۃ العلماء کے فرزند اور موجودہ نائب ناظم ڈاکٹر سید عبدالعلی کے برادر خورد ہونے کے رشتہ سے اہل تعلق کا شفقت و محبت سے پیش آنا طبعی امر ہے لیکن اس نوعمری میں حضرت کے عربی میں گفتگو کرنے کے نتیجہ میں مشاہیر و علماء کی خصوصی توجہ ہوئی۔ اس کا ذریعہ یہ ہوا کہ مدنی شاعر و ادیب شیخ سعد الدین برادہ بھی اس جلسہ میں شریک تھے، ان کو کسی سے راستہ پوچھنے یا بات کرنے کی ضرورت پیش آتی تو حضرت ہی ترجمان بنتے، لوگوں میں مشہور ہو گیا، ۱۲/ ۱۳/ سال کا لڑکا بے تکلف عربی بولتا ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم، اور مولانا ابو عبد اللہ محمد سورتیؒ نے اپنی قیام گاہ پر بلوا کر کچھ سوالات بھی کیے تھے۔

اس اجلاس میں جن مشاہیر و علماء کی زیارت پہلی مرتبہ ہوئی، ان میں حکیم اجمل خاں صاحبؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ظفر علی خاںؒ، مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ، قاضی سلیمان صاحب منصورپوریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ "رحمۃ للعالمین" (جو حضرت کی پسندیدہ سیرت کی کتاب ہے) کے مصنف قاضی سلیمان صاحب منصورپوری بھی اجلاس میں موجود تھے، انھوں نے فرمایا کہ میں نے کتاب تم کو بھیجی تھی۔ حضرتؒ تک کتاب تو نہ پہونچ سکی، اور حضرتؒ نے وہ کتاب خرید کر پڑھی، لیکن اس سے قاضی صاحبؒ کے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتؒ کی اس نوعمری میں انھوں نے کتاب بھیجنے کا اہتمام کیا، حضرتؒ کو بھی اس کتاب سے جو شغف تھا اس کا تذکرہ ابھی گزر چکا ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ اور اسکی بعض حکمتیں

۱۹۲۷ء کو اگست کے مہینہ میں ڈاکٹر صاحبؒ نے غالباً عرب صاحب کے رجحان اور اصرار پر حضرتؒ کو لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل کر دیا، خود ڈاکٹر صاحبؒ ان یونیورسٹیوں میں مشرقی امتحانات دینے کے طبعاً خلاف تھے، لیکن عرب صاحبؒ اس کی افادیت کے قائل تھے اور ایم اے، بی اے کلاسز کو عربی پڑھاتے تھے، یونیورسٹی میں داخلہ کے باوجود عرب صاحبؒ کے یہاں اسباق جاری رہے اور حضرت کو اصل فائدہ اسی سے پہونچا۔

یونیورسٹی میں دو مضامین سے حضرت کو مناسبت نہیں تھی۔ ایک فن عروض، دوسرے دقیق نحوی مسائل، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سالانہ امتحان میں اور مضامین میں امتیازی نمبرات کے باوجود ان دقیق نحوی مسائل کی وجہ سے ایک مضمون میں ناکامی ہوئی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "شاید اس میں حکمت الٰہی تھی کہ مجھے ناکامی کا تجربہ کرنے اور اس کو برداشت کرنے کا موقعہ ملا اور دوبارہ محنت و جانفشانی کے لئے مجبور ہوا۔"(۱)

اگلے سال اس کی پوری تلافی ہوگئی، وظیفہ بھی دیا گیا، اور گولڈ میڈل کا استحقاق بھی ہوا، لیکن کسی تعلقہ دار کے رقم جمع نہ کرنے کی وجہ سے وہ مل نہ سکا، حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں:

"غالباً اسکی قیمت سو روپے سے زائد نہ ہوتی ہوگی، اس وقت اگر کوئی پیشین گوئی کرتا کہ تمہیں اسکے بجائے کسی زمانہ میں سب سے بڑی قابل احترام حکومت (سعودی عرب) کی طرف سے فیصل ایوارڈ کی شکل میں وہ بیش قیمت طلائی تمغہ ملے گا جس کی قیمت سے یونیورسٹی کے اس تمغہ کو کوئی نسبت نہیں تو کوئی باور نہ کرتا، لیکن یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید"(۲)

---

(۱) کاروان زندگی حصہ اول ص ۱۰۴

(۲) کاروان زندگی اول ص ۱۰۴

لاہور کا تاریخی سفر

حضرتؒ کی امتیازی کامیابی کی خبر پھوپھی صاحبہ (اہلیہ مولانا سید طلحہ صاحبؒ) کو لاہور میں ملی، تو انھوں نے خوشی میں حضرتؒ کو لاہور بلوایا، والدہ صاحبہ اور بھائی صاحب سے اجازت کے بعد اواخر مئی یا اوائل جون ۱۹۲۹ء میں حضرتؒ کا پہلا باقاعدہ سفر ہوا، لاہور اس وقت برصغیر کا سب سے بڑا ثقافتی ادبی اور صحافتی مرکز تھا، مولانا طلحہ صاحبؒ نے حضرت کو ہر طبقہ کے اہل کمال سے ملایا، اس وقت حضرتؒ کی عمر سولہ سال کی تھی۔ اس سفر میں پہلی مرتبہ حفیظ جالندھریؒ کے ساتھ مجلس اور کھانے میں شرکت کی نوبت آئی اور انھوں نے حضرتؒ کی فرمائش پر اپنی بعض نظمیں سنائیں۔ علامہ اقبالؒ سے بھی پہلی ملاقات اسی سفر میں ہوئی اور حضرتؒ نے ان کی نظم "چاند" کا عربی ترجمہ ان کو دکھایا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "یہ سفر میری زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ "مزید فرماتے ہیں کہ میں نے اس سفر میں مولانا طلحہ صاحبؒ کی بدولت جو کچھ سیکھا اور دیکھا، اس سے اپنی پوری زندگی میں فائدہ اٹھایا، ان کا احسان کبھی بھول نہیں سکتا، کہ وہی حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے تعارف و تعلق کا ذریعہ بنے اور ان کی شفقتوں و خصوصی توجہات کی سعادت حاصل ہوئی، جسکا میری زندگی پر بہت گہرا اور دیرپا نقش ہے۔" (۱)

اسی سفر میں مولوی شفیع سے ملاقات ہوئی اور استصواب رائے کا وہ واقعہ پیش آیا جس کا تذکرہ عربی تعلیم کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

انگریزی تعلیم کا انہماک اور والدہ صاحبہؒ کی پریشانی

حضرتؒ کی انگریزی تعلیم کی ابتدا تو عربی کے ساتھ ہی ہوگئی تھی اور لکھنؤ میں خلیل الدین صاحب ہنسویؒ سے یہ سلسلہ آہستہ آہستہ جاری تھا، رائے بریلی کے زمانۂ قیام میں بڑے ماموں سید احمد سعید صاحبؒ اس سلسلہ کو جاری رکھتے تھے، جو روز

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۰۸

مرہ کی زبان اور محاورات پر بڑے قادر تھے۔ پھر جب دار العلوم میں قیام ہوا تو ماسٹر محمد سمیع صدیقی صاحب سے حضرت نے استفادہ فرمایا اور بعد میں محمد الفاروقی صاحب (استاذ شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی) سے باقاعدہ انگریزی پڑھنے کی نوبت آئی۔

فاضل ادب میں نمایاں کامیابی کے بعد حضرتؒ کو میٹرک کر لینے کا خیال ہوا، یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزی تعلیم عروج پر تھی، خاندان میں اسی کا رواج ہو چلا تھا، اور چند ہی روز پہلے حافظ سید اسحاق حسنی صاحب کا آئی سی ایس (I.C.S.) کیلئے انتخاب ہو گیا تھا۔ خلیل عرب صاحبؒ بھی بڑی حد تک اس کی ضرورت وافادیت کے قائل تھے اور چاہتے تھے کہ عربی داں نوجوان انگریزی میں مہارت پیدا کریں، اور اسکے ذریعہ دین کی خدمت اور تبلیغ کریں۔ حضرت فرماتے ہیں:

"یہی زمانہ تھا جب مجھ پر انگریزی پڑھنے کا دورہ پڑا اور اس کا بخار چڑھا، میں نے میٹرک کے کورس کی کتابیں خرید لیں، ریاضی محلہ کے ایک استاد سے پڑھنی شروع کی، انگریزی محمد فاروقی صاحبؒ کے یہاں پڑھنے جاتا تھا، جب وہ لکھنؤ سے منتقل ہو گئے تو میں نے بطور خود مطالعہ کرنا شروع کیا، اور اپنے شوق سے انٹر میڈیٹ کے معیار کی کتابیں (جو اب شاید بی اے کے معیار کی ہونگی) ڈکشنری سے حل کر کے مطالعہ کرنے لگا ابھی امتحان میں بیٹھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والدہ صاحبہؒ کو (غالباً بھائی صاحبؒ کے ذریعہ) میرے اس انہماک کا علم ہوا۔ انھوں نے مجھے بڑے موثر اور دردمندانہ خط لکھے، جن کے کچھ نمونے میں نے انکے تذکرہ "ذکر خیر" میں چند تربیتی خطوط کے عنوان سے دیئے ہیں۔ صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان مردوں پر نظر کرو جنھوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی، ان کے مرتبے کیا تھے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ عبد العزیز صاحبؒ، شاہ عبد القادر صاحبؒ مولوی محمد ابراہیم

صاحبؒ، اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحبؒ اور مولوی محمد امین صاحبؒ، جن کی زندگی اور موت اس وقت قابل رشک ہوئی، کس شان و شوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی، یہ مرتبے کیسے حاصل ہوسکتے ہیں، انگریزی مرتبہ والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں، اور ہوں گے، مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں.......... علی! اگر میرے سو اولادیں ہوتیں تو میں یہی تعلیم دیتی اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں، آمین ثم آمین یارب العالمین۔

والدہ صاحبہؒ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی کا اثر تھا کہ میرا دل اچانک انگریزی کی مزید تعلیم سے اچاٹ ہوگیا، اور میں نے کورس کی ساری کتابیں زبردستی لوگوں کے گلے لگائیں، مگر اس غیر معتدل اور بحرانی مصروفیت کا یہ اثر ہوا کہ اس تھوڑے سے وقت میں میں نے انگریزی کی ضروری استعداد پیدا کرلی، اور میں نے اپنے علمی و تصنیفی کاموں میں، اور بعد میں انگلستان اور امریکہ کے سفر میں اس سے کام لیا، اس کے بعد شاید انگریزی پر محنت کرنے کا موقع نہ ملتا، انگریزی کی اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ میں ان کتابوں کا آسانی سے مطالعہ کرسکا جو اسلامیات کے موضوع پر اور تاریخ پر لکھی گئی ہیں اور میں اس سے ابھی تک فائدہ اٹھا رہا ہوں۔"(۱)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں

دارالعلوم سے حضرتؒ کا تعلق خاندانی اور موروثی تھا، والد ماجد اور برادر معظم اسی طرز فکر کے حامل بلکہ داعی تھے، حضرتؒ کی نشو و نما بھی اسی فکر میں ہوئی تھی لیکن باقاعدہ اور براہ راست استفادہ کی نوبت اس وقت آئی جب حضرتؒ نے

(۱) کاروان زندگی ص ۱۲۱ تا ۱۲۳

دارالعلوم کے قدیم و مقبول استاذ مولانا شبلی صاحب جیراجپوریؒ سے فقہ پڑھنی شروع کی، یہ غالباً ۱۹۲۸ء کے اواخر کی بات ہے، مولانا شبلیؒ حضرتؒ پر بڑے شفیق تھے اور ان کا حضرتؒ کے خاندان سے قدیم تعلق تھا، اس کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے دورانِ درس حضرتؒ سے فرمایا کہ ہمارے علاقہ میں شرک و بدعت نام کی کوئی چیز نہیں ہے، پھر فرمایا جانتے ہو کیوں؟ حضرت نے عرض کیا آپ ہی فرمائیں، تو فرمانے لگے یہ تمہارے بزرگوں حضرت خواجہ احمد صاحبؒ اور مولانا محمد امین صاحبؒ کا فیض ہے۔

حضرت مولانا حیدر حسن خان صاحبؒ کے درس حدیث میں

لاہور سے واپسی پر حضرتؒ باقاعدہ حضرت مولانا حیدر حسن خان صاحبؒ (شیخ الحدیث دارالعلوم) کے درس حدیث کے طالب علم بن گئے۔ یہ سلسلہ جولائی ۱۹۲۹ء سے شروع ہوا، حضرتؒ اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

”میں نے مولانا سے دارالعلوم میں صحیحین (بخاری و مسلم) اور ابوداؤد، ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی، کچھ حصہ بیضاوی کا بھی علیحدہ سے پڑھا، اور کچھ سبق منطق کے بھی مولانا نے اپنے شوق سے پڑھائے۔ دو سال میں نے مولانا کے ساتھ ہی ان کے کمرے میں جو دارالحدیث میں تھا شب و روز قیام کیا، ٹونک کے قدیم خاندانی تعلقات، پھر والد صاحب سے خصوصی تعلق (کہ دونوں ہم استاد اور سہیل یمانیؒ امام حدیث شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی بھوپالیؒ کے عزیز شاگرد تھے اور والد صاحبؒ ہی کے طلب و اصرار پر مولانا نے دارالعلوم کی خدمت تدریس قبول کی تھی۔) مجھ پر مربیانہ بلکہ پدرانہ شفقت رکھتے تھے، کھانے پینے میں بھی ساتھ تھا، حساب و کتاب بھی میرے پاس رہتا تھا، آنے جانے میں بھی معیت و ہم رکابی حاصل رہتی تھی، تدریس حدیث کا طرز خالص محدثانہ و محققانہ تھا، محدثین یمن کی

خصوصیات کا حامل، اور شیخ حسین کے درس کا عکس۔ درس میں طالب علموں سے مراجعت و تحقیق، تلاش و جستجو کا پورا کام لیتے تھے ان کو محض سامع نہیں رہنے دیتے تھے، کتابوں میں سے حوالہ نکالنے، کتب رجال اور جرح و تعدیل میں مواد تلاش کرنے، اور مسئلہ لکھنے میں بھی شریک رکھتے، جس سے طلباء کی نظر وسیع اور تجربہ عملی ہوتا، وہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے، نماز میں رقت و خشیت کا غلبہ ہوتا، اور آخر شب میں طویل نوافل اور طویل سجود کا معمول جس میں گریہ غالب ہوتا، زندگی کی سادگی، شاگردوں اور ساتھیوں کے ساتھ مساوات اور ہر کام میں مشارکت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، جس میں افغانی نسل و خون کے علاوہ ٹونک کی معاشرت کو بھی بہت دخل تھا۔ میری حدیث کی تعلیم سر تاپا ان کی شفقت اور مہارت فن کی رہین منت ہے۔ مولاناؒ عام طور پر جن فضلاء کو حدیث کی سند عنایت فرماتے، اس کی کتابت اپنے کسی خوشخط شاگرد سے کرواتے اور دستخط فرمادیتے، میں نے بھی یہ خدمت انجام دی، لیکن مجھے سند عطا فرمانے کا ارادہ کیا تو باوجود نقل و کتابت سے عدم مناسبت کے اور اس کے کہ لکھنے میں بہت دیر لگتی تھی، مجھے سند اپنے قلم سے لکھ کر (جس میں غالباً پورا دن لگ گیا) عنایت فرمائی، جو شفقت خاص اور عنایت خاص کی دلیل تھی، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔"(۱)

مولانا کو حضرتؒ سے غایت درجہ تعلق تھا، مولانا احمد علی صاحبؒ کے درس میں شرکت کے لئے جب حضرت لاہور جانے لگے تو مولانا فرط محبت میں فرمانے لگے "میاں تم جارہے، میاں تم کو دیر تک دیکھتا رہوں گا۔"

حضرتؒ کے اسی دور کے رفقاء میں مولانا محمد ناظم ندویؒ، مولانا محب اللہ صاحب ندویؒ (سابق مہتمم دارالعلوم)، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی (سابق مہتمم دارالعلوم)، مولانا محمد اویس صاحب ندوی (شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۱۱-۱۱۲

العلماء) ہیں، مولانا سید ابو بکر حسنی بھی اس درس میں شریک رہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرتؒ نے جب ترمذی شریف شروع کی تو ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرت کو وہ قدیم خاندانی نسخہ پڑھنے کے لئے دیا، جو مولانا سید قطب الہدیٰ محدث نے شاہ عبد العزیزؒ کے یہاں نقل کیا تھا اور شاہ صاحب ممدوح کے درس کے کچھ مضامین بھی حاشیہ پر نقل کئے تھے، پھر حضرت کے والد مولانا حکیم سید عبد الحی صاحبؒ نے بھی علامہ حسین عربؒ کے درس میں اسی نسخہ سے پڑھا۔ اور انھوں نے بھی شیخ کے کچھ امالی حاشیہ پر تحریر کئے۔ حضرتؒ نے بھی جب مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ سے اس نسخہ میں پڑھا، تو کچھ افادات حاشیہ پر نقل فرمائے، لیکن بعد میں تواضع غالب ہونے پر حضرتؒ نے اس کو مندمل فرمادیا، کہیں ایک دو جگہ وہ افادات باقی رہ گئے ہیں جو حضرتؒ کے حسن ذوق کا ثبوت ہیں۔

ترمذی شریف کا یہ ایک نادر اور صحیح ترین نسخہ ہے، جو کتب خانہ ندوۃ العلماء میں خاندانی ذخیرہ مخطوطات میں محفوظ ہے، اور اس کے لئے باعث زینت ہے۔

علامہ تقی الدین ہلالیؒ سے زبان وادب کی تکمیل

ستمبر ۱۹۳۰ء کو عربی زبان وادب کے محقق عالم علامہ تقی الدین ہلالیؒ (۱) کی دار العلوم میں آمد ہوئی اور باقاعدہ تدریس کا سلسلہ شروع ہوا، حضرتؒ نے ان سے بھرپور استفادہ کیا، باقاعدہ "دیوانِ نابغہ" ان سے پڑھا اور انکے افادات نوٹ کئے، اس کے علاوہ "شرح شذور الذہب" کے درس میں شرکت کی، ان کی تصنیف کردہ ایک نا تمام تفسیر بھی ان سے پڑھی، لیکن حضرتؒ کو اصل فائدہ ان کی مجلسوں اور علمی افادات سے ہوا، حضرتؒ پر وہ ڈاکٹر صاحبؒ اور عرب صاحبؒ کی وجہ سے بڑی شفقت فرماتے اور خصوصی توجہ دیتے، اسی توجہ کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے ایک

---

(۱) علامہ موصوف عربی زبان کے ان گنے چنے اساتذہ اور فضلاء میں تھے جو سند کا درجہ رکھتے تھے، ان کے امتیاز کیلئے اتنی شہادت کافی ہے کہ جب علامہ رشید رضا اور علامہ امیر شکیب ارسلان کا نحو و عربیت کے کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا، تو ہلالی صاحب کو حکم بناتے۔ (کاروان زندگی اول ص ۱۱۵-۱۱۶)

بنارس، اعظم گڑھ، مئو کے سفر میں حضرت کو اپنا رفیق بنایا۔ اسی سفر میں مبارکپور بھی حاضری ہوئی اور صاحب "تحفة الاحوذی" مولانا عبد الرحمان صاحب مبارکپوریؒ نے حدیث کی سند اور اجازت مرحمت فرمائی۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی تعلیم و تربیت کے خاص انداز اور حضرتؒ کی مضمون نگاری

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحبؒ کو تعلیم و تربیت کا فطری اور خداداد ملکہ عطا فرمایا تھا، شیخ خلیل عربؒ اور علامہ تقی الدین ہلالیؒ جیسے یگانہ روزگار اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ان کو یہ فکر رہتی تھی کہ حضرتؒ عربی مضمون نگاری اور انشاء میں مہارت حاصل کریں، اس سے پہلے ہندوستان میں اس کا کوئی تصور نہ تھا۔ عربی تعلیم محض قرآن و حدیث سمجھنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی لیکن ڈاکٹر صاحبؒ اپنی فراست اور عالم اسلام سے گہری واقفیت کی بنا پر یہ محسوس کر رہے تھے کہ عربوں کو ان ہی کی زبان میں خطاب کرنے اور ان کا منصب یاد دلانے کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ حضرتؒ عالمی سطح پر داعیانہ و مجددانہ کردار ادا کر سکیں، اسی لئے انھوں نے ابتدا ہی سے اس کی کوشش کی، حضرت کی عمر تیرہ یا چودہ سال کی تھی کہ انہیں ام القریٰ کا ایک مضمون ترجمہ کے لئے دیا، اس میں باہر سے آنے والے حجاج کے لئے ہدایتیں تھیں، حضرتؒ نے اس کا ترجمہ کیا، جو اس وقت کے مشہور اخبار "زمیندار" میں ابوالحسن علیؒ پسر مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے نام سے شائع ہوا۔

عربی مضمون نگاری اور انشاء کی پختگی کے لئے ڈاکٹر صاحبؒ نے خاص انداز اپنایا، اور عربی کا پہلا مضمون جو حضرت سید صاحبؒ کے تذکرہ پر مشتمل تھا، ڈاکٹر صاحبؒ کی رہنمائی میں لکھا گیا، اس کا ایک فائدہ عربی تحریر کی مشق کا ہوا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت سید صاحبؒ کی تحریک و دعوت سے واقفیت اور اس سے گہرا تعلق پیدا ہوا، اس کی تفصیل حضرتؒ بیان فرماتے ہیں

''وہ چاہتے تھے کہ میرا حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اور ان کی سیرت و دعوت سے گہرا تعلق پیدا ہوا کہ ہمارے اجداد انہیں کے سلسلہ کے حلقہ بگوش اور اس میں صاحب اجازت تھے، اور ہماری جدی شاخ کا ان سے بہت گہرا ربط تھا، اسی زمانہ میں رسالہ ''توحید'' میں جو مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی کی ادارت میں امرتسر سے نکلتا تھا، مولوی محی الدین صاحب قصوریؒ کا ایک سلسلہ مضامین ''ہندوستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم'' کے نام سے نکلا تھا، جس میں پہلی مرتبہ سید صاحبؒ کی حیات و دعوت کو سلیقہ اور نئے اسلوب کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ یہ پرچہ عم محترم مولوی سید خلیل الدین صاحبؒ کے یہاں آتا تھا، بھائی صاحبؒ نے مجھے اس کے عربی ترجمہ کی ہدایت کی، اور مشورہ دیا کہ پہلے میں تاریخ و سیر کی مستند اور سلیس کتابیں دیکھ لوں، اور ان کی خاص خاص تعبیرات اور مطالب کے طریق ادا جس کی تاریخ اور سوانح میں ضرورت پڑتی ہے، نوٹ کرلوں۔ میں نے اس غرض کے لئے ابن الاثیر کی ''الکامل'' دیکھی، اور خاص خاص الفاظ و محاورے نوٹ کرتا گیا، اس کے بعد مجھے ترجمہ میں بڑی آسانی ہوئی۔

میں نے اس کا ترجمہ تیار کر لیا تھا کہ اسی زمانہ میں شیخ تقی الدین ہلالیؒ تشریف لے آئے، میں نے ان کو دکھایا انھوں نے برائے نام تصحیح کی، اور مجھ سے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارا یہ مقالہ علامہ رشید رضا کو ''المنار'' میں اشاعت کے لئے بھیج دوں، لیکن یاد رکھنا کہ ان کی نظر بڑی خوردہ گیر ہے، اور ان کے یہاں صحت کا معیار بہت بلند ہے۔ اچھے لکھنے والوں کی تحریروں میں وہ سقم نکالتے ہیں۔ میں نے بخوشی اس کو منظور کیا، اور انھوں نے اپنے ایک تعارفی خط کے ساتھ علامہ موصوف کو میرا مقالہ بھیج دیا، انھوں نے نہ صرف اسکو شائع کیا بلکہ لکھا کہ اگر صاحب مقالہ چاہیں تو میں اسکو الگ رسالہ کی شکل میں طبع کر سکتا ہوں

ع کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

اس سے بڑھ کر ایک ہندی نوعمر طالب علم کا کیا اعزاز ہو سکتا تھا کہ اس کا رسالہ علامہ رشید رضا مصر سے شائع کریں، تھوڑے عرصہ میں "ترجمة الامام السيد احمد بن عرفان الشهيد" کے عنوان سے وہ رسالہ چھپ کر آگیا، اور میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی، میری عمر اس وقت سولہ سال کی رہی ہوگی، یہ میری پہلی تصنیف ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر سے شائع ہوئی۔"(۱)

خاندان میں کئی پشتوں سے ایک قیمتی ذخیرہ کتب چلا آرہا تھا، ڈاکٹر صاحبؒ کی بڑی خواہش اور تاکید تھی کہ حضرتؒ اس کی دیکھ بھال کرتے رہیں، تاکہ خاندانی تبرکات اور علمی مطبوعات و مخطوطات سے واقفیت حاصل ہو سکے، والدہ صاحبہؒ نے بھی ڈاکٹر صاحبؒ کے توجہ دلانے سے تاکید فرمائی، ان کتابوں کے رکھنے اٹھانے سے خاندانی ذوق اور اسلاف کی علمی و دینی خدمات سے شناسائی ہوئی اور چونکہ ان کتابوں میں تاریخ ہند، تراجم علماء، اور تذکرہ و سوانح کا بڑا ذخیرہ تھا، اس لئے ان کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی بہت نفع ہوا، اور ہندوستان کی اسلامی و دینی تاریخ سے ذوق و شغف پیدا ہوا۔ اسی ذخیرہ میں سب سے پہلے "مکاتیب مجدد الف ثانی" دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس سے حضرت نے بعد میں بڑا فائدہ اٹھایا۔

ڈاکٹر صاحبؒ حضرتؒ کی تربیت کے لئے نئے نئے طریقے اختیار فرماتے، فاضل ادب کے امتحان میں نمایاں کامیابی ہوئی تو ڈاکٹر صاحبؒ نے بیس روپیہ دیئے کہ حضرتؒ اپنے اساتذہ و رفقاء کی دعوت کر دیں۔ پھر کچھ وقفہ دیکر فرمایا کہ اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں، لوگ ایک وقت کھانا کھالیں گے، اور ذائقہ مل جائیگا۔ اس رقم کو مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ میں بھیج دو کہ ثواب ملے اور حقیقی فائدہ حاصل ہو۔

یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ لکھنؤ کے محلہ کے قریب ہی ایک ڈاکٹر صاحبؒ رہتے تھے، جو طبی سارٹیفکٹ دینے میں بہت فراخ دل اور غیر محتاط تھے۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۱۸-۱۱۹

ایک دن ان پر تنقید ہو رہی تھی، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے بھی اس موضوع سے دلچسپی لی اور ان کے اس طرز عمل پر تنقید کرنے لگا۔ بھائی صاحب نے فوراً مجھے ٹوکا، اور کہا کہ تم بچپن میں ایک مرتبہ بہت سخت بیمار ہو گئے تھے، تو انھوں نے بڑی ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ تمہارا علاج کیا تھا، تم کو اس کا شکر گذار ہونا چاہئے اور ان کے حق میں کلمہ خیر کہنا چاہئے، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔"(۱)

ڈاکٹر صاحب نے اسی زمانہ میں حضرتؒ کو امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابیں پڑھنے کی تاکید کی، حضرتؒ فرماتے تھے کہ بھائی صاحب کے بار بار تاکید کے نتیجہ میں میں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا اور مجھے بڑا فائدہ پہونچا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے ذہن میں بڑی وسعت اور فکر میں عالمیت تھی، عالم اسلام کے حالات سے باخبر رہتے، اور اس کے لئے عربی اخبارات شوق سے منگواتے اور ان کا مطالعہ کرتے۔ حضرتؒ نے بھی ان سے فائدہ اٹھایا۔ ڈاکٹر صاحبؒ اس سلسلہ میں رہنمائی فرماتے، جدید تعبیرات واصطلاحات کی تشریح کرتے، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "میں رفتہ رفتہ ان کو بے تکلف پڑھنے لگا اور مجھے اس سے انشاء و تحریر میں بڑی مدد ملی کہ اخبارات میں تنوع بھی ہوتا ہے اور تکرار بھی۔"(۲)

زندگی کا ایک موڑ

اصلاح وترقی اور تعلق باللہ کا رنگ حضرت پر والدہ کی توجہ ودعا سے ابتدا ہی میں چڑھنے لگا تھا، اور شعور کی منزل کو پہونچتے پہونچتے اس کے اثرات نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگے، پھر خداداد ذہانت نے اس میں چار چاند لگا دیے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر تک اس میں مزید پختگی پیدا ہوئی۔ اس وقت کے حضرت کے رفقاء بیان کرتے ہیں کہ لغویات سے اجتناب اور لایعنی باتوں سے تنفر پیدا ہو گیا تھا، مجلس میں اگر کوئی اس قسم کی بات شروع ہوتی تو حضرتؒ خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ

(۱) ماخوذ از حیات عبدالحی ضمیمہ ص ۲۹۳

(۲) کاروان زندگی اول ص ۱۲۴

جاتے۔ تلاوت سے بڑا شغف پیدا ہو گیا، دیر دیر تک مسجد میں ٹہل ٹہل کر تلاوت میں مشغول رہتے، فنائیت اور انکار ذات کا بھی غلبہ تھا۔ اسی زمانے میں علاقہ والوں کی اصلاح کی بھی فکر ہوئی، اور اسی مقصد کی خاطر عید کے دن عیدگاہ میں حضرتؒ نے تقریر فرمائی یہ حضرتؒ کی پہلی تقریر تھی مگر اس میں ایسی روانی اور اثر انگیزی تھی کہ سامعین کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ بعد میں حضرتؒ نے یادداشت سے وہ تقریر قلمبند فرمائی اور "مسلمانوں پر ایک نظر اور قلب پر تین اثر" کے عنوان سے وہ شائع ہوئی۔ خاندان کے بزرگوں کو حضرتؒ کے اس جذبہ کا احساس بھی تھا اور قدر بھی۔ ۱۹۳۰ء میں جب دائرہ شاہ علم اللہ کے قریبی گاؤں میدان پور میں مسجد کی بنیاد رکھنے کا مسئلہ سامنے آیا، تو اس وقت کے بزرگ خاندان سید خلیل الدین صاحبؒ نے حضرت سے اس کا سنگ بنیاد رکھوایا، جبکہ حضرت کی عمر اس وقت صرف سولہ سال کی تھی۔(۱)

۱۹۳۰ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس رنگ میں مزید پختگی پیدا کر دی، ہوا یہ کہ حضرت کے بڑے بھانجے سید محمود حسن صاحبؒ (برادر اکبر مولانا محمد ثانیؒ و مولانا محمد رابع و مولانا محمد واضح مدظلہما) کو مثانہ میں شدید تکلیف ہوئی، آپریشن کے لئے لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخل کیا گیا۔ حضرتؒ ہی ان کے تیماردار تھے، شب و روز اسپتال میں رہنا ہوا، حضرتؒ اس واقعہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> "رات کو مریض کے پاس ہی رہنا ہوتا تھا، عزیز موصوف سب سے زیادہ مجھ سے مانوس تھا، اس لئے مجھی کو آواز دیتا، اور تکلیف کی شکایت کرتا۔ بعض اوقات رات کا بڑا حصہ جاگنے اور نرسوں کو بلانے میں گذر جاتا، اسپتال کا سارا ماحول، انسان کی کمزوری صحت کی بے وفائی اور زندگی کی بے ثباتی کا

(۱) یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نصف صدی سے زائد گذرنے کے بعد اسی مسجد کی تعمیر جدید کا سنگ بنیاد بھی حضرت ہی نے رکھا، اور مدرسہ ضیاء العلوم کی زیر نگرانی الحمدللہ یہ عالیشان مسجد تیار ہوئی۔

منظر اور قوی دلائل پیش کرتا تھا۔ اس سے طبیعت میں جو ابھی تک لکھنے پڑھنے اور ادبیات سے زیادہ مانوس تھی ایک تغیر پیدا ہوا جس کو انابت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، اس قیام نے جو ایک طرح کا مجاہدہ بھی تھا، ایک خانقاہی ماحول اور بزرگوں کی صحبت کا کام دیا۔ ان سب حالات نے دل و دماغ پر ایک گہرا اثر ڈالا اور اسپتال تیمار دار کیلئے ایک چھوٹا سا دارالشفاء بن گیا۔"(۱)

یہی زمانہ تھا کہ والدہ صاحبہؒ کو آنکھ کے آپریشن کے لئے لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخل کرنا پڑا، ان کی خدمت اور تیمارداری کے لئے حضرتؒ نے وہ پوری مدت اسپتال میں گذاری۔ اسی زمانہ میں "رحمۃ للعالمین" حضرتؒ نے بڑے تاثر کے ساتھ پڑھی اور دل و دماغ پر اس کے نقوش ثبت ہوگئے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ

"اس کا خیال کئے بغیر کہ کالج کے طلباء، پروفیسر اور مریضوں کے تیمار دار کیا رائے قائم کریں گے اور کس نظر سے دیکھیں گے، رحمۃ للعالمین کھولے ہوئے سڑک پر ٹہل ٹہل کر وجد و تاثر کی کیفیت میں پڑھتا تھا، خاص طور پر وہ حصہ جس میں حضرت مصعب بن عمیرؓ اور ان کے پاک نہاد رفقاء کے تبلیغی شغف اور دعوتی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔"(۲)

قدیم مکان میں دوبارہ قیام اور حضرت مدنیؒ سے تعارف و استفادہ

وہ قدیم مکان جس میں حضرتؒ کا بچپن گزرا تھا، اور وہیں والد صاحبؒ کی وفات ہوئی تھی، اہل خاندان کو اس سے ایک جذباتی تعلق تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا مطب جب اچھا چلنے لگا اور اتفاق سے وہ مکان خالی ہوا تو ڈاکٹر صاحبؒ نے اس کو کرایہ پر لے لیا، اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سے بیعت و ارادت کا تعلق قائم کیا اور حضرت مدنیؒ کو ڈاکٹر صاحب سے بہت جلد اتنا تعلق اور اعتماد پیدا ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کا گھر لکھنؤ میں ان کی مستقل فرودگاہ

(۱) کاروان زندگی ص ۱۱۴-۱۱۵ اختصار و معمولی تغیر کے ساتھ۔

(۲) کاروان زندگی اول ص ۲۷۹

بن گیا۔ حضرتؒ اس زمانہ میں اپنے تعلق واستفادہ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"۱۹۲۸ء میں لکھنؤ آل پارٹیز کانفرنس میں مولانا کی زیارت ہوئی تھی۔ اب اس قیام کی وجہ سے جس کی نوبت جلد جلد آتی تھی اور بعض مرتبہ کئی کئی دن قیام رہتا تھا، مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے اور گھر کا سب سے چھوٹا باشعور فرد ہونے کی وجہ سے خدمت کرنے موقع ملا۔ باطنی کمال اور روحانی مرتبے کا ادراک نہ اس وقت تھا، نہ اب ہے، لیکن اتنا یاد ہے کہ مولانا کے آنے سے گھر میں ایک خاص رونق وبرکت محسوس ہوتی تھی جس کو نورانیت سے تعبیر کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ سادے کھانے میں بھی (جس کیلئے مولانا کی بڑی تاکید تھی اور اگر کوئی تکلف کی چیز پکتی تھی تو احتجاج فرماتے تھے) عجیب لذت وذائقہ محسوس ہوتا تھا۔ مولانا بھی مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے تھے۔ اور جیسا کہ ایک مرتبہ بھابھی صاحبہ والدہ عزیزی سید محمد حسنی مرحوم نے ذکر کیا۔ مولانا نے بھائی صاحب کو میرا خاص خیال رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ یہ پہلی دینی روحانی شخصیت تھی جس سے میں متعارف اور متاثر ہوا اور الحمد للہ بعد میں اس میں اضافہ ہی ہوا اور وہ عقیدت ومحبت ابھی تک قائم ہے۔ مجھے یاد ہے کہ یہ تاثر مولانا کی تقریروں یا دوسرے کمالات کی بنا پر نہیں تھا، جس کا اندازہ اس وقت میرے لئے مشکل تھا۔ ان کی شخصیت میں ایسی کشش معلوم ہوتی اور دل اس طرح کھنچتا کہ بے اختیار پاؤں پکڑ لینے اور ہاتھوں کو بوسہ دینے کو جی چاہتا۔ بعد میں جب کچھ عرصہ تک تلمذ اور صحبت کا شرف حاصل ہوا تو اس میں مزید اضافہ اور استحکام پیدا ہوا۔" (۱)

حضرت مولانا احمد علیؒ لاہوری سے تعلق، استفادہ واسترشاد

لاہور کے پہلے سفر میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی زیارت

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۲۴

وملاقات کا اجمالی ذکر آچکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اس کی تفصیل حضرتؒ کی زبانی نقل کر دی جائے۔ فرماتے ہیں:

"یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مولانا احمد علی صاحبؒ کے دیدار سے آنکھیں روشن نہ کرتا، جن کا ذکر خیر عرصہ سے سنتا تھا، اس پر اضافہ یہ ہوا کہ بھائی صاحبؒ نے میرے لاہور پہنچنے پر جو خط پھوپھا صاحب کو لکھا اس میں تاکید کی کہ مجھے مولانا احمد علی صاحبؒ سے ضرور ملایا جائے۔

مئی کی غالباً کوئی آخری تاریخ تھی کہ مولانا سید طلحہ صاحبؒ مجھے مولانا احمد علی صاحبؒ کے پاس لے گئے، میری عمر اس وقت ۱۵-۱۶ کے درمیان رہی ہوگی، میرے تعارف میں وہی باتیں کہی جاتی تھیں، والد صاحب کا نام اور ان سے نسبت فرزندی اور عربی زبان سے مناسبت اور اس میں بے تکلف لکھنے پڑھنے کی صلاحیت جو اس عمر اور زمانہ میں کچھ نئی ہی بات سمجھی جاتی تھی۔ مولانا نے جس شفقت و عنایت کا اظہار فرمایا اس کا مجھے اس وقت تک کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا اور وہ میری توقع اور حیثیت سے زیادہ تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی محبت وعقیدت کا بیج دل کی نرم زمین پر پڑا اور زمین نے اس کو قبول کر لیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ دوسرے یا تیسرے سال کی گرمیوں کی تعطیل میں لاہور پھر اس شوق میں گیا کہ مولانا کے درس قرآن میں شرکت کروں، لیکن معلوم ہوا کہ عربی مدارس کے طلباء اور فضلاء کا باقاعدہ درس جس کو مولانا کے رفقاء وخدام، علماء کلاس کے نام سے یاد کرتے ہیں، رمضان، شوال، ذیقعدہ میں ہوا کرتا ہے۔ لیکن مولانا نے ازراہ شفقت مجھے مستقل وقت دیا اور شروع سے قرآن شریف پڑھانا شروع کیا، اس درس میں صرف میں اور برادر سید احمد الحسنی جو پہلے سے لاہور میں تھے شریک تھے۔ اس درس کا سلسلہ زیادہ دن نہیں رہا، شاید سورہ بقر نصف ہوئی ہوگی کہ لکھنؤ میری واپسی ہو گئی۔ اس درس میں نیز صبح کے عمومی درس میں شرکت سے

اور کوئی فائدہ ہوا ہو یا نہ ہو دینی ذوق ضرور پیدا ہوا۔"(۱)

اگلے سال ۱۹۳۱ء کو حضرت نے پھر سفر کیا اور باقاعدہ "حجۃ اللہ البالغہ" کے درس میں شرکت فرمائی۔ مولانا کے درس کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں:

"مولانا کے درس کے تین اہم بڑے مرکزی مضمون تھے، عقیدہ توحید کی وضاحت جو ہر قسم کے مشرکانہ اثرات و رسوم سے پاک تھی اور جس میں ان کا طرز مولانا اسماعیل شہیدؒ سے بہت ملتا جلتا تھا۔ یہ چونکہ خود اپنے خاندانی مسلک کی ترجمانی اور تائید تھی اس لئے دل نے اس کا خوب ذائقہ لیا اور دماغ نے اس کو پورے طور پر قبول کیا۔ دوسرا مرکزی مضمون اہل اللہ کے موثر اور دل آویز واقعات بالخصوص جب وہ اپنے سلسلے کے مشائخ کا دلنشین و دلپذیر تذکرہ کرتے تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ان کے دل کا ساز چھیڑ دیا ہے، قدرۃً اس کا اثر سننے والوں پر پڑتا تھا اور بجلی کی کرنٹ کی طرح جسم و جان میں دوڑ جاتا تھا۔ تیسرا مرکزی مضمون جذبہ جہاد، بغض فی اللہ کا ہوتا تھا۔"(۲)

خود مولانا کے حال کے بارے میں فرماتے ہیں

"اسی کے ساتھ زیادہ قیام اور قرب کی وجہ سے مولانا کی زاہدانہ اور مجاہدانہ زندگی ہمارے سامنے آئی جس کی نظیر ہم نے کم میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

مولانا کے گھریلو حالات اور ان کے زہد و تقشف، ورع و احتیاط اور قناعت و استغنا کے واقعات ان کے معتمد خاص رفیق زندگی اور انجمن خدام الدین کے سکریٹری خلیفہ شہاب الدین صاحبؒ سے سننے میں آتے تھے جو مجھ پر خصوصی کرم فرمانے لگے تھے۔ خلیفہ صاحب نے بتایا مولانا ہی کے ساتھ ہجرت کی تھی اور کابل و بغداد اہم وہاں سے ترک کئے گئے تھے، وہ مولانا کے محرم راز

(۱) پرانے چراغ جلد اول تذکرہ مولانا احمد علی صاحب لاہوری، ص [illegible]

(۲) پرانے چراغ جلد اول ۱۴۱ ملخصاً

اور خلوت وجلوت کے آشنا تھے، ان ذرائع سے مولانا کی زندگی کے جو حالات، ان کے زہد، ورع، روشن ضمیری، قوتِ ادراک اور باطنی کمالات کا جو اندازہ ہوا اس سے مولانا سے اصلاح وتربیت کے مستقل تعلق کا داعیہ پیدا ہوا اور میں نے ایک دن مولانا سے درخواست کردی۔ مولانا نے فرمایا ابھی میرے شیخ ومرشد حضرت خلیفہ غلام محمد صاحبؒ حیات ہیں میں آپ کو ایک تعارفی خط دے دیتا ہوں آپ دین پور چلے جائیں اور ان سے بیعت ہو جائیں، میرے لئے تعمیر ارشاد کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، سخت گرمی کا زمانہ تھا اور غالباً جون کا مہینہ دین پور، ریاست بھاولپور میں خان پور سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے جو لاہور کراچی لائن کا ایک مشہور اسٹیشن ہے اور تقریباً سندھ کی سرحد پر واقع ہے، میں نے وہاں جانے کا عزم کر لیا۔"(۱)

حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دینپوریؒ سے بیعت

"غرض ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء کے جون کی کوئی تاریخ تھی کہ میں کراچی میل سے خانپور کے لئے روانہ ہوا، ایک رفیق درس اور دوست مولوی محمد موسیٰ سندھی رفیق سفر تھے جو خود بڑے صاحب صلاح اور قوی الاستعداد نوجوان تھے۔ مغرب کو ہم لوگ خان پور پہونچے، وہاں سے دین پور کی طرف روانہ ہوئے۔ غالباً رات ہی کو حضرتؒ کی زیارت ہو گئی، ایسا منور چہرہ غالباً اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا، نہایت کم گو اور کم سخن بزرگ تھے، گفتگو بھی فرماتے تو ٹھیٹھ ریاستی زبان میں جو ملتانی وسندھی کا مجموعہ ہے، اور جس سے میں بالکل نا آشنا تھا۔ دین پور کی دنیا ہی نرالی تھی، وہ صحیح معنی میں دین پور تھا، قادری طریقہ پر ذکر جہر سے مسجد وخانقاہ اور بستی ہر وقت گونجتی رہتی تھی، اگر کوئی کسی کو آواز بھی دیتا تو پکارنے والا بھی اِلا اللہ کہتا اور جواب دینے والا بھی اِلا اللہ سے اسکا جواب دیتا، اس طرح اذان، ذکر جہر اور

(۱) پرانے چراغ، اول ص ۱۴۶

صدائے الا اللہ کے سوا کوئی اور بلند آواز سننے میں نہ آتی، یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں صرف حضرتؒ اور حضرتؒ کے متعلقین آباد تھے، نیم خام پختہ چند مکانات جن کی تعداد شاید ۵-۷ سے زیادہ نہ ہوگی، ایک سادہ سی مسجد، چند خام حجرے ذاکرین کے لئے، کچھ کھجوروں کے درخت جن کو دیکھ کر عرب کے بادیہ کی بستیاں یاد آتی ہیں، آب و ہوا بھی بادیہ عرب سے ملتی جلتی تھی، مقیمین خانقاہ کے لئے ایک لنگر تھا، جس میں خالص سندھی اور بہاولپوری مذاق کا ایسا کھانا تیار ہوتا تھا جو قوت لایموت کا صحیح مصداق تھا، اور ہم اودھ کے نازک مزاج مہمانوں کے لئے اس کا کھانا بڑا مجاہدہ اور امتحان تھا، گرمی شدت کی تھی، دن بھر لو چلتی، رات کسی قدر ٹھنڈی ہوتی۔

یہ تھا دین پور کا نقشہ جہاں عمر میں صرف دو مرتبہ جانا ہوا۔ ایک اسی ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں۔ دوسرے ۱۹۵۸ء یا اس کے بعد خلیفہ صاحبؒ کی وفات کے عرصہ کے بعد ایک شب کیلئے جانا ہوا۔ حضرت خلیفہ صاحبؒ (۱) کی عمر اس وقت بھی ۹۰ سال سے متجاوز تھی، مولانا احمد علی صاحب کا خط آپ کو سنایا گیا جس میں غالباً حضرت سید صاحبؒ کی نسبت سے میرا تعارف تھا۔ حضرت نے سلسلہ میں داخل فرمایا اور ذکر قلبی کی تلقین کی۔" (۲)

حضرتؒ نے یہ واقعہ بھی بارہا سنایا کہ "بیعت کے بعد مجھے کچھ خدمت کرنے کا شوق ہوا، اس وقت چھت کے ان پنکھوں کا رواج تھا جو ہاتھ سے کھینچے جاتے

(۱) حضرت خلیفہ صاحب سلسلہ قادریہ کے نامور مشائخ میں تھے، جمال کا غلبہ تھا، بڑے صاحب سکینت اور تمکین تھے، چہرہ مبارک گلاب کی طرح سرخ اور آفتاب کی طرح پر انوار تھا، معاصر مشائخ ان کے علوئے مرتبت اور قوت نسبت اور بزرگی کے قائل تھے۔ حضرت مدنیؒ کو بھی ان کی طرف سے اجازت تھی، حضرت تھانویؒ سے بھی بڑا ربط و تعلق تھا اور کسی سفر میں وہ کراچی سے واپسی پر خلیفہ صاحب کی زیارت و ملاقات کے لئے دین پور ٹھہرے تھے۔ حضرت رائپوری بھی بڑے احترام و عقیدت سے ان کا نام لیتے تھے۔

(۲) پرانے چراغ ص ۱۴۸ تا ۱۵۰

تھے۔ میں نے وہ کھینچنا شروع کیا، تھوڑی دیر میں احساس ہوا کہ یہ میرے بس سے باہر ہے مگر چونکہ اپنے شوق سے لیا تھا اسلئے نہ ہی وہ چھوڑتے بنتا اور نہ کھینچتے بنتا۔ حضرت خلیفہ صاحبؒ کو غالباً بطریق کشف احساس ہو گیا، انھوں نے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ پانی پلا دو۔ میں پانی لیکر حاضر ہوا حضرت خلیفہ صاحبؒ نے کچھ پانی پیا، بقیہ مجھے دیکر کہا کہ تم پی لو، میں نے وہ پی لیا، اسطرح میں ندامت سے بچ گیا۔"

حضرتؒ تین چار دن دین پور ٹھہر کر لکھنؤ تشریف لے آئے، اس کے بعد حضرت خلیفہ صاحبؒ کا وصال ہو گیا۔ اور حضرتؒ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کو ہی اپنا شیخ و مربی سمجھتے رہے، اور ان سے مراسلت کا سلسلہ بھی جاری رہا، اور تعلق بھی بڑھتا گیا۔

دیوبند کا قیام

۱۹۳۲ء کے کسی قیام میں ایک دن ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرتؒ کو بطور خاص حضرت مدنیؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت مدنیؒ نے کچھ عرصہ کیلئے دیوبند قیام کا مشورہ دیا، اس کی تعمیل میں ربیع الاول یا ربیع الثانی کی کسی تاریخ کو حضرتؒ دیوبند تشریف لے گئے، حضرت مدنیؒ نے اپنا مہمان بنایا(۱)۔ حضرتؒ نے درس میں بھی شرکت فرمائی اور اس کے علاوہ بھی حضرت مدنیؒ سے استفادہ کا سلسلہ جاری رہا، خاص طور سے قرآن مجید کی بعض مشکل آیات کو سمجھنے کے لئے حضرتؒ نے مولانا مدنیؒ سے خصوصی وقت چاہا، مولانا نے جمعہ کا وقت دیا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس سے مولانا کے تدبر قرآن کا اندازہ ہوا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کو جب حضرتؒ کے باقاعدہ قیام کا علم ہوا، تو انھوں نے حضرتؒ

---

(۱) یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب دیوبند میں حضرت مدنیؒ سے ملاقات ہوئی تو حضرت مدنیؒ نے حضرت کو بیعت کرنے کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر پھر خود ہی فرمانے لگے "آپ کسی سے بیعت تو نہیں ہیں؟" حضرت نے فرمایا کہ "حضرت خلیفہ سے بیعت کی ہے" اس پر فرمایا کہ "مجھے ان سے اجازت حاصل ہے۔"

سے دار الاقامہ میں رہنے اور مطبخ سے کھانا جاری کرالینے کی ہدایت کی۔ حضرتؒ نے اجازت چاہی تو حضرت مدنیؒ نے کسی قدر ناگواری اور مجبوری کے ساتھ اجازت دی، لیکن فرمایا ناشتہ ساتھ ہوا کریگا۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے فرزند مولانا حبیب اللہ صاحبؒ بھی اس زمانہ میں دیوبند میں طالب علم تھے، مولانا سے تعلق کی وجہ سے ان سے بھی خاص ربط رہا۔

حضرتؒ نے اسی زمانہ میں مولانا اعزاز علی صاحبؒ (شیخ الادب دار العلوم دیوبند) کے درس "شرح نقایہ" میں بھی شرکت فرمائی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ:

"مجھے اس درس سے بہت فائدہ ہوا، مولانا اس وقت سے مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے تھے اور یہ شفقت اخیر تک قائم رہی، جب میری کتاب مختارات چھپ کر ان کے پاس پہونچی، تو بعض حاضرین مجلس سے بلند الفاظ میں اسکا تعارف اور تعریف فرمائی۔" (۱)

اسی زمانہ قیام میں ایک مرتبہ مولانا انور شاہ صاحبؒ ڈابھیل سے تشریف لائے، ڈاکٹر صاحبؒ نے ان کی زیارت و ملاقات اور سلام پہونچانے کی ہدایت کی تھی۔ حضرت نے سلام پہونچایا تو انھوں نے پہچان لیا، اور خیریت و حالات دریافت کئے۔ دو تین مرتبہ حضرت ان کی عصر کی مجلس میں شریک ہوئے۔ اسی زمانہ قیام میں حضرت نے قاری اصغر علی صاحب سے قرأت حفص بھی پڑھی۔

حضرتؒ دیوبند کے اس قیام کے بارے میں فرماتے ہیں:

"دار العلوم کے اس چار ماہ کے قیام میں میری دلچسپی کا سامان اور میرے انس و عقیدت کا مرکز مولانا مدنیؒ کی ذات تھی اور اصل مناسبت انھیں سے تھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ صبح کبھی اپنے خاص لہجہ میں مجھ سے مخاطب ہوتے اور فرماتے "کہیے مولوی علی میاں صاحب! آج اخبار میں آپ نے

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۳۱

کیا پڑھا؟" تو مجھے دن بھر اس کا مزہ آتا رہتا اور دل مسرت سے معمور بلکہ مخمور رہتا۔ بقول شاعر ؎

بہر تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ جنبش تیرے ابرو میں تھی (۱)

دار العلوم میں امتحانات کی تیاری شروع ہوئی اور کتابیں ختم ہوئیں تو حضرتؒ شعبان ہی میں لکھنؤ واپس ہوئے۔

لاہور کا سفر اور حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے درس کی تکمیل

حضرتؒ نے دیوبند ہی کے قیام میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے درس میں شرکت اور اسکی تکمیل کا ارادہ فرمالیا تھا۔ دیوبند سے واپس ہوتے ہی چند روز قیام کے بعد حضرت لاہور روانہ ہوگئے۔ وہاں قیام کی تفصیل حضرت ہی کے الفاظ میں نقل کی جاتی ہے:

"۱۳۵۱ھ کے شعبان کے آخر یا رمضان کے اوائل میں (۱۹۳۲ء کے غالباً دسمبر میں) میں نے لاہور کے لئے رخت سفر باندھا، اور مدرسہ قاسم العلوم کا باقاعدہ طالب علم بن گیا۔ اس درس میں جس میں پورا قرآن مجید پڑھایا جاتا تھا، صرف مدارس عربیہ کے فارغین یا منتہی طلبہ شریک ہوتے تھے، یہ "علماء کلاس" کہلاتی تھی، آخر شعبان سے شروع ہو کر وسط ذیقعدہ تک اس کا سلسلہ جاری رہتا۔ میں جب پہونچا ہوں تو اس درجہ میں پچاس کے قریب طلبہ تھے، جن میں اکثریت دار العلوم دیوبند کے فضلاء کی تھی۔ انہیں میں ہمارے درس حدیث کے ساتھی مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاریؒ بھی تھے۔ یہ درس بڑی محنت اور قوی حافظہ کا طالب تھا کہ ہر رکوع کا خلاصہ اور اسکا ماخذ تیار کرنا پڑتا تھا، اور نیا درس شروع ہونے سے پہلے پچھلے درس کا

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۳۰

امتحان ہوتا تھا، اور جس کی جس رکوع کی باری آجائے اس کو اس کا خلاصہ مولانا سندھی کے مقرر کیے ہوئے لفظوں میں اور اس کا قرآنی ماخذ سنانا پڑتا تھا۔ میرا حافظہ خاندانی طور پر کمزور ہے، اس لئے مجھے بڑی محنت پڑی، پھر لاہور کی سردی اور میری جسمانی کمزوری، اور ہوسٹل کے بجائے گھر کے کھانے اور زندگی کی عادت۔ لاہور کا قیام اچھا خاصا مجاہدہ تھا لیکن اللہ تعالی نے مدد فرمائی۔ اوائل ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ اور شروع مارچ ۱۹۳۳ء میں امتحان ہوا، مولانا کی دعوت پر خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی دہلی سے کاپیاں جانچنے کے لئے آئے۔ تقدیری بات کہ انھوں نے مجھے سب سے زیادہ نمبر دیے، جو غالباً ۹۰ یا اس سے کچھ اوپر تھے، رفقاء نے جو سب مدارس کے فضلاء تھے ایک احتجاجی جلسہ کیا جس میں ممتحن صاحب پر نمبر دینے میں ناانصافی اور جنبہ داری کا الزام لگایا، اس پر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ نے خود کاپیوں کے دیکھنے کا اعلان کیا۔ قسمت کی بات کہ جب انھوں نے کاپیاں دیکھیں تو سب شرکائے امتحان کے نمبروں میں تھوڑا تھوڑا اضافہ کیا، اور میرے نمبر بڑھا کر ۹۸ کر دیے۔ ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ ۱۲ مارچ ۱۹۳۳ء کو مدرسہ قاسم العلوم میں جو ہم لوگوں کی قیام گاہ تھی اور جو انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ لاہور کے زیر نگرانی و سرپرستی تھا، تقسیم اسناد کا جلسہ منعقد ہوا۔ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ مولانا کی خاص دعوت پر تشریف لائے، اور اپنے دست مبارک سے وہ سند عطا فرمائی جس کا عربی مضمون علامہ سید انور شاہ کشمیری کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ آخر میں خود ان کے مولانا مدنیؒ کے اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ امیر انجمن خدام الدین لاہور کے مبارک دستخط ہیں۔"(۱)

یہاں یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت مدنیؒ جب حضرتؒ کو سند دینے

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۳۲-۱۳۳

لگے اور انھوں نے نمبرات ملاحظہ فرمائے تو اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے "دو نمبر کم کیوں رہ گئے؟"

لاہور کا دوبارہ سفر اور شاہی مسجد میں قیام

۱۹۳۲ء کو غالباً اپریل کے مہینہ میں حضرتؒ نے دوبارہ لاہور کا سفر کیا، یہ سفر حضرت لاہوریؒ کی ہدایت و ایماء پر انکی صحبت و تربیت میں رہنے اور یکسوئی کے ساتھ ذکر و شغل کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ حضرتؒ نے حضرت لاہوریؒ کے ایماء پر ان کے شیخ سے تعلق بیعت تو دوسرے سفر میں ہی قائم فرما لیا تھا اور حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کی توجہ و تربیت کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن باقاعدہ اس کے لئے کچھ عرصہ قیام اور یکسوئی کی نوبت نہیں آسکی تھی۔

لاہور میں پھوپھی صاحبہ موجود تھیں، جو بڑی شفقت فرمانے والی تھیں، لیکن حضرت لاہوریؒ کی ہدایت کے مطابق حضرتؒ نے شاہی مسجد کے ایک حجرہ میں قیام فرمایا، حضرت لاہوریؒ کی یہ بھی ہدایت تھی کہ سوائے ذکر و شغل نوافل اور تلاوت قرآن کے دوسرا کوئی مشغلہ نہ رہے۔ تقریباً تین ماہ حضرتؒ نے اسی طرح گزارے، دن بھر میں صرف ایک سبق حاجی عبدالواحد صاحب کو پڑھاتا ہوتا تھا، جو حضرت لاہوریؒ سے ہی بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے، اس کے سوا سارا وقت ذکر و تلاوت اور نوافل میں گزرتا، یہ پورا وقت بڑی ریاضت و مجاہدہ میں گزرا۔ لق دق مسجد، رات کو ایک دو آدمی آگئے تو آگئے۔ اسی زمانہ کا حضرتؒ یہ واقعہ بھی بیان فرماتے تھے کہ "ایک مرتبہ کوئی مغلوب العقل شخص اندر آگیا میں جب رات کو اٹھا تو وہ مجھ پر حملہ آور ہوا اور میرا ہاتھ اس زور سے پکڑا کہ معلوم ہوتا تھا کہ توڑ دے گا۔ میں بہت گھبرایا کوئی دوسرا ایسا نہیں تھا جو چھڑا سکے۔ اللہ کا فضل ہوا کہ میں اس سے محفوظ رہا۔"

حضرتؒ اسی زمانہ کا یہ عبرت آموز واقعہ بھی بیان فرماتے تھے کہ "ایک

مرتبہ میں رات کو کسی ضرورت سے باہر نکلا تو دیکھا کہ دروازہ پر ایک مضبوط و توانا شخص گھوڑے پر سوار ہے، مجھے دیکھ کر کہنے لگا کہ مولوی جی! یہ بتاؤ کہ کہیں جہاد ہو رہا ہے؟ اس وقت میرے علم میں کہیں باقاعدہ جہاد کی کوئی مہم نہیں چل رہی تھی۔ میں نے کہا کہ میرے علم میں تو نہیں ہے۔ اس پر وہ کہنے لگا میری دادی کہتی تھیں کہ جب تمہارے دادا کا انتقال ہونے لگا تو کلمہ ان کی زبان سے نہیں نکل رہا تھا۔ تو وہ کہنے لگے کہ میں حضرت سید احمد شہید کے خلاف یار محمد خاں کے لشکر میں شامل تھا، یہ اسی کی نحوست ہے۔ میں نے یہ عزم کیا ہے کہ جہاد کرتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر جان دوں گا۔"

حضرت لاہوریؒ کی ہدایت پر حضرتؒ مسلسل تین ماہ اسی ریاضت و مجاہدہ کے ساتھ شاہی مسجد میں مقیم رہے (۱) اور آخر جون تک لکھنؤ واپسی ہوئی۔

(۱) حضرت لاہوریؒ نے حضرتؒ کو یہ بھی ہدایت فرمائی تھی کہ مسجد میں واقع حوض کی منڈیر پر سویا کریں تاکہ غفلت کی نیند نہ آئے۔ ایک عرصہ تک یہ معمول بھی رہا۔

پانچواں باب

دار العلوم ندوۃ العلماء میں باضابطہ تدریس کے دس سال، اس دوران پیش آنے والے اہم حوادث وواقعات اور نصاب تعلیم کی از سر نو ترتیب

دار العلوم ندوۃ العلماء سے باضابطہ تعلق

دار العلوم ندوۃ العلماء سے حضرت کا خاندانی وموروثی تعلق تھا، حضرت کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی تنہا وہ ذات تھی جن پر تمام ذمہ داران ندوہ کا اتفاق ہوا تھا اور وہ تاحیات اس کے ناظم رہے۔ ان کی وفات کے چند ہی سال گزرے تھے کہ اراکین ندوہ کی نظر انتخاب حضرت کے برادر بزرگوار ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ پر پڑی اور وہ ناظم بنائے گئے۔ اس خاندان کا ذہنی وفکری طور پر بھی ندوہ سے گہرا ارتباط وتعلق اور ہم آہنگی تھی۔ حضرت نے تعلیم کی تکمیل بھی دار العلوم ہی میں فرمائی تھی، اور اس وقت دار العلوم کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب حضرت کے بڑے شفیق ومحب استاد تھے۔

۱۹۳۱ کے اواخر میں علامہ تقی الدین ہلالی کی ہمرکابی میں اعظم گڑھ کا سفر ہوا، اور دار المصنفین میں کئی روز قیام کی نوبت آئی۔ اسی زمانہ میں حضرت کو وہاں قیام کرکے کچھ خدمت کرنے کا خیال پیدا ہوا کہ وہاں رہ کر علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سرپرستی میں علمی وتصنیفی کام آسان تھا۔ حضرتؒ نے ہلالی صاحبؒ سے اپنی اس

خواہش کا اظہار بھی فرمایا، لیکن انھوں نے فرمایا کہ "تمہارے لئے دار العلوم زیادہ موزوں جگہ ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ

"اس میں حکمت الٰہی تھی کہ

خواجہ خود روش بندہ پروری داند

مجھے اگر دار المصنفین میں قبول کر لیا جاتا تو میری زندگی کا سانچہ کچھ اور ہوتا اور شاید میری تمام سرگرمیاں اور ٹوٹی پھوٹی صلاحیتیں تصنیف و تالیف کے دائرہ میں محدود رہ جاتیں۔" (۱)

دار المصنفین کے اسی زمانہ قیام میں سید صاحب کو ندوے سے ایک عربی رسالہ کے اجراء کا خیال آیا، ہلالی صاحبؒ سے مشورہ کے بعد اس کا فیصلہ کر لیا گیا، اور ندوہ کے لائق فرزند، ادیب و انشاء پرداز مولانا مسعود عالم ندویؒ کو اس کا مدیر منتخب کیا گیا، حضرتؒ اعزازی طور پر اس کی ادارت میں شریک ہوئے اور اس میں مستقل مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع فرمایا، اس دور کے بعض مضامین اہم اور مشہور عربی رسائل میں بھی شائع ہوئے، اور مشہور عرب اہل قلم اور ادباء نے ان مضامین کو قدر کی نگاہ سے دیکھا، ان میں خاص طور پر استاد محب الدین خطیب نے اپنے رسالہ "الفتح" میں ان کو شائع کیا، اس طرح عالم عربی سے رابطہ قائم ہو گیا۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری تھا اور حضرت آزادانہ طور پر خدمت انجام دے رہے تھے کہ اچانک ایک لطیفہ غیبی پیش آیا اور حضرت کا دار العلوم سے باضابطہ تعلق ہو گیا۔ اس اجمال کی تفصیل حضرت یوں بیان فرماتے ہیں:

"سن ۱۹۳۴ء کی ابتداء میں ہلالی صاحب دار العلوم سے علاحدہ ہو کر زبیر (عراق) چلے گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مسعود صاحب پر یہ جدائی بہت شاق گزری کہ ان کو ابھی فاضل استاد سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا، انھوں نے اس کا عزم کر لیا کہ وہ دار العلوم سے چھٹی لے کر کچھ عرصہ

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۳۶-۱۳۷

کے لئے ہلالی صاحبؒ کے پاس "زبیر" میں قیام کریں گے اور ان سے مزید استفادہ کریں گے۔ میں لاہور میں تھا اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب کی ہدایت کے مطابق شاہی مسجد کے ایک حجرہ میں مقیم تھا کہ اچانک مسعود صاحب کا یہ خط میرے نام آیا، خط پر ۲ محرم ۱۳۵۳ھ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔

"ہلالی صاحب "زبیر" میں قیام پذیر ہیں، میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ ایک سال کے لئے ہو آؤں، ڈاکٹر صاحب راضی ہیں اور پوری تائید کے ساتھ، مسعود صاحب پہلے متامل تھے مگر اب راضی معلوم ہوتے تھے مگر ان کا پہلے مطالبہ یہ ہے کہ علی میاں کو بلا کر "الضیاء" سپرد کر دو، اس کے بعد زخ کر سکتے ہو۔ سید صاحب کو خط لکھا ہے اب صرف ان کے جواب کا انتظار ہے اگر حسب توقع انھوں نے اجازت دے دی تو میرا سفر صرف آپ کے اختیار میں رہے گا، ادارت و ترتیب کا آپ ذمہ لے لیں، دوڑ دھوپ کا کام کوئی صاحب کر لیں گے۔"(۱)

حضرتؒ نے یہ پیش کش قبول فرمالی، مگر اتفاق سے بعض ایسی قانونی رکاوٹیں پیش آئیں کہ مولانا مسعود عالم صاحب ہجرت کر سکے لیکن یہ واقعہ دارالعلوم سے حضرت کے باضابطہ تعلق کی تمہید اور ذریعہ بن گیا۔

مولانا مسعود علی صاحب ندویؒ دارالعلوم کی مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں عرصہ سے دارالعلوم میں مقیم تھے، اللہ نے ان کو بڑی انتظامی صلاحیت عطا فرمائی تھی، وہ چاہتے تھے کہ دارالعلوم کے فارغین میں نوجوان فضلاء کا انتخاب کیا جائے اور تعلیمی و تربیتی اور انتظامی حیثیت سے ایسے افراد مہیا کئے جائیں جو نئے جذبہ اور پورے حوصلے کے ساتھ دارالعلوم کی خدمت کر سکیں، اس سلسلہ میں ان کی نظر جن نوجوان فضلاء پر پڑی ان میں حضرتؒ کی ذات گرامی بھی تھی۔ انھوں نے جلسے

---

(۱) کاروان زندگی اول ۱۳۷-۱۳۸

انتظامی مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۳۲ء میں حضرت کا نام تدریس کے لئے پیش کیا۔ ڈاکٹر
صاحب بھائی ہونے کی وجہ سے خاموش رہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی تائید اور
ارکان کے اتفاق سے یہ تجویز منظور کر لی گئی اور یکم اگست ۱۹۳۲ء سے حضرت کا
بحیثیت استاد تفسیر وادب تقرر ہو گیا۔

ذہنی وفکری ہم آہنگی

حضرت فرماتے ہیں:

"میرا ذہنی سانچہ جس کی تشکیل میں ددھیالی اور ننھیالی اثرات،
خاندانی ماحول اور روایات، تین پشتوں کے تصنیفی اور ادبی ذوق حضرت سید
احمد شہیدؒ کے خاندان وجماعت سے انتساب کے نتیجہ میں قلب ونظر کی
وسعت اور دین کی حمایت وحمیت، پھر سب سے بڑھ کر اپنے برادر بزرگوار
ومربی ومحسن ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب (جنھوں نے قدیم وجدید تعلیم
کی بہترین خصوصیات کو اپنے اندر جذب کیا تھا اور جو مشرقی ومغربی علوم کے
مجمع البحرین تھے جن کے متعلق کہنا صحیح ہوگا "مرج البحرین یلتقیان
بینهما برزخ لا یبغیان" کی صحبت وتربیت نے برابر کا حصہ لیا تھا) اپنی علمی
بے بضاعتی اور کم حیثیتی کے باوجود جو اس سن وسال کا قدرتی تقاضہ بھی تھا،
ندوۃ العلماء کے اس دینی وفکری مزاج اور جس ثقافت کا وہ نمائندہ اور علم
بردار تھا اس سے فطری مناسبت رکھتا تھا، اسلئے انکو اپنے کو اس ماحول میں
فٹ کرنے کے لئے کوئی ذہنی ہجرت اور کوئی طویل سفر کرنا نہیں پڑا، اس کو
محسوس ہوا کہ وہ اپنے ہی گھر کے ایک گوشہ یا ایک کمرہ سے منتقل ہو کر دوسرے
گوشہ اور کمرہ میں آ گیا ہے، اس میں اس بات کو بھی دخل تھا کہ اس کا ذہنی
وعلمی نشو ونما شروع سے ندوہ ہی کے ماحول میں ہوا تھا، اور بچپن ہی سے اس
کے کان میں وہ باتیں پڑی تھیں جو اس کو ندوہ کی تحریک سے واقف اس کے

جلیل القدر بانیوں سے آشنا اور اسکے خیالات سے مانوس کرتی تھیں، اس کے مربی اور ولی نعمت برادر بزرگؒ اس کے محبوب و شفیق استاد شیخ خلیل عربؒ اور اسکی ایک طرح کی ذہنی تربیت کرنے والے اور اسکے ایک دوسرے استاد واتالیق مولانا سید طلحہ صاحبؒ سب ندوہ ہی کے تعلیم یافتہ اور خوشہ چیں تھے۔

ان فکری و علمی مناسبتوں اور قدیم رشتوں کے علاوہ دارالعلوم میں بحیثیت استاد و معلم کے آنے میں اللہ کی یہ بھی بڑی حکمت تھی کہ اس ماحول میں مجھے آزادی سے کام کرنے، اپنی ٹوٹی پھوٹی صلاحیتوں سے کام لینے اور ان کو ترقی دینے کا جو موقع تھا وہ کسی اور درسگاہ میں ملنا مشکل تھا۔ ندوۃ العلماء کے ناظم میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ تھے۔ معتمد تعلیم مولانا سید سلیمان ندویؒ تھے، جو والد صاحب سے تلمذ اور بھائی صاحب سے محبت واتحاد کے رشتہ سے ایک خاندانی بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے مہتمم و شیخ الحدیث میرے شفیق استاد مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ تھے۔ نیابت اہتمام اور دفتر کی سربراہی میرے رفیق درس اور دوست مولانا حافظ محمد عمران خاں ندویؒ کرتے تھے۔ اساتذہ و مدرسین میں متعدد میرے درس کے ساتھی اور دیرینہ دوست ورفیق تھے، مثلاً مولانا مسعود عالم صاحب ندویؒ، مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ، شیخ محمد العربیؒ، کچھ عرصہ کے بعد مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندویؒ، مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندویؒ، اور مولانا اویس صاحب ندویؒ بھی اس گروہ میں آکر شامل ہوگئے۔ اس لئے یہاں تعلیم وتدریس کا فرض انجام دینے، طلبہ سے قریبی رابطہ رکھنے اور اگر کبھی ذہن میں آئے تو کوئی نیا تعلیمی تجربہ کرنے بلکہ نصاب کے بارے میں بھی حقیر معروضات پیش کرنے اور مشورہ دینے میں کوئی انتظامی دِقت اور دفتری اور حاکمانہ رکاوٹ حائل نہیں تھی۔" (۱)

---

(۱) کاروانِ زندگی اوّل ۱۴۴-۱۴۵

تدریس و تعلیم کا آغاز اور دار العلوم میں قیام

تدریس کی ابتداء ہوئی تو حضرت نے باقاعدہ دار العلوم ہی میں قیام پسند فرمایا تاکہ پوری توجہ وانہماک کے ساتھ تدریس و تعلیم میں مشغول ہو سکیں۔ جس کمرہ میں حضرت کا قیام تھا، اس میں مولانا مسعود عالم صاحب ندویؒ بھی مقیم تھے، اس طرح وہ رہائش گاہ بھی تھا اور "الضیاء" کا دفتر بھی۔ مولانا مسعود صاحب اگرچہ دار العلوم میں دوران تعلیم ایک سال آگے تھے لیکن ان سے بڑی ذہنی و فکری مناسبت اور اتحاد تھا۔ پہلے ہی سال حضرتؒ کو درجہ ششم میں ترمذی شریف کا نصف ثانی اور قرآن کے ابتدائی دس پاروں کی تفسیر پڑھانے کے لئے دی گئی، اس کے علاوہ ادب میں دیوان حماسہ کا کچھ حصہ اور خضری کی "تاریخ الامم الاسلامیۃ" اور ابتدائی درجات میں بھی کوئی ایک عربی ریڈر حصہ میں آئی۔

درس تفسیر کی تیاری کے سلسلہ میں حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"میں کتب خانہ سے تفسیر کی قدیم بڑی کتابیں اور اہم بنیادی مآخذ لے آیا، ان میں سے بعض تفسیریں مثلاً "کشاف"، "معالم التنزیل" بغوی و مدارک تقریباً لفظاً لفظاً پڑھیں۔ جدید تفاسیر میں سے "تفسیر المنار" پھر مولانا آزاد کی "ترجمان القرآن" سے پورا استفادہ کیا۔ تدریس اور طلباء کے سوالات کے جواب میں علامہ آلوسی کی "رُوح المعانی" سے سب سے زیادہ مدد لی، جدید معلومات اور تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبد الماجد دریابادیؒ سے خط و کتابت شروع کی اور سوالات کے حل میں ان سے مدد لی، اس کے لئے کئی بار دریاباد حاضر ہوا اور مولانا سے استفادہ کیا۔" (۱)

دار العلوم کا ادبی و فکری رنگ

اس وقت دار العلوم پر ادبی و تاریخی ذوق سایہ فگن تھا۔ اور پورے

(۱) کاروان زندگی اوّل ص ۱۴۷

دار العلوم پر عربی زبان وادب، انشاء وخطابت اور اُردو ادبیات وتاریخ کے مطالعہ کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ اس کے متعدد اسباب تھے، جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ دار العلوم کے ماحول میں سب سے بڑی مثالی شخصیت علامہ شبلی نعمانی کی سمجھی جاتی تھی، انہیں کو دار العلوم کا اصل بانی اور معمار سمجھا جاتا تھا اور طلبہ کے منتہائے پرواز و تخیل میں ان ہی کی ذات لائق تقلید واتباع تھی، اور ہر ذہین طالب علم مصنف، مورخ، ادیب وناقد بننے ہی کا خواب دیکھتا تھا۔ اس کا یہ ایک خوش کن پہلو تھا تو دوسری طرف اس کے بعض بڑے دور رس نقصانات تھے کہ اس وقت کوئی دینی وعوتی فضا نہیں تھی۔ دار العلوم کے داعی اول اور بانی حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے رشتہ بڑی حد تک منقطع ہو چکا تھا، جس کی بے برکتی اور نقصانات ظاہر تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کو بھی اس کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا اور ڈاکٹر صاحبؒ بھی اس صورت حال سے بہت دل گیر تھے۔

دوسری طرف علامہ تقی الدین ہلالی کی آمد سے عربی زبان وادب کا بھی ذوق پیدا ہونے لگا تھا۔ "الضیاء" کے اجراء سے اس میں مزید حرکت پیدا ہوئی، پھر ان فاضل نوجوان اساتذہ کے اثر سے جو براہ راست طلبہ پر اثر انداز تھے اس میں مزید ترقی ہوئی۔ الضیاء کے تبادلہ میں متعدد عربی رسائل آنے لگے، جن میں مصر کا "المنار" و "الفتح" ڈاکٹر احمد حسن زیات کا "الرسالہ" ڈاکٹر احمد امین کا "الثقافہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں:

"اس وقت ہمارا یہ چھوٹا سا کرہ اور محدود ماحول بحر ہند کا ایک عربی جزیرہ بنا ہوا تھا۔" (۱)

اسی زمانہ کا ایک واقعہ بھی حضرت نے تحریر فرمایا ہے جس سے اس وقت زبان وادب کے ذوق پھر اس کی سطح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"اسی زمانہ کا دلچسپ واقعہ ہے کہ انجمن الاصلاح میں عربی کا ایک بڑے

---

(۱) کاروان زندگی اول ۱۳۸

معرکہ کا ادبی مباحثہ ہوا، جس کا موضوع تھا "من هو اكبر رجل في العالم الاسلامي؟!" "عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کون ہے؟" تو عمر مقررین جوش و خروش اور سنجیدگی و اصرار کے ساتھ اس بحث میں حصہ لے رہے تھے گویا عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کا انتخاب اسی وقت کرتا ہے اور اس کے سر پر خلافت یا عظمت کا تاج رکھتا ہے۔ اس بحث میں شام کے ایک اخبار نویس محمود خیر الدین دمشقی بھی (جو ان دنوں آئے ہوئے تھے) شریک تھے۔ مسعود صاحب ؒ کے رجحان اور اس وقت کے صدر اجلاس (راقم سطور) کے فیصلہ نے امیر شکیب ارسلان کا پلڑا بھاری کر دیا اور حاضرین کی اکثریت نے ان کے حق میں فیصلہ کیا، ہم لوگوں نے تازہ اس وقت "حاضر العالم الاسلامي" کا مطالعہ کیا تھا اور "الفتح" میں امیر کے ولولہ انگیز و اسلامی مضامین پڑھتے تھے، اس لئے وہی ہمارے دل و دماغ میں رچے بسے ہوئے تھے۔ اس جلسہ کی صدائے بازگشت مصر میں بھی سنی گئی۔ امیر شکیب ارسلان نے مسعود صاحب کو ذاتی خط لکھا، جس میں اپنے نادیدہ معتقدین کے حسن ظن کا شکریہ ادا کیا، لیکن صفائی سے لکھا کہ یہ جامہ حقیقۃً عصر حاضر کے نامور مجاہد، غازی عبد الکریم الریفی کے قامت بلند پر راست آتا ہے، جنھوں نے اپنی خداداد جنگی قابلیت اور عبقریت سے فرانس اور اسپین کے چھکے چھڑا دیے۔ امیر مرحوم نے اپنی کتاب "السيد رشيد رضا أو إخاء اربعين سنة" (علامہ رشید رضا یا چالیس سال کی اخوت و محبت) میں اس جلسہ کا تذکرہ کیا۔ اس سے ہم لوگوں کی اس وقت کی ذہنی سطح اور ذوق مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔" (۱)

یہ ادبی ذوق زبان پر قدرت و مہارت اور عربی و اردو پر یکساں عبور وہ امتیازات ہیں جو اس وقت دار العلوم کو حاصل تھے، لیکن کوئی ایسی تحریک یا

(۱) پرانے چراغ حصہ اول ص ۲۲۳-۲۲۵

دعوت نہیں تھی جو اس کو بروئے کار لاتی اور ان وسائل کا حصول مقصد کے لئے استعمال ہوتا۔ جزوی طور پر یہ عمل جاری تھا، لیکن اس کو تحریک کی شکل دینے کی ضرورت تھی، اس کے لئے ضروری تھا کہ خالص دینی ماحول پیدا ہو اور دعوتی فضا بنے۔ حضرت نے دارالعلوم کے اس ادبی ماحول میں رہ کر جو فائدہ اٹھایا، اس سے دعوتی میدانوں میں کام لیا۔ فرماتے ہیں :

”اس نظام اور فضا کی بدولت میں مصر و شام کے اہل قلم اور صاحب اسلوب ادیبوں اور اپنا مستقل دبستان فکر رکھنے والے فضلاء و اہل فکر سے اتنا ہی واقف اور مانوس ہو گیا جیسے ہندوستان کے ادباء، شعراء اور ناقدین و مفکرین سے واقف تھا بلکہ بعض خصوصیات کی بنا بر ان غیر ملکی ادیبوں اور اہل فکر و قلم سے اس وقت زیادہ واقف تھا، ہم لوگ بے تکلف ان کے محاسن اور ان کی کمزوریوں اور ذہنی و دینی بے راہ روی پر تبصرہ کرتے تھے اور ان کے درجوں و مراتب کی تعیین کرتے تھے، اس کا فائدہ مجھے پورے طور پر اس وقت محسوس ہوا جب میں ١٩٥١ء میں مصر گیا، وہاں میرے لئے کوئی شخصیت نئی سحر انگیز اور مرعوب کن نہ تھی، نہ مجھے وہاں کسی نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ باہر کے ان ملکوں میں (جن کی تہذیب و ترقی و علم کا طلسم دل و دماغ پر چھایا ہوتا ہے) دین کے ایک داعی اور خادم کے لئے یہ بات بڑی اہمیت وافادیت رکھتی ہے کہ وہاں جانے سے پہلے وہاں کے ادب و انشاء کا تنقیدی مطالعہ کر چکے ہوں اور وہاں کے رگ و ریشہ سے واقف ہو چکے ہوں۔“ (١)

حضرت نے دارالعلوم سے باضابطہ تعلق کے بعد آہستہ آہستہ اپنی اس دعوتی فکر اور جذبہ کو دارالعلوم کی چہار دیواری کے اندر منتقل کرنا شروع کیا۔ پھر معاصر کبار مشائخ کی آمد اور دارالعلوم میں ان کے قیام سے جو فضا قائم ہوئی اس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ صفحات کا موضوع ہوگی۔

---

(١) کاروانِ زندگی اول ١٤٨-١٤٩

رشتۂ ازدواج

دار العلوم کے قیام کے پہلے ہی سال میں حضرتؒ کی شادی حقیقی ماموں زاد بہن سیدہ طیب النساء صاحبہؒ سے ہوئی جو حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی پوتی اور مولانا سید عبدالرزاق کلامی، "صاحب صمصام الاسلام" کی نواسی تھیں، حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ نے نکاح پڑھایا اور ڈاکٹر صاحب نے بڑے اہتمام سے ولیمہ کا انتظام فرمایا۔

تعلیم و تدریس میں حضرتؒ کی دلسوزی اور محنت

عربی زبان وادب حضرت کا خاص موضوع تھا، اس میں یہ بھی اہتمام تھا کہ سبق اس طرح پڑھایا جائے کہ وہ غذا بن جائے اور طلبہ اس سے مانوس ہوں۔ حضرت فرماتے ہیں:

"اس وقت اپنے درجوں کے طلبہ سے ایسا تعلق پیدا ہو گیا تھا جو افادہ واستفادہ کے لئے شرط ہے۔ گھول کر پلادینے کا جذبہ جو اپنے شفیق استاد شیخ خلیل عربؒ سے ملا تھا اس وقت سینہ میں موجزن تھا، ضوابط و قواعد نپے تلے وقت اور مقام کی کوئی قید نہ تھی، طلبہ کو ہر طرح مشق کرانے اور عربی سکھانے کا اہتمام رہتا تھا اس کے لئے ہم لوگ نئے نئے طریقہ اختیار کرتے اور ذہنی اُپج سے کام لیتے تھے۔"(۱)

اسی زمانہ میں استاذ محمد العربیؒ جو شیخ تقی الدین ہلالیؒ کے چھوٹے بھائی تھے اور دار العلوم میں مدرس تھے، حضرت فرماتے ہیں کہ

"ان سے بڑی مدد ملتی تھی، پھر ان ہی کے مشورہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ عربی زبان کی تعلیم کا بطرز مستقیم (Direct Method) کے اصول پر تجربہ کیا جائے۔ طلبہ کی ایک جماعت ہمارے حوالہ کی گئی اور الحمد للہ خاطر خواہ نتائج سامنے آئے۔ اس سے طلبہ کو بھی فائدہ ہوا اور اس سے زیادہ اہم

---

(۱) کاروان زندگی حصہ اول ص ۱۵۱

پڑھانے والوں کو ہوا۔ عربی زبان میں طلاقت وروانی اور بولنے اور تقریر کرنے کی مشق ہوئی جو ان خدمتوں کی بنیاد بنی جو دعوت کے میدان میں فضل خداوندی سے نصیب ہوئیں۔"(۱)

دوسری زیر درس کتابوں میں بھی حضرت کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہوتی کہ طلبہ اصل مضمون سے براہ راست مستفید ہوں۔ ایک درجہ میں منطق پڑھانے کی بھی نوبت آئی۔ فرماتے ہیں "میں اس کی مثالیں روزمرہ کی چیزوں اور مشاہدات سے دیتا تھا"۔

تدریس کے دوسرے ہی سال سے درجہ ہفتم میں تاریخ ادب عربی کا گھنٹہ مستقل حضرت کے حصہ میں آگیا، اور کئی سال احمد حسن زیات کی "تاریخ الادب العربی" پڑھانے کا سلسلہ جاری رہا۔

تدریس کے آخری سالوں میں کئی سال تک بخاری شریف کی کتاب الوحی، کتاب الایمان اور کتاب العلم پڑھائی۔ فرماتے ہیں کہ "اس میں خوب جی لگا"۔ ایک سال کچھ عرصہ تک حجۃ اللہ البالغۃ بھی زیر درس رہی۔

سفر بمبئی اور ڈاکٹر امبیڈکر کو دعوت اسلام

۱۹۳۵ء کے اواخر کی بات ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر کے متعلق یہ شہرت ہوئی کہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے لئے صحیح مذہب کی تلاش میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور عرب صاحب دونوں کا اصل اور فطری ذوق غیر مسلموں میں تبلیغ کا تھا۔ ان کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ بمبئی کا سفر کریں اور ان کو دعوت اسلام دیں۔ تدریس شروع کئے ہوئے حضرت کو ایک ہی سال ہوا تھا اور حضرت کی عمر بھی صرف اکیس سال کی تھی مگر شاید اس وجہ سے کہ حضرت ان دونوں کے مزاج و مذاق سے واقف اور اس درد کے شریک تھے، انھوں نے

---

(۱) کاروان زندگی اول ۱۵۱

حضرت کا انتخاب کیا۔ اکتوبر کی کسی تاریخ میں یہ سفر ہوا۔ اس کی تفصیل حضرت کی زبان ملاحظہ ہو:

"میں نے اس وقت لاہور کے علاوہ کوئی طویل سفر نہیں کیا تھا۔ بمبئی میرے لئے ایک جدید و عظیم اور مولانا دریابادی کی اصطلاح میں "یاجوجی" شہر تھا۔ میں وہاں سوائے شرف الدین کتبی صاحب کے جن کا مکتبہ تیمہ بھنڈی بازار میں عربی کتابوں کا واحد مکتبہ تھا، کسی سے واقف نہ تھا۔ میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی اور مولوی رئیس احمد صاحب جعفری عرصہ تک اخبار "خلافت" میں کام کر چکے تھے اور خلافت ہاؤس میں ان کا قیام رہ چکا تھا۔ مولانا عبدالسلام کو جب معلوم ہوا کہ میں بمبئی جا رہا ہوں تو انھوں نے مولانا محمد عرفان صاحب جو آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری اور خلافت ہاؤس کے ناظم اعلیٰ تھے ایک تعارفی خط لکھ دیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت میرے ایک دوست و رفیق مولانا ابراہیم عمادی "خلافت" میں کام کرتے تھے اور خلافت ہاؤس ہی میں مقیم تھے۔ بمبئی پہنچ کر میں سیدھا خلافت ہاؤس پہنچا جو لیمن بائی کلہ میں واقع ہے۔ مولانا عرفان صاحب نے مجھے خلافت ہاؤس میں ٹھہرالیا، اور مولانا عمادی صاحب نے اپنا مہمان بنالیا، لیکن میں جب کسی سے اس مہم کا ذکر کرتا تو اس کو ہنسی آجاتی اور مجھ کو سر سے پاؤں تک دیکھا

ع اس حوصلہ کو دیکھئے اور ان کو دیکھئے

میں نے بڑی احتیاط اور رازداری کے ساتھ ڈاکٹر امبیڈکر کے مکان کا پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ دادر میں ان کا بنگلہ ہے۔ اس وقت بمبئی میں ٹرام چلتی تھی، میں ان دعوتی رسائل کو جو لکھنؤ سے لایا تھا، ساتھ لے کر ٹرام پر سوار ہو گیا اور دادر اتر کر ان کے بنگلہ پر پہنچا۔ صبح ۷-۸ بجے کا وقت ہوگا۔ معلوم ہوا کہ وہ ہوا خوری (Walk) کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ انتظار کے کرہ میں

میں نے دیکھا کہ ملاقات کے لئے آنے والے بہت سے حضرات قطار در قطار بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے سوچا ان اہم ملاقاتیوں اور آنے والوں میں، میں ان کی نظر میں کیا جچوں گا اور وہ کیا میری طرف توجہ کریں گے لیکن میں اللہ کا نام لے کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر میں وہ مکان میں داخل ہوئے، دوہرا بدن، میانہ قد، رنگ کھلتا ہوا، ہاتھ میں چھڑی، مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور مجھے اشارہ کیا کہ آپ آئیے۔ وہ مجھے اوپر لیکر اپنے ریڈنگ روم میں پہنچے اور بیٹھنے کا اشارہ کیا، میں نے دیکھا کہ میز پر جو کتابیں تھیں، ان میں پکتھال صاحب کا "ترجمۃ القرآن" بھی تھا جس میں نشانی رکھی ہوئی تھی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں تک پڑھا ہے۔ میں نے اپنی گفتگو کا نقشہ (پلان) بنالیا تھا۔ میں اپنی حیثیت اور قابلیت سے واقف تھا، اس لئے میں نے طے کر لیا تھا کہ میں ایک سیدھے سادے مسلمان اور خالص داعی کی حیثیت سے صاف صاف گفتگو کروں گا، جس میں کسی سیاسی معاشرتی ترغیب کی آمیزش نہ ہوگی۔ میں نے گفتگو کا آغاز کیا اور کہا ڈاکٹر صاحب! آپ سے مختلف مذاہب کے بڑے بڑے لوگ ملے ہوں گے، انھوں نے اونچی اونچی باتیں کہی ہوں گی، میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی اور اپنی برادری (Community) کی نجات کی فکر ہے اور خلوص کے ساتھ صحیح مذہب کی تلاش ہے تو میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اور اسکے لئے کوئی رشوت یا ترغیب یا لالچ نہیں دیتا۔ پوری گفتگو تو یاد نہیں ہے لیکن گفتگو کی روح اور جان یہی تھی۔ انھوں نے بڑی سنجیدگی اور احترام کے ساتھ میری بات سنی اور جواباً کہا کہ معاملہ بڑا سنجیدہ اور غور طلب ہے۔ میں مطالعہ بھی کر رہا ہوں اور غور بھی، اس کے بعد میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ میں یہ لکھنا بھول گیا کہ چلتے وقت عرب صاحب نے میرے کان میں کہا تھا کہ اگر بات اس پر آکر رک جائے کہ ہم لوگوں کو رشتہ کون دے گا؟ تو کہہ دینا کہ ایک خالص

عربی النسل شریف انصاری خاندان ہے، وہ آپ کو اپنی بیٹی دینے کو تیار ہے۔ اور میں تم کو اجازت دیتا ہوں کہ تم میری طرف سے وعدہ کر لینا۔ مجھے یاد ہے کہ عرب صاحب نے بڑے رقت انگیز طریقہ پر یہ بات کہی تھی اور وہ اس کے لئے ضرور تیار ہو جاتے۔ میں نے جب دیکھا اب مزید گفتگو کی گنجائش نہیں تو وہ انگریزی لٹریچر پیش کیا اور ان سے درخواست کی کہ اس کا مطالعہ ضرور کر لیں۔ انھوں نے مجھے احترام کے ساتھ رخصت کیا، اور میں چلا آیا۔ اب یہ تقدیری بات ہے 'إنك لا تهدي من أحببت و لكن الله يهدي من يشاء' کی تفسیر معلوم ہوتی ہے کہ اس اعلان کے بعد انھوں نے اپنی اور اپنی کمیونٹی کے لئے بودھ مت کا انتخاب کیا۔ غالباً ان کو اپنی زندگی ہی میں اپنی اس انتخاب کی غلطی اور ''کوہ کندن و کاہ بر آوردن'' کے انجام کا احساس ہو گیا۔ اور اگر ان کو نہیں ہوا تو ان کی (Community) اور پڑھے لکھے صاحب فکر اچھوتوں کو اب شدت سے یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ اس تبدیلی سے ان کی تقدیر نہیں بدلی، جیسا کہ مسٹر V.T. Rajshekar کی کتاب Ambedkar and His Conversion کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے۔''(۱)

حضرت کا بمبئی میں مزید ہفتہ عشرہ قیام رہا لیکن اچانک ملیریا نے حملہ کیا اور بخار کا سلسلہ شروع ہو گیا اور لوگوں کی رائے وطن واپسی کی ہوئی۔ حضرت فرماتے ہیں:

''لکھنؤ پہنچ کر دو اطلاعیں ملیں: ایک بڑی خوش کن اور مسرت افزا اور ایک غم آگیں اور افسوسناک۔ خوش کن اطلاع تو برادر زادۂ عزیز محمد الحسنی کی ولادت کی خبر تھی، میرے لکھنؤ پہنچنے سے پانچ ہی سات روز پہلے ۱۵/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ان کی ولادت ہوئی۔ افسوسناک خبر میرے حقیقی ماموں

(۱) تلخیص از کاروان زندگی اول ص ۱۵۶-۱۶۰

زاد بھائی سید محمد مصطفیٰ مرحوم کی اچانک وفات جو غالباً سانپ کے کاٹنے سے ہوئی تھی، وہ مجھ سے تین چار سال بڑے تھے اور حقیقی بھائیوں کی طرح ہم لوگ ساتھ رہے اور کھیلے تھے۔"(۱)

دواہم واقعات

اکتوبر ۱۹۳۵ء کو علامہ سید سلیمان ندویؒ شدید طور پر علیل ہوئے، اہل تعلق عیادت کے لئے دار المصنفین حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اعظم گڑھ کا اسی لئے سفر کیا اور تشخیص یہ کی کہ سید صاحب کا ذہن مستقل مشغول رہتا ہے اور کسی وقت راحت نہیں ہوتی اس لئے مرض میں تخفیف دشوار ہو رہی ہے۔ یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ اس کی صرف تین شکلیں ہیں، ایک تو یہ کہ شطرنج کھیلیں، دوسرے یہ کہ الیکشن میں کھڑے ہو جائیں اور تیسری شکل یہ ہے کہ شاعری شروع کر دیں تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائیں گے اور ذہن یکسو ہو جائے گا۔ حضرتؒ اور حضرتؒ کے رفقاء مولانا عبد السلام صاحب قدوائی اور مولانا مسعود عالم ندویؒ صاحب بھی حاضر خدمت ہوئے۔

صحت یابی کے بعد جب سید صاحبؒ کی لکھنؤ تشریف آوری ہوئی تو اس تقریب میں دار العلوم میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں شہر کے معززین بھی شریک ہوئے، حضرت نے اساتذہ کی جانب سے سپاس نامہ پیش کیا، جو حضرت کی تحریروں میں ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ اسکے بارے میں حضرت فرماتے ہیں:

"میں نے سپاس نامہ میں اس کی خاص رعایت کی کہ سید صاحب کی تمام اہم تصنیفات کا نام ان کی فہرست پیش کئے بغیر تلمیحات میں آجائے اور اس میں بحمد اللہ کامیاب رہا۔ ان کو خطاب بھی پیرایہ بیان بدل بدل کر کیا گیا۔ سپاس نامہ اب بھی دار المصنفین میں کسی جگہ آویزاں ہے۔"(۲)

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۶۴ (۲) کاروان زندگی اول ص ۱۶۵

۱۹۳۶ء میں علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جبلی منعقد ہوئی۔ ندوہ کے وفد میں حضرت بھی شامل تھے۔ کانفرنس کے روح رواں صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی تھے جو ندوہ اور اہل ندوہ کے بھی سرپرست اور بزرگ تھے۔ حضرت کا یہ علی گڑھ کا پہلا سفر تھا، قیام مولانا ابو بکر صاحب فاروقی (ناظم شعبہ دینیات) کے یہاں ہوا، جن سے پشتوں سے گوناگوں تعلقات تھے۔(۱)

حضرت فرماتے ہیں:

"نواب صدر یار جنگ مرحوم نے جب اس پر شکایت کی اور بزرگانہ عتاب فرمایا کہ میں ان کے یہاں کیوں نہ ٹھہرا، تو میں اخیر میں کچھ وقت کے لئے حبیب منزل چلا گیا۔"(۲)

حضرت کی خاص طور پر شعبہ مدارس کے جلسہ میں شرکت ہوئی جس کی صدارت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرما رہے تھے۔ کاروانِ زندگی میں تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا ابو بکر صاحب کی خیر مقدمی تقریر کا یہ جملہ ابھی تک یاد ہے "ابھی آپ کو نوجوانوں کے چھپے ہوئے ٹخنوں کی شکایت ہے وہ وقت قریب ہے کہ آپ کو نوجوانوں کے کھلے ہوئے گھٹنوں کی شکایت ہوگی۔ ان کا اشارہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب اور اس جدید تہذیب کی طرف تھا جو اس انقلاب کی جلو میں آ رہا تھا"(۳)

حضرت سید احمد شہیدؒ کی ذات سے شغف و تعلق اور سیرت سید احمد شہیدؒ کی تصنیف کا آغاز

خاندان کی نمایاں شخصیات کی امتیازی صفات و خصوصیات کا نسل میں منتقل ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے۔ حضرت کی حیات و شخصیت پر غور کرنے سے اندازہ

(۱) مولانا کے والد مولانا محمد وحید [illegible] حضرت کے نانا حضرت شاہ ضیاء النبی کے مرید [illegible] تھے اور دادا مولانا [illegible] حضرت سید صاحب کے خلفاء میں تھے۔

(۲) کاروانِ زندگی اول ص ۱۹۲ (۳) کاروانِ زندگی اول ص ۱۹۲

ہوتا ہے کہ خاندان کے بزرگوں کے اوصاف و کمالات کو حضرتؒ نے اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ خاندان کی جن شخصیتوں نے حضرتؒ پر گہرے نقوش چھوڑے ان میں سر فہرست حضرت امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کی ذات والا صفات ہے، جس نے ذہنی و فکری طور پر سب سے زیادہ متاثر کیا اور حضرتؒ نے تجدید و اصلاح کی جو کوششیں فرمائیں ان میں اس کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اس خاندان کے وہ بدر کامل ہیں جن کی کرنوں سے ایک عالم ضیاء بار ہوا۔ خاندان میں ان کے حالات و کمالات کا چرچا ہوتا ایک قدرتی امر تھا، پھر حضرت کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اور برادر بزرگوار مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلیؒ کو حضرت سید صاحبؒ سے خصوصی عقیدت و مناسبت تھی۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ کے (دہلی اور اس کے اطراف) کے سفرنامے سے اس عقیدت و محبت بلکہ عشق و وارفتگی کا جابجا اظہار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے بارے میں حضرتؒ سے یہ بارہا سنا کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ بھائی صاحب کو حضرت سید صاحب سے ہی سب سے زیادہ عقیدت ہے۔ حضرت شہیدؒ کا نام بچپن سے ہی حضرت کے کانوں میں پڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی فکر و توجہ سے اس میں جلا پیدا ہوئی اور حضرتؒ کو سید صاحبؒ کی ذات اور انکی سیرت و دعوت سے گہرا تعلق پیدا ہوا۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر صاحب کی تربیت کے خاص انداز اور حضرت کی مضمون نگاری کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ والد ماجد مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ کا سفرنامہ گھر کی کتاب تھی جو ایک قلمی رسالہ کی شکل میں ان کے مسودات میں محفوظ تھی اس کا نام انھوں نے "ارمغان احباب" رکھا تھا۔ جو بعد میں "دہلی اور اسکے اطراف" کے نام سے شائع ہوئی۔ اسکے مطالعہ نے گہرا اثر ڈالا۔ حضرتؒ خود تحریر فرماتے ہیں کہ "مجھے سب سے زیادہ جس تحریر نے سید صاحب کی شخصیت سے متعارف اور متاثر کیا وہ یہی روزنامچہ یا سفرنامہ ہے۔"(۱)

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۶۷

بالآخر وہ زمانہ اور مبارک موقع بھی آیا جو حضرتؒ کے الفاظ میں زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ایک نئے اور مبارک دور کا آغاز۔ ۱۹۳۶ء کی گرمیوں کی تعطیل میں حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب کی دعوت پر ٹونک کا سفر ہوا۔ ٹونک سے خاندان کے قریبی روابط تھے، اعزہ کی بڑی تعداد کا وہ مسکن تھا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کے قریبی اہل خاندان اور بقیہ مجاہدین نے اس کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ حضرتؒ نے جس زمانہ میں ٹونک کا سفر کیا اس وقت وہاں حضرت سید صاحبؒ کے حقیقی نواسہ کے صاحبزادہ سید محمد اسمٰعیل صاحب موجود تھے جو حضرت کے رشتہ میں چچا ہوتے تھے۔ دوسرے نواسہ کے صاحبزادہ حافظ سید محمد یونس صاحب کی صاحبزادی بھی وہاں موجود تھیں، جو حضرت کے دوسرے رشتے کے چچا سید عبدالحفیظ صاحب کی اہلیہ تھیں۔ اگرچہ حضرت کا زیادہ تر قیام داعی و میزبان حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کے یہاں رہا، جو بڑے محبت کرنے والے اور شفیق استاد تھے لیکن یہ اعزہ بھی محبت و تعلق میں کم نہ تھے، خاص طور پر اہلیہ سید عبدالحفیظ صاحب نے بزرگانہ شفقت فرمائی۔ حضرتؒ اکثر ان کے یہاں مہمان رہتے، ان ہی کے گھر سے حضرت کو سید صاحبؒ کے حالات و واقعات کا سب سے زیادہ مستند و ضخیم مرقع "وقائع احمدی" کی جلدوں میں ملا۔

وقائع احمدی، سیرت سید احمد شہید کا بڑا ماخذ ثابت ہوئی اور بعد کے ایڈیشن میں اس سے بڑا فائدہ اٹھایا گیا۔ اس کے مطالعہ سے حضرت پر گہرا اثر پڑا۔ اسکے بارے میں حضرتؒ سے راقم نے خود سنا ہے کہ دارالعلوم کے مہمان خانہ میں راتوں کو لالٹین جلا کر میں اس کے مطالعہ میں محو ہو جاتا، بعض بعض مرتبہ معلوم ہوتا تھا کہ رحمت الٰہی کا کوئی جھونکا آیا، رقت طاری ہو جاتی اور خود بخود دعا کے لئے ہاتھ اٹھ جاتے۔ اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی سنایا کہ رائے بریلی کے سفر میں یہ کتاب مطالعہ میں تھی، جب اسٹیشن پر اترا تو سواری والے دریافت کرنے لگے کہاں جاؤ گے ہم پر اتنا گریہ طاری تھا کہ جواب دینا مشکل ہو رہا تھا۔

اسی سفر میں سیرت سید احمد شہیدؒ کی تالیف کا آغاز ہوا۔ اس کا واقعہ خود حضرت کے الفاظ میں نقل کیا جارہا ہے:

"ایک دن جب میں مولانا کے ساتھ دریائے بناس کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا، جہاں سید صاحب" اور ان کے پاکباز مجاہدین نے بارہا وضو کیا ہوگا، صبح کے سہانے وقت طلوع آفتاب سے پہلے ایک پتھر پر بیٹھ کر دریا میں پاؤں ڈال کر "سیرت سید احمد شہید" کا مقدمہ لکھا، جس پر مئی ۱۹۳۶ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے، جو "سید صاحب کی سیرت پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔"(۱)

حضرت سید صاحب کے مجاہدانہ، مجددانہ کارناموں سے حضرت کے تاثر کا اندازہ اس مختصر سے ٹکڑے سے بھی کیا جاسکتا ہے، جو حضرت نے اس وقت تحریر فرمایا تھا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس تحریر کا لکھنے والا کوئی سن رسیدہ پختہ کار مصنف نہیں بلکہ صرف ۲۲ سال کا نوجوان ہے جس نے ابھی تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا ہے، اس سے نو عمر مصنف کے طرز تحریر اور انداز فکر کا بھی اندازہ ہوگا:

"کیفیات ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں لیکن ایمان و یقین اور خلوص و للہیت کی ایسی باد بہاری ہمارے علم میں، کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی۔ نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم و توکل، جوش جہاد، ایمان و احتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے۔ آدم گری، مردم سازی، اصلاح و انقلاب کے ایسے محیر العقول واقعات اصلاح و تربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔"(۲)

حضرت فرماتے ہیں:

"یہ بڑا مبارک آغاز تھا اور اس سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۹۹ (۲) سیرت سید احمد شہید اول ص ۵۲

ہوتا ہے، مجھے خود اندازہ نہ تھا کہ یہ اقدام خود میری زندگی میں انقلاب انگیز بلکہ مبدأ آفریں ثابت ہوگا، اور یہ کتاب ہندوستان میں اتنی مقبول اور دینی حلقہ میں میرے تعارف اور بزرگوں کے یہاں قرب کا ذریعہ بنے گی۔ بقول شاعر

حکایت از قد آں یار دل نواز کنیم

باین بہانہ، مگر عمر خود دراز کنیم"

"تعطیل گرما کے اختتام پر جون کی آخری تاریخوں میں ٹونک سے واپسی ہو گئی۔ راستہ میں مولانا نے ہمیں جے پور اور آمیر (۱) کے قلعہ کی سیر کرائی اور میں سیرت سید احمد شہیدؒ کی تکمیل کا عزم اور تحفہ لے کر لکھنؤ واپس ہوا۔" (۲)

حضرت سید صاحبؒ کی عقیدت و محبت اور عظمت و بزرگی کا جو تخم بچپن میں پڑ گیا تھا وہ برگ و بار لا تا رہا۔ اخلاص و للہیت، دینی حمیت و جوش دعوت، جذبہ اصلاح و تجدید اور امت کا جو درد حضرتؒ کے دل میں تھا اس کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑ گئی تھی، جب حضرت کا سید صاحبؒ کی ذات اور ان کی تحریک اصلاح و تجدید سے تعارف ہوا تھا۔ اس کی تعمیر و ترقی میں اگرچہ بعض دوسرے حضرات کا بھی بڑا حصہ ہے لیکن حضرت سید صاحب کی زندگی اور کارناموں کا جو اثر ابتداء میں حضرت پر پڑا تھا اس کی چھاپ ساری زندگی رہی۔

دار العلوم میں مالی بحران اور اس کیلئے فکر اور بعض اسفار

اس زمانہ میں دار العلوم کی مالی حالت بہت سقیم چل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی نظامت کا دور تھا اسلئے بھی حضرت کو اس کی فکر تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے حکم سے حضرت اور دار العلوم کے بعض اساتذہ لوکو شاپ ریلوے کے دروازے پر جا کر کھڑے ہو جاتے اور جو لوگ ہفتہ کا چھٹا لیکر آتے ان سے چندہ لیتے، کوئی چار آنہ

(۱) راجستھان سے پور کا قدیم پایہ تخت

(۲) کاروان زندگی اول ص ۱۰۸

دیتا تو کوئی آٹھ آنہ، اس پر بھی دو دو، تین تین مہینہ کی تنخواہیں قرض ہو جاتیں۔ اسی ضرورت کے پیش نظر ڈاکٹر صاحبؒ ہی کی ہدایت پر اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کی سرپرستی میں یکم مئی ۱۹۳۷ء کو ایک وفد مدراس کے لئے روانہ ہوا، حضرت بھی اس میں شامل تھے۔ بھوپال، ناگپور ہوتا ہوا یہ وفد مدراس پہنچا۔ ناگپور میں تو کچھ کامیابی ہوئی، لیکن مدراس میں جو اس سفر کی اصل منزل تھی، توقع کے مطابق کامیابی نہ ہوئی اور مختصر قیام کے بعد یہ وفد واپس ہوا۔ حضرت فرماتے ہیں:

"اہل مدراس کو اس وفد کی آمد کا علم زیادہ نہیں ہوا، اور انھوں نے اس کا کچھ زیادہ نوٹس نہیں لیا، افسوس ہے کہ ان کو مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ جیسے جلیل القدر عالم و محدث کے اس شہر میں تشریف لانے کی اہمیت بھی زیادہ معلوم نہیں ہوئی جو اپنی علمی و اخلاقی بلندی اور طویل خدمت حدیث کے علاوہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے براہ راست ارادت و اجازت کی نسبت رکھتے تھے۔" (۱)

حضرت تھانویؒ کی لکھنؤ تشریف آوری اور انکی مجالس میں شرکت

اگست ۱۹۳۸ء کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے، چالیس روز قیام فرمایا، ڈاکٹر صاحب التزاماً ظہر اور عصر بعد کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور حضرت کو بھی پابندی سے اپنے ساتھ لے جاتے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:

"قسمت سے اس وقت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا رسالہ "القول المنصور" زیر طبع تھا، اور مولانا کی توجہ و دلچسپی کا مرکز بنا ہوا تھا، اس میں طویل طویل عربی کی عبارتیں تھیں، وصل بلگرامی صاحب نے اس کی تصحیح و

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۶۳

مقابلہ کا کام میرے سپرد کر دیا، اس تقریب سے مزید قرب و حضوری کا موقع ملا۔"(۱)

۱۰ر ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک عصر بعد ڈاکٹر صاحبؒ سے فرمانے لگے کہ آپ کے گھر جانے کو جی چاہتا ہے۔ پھر مسجد خواص سے پاپیادہ گوئن روڈ ڈاکٹر صاحبؒ کے مکان میں تشریف لائے، مطب میں جو مکان ہی کا ایک حصہ میں تھا، کچھ دیر تشریف رکھ کر اس خصوصیت کا اظہار فرمایا جو سارے علماء و مشائخ دیوبند کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے رہی ہے۔

لاہور کا سفر اور علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات

علامہ اقبال سے تعارف و ملاقات لاہور کے پہلے سفر میں ہو چکی تھی۔ حضرت نے ان کے کلام میں سے "بانگ درا" کا مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کی بعض نظموں کے ترجمے بھی کیے تھے، لیکن جب ان کے دوسرے کلام کے مجموعے نظر سے گزرے تو اس نے گہرا اثر ڈالا اور ادب و شاعری و فکر کے اعتبار سے ان کی شخصیت سے حضرتؒ نے وہ اثر قبول کیا جو کسی معاصر شخصیت کا نہیں کیا تھا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:

"سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا۔ میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہیں تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تسخیر انفس و آفاق کے لئے ابھارتا ہے، جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد ﷺ کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت وابدیت پر ایمان لاتا ہے۔"(۲)

---

(۱) ایضاً ص ۱۷۸ (۲) کاروان زندگی اول ص ۱۷۱

کلام اقبال سے تاثر اور سرشاری کا یہی زمانہ تھا کہ غالباً مدرسۃ البنات جالندھر کی دعوت پر حضرت نے پنجاب کا سفر کیا، اور وہاں سے لاہور تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ پھوپھی صاحبہ اور مولانا طلحہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ایک دن مولانا کی معیت میں علامہ مرحوم سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ اس کی تفصیل حضرت کی زبانی نقل کی جاتی ہے:

"۱۶ر رمضان ۱۳۵۶ھ ۲۲ر نومبر ۱۹۳۷ء کو مولانا سید طلحہ صاحب کی معیت میں علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس موقع پر میرے عزیز بھائی سید ابراہیم حسنی بھی ساتھ تھے، کئی گھنٹے نشست رہی "دل را بہ دل رہیست" معلوم نہیں کیا بات ہے کہ علامہ مرحوم نے غیر معمولی طریقہ پر بڑا وقت دیا، باوجود علالت کے (جو آخری علالت ثابت ہوئی) ان کی طبیعت میں اول سے آخر تک بڑا انبساط اور شگفتگی رہی، ان کو طویل مرض کی نقاہت تھی، اور ان کے خادم خاص علی بخش چاہتے تھے کہ یہ مجلس برخاست ہو اور وہ آرام کریں۔ انھوں نے کئی مرتبہ آکر اس کی درخواست کی مگر ہر مرتبہ علامہ مرحوم نے اس کو نظر انداز کیا اور گفتگو میں منہمک رہے۔ اس موقعہ پر مولانا مدنیؒ کا تذکرہ بھی آیا، میں نے مولانا کی مدافعت اور صفائی میں کچھ عرض کیا، عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو قومیت متحدہ کی تردید میں کچھ عرصہ پہلے اپنے مشہور شعر کہہ چکے تھے، سن کر خاموش ہو گئے اور کوئی لفظ تنقید کا نہیں فرمایا۔ میں نے اس مجلس کی روئداد واپسی پر "عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" لکھ کر جالندھر سے نکلنے والے رسالہ "پیغام" کو دے دی اور وہ اس میں شائع ہوئی، "روائع اقبال" اور اس کے اردو ترجمہ "نقوش اقبال" میں اس کا خلاصہ آگیا ہے۔ آخر میں ہم ہی لوگوں نے مناسب سمجھا کہ اجازت لی جائے اور علامہ کو آرام کا موقع دیا جائے۔ مجھے

اس کے اگلے دن سفر بھی کرنا تھا اور رمضان کا مہینہ تھا۔ ہم لوگ رخصت ہوئے۔ یہ آخری ملاقات تھی، اس ملاقات کے صرف پانچ مہینہ بعد ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو انھوں نے اس دنیا سے رحلت فرمائی۔"(۱)

۱۹۳۸ء کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے پٹنہ کا سفر ہوا، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صادق پور بھی حاضری ہوئی جو حضرت سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ان کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز رہا تھا، اور جس نے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قربانیاں دی تھیں۔ مولانا یحییٰ علی صاحب کے فرزند مولانا محمد موسیٰ صاحب کی بھی زیارت ہوئی۔ اس پورے سفر میں حضرت کے مخلص دوست مولانا مسعود عالم صاحبؒ نے رفاقت اور رہبری فرمائی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیلئے دینیات کی ایک کتاب کی ترتیب اور وہاں قیام

۱۹۳۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے بی۔اے کلاس کے لئے حضرتؒ نے وہاں کے صدر شعبہ دینیات مولانا سلیمان اشرف صاحب کی خواہش پر دینیات کی ایک کتاب تیار فرمائی، مولانا نے کتاب پسند کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کچھ عرصہ کے لئے علی گڑھ قیام ہو جائے تو اس کتاب کے سلسلہ میں کچھ تبادلۂ خیال بھی ہو، اور کہیں ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہو تو وہ کیا جا سکے۔ حضرتؒ نے اس کو منظور فرمایا اور ڈیڑھ دو مہینہ کے لئے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ روزانہ عصر بعد کی مجلس میں اس سلسلہ میں گفتگو ہوتی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں "مجھے ان کے وسیع و طویل تدریسی تجربے انکے گرانقدر مشوروں اور رہنمائی سے بڑا فائدہ ہوا۔"(۲)

اس کتاب کی تیاری پر یونیورسٹی کی طرف سے پانچ سو روپیہ اکرامیہ بھی دیا گیا جو حضرت نے قبول فرمالیا۔ کتاب کی منظوری اور اس کے اکرامیہ پر علامہ سید

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۷۸ (۲) ایضاً ص ۱۸۳

سلیمان ندویؒ نے اپنے دو خطوط میں مکرر مبارکباد دی۔

حضرتؒ اس زمانہ کے طلبہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس وقت احساس یہ ہے کہ طلباء میں تہذیب اور علماء کا احترام تھا، ایسا کم اتفاق ہوا ہوگا کہ مجھے سلام میں سبقت کا موقع ملا ہو۔"(۱)

مسلم لیگ اور خاکسار تحریک کا زور اور حضرتؒ کا اس پر تنقیدی مضمون

اس زمانہ میں مسلم لیگ کی تحریک زور پر تھی، جمعیۃ العلماء اور خاص طور پر حضرت مدنیؒ کے اختلاف کی وجہ سے اس کے اندر علماء کی تحقیر کا پہلو بھی شامل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ حضرت مدنیؒ کے دست گرفتہ اور معتقد تھے، اور پورا گھر جمعیت کا حامی اور موید تھا۔ مزید خاکسار تحریک نے اس میں آگ لگادی تھی، لوگوں کی زبانیں بڑی بے باک ہو گئی تھیں۔ اسی زمانہ میں حضرتؒ نے خاکسار تحریک پر تنقیدی مضمون لکھا، جو الفرقان میں شائع ہوا۔ حضرت مضمون کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے علمی انداز میں اس تحریک کا محاسبہ کیا تھا، اور خوارج اور باطنیوں کی مثال سامنے رکھ کر اس سے اس کا موازنہ کیا تھا اور ثابت کیا تھا کہ محض نظم و اتحاد، جوش و خروش، قربانی، ڈسپلن اور نظام حتی کہ کثرت عبادت بھی (جو خوارج کا طرۂ امتیاز تھا) حقانیت اور مقبولیت عند اللہ کی ضامن نہیں اصل چیز صحت اعتقاد، مقصد کا درست ہونا، اور اتباع شریعت ہے۔"(۲)

سیرت سید احمد شہیدؒ کی طباعت اور اس کی مقبولیت

سیرت سید احمد شہیدؒ کی تصنیف کا آغاز ٹونک کے سفر میں ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۸ء ختم ہو رہا تھا کہ یہ کتاب طباعت کیلئے تیار ہو گئی اور ۱۹۳۹ء کی ابتداء میں شائع ہوئی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس پر دل کھول کر مقدمہ لکھا جس میں سید

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۸۳ (۲) کاروان زندگی اول ص: ۱۸۵

صاحبؒ کی تحریک کا اچھوتے اسلوب میں تعارف کرلیا۔ یہ مقدمہ خود سید صاحب کی تحریروں میں امتیاز رکھتا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں حضرت مدنیؒ اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کے مختصر تاثرات بھی شامل ہیں۔ اس ایڈیشن کو حضرتؒ نے اپنے شفیق ماموں، مولوی حافظ سید عبداللہ صاحبؒ کے نام معنون کیا تھا، جن کی چند مہینہ پہلے وفات ہوئی تھی۔

یہ حضرتؒ کی باقاعدہ پہلی تصنیف تھی، جو منظر عام پر آئی۔ حضرت سید صاحب کی مقبولیت عند اللہ، پھر حضرت کا سوز دروں اور اخلاص کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی، عقیدت وقدر کی نگاہ سے پڑھی گئی، مسجدوں اور مجلسوں میں پڑھ کر سنائی گئی۔ حضرت فرماتے ہیں:

"گمنام و نو عمر مصنف کے نام گہرے تاثر اور اعتراف و تحسین کے ایسے خطوط آئے جو اس کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھے، بعض ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جو اسلام کی مسیحائی سے مایوس اور الحاد و کمیونزم کا شکار ہو گئے تھے، دینی رجحان اور ایمانی شعور کے بیدار ہونے کی اطلاع ملی۔"(۱)

معاصر مشائخ، خاص طور پر مشائخ دیوبند نے اس کو قدر و منزلت اور عقیدت کے ساتھ قبول کیا، اور یہ اس حلقہ میں حضرت کے مزید تعارف و قرب کی ایک تقریب اور ان حضرات کی خصوصی توجہ و التفات کا ایک ذریعہ بن گئی۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ کو اسکا نسخہ ارسال فرمایا تو حضرت تھانویؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

"اس ہدیہ سے قلب پر دو اثر ہوئے، ایک مسرت کا دوسرے ظلمت کا، وہ ظلمت یہ کہ کتاب دیکھ کر اپنی نا کارگی سامنے آجاتی ہے کہ ہم میں نہ ہمت، نہ غیرت، بہائم کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں، بجز خواب و خور کے کوئی شغل نہیں.................. اللہ تعالیٰ اپنے بزرگوں کا اتباع نصیب فرمائے۔"

---

(۱) کاروان زندگی جلد اول ۱۸۹

حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں:

"اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ میں جب ۱۹۴۲ء کے موسم گرما میں تھانہ بھون حاضر ہوا (جب کتاب کی طباعت پر تقریباً ڈھائی تین سال گزر چکے تھے) تو میں نے دیکھا کہ مولانا کے ڈکس پر جو کہ سامنے تھا، اور جس پر آئی ہوئی ڈاک اور لکھنے کے کاغذات رکھے ہوئے تھے "سیرت سید احمد شہید" رکھی ہوئی تھی، چونکہ اس کی جلد پر سونے کی ڈائی تھی اور نام سونے کے پانی کی وجہ سے چمک رہا تھا، اسلئے دیکھنے میں اشتباہ نہ تھا۔

مولانا عبد الباری صاحبؒ لکھنؤ سے حیدر آباد جارہے تھے، میں نے ان کی خدمت میں کتاب پیش کی، ٹرین ہی پر انھوں نے اس کا مطالعہ فرمایا اور حیدر آباد پہونچ کر حسب ذیل مکتوب تحریر فرمایا:

"عثمانیہ کالج ڈاک خانہ لالہ گوڑہ، حیدر آباد دکن

۱۲/مارچ ۳۹ء

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سید صاحبؒ کے حالات میں آپکی کتاب سفر میں ختم کی، بلکہ کہنا چاہئے یہ سفر کاملین ایمان کی مجلس وصحبت میں تھا، اسلام وایمان انہیں بزرگوں کا تھا، باب چہارم پڑھ کر تو یہ سنگ دل بھی اپنی آنکھوں کو خشک نہ رکھ سکا جو ہمیشہ تری کو ترسا کرتی ہیں۔ واقعی مسلمانوں کے اندر ایمان کو زندہ رکھنے کے لئے ایسے ہی احوال وسوانح کی ضرورت ہے۔ فجزاکم اللہ عن المسلمین۔ میرے تو اس یقین کو بھی آپ کی کتاب نے اور مضبوط کردیا کہ مسلمانوں کا کام آج کی انجمن بازیوں اور انجمن سازیوں سے ہرگز نہ چلے گا، اس کا کام کسی سربکف مومن کامل فرد ہی سے چلے گا جسکے گرد خود ہی ہر خدمت وصلاحیت کے مخلصین جمع ہوجائیں گے اور ایمانیوں کی سچی انجمن وہی ہوگی۔"(۱)

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۹۰-۱۹۱

علامہ سید سلیمان ندوی اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

"کتاب ملی، جابجا سے پڑھی، بعض حصہ تو بہت موثر ہے۔ جن کو پڑھ کر آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ آپ کا انداز بیان اور انشاء بھی دلپذیر ہے۔"(١)

سید صاحبؒ کی رفاقت میں ایک تاریخی سفر

حضرتؒ کاروان زندگی میں تحریر فرماتے ہیں :

"سید صاحبؒ کے اس کتاب کا مطالعہ فرمانے، پھر اس پر ذوق و شوق سے مقدمہ لکھنے سے اس کے ناچیز مصنف سے (جس پر محض استاد زادہ اور دار العلوم کے ایک عام مدرس کی حیثیت سے شفقت تھی،) تعلق بہت بڑھ گیا۔ اس تعلق نے اپنے ظہور و ثبوت کے لئے ایک راستہ پیدا کر لیا (جو ایسے موقع پر ہوا کرتا ہے) سید صاحب کو کرنال (مشرقی پنجاب) کے مشہور مدرسہ اسلامیہ کے معاینہ کی دعوت دی گئی تھی، جو چند سال پہلے بڑے عزائم و اعلیٰ مقاصد کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لئے قائم کیا گیا تھا، اور اس کے لئے شمشیر جنگ نواب عظمت علی خاں بہادر کرنالی نے ایک جائداد وقف کی تھی۔ سید صاحب نے مجھے اپنی ہمرکابی اور اس بہانہ سے ازدیاد تعلق و اعتماد علمی و رہنمائی کا شرف بخشا۔ دیباچہ کے ساتھ اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا :

"مارچ کے شروع میں کرنال کے مدرسہ اسلامیہ کے معاینہ کے لئے جانا ہے، آپ بھی چلنے کو تیار رہیے۔"(٢)

پرانے چراغ میں اس سفر کا تذکرہ فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"یہ میرا پہلا سفر تھا جو سید صاحب کی معیت میں ہوا۔ یہ سفر کئی حیثیتوں سے یادگار اور میرے لئے سرمایہ عزت و افتخار تھا۔ سید صاحب کے پایہ کے ایک عالم و محقق و ادیب کی ہمہ وقت صحبت، دینی و علمی مرکزوں کا سفر، تاریخی مقامات اور آثار قدیمہ کی سیر، بڑے بڑے اہل علم و فضل سے

---

(١) کاروان زندگی اول ص ١٩٠ (٢) کاروان زندگی اول ص ١٩١، ١٩٢

ملاقات۔ علمی وادبی مجلسیں ہر حیثیت سے یہ سفر میرے لئے وسیلۂ الظفر بن گیا۔"(۱)

رسالہ "الندوۃ" کا اجراء

رسالۂ الندوۃ دو مرتبہ جاری رہ کر بند ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں سید صاحب نے پھر اسکے اجراء کی تحریک فرمائی۔ اس کی ادارت حضرت اور مولانا عبد السلام قدوائی مرحوم کے سپرد کی گئی اور کچھ ہی عرصہ میں وہ ملک کا ایک سنجیدہ، باوقار، معلومات افزا، فکر انگیز، علمی و دعوتی رسالہ شمار ہونے لگا۔ اسی رسالہ میں حضرت نے مشاہیر اہل علم کی محسن کتابوں کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع فرمایا۔ جس میں اس وقت بعض کبار علماء مشاہیر نے مضامین تحریر کئے۔ افسوس ہے کہ فروری ۱۹۴۲ء میں یہ رسالہ ملک کی ناقدری اور خریداروں کی کمی کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔

۱۹۳۸ء میں مولانا محمد ناظم صاحب ندوی بحیثیت استاد اعلیٰ ادب عربی، دار العلوم تشریف لے آئے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ان سے ایسی رفاقت رہی جو کم دوستوں کے ساتھ رہی ہوگی:

"۱۹۳۹ء کو مولانا شاہ حلیم عطا سلونی کا تقرر بحیثیت استاد حدیث ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے وطن تشریف لے جانے کے بعد وہی شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ حضرت فرماتے ہیں: "وہ سلف کے حافظہ، ذوق علمی اور شوق مطالعہ کی ایک نشانی تھے۔ ہندوستان میں امام ابن تیمیہ، ابن رجب، ابن عبد الہادی اور ابن جوزی کی تصنیفات و تحقیقات پر شائد کسی کی نظر اتنی وسیع اور گہری ہو جیسے ان کی تھی۔ مجھے تدریسی خاص طور پر تحقیق کاموں میں شاہ صاحب سے بڑی مدد اور رہنمائی حاصل ہوئی۔"(۲)

---

(۱) پرانے چراغ اول ص ۴۹ (۲) کاروانِ زندگی اول ص ۱۹۶

عربی زبان وادب کی نئی کتابوں کی ترتیب

ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد میں یہ بات بھی داخل تھی کہ نصاب تعلیم کو زمانہ اور بدلے ہوئے حالات کے جائز اور فطری تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا جائے اور اس میں ایسی تبدیلی کی جاتی رہے جو زمانہ کا ساتھ دے سکے، لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ندوۃ العلماء اپنے ابتدائی دور میں جن ناسازگار حالات سے گذرا، وہ ایسے سخت اور دشوار تھے کہ اس کو اپنی ضرورت کے مطابق جدید نصاب کی تیاری کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کا باقاعدہ آغاز دار العلوم کے ناظم سادس مولانا حکیم سید عبدالعلی صاحب ؒ کے دور میں ہوا جو قدیم وجدید کے سنگم کا بہترین نمونہ تھے، ایک طرف ندوہ اور دیوبند سے فیض یافتہ اور دوسری طرف طب جدید وطب قدیم کے علوم سے آراستہ تھے۔ وہ دور علامہ سید سلیمان ندوی کی معتمدی کا تھا جن کا ان کو پورا تعاون واعتماد حاصل تھا۔ ڈاکٹر صاحب ؒ نے اس سلسلہ کی سب سے پہلے باقاعدہ کوشش فرمائی۔ جسکے نتیجہ میں مصر سے شائع شدہ زبان وادب کی بعض کتابیں داخل نصاب ہوئیں، لیکن ابھی ایسی شدید ضرورت تھی کہ زبان وادب کی ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن سے دینی واخلاقی اثرات بھی مرتب ہوں، اور زبان وادب کی تعلیم بھی ان کے ذریعہ سے دی جا سکے۔ حضرت کو بھی شدت سے اسکا احساس تھا۔

مختارات

۱۹۳۹ء کا قصہ ہے کہ حضرت نے ڈاکٹر صاحب ؒ کی اجازت سے سب سے پہلے "مختارات" کی تالیف فرمائی، جس میں مختلف ادوار میں نثر کے اعلیٰ ادبی نمونوں کو جمع کیا گیا ہے۔ کتاب سید صاحب کی اجازت سے پہلی مرتبہ ۱۹۴۰ء میں چھپی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کو سہولت وصعوبت کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ اس کے متعدد ایڈیشن نکلے اور عالم عربی کی بعض موقر یونیورسٹیوں میں داخل نصاب کی گئی۔ خود سعودی

عرب کی وزارت تعلیم نے کالجوں کے نصاب میں اس کو داخل کیا۔ نامور ادیب و انشاء پرداز شیخ علی طنطاوی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اگر کسی ادیب کے ذوق کی دلیل اس کا انتخاب ہے تو قارئین کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے کچھ عرصہ ہوا ادبی منتخبات اور نمونوں کے مجموعوں کو جمع کیا تاکہ ان میں سے کسی کو ثانویات شرعیہ کے طلباء کے سامنے رکھیں۔ ہماری کمیٹی کے ممبران نے (جو سب ادباء میں سے تھے) علیحدہ علیحدہ تلاش و جستجو شروع کی اور اس موضوع کی کتابوں کا جائزہ لیا، آخر میں ہم سب متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ درسی منتخبات کے مجموعوں میں سب سے بہتر ابوالحسن علی ندوی کا مرتب کردہ مجموعہ "مختارات" ہے جو زبان کی اصناف اور ادب کے متنوع نمونوں کا سب سے جامع مجموعہ ہے۔"(۱)

القراءۃ الراشدۃ اور قصص النبیین

مختارات کی تالیف کے بعد حضرت کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسی عربی ریڈریں تیار کی جائیں، جو ان مصری کتابوں کی جگہ لے سکیں جن پر مصری تہذیب کی چھاپ ہے اور جو اصلاً مصری بچوں کے لئے مرتب کی گئی ہیں۔ اور دوسری طرف کامل کیلانی کی "حکایات للاطفال" کی جگہ جو دینی روح اور اخلاقی تعلیمات سے یکسر خالی ہیں۔ حکایت للاطفال کا ایسا سلسلہ مرتب کیا جائے جو اسکی جگہ داخل نصاب کیا جا سکے اور بچوں کے لاشعور میں ان کے ذہنوں کی دینی آبیاری کر سکے۔ اس کے لئے ایک طرف تو حضرت نے "القراءۃ الراشدۃ" تین حصوں میں تیار فرمائی جس میں یہ التزام کیا گیا کہ کوئی سبق کسی دینی موعظت سے خالی نہ ہو، لیکن اس طرح کہ طالب علم کو یہ محسوس نہ ہو کہ کوئی چیز اوپر سے لادی جا رہی ہے یا کوئی خارجی انجکشن دیا جا رہا ہے۔ اور دوسری طرف "قصص النبیین" کا مبارک سلسلہ

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۱۲-۲۱۳

شروع فرمایا(۱) جس کے تین حصے تو جلدی مکمل ہو گئے، لیکن بعد کے دو حصے کئی سالوں کے بعد تالیف فرمائے۔ یہ دونوں کتابیں داخل نصاب ہو گئیں، اور ہاتھوں ہاتھ لی گئیں لیکن ان میں خاص طور پر "قصص النبیین" کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت عطا فرمائی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:

"یہ کام جو غالباً ۴۲ء سے ۴۳ء کے درمیان شروع ہوا اور اس کا سلسلہ سفر و حضر میں، ریل پر، کسی سڑک کے کنارے سواری کے انتظار میں، لاہور، سوہاوہ اور نظام الدین کے قیام میں تنقل و حرکت اور انتشار کی حالت میں بھی جاری رہا، خدا کی توفیق سے مکمل ہوا۔ اس کو شروع کرنے کے بعد ایسا احساس ہوا کہ خدا نے اس کو میرے لئے ایسا آسان کر دیا ہے کہ قلم برداشتہ بے تکلف اس طرح لکھتا جاتا جیسے باتیں کر رہا ہوں۔"(۲)

مولانا عبدالماجد صاحبؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ اس کتاب کے ذریعہ بچوں کا "علم کلام" تیار ہو گیا۔

عالم عربی میں اس کتاب کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور وہاں کے نصاب میں داخل کی گئی۔

سید قطبؒ نے کھل کر اس کی داد دی اور اس کے امتیاز کو تسلیم کیا۔ وہ لکھتے ہیں

"میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھی ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں اور جن میں انبیاء کرام کے حکایات و قصص بھی شامل ہیں، خود ایک سلسلہ کتب کی ترتیب میں میں نے شرکت کی جو "القصص الدینی للاطفال" کے نام سے مصر میں مرتب ہوا اور جس کا مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا لیکن میں تکلف اور خوشامد کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ "قصص

---

(۱) قصص النبیین کی تالیف میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریک کو بھی بڑا دخل تھا، جنہوں نے بذریعہ مراسلت اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی۔

(۲) کاروان زندگی جلد اول ص ۲۲۱

النبیین للاطفال" کے مصنف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصے کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آگئے ہیں جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔(۱)

"مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی"

درس قرآن کا سلسلہ شروع سے ہی جاری تھا اور کئی سال سے ابتدائی دس پاروں کی تفسیر حضرتؒ کے ذمہ تھی۔ ۴۰-۱۹۳۹ء کا قصہ ہے کہ حضرتؒ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ طلباء مطالعہ قرآن اور اس سے صحیح استفادہ کرنے کے بہت سے مقدمات اور اصول ومبادی سے ناواقف ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ قرآن مجید سے پورا فائدہ نہیں اٹھاپاتے۔ ضرورت ہے کہ ایسے مضامین تیار کئے جائیں جو اس سلسلہ میں معاون ثابت ہوں۔ اس کے لئے حضرتؒ نے ایک سلسلہ مضامین تحریر فرمایا جو قسط وار "الندوہ" میں شائع ہوا اور بعد میں "مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی" کے نام سے یہ کتاب مکتبہ اسلام سے شائع ہوئی۔ اس میں ایسے مضامین ہیں جو قرآن مجید سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے بہت مفید، ضروری اور بصیرت افروز ہیں۔

(۱) مقدمہ قصص النبیین جزء ثالث مطبوعہ دار الکتاب العربی مصر ۱۳۷۲ھ

چھٹا باب

دعوتی واصلاحی کوششوں کا آغاز، دعوتِ فکر ونظر سے لیکر عملی جد وجہد تک

دعوتی واصلاحی فکر

حضرتؒ کے خاندان حسنی وقطبی کی ہزار سالہ تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں اس خاندان میں مصلحین، علماء ومشائخ اور حاملین دعوت پیدا ہوتے رہے۔ اسی خاندان میں حضرت سید احمد شہید جیسا صاحب عزیمت مجدد ومجاہد پیدا ہوا جنکی مجاہدانہ ومجددانہ کوششوں نے کم سے کم بر صغیر میں تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ اخیر دور میں حضرتؒ کے جد مادری حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ نے رائے بریلی اور اس کے قریبی اضلاع میں دعوتی واصلاحی کوششیں فرمائیں اور ان کے فیض یافتہ حضرت مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی کی اصلاحی تحریک سے رائے بریلی سے لے کر جونپور اور اعظم گڑھ تک ایک دینی فضا قائم ہوئی۔ خود حضرت کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی صاحبؒ نے اسی فکر کے نتیجہ میں "انجمن آل ہاشم" کی بنیاد ڈالی تھی جس کا بنیادی مقصد ہی خاندان میں دعوت واصلاح کا کام تھا، اسی کی خاطر انھوں نے تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم سے وابستگی اختیار کی۔ حضرت کے اندر اس کی چنگاریاں موجود تھیں، اور خاندانی وموروثی طور پر انکے اثرات زندگی پر نمایاں تھے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم میں تدریس کے دوران دارالعلوم کی سطح پر وہاں کے طلبہ میں دینی ذوق پیدا کرنے اور ان کی صحیح دینی اور فکری رہنمائی کرنے کا حضرت کو ہمیشہ اہتمام رہا، پوری دلسوزی کے ساتھ اس کی کوششوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن تدریسی دور کے آخری سالوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ اس محنت کے بعد جن نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے وہ سامنے نہیں آتے، اور بڑی حد تک یہ کوششیں نقش بر آب ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں طبیعت لگے بندھے نظام سے عاجز آنے لگی۔ حضرت اس کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں:

"دارالعلوم کی تدریس کے آغاز (۳۴ء سے ۳۹ء) تک میری سب سے بڑی لذت اور دلچسپی طلباء کے پڑھانے، ان میں قرآن مجید اور عربی زبان و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں تھی، ذہین اور ذی استعداد اور سعادت مند طلباء سے ایسا تعلق پیدا ہو جاتا تھا، اور ان کے پڑھنے پڑھانے میں ایسی قلبی مسرت اور روحانی طاقت محسوس ہوتی تھی کہ بڑی تعطیلات کے آنے پر بجائے خوشی کے رنج اور فکر پیدا ہوتی تھی، اور ان کی جدائی کا صدمہ اور طویل خلا کا احساس تکلیف دیتا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ آخری دنوں میں یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ جس دلسوزی اور جانفشانی کے ساتھ تدریس کی خدمت انجام دی جاتی ہے، طلباء کی علمی، اخلاقی و دینی اصلاح و ترقی کی کوشش کی جاتی ہے اور جس طرح سبق بالخصوص قرآن مجید کے درس میں بعض اوقات کلیجہ نکال کر رکھ دیا جاتا ہے، جس طرح خدا کی طرف سے اس کام میں مدد ہوتی ہے اور مضامین کا ورود ہوتا اس کے بقدر طلباء پر (باستثنائے چند) فائدہ مرتب ہوتا نظر نہیں آتا، بعض مرتبہ خیال ہوتا تھا کہ آج کے درس سے شاید در و دیوار پر بھی نشان بن گئے ہوں، لیکن نوجوان طلباء کے دل و دماغ پر اس کے نقوش مرتسم نظر نہیں آتے تھے۔

اس سے ایک طرف یہ احساس بیدار ہونے لگا کہ خارجی ماحول کا فساد، عام فضا میں پھیلے ہوئے انتشار انگیز و تخریبی اثرات (جو مطالعہ کی کتابوں، لٹریچر اور اخبارات، ناولوں اور ترقی پسند لادینی ادب کے ذریعہ آنکھوں اور کانوں کے راستے سے طلباء کے دل و دماغ میں نفوذ کرتے رہتے ہیں) اور جتنی صالح خوراک طلباء کو درجے میں دی جاتی ہے، اس سے کئی گنا انکے اندر مختلف راستوں سے پہونچ جانے والا زہر ان کوششوں کو بار آور نہیں ہونے دیتا۔"(۱)

آغاز تدریس کے تین چار سال بعد ہی حضرتؒ نے بعض ان اہم کتابوں کا مطالعہ فرمایا جن سے فکر و نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور عالم اسلام کے مسائل اور تحریکات سے دلچسپی پیدا ہونا شروع ہوئی، جن میں خاص طور پر "حاضر العالم الاسلامی" اور اس پر امیر شکیب ارسلان کے طاقتور حواشی، عبد الرحمن الکواکبی کی "موتمر أم القری" قابل ذکر ہے۔ ان میں محب الدین الخطیب کے ہفتہ وار رسالہ الفتح کو بھی بڑا دخل ہے جس کے مضامین بڑے طاقت ور اور ولولہ انگیز ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی جنگ آزادی اور سیاسی تحریکات پر لکھی ہوئی کتابوں کا بھی اسی زمانہ میں مطالعہ فرمایا اور بعض ان انگریزی مآخذ کا بھی براہ راست یا ترجمہ کی مدد سے مطالعہ کیا جن کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں کہ

"ان کتابوں نے میرے بعد کی تحریروں اور مضامین کے لئے مستحکم بنیادی اور قیمتی مواد فراہم کیا نیز مغربی تہذیب اور نظام حیات کے تشکیلی عناصر اور پس منظر کو سمجھنے میں مدد دی، ان میں خاص طور پر ڈریپر کی کتاب (Conflict Between Religion & Science) کا ترجمہ "معرکہ مذہب و سائنس" مولانا ظفر علی خاں کے جادو نگار قلم سے، لیکی کی (History of European Morals) کا شستہ و رفتہ ترجمہ مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے قلم سے، گبن (Gibbon) کی شہرۂ آفاق کتاب

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۲۸-۲۲۹

Decline and Fall of Roman Empire کے بعض حصوں کا براہ راست مطالعہ اور ہوفڈنگ کی "تاریخ فلسفہ جدید" پڑھی۔"

مزید فرماتے ہیں :

"اسی زمانہ میں نو مسلم فاضل محمد اسد صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب Islam at the Crossroads تقریباً سبقاً سبقاً پڑھی اور ان کے پر از اعتماد اقدامی طرز تحریر، مغربی تہذیب کے پوسٹ مارٹم اور اسکے اور اسلامی تہذیب کے تضاد، پھر سنت کی طاقتور حمایت سے دل و دماغ متاثر ہوئے۔ ان سب چیزوں نے ذہن کی ساکن فضا پر ایک تموج پیدا کر دیا۔"(۱)

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے تعارف وارتباط اور پنجاب وبلوچستان کا ایک تاریخی سفر

مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ سے حضرتؒ کی سب سے پہلی ملاقات اس زمانہ میں ہوئی جب مولانا دار المبلغین میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حاجی محمد سعید صاحب نصیر آبادی نے جن کا ساتھ دار العلوم دیوبند کے قیام میں رہا تھا ایک دعوت میں مولانا سے ملایا تھا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ "ابتدائی تعارف اور ملاقاتوں کے بعد متعدد مشترک باتوں کی وجہ سے بہت جلد مناسبت و ربط پیدا ہو گیا۔(۲)

اسی زمانہ میں سیرت سید احمد شہیدؒ تازہ تازہ چھپ کر آئی، حضرتؒ نے اس کا ایک نسخہ مولانا کو بھی بھیجا، مولانا نے اس پر بڑے تاثر کا خط لکھا، اس میں یہ بھی لکھا کہ عملی طور پر کچھ کرنے کا ارادہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ حضرت نے اس کا اثبات میں جواب دیا تو مولانا خود رائے بریلی تشریف لائے۔ مولانا اس زمانہ میں چاہتے

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۳۰-۲۳۱ ملخصاً

(۲) کاروان زندگی اول ص ۲۳۴

تھے کہ خاکسار تحریک کے متوازی کوئی ایسی عملی تنظیم بنائی جائے جس سے نوجوانوں کو مربوط کیا جاسکے اور اس طرح خاکسار تحریک کے فتنہ سے لوگوں کو بچایا جاسکے۔ مولاناؒ نے حضرتؒ سے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا اور یہ بھی اصرار کیا کہ حضرت اس کی قیادت قبول فرمائیں، حضرت نے صاف لفظوں میں معذرت فرمائی اور اس کام کے لئے حاجی عبدالواحد صاحب کا نام پیش کیا اور فرمایا کہ

"وہ صاحب عزیمت شخص ہیں، انگریزی پر انہیں پوری قدرت ہے اور ایسی تحریک کے قائد کے لئے اس کی ضرورت بھی ہے، ضروری حد تک دین کا علم رکھتے ہیں، صحیح العقیدہ اور صحیح الفکر شخص ہیں، اپنے بزرگوں سے ان کا تعلق ہے اور عرصہ سے دین وملت کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں، لیکن وہ بلوچستان کے محکمہ تعلیم سے منسلک ہیں اور یہاں سے بہت دور فورٹ سینڈیمن میں ان کا قیام ہے، ان کو آمادہ کرنا ہوگا۔"(۱) مولانا منظور نعمانی صاحبؒ پر اس فکر کا ایسا غلبہ تھا کہ انھوں نے سفر کا ارادہ فرمالیا، اور حضرت کو بھی رفاقت پر آمادہ کرلیا، اگست ۱۹۳۹ء کو روانگی ہوئی، پہلی منزل لاہور تھی، حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے یہاں قیام رہا۔ اسی سفر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ لاہور سے کوئٹہ ہوتے ہوئے فورٹ سینڈیمن پہنچے۔ حاجی عبدالواحد صاحب وہاں ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے، ان سے ملاقات ہوئی، اور یہ طے ہوا کہ پہلے ان مراکز کا دورہ کرلیا جائے جہاں اجتماعی وتنظیمی کام پہلے سے ہورہا ہے، اگر ان میں سے کسی تحریک، دعوت یا تنظیم سے ذوقی اتحاد اور عملی شرکت ممکن ہو، تو اسی کو مفید موثر بنانے کی کوشش کی جائے اور اس کا تعاون کیا جائے۔ اس لئے سہارنپور، رائے پور، دہلی، دیوبند، تھانہ بھون کے مراکز کا دورہ طے کرلیا گیا۔

دینی مرکزوں کا دورہ اور حضرت رائے پوریؒ سے پہلی ملاقات

۱۹۳۹ء کی آخری تاریخوں میں اس تاریخی سفر کا آغاز ہوا۔ سہارنپور اس سفر

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۳۵-۲۳۶

کی پہلی منزل تھی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب تشریف نہیں رکھتے تھے اسلئے کچھ دیر سہارنپور میں مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم کے یہاں قیام کر کے رائے پور روانگی ہوئی۔ حضرت رائے پور حاضری کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"پانچ میل کی مسافت پیادہ پا طے کر ہم لوگ رائے پور کی خانقاہ اس وقت پہنچے جب حضرت کھانے سے فارغ ہو چکے تھے، اور آرام کے لئے تشریف لے جانے والے تھے۔ حضرت نے ہم لوگوں کا پرتپاک خیر مقدم فرمایا اور سابقہ تعارف کے بغیر بڑی گرم جوشی اور بزرگانہ شفقت سے ملے۔ حضرت کے خادم خاص بھائی الطاف کا بیان ہے کہ حضرت نے مجھ سے معانقہ کیا تو فرمایا "میں تو آپ کا منتظر ہی تھا" لیکن یہ بات مجھے یاد نہیں۔ رائے پور میں ایک شب و روز قیام رہا، حضرت نے پوری شفقت اور ذرہ نوازی فرمائی۔ جب ہم لوگوں نے اپنے عزائم کا ذکر کیا تو اپنی معذوری اور ضعیف العمری کے باوجود دعا اور ممکن تعاون کا اطمینان دلایا، یہ بھی فرمایا کہ یہ جگہ بھی حاضر ہے۔ اپنے ایک معتمد خاص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نومسلم رائے پوری سے بھی ملایا جو بعض تنظیمی کوششیں کر چکے تھے لیکن مشورہ دیا کہ پہلے ہم لوگ نظام الدین جا کر حضرت مولانا الیاس صاحب سے ملیں (جن کو حضرت، حضرت دہلوی کے نام سے یاد فرماتے تھے۔) اور ان کے عظیم الشان تبلیغی کام کو دیکھیں اور اگر شرح صدر ہو تو اس میں شریک ہوں۔" (۱)

خانقاہ رائے پور اور حضرت شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری سے اپنے تاثر کا اور ان کے امتیازی وصف کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"شہر سہارن پور سے ۲۰-۲۱ میل کے فاصلہ پر کوہ شوالک کے دامن

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۳۸-۲۳۹

میں رائے پور نامی ایک قصبہ ہے، جو حضرت مولانا شاہ عبد القادر مدظلہ (خلیفہ حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ) کی اقامت گاہ ہے۔ ہم نے ایک دن اور دو راتیں بڑے حظ و کیف کے ساتھ اس گمنام خانقاہ میں گذاریں اور ان زندہ خانقاہوں کا نمونہ دیکھا جو اس عہد انقلاب میں بھی مسلمانوں کے لئے مفید اور بعض دینی و اصلاحی وجوہ سے ضروری ہیں۔ مولانا شاہ عبد القادر صاحب ایک باخبر، روشن ضمیر اور روشن دماغ، جامع عالم اور شیخ طریقت ہیں اور زمانہ حاضر کے ان مخصوص بزرگوں اور روحانی پیشواؤں میں سے ہیں جن کے انفاس و برکات اور رہنمائی کی مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ مولانا کی حالات زمانہ سے مکمل باخبری، سیاسی فہم و فراست، دینی و دنیوی جامعیت اور جذبہ عمل سے اس خانقاہ میں سنوسی خانقاہوں کی جھلک پیدا کر دی ہے اور مولانا کے کریمانہ اخلاق، بزرگانہ شفقت، تواضع اور مسافر نوازی نے مشائخ سلف کے اخلاق کریمانہ کی (جن میں صاحب خلق عظیم کا پرتو ہوتا ہے) یاد تازہ کر دی۔"(۱)

رائے پور سے دہلی کا سفر ہوا، حضرت مولانا الیاسؒ اور ان کی تحریک و دعوت کا تذکرہ پہلے کانوں میں پڑ چکا تھا، اور سفر سے چند ماہ قبل مولانا مودودی نے نظام الدین کے ایک سفر کے بعد "ایک دینی تحریک" کے عنوان سے بڑا طاقتور اور موثر مضمون لکھا تھا، جو ماہ شعبان ۱۳۵۸ھ کے "ترجمان القرآن" میں شائع ہوا تھا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ اس مضمون کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے تھے" اس کے علاوہ بھی بعض قریبی اہل تعلق سے حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کا نام اور ان کی تبلیغی کوششوں کا ذکر آ چکا تھا، جن میں خاص طور پر الحاج سید محمد خلیل صاحب نجہوری قابل ذکر ہیں، جو مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی صاحبؒ کے بڑے عزیز و محب دوست تھے۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۲۰

دہلی پہونچ کر مولانا محمد منظور نعمانیؒ اہلیہ صاحب کی شدید علالت کی وجہ سے بریلی تشریف لے گئے۔ حضرت اور حاجی عبدالواحد صاحب نظام الدین اور میوات حاضر ہوئے۔ مولانا الیاس صاحب سے تعلق اور جماعت سے وابستگی کی تفصیلات انشاء اللہ مستقل باب میں آئیں گی، حضرت کے الفاظ میں وہ ایک مستقل دور کی کہانی اور تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ وہاں سے واپسی پر حضرت نے اپنے ایک مضمون میں جس تاثر کا اظہار فرمایا اس کا ایک اقتباس یہاں پر نقل کیا جاتا ہے:

"اس سفر میں ہم نے جو سب سے حیرت انگیز چیز دیکھی اور جس سے ہم کو لازوال مسرت اور شادمانی حاصل ہوئی وہ میوات کے علاقہ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا تبلیغی کام اور نظام ہے، ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ بیسویں صدی عیسوی کا منظر نہ تھا بلکہ پہلی صدی ہجری کا نقشہ معلوم ہوتا تھا، عہد بعثت کی اصلاح و انقلاب حال اور قرن اول کے نومسلموں کے جوش و جذبہ اور تبلیغ کے ذوق و شوق کے جو قصے ہم نے سیرت اور تاریخ اسلام میں پڑھے تھے۔ گوڑ گانوں کی جامع مسجد اور قصبہ نوح اور شاہ پور کی گلیوں میں اس کا ایک نمونہ دیکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ چشتی درویش، اور مجددی عالم، قدیم غیاث پور (حال بستی نظام الدین) میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اشاعت اسلام اور حضرت مجدد سرہندیؒ اور حضرت شہید رائے بریلویؒ کی حفاظت اسلام کی سنت زندہ کر رہا ہے۔"(۱)

"جماعت اسلامی" میں شرکت اور اس سے علاحدگی

مولانا مودودیؒ سے پہلی ملاقات لاہور کے ایک سفر میں ہو چکی تھی، ان کے مضامین سے واقفیت اور مطالعہ کا سلسلہ بھی ۳۵-۱۹۳۴ء سے جاری تھا۔ حضرتؒ

(۱) کاروان زندگی اول ص ۱۰۳

تحریر فرماتے ہیں کہ "میرے مولانا کی تحریروں اور جماعت کے لٹریچر سے تاثر اور وابستگی کی بنیاد مولانا کے وہ فاضلانہ تنقیدی مضامین تھے جو انھوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات اور موجودہ مادی نقطۂ نظر کے خلاف لکھے تھے۔"

۱۹۴۱ء کی ابتدا میں وہ لکھنؤ تشریف لائے اور دارالعلوم کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی تحریک پر حضرتؒ باقاعدہ رکن بنے اور حلقۂ لکھنؤ کے ذمہ دار قرار پائے۔(۱) اسکے بعد مولانا کا ایک سفر لکھنؤ اور ہوا جس میں انھوں نے حضرت کی خواہش پر دارالعلوم میں "نیا تعلیمی نظام" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ۱۹۴۲ء میں حضرتؒ نے جماعت کے جلسہ عاملہ میں شرکت کے لئے لاہور کا سفر کیا اور اسی سال فروری میں دہلی میں عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں حضرتؒ شریک ہوئے۔ وہاں سے مولانا کے ساتھ ہی حضرت علی گڑھ تشریف لے گئے اور ایک دو روز ساتھ ہی قیام رہا۔ حضرت فرماتے ہیں:

"میں نے یونیورسٹی کے حلقہ میں مولانا کی مقبولیت کا اندازہ کیا جو اس وقت کے حالات اور مسلمان نوجوانوں کی ذہنی بے چینی اور روحانی پیاس کا عین تقاضا تھا۔"(۲)

تقریباً تین سال حضرت باقاعدہ جماعت سے وابستہ رہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ

"اس عرصہ میں میرے اندر تین احساسات پیدا ہوئے جنھوں نے مجھے جماعت سے وابستگی اور انتساب پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کیا۔

ایک یہ کہ میں دیکھتا تھا کہ مولانا کی شخصیت کے بارے میں جماعت کے افراد میں بڑا غلو پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور مفکر، مصنف اور

---

(۱) ڈاکٹر صاحب کو حضرت کی جماعت اسلامی سے وابستگی پر اعتراض شروع سے تھی جس کا اظہار انھوں نے اسی وقت یک خط بلا لیا تھا کہ "مولانا مودودی کی تحریروں میں مجھے تجدد کی بو محسوس ہوتی ہے" اسی لئے علامہ سید سلیمان ندوی کو بھی تردد تھا۔

(۲) کاروان زندگی اول ص ۲۲۳

داعی کے متعلق بلند خیال قائم کرنے، اس پر اعتماد کرنے اور اس کی تحریروں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان میں تنقید کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے اور علماء و دینی حلقوں کے بارے میں ان کی زبانیں بے باک ہو رہی ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ان میں دین کے ذوق و عمل میں کوئی ترقی، اصلاح نفس کا کوئی نمایاں جذبہ اور تعلق مع اللہ میں ترقی کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی تھی۔" (۱)

مزید فرماتے ہیں:

"پھر مولانا الیاس صاحبؒ کی ملاقات، وہاں کی آمد و رفت اور ان کے حالات سے جتنا تاثر بڑھتا گیا جو مجھے مزاج نبوت، سیرت طیبہ اور دین کی دعوت کی روح سے قریب تر نظر آئے، میرے ذہنی کشمکش بڑھتی گئی، یہاں تک کہ خود میں نے اس کی اطلاع مولانا کو دی۔ اور مجھے مولانا نے یکسو ہو جانے کا مشورہ دیا۔"

حضرتؒ مزید فرماتے ہیں: "علاحدگی کے بعد بھی میرے تعلقات دو قدیم شریف دوستوں کے سے تعلقات تھے، جن میں بنیادی خیالات کا اختلاف اور طریق کار کا فرق پایا جاتا تھا۔" (۲)

جامعہ ملیہ میں مذہب و تمدن پر مقالہ

سیرت سید احمد شہید کی طباعت پھر اس کی اشاعت و مقبولیت کے نتیجہ میں کم از کم ہندوستان گیر پیمانہ پر حضرتؒ کی شہرت ہو چکی تھی۔ اس زمانہ کے کبار علماء و

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۲۳-۲۲۲ ملخصاً۔ اس سلسلہ میں حضرتؒ نے "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی جس میں مولانا کی دعوتی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ان کی فکری لغزشوں اور تحریری فروگذاشتوں کو مثبت اور معروضی انداز میں پیش فرمایا ہے۔

(۲) ایضاً ص ۲۲۵ ملخصاً

مشائخ نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اس وقت عمر صرف تیئیس، ستائیس سال کی تھی۔ اس نوعمری میں ایسی محبوبیت شاید ہی کسی کا مقدر رہی ہو۔

اسی مقبولیت وشہرت کا اثر تھا کہ جامعہ ملیہ میں شعبہ دینیات کی طرف سے مقالہ پڑھنے کی پیش کش ہوئی، اور اس کے لئے خود صدر شعبہ مولانا خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے اصرار کے ساتھ دعوت بھیجی جو خود حضرتؒ کے باقاعدہ استاذ بھی رہ چکے تھے۔ ۱۹۴۲ء کا آغاز تھا کہ حضرتؒ نے مذہب وتمدن کے عنوان سے وہاں ایک موقر مجلس میں مقالہ پیش فرمایا۔ یہ مقالہ علمی استقرائی انداز میں لکھا گیا تھا اور مغربی مآخذ کو سامنے رکھ کر اس میں انسانوں کے خود ساختہ تمدنوں کی حقیقت دو، دو چار کی طرح واضح کردی گئی تھی۔ پھر وحی الٰہی سے ماخوذ تمدن وطریقۂ حیات اور انبیاء کرام کی تعلیمات، اسلامی زندگی کی خصوصیات، اور دنیا کے تمدن پر اس کے مثبت اثرات کا ذکر ایسے اسلوب میں کیا گیا تھا جس سے ایک صاحب علم اور صاحب فکر کا متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔

اس موقر مجلس میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے علاوہ متعدد فضلاء ودانشور موجود تھے۔ جلسہ کی صدارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے فرمائی۔

خودداز ضمیر اور حساس دل پر ایک چوٹ

حضرتؒ کی رگوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا خون گردش کررہا تھا۔ انگریزی سامراج اور برطانوی اقتدار سے نفرت اس خاندان کے باحمیت افراد کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی۔ پھر حضرتؒ کے حساس دل اور دوربیں نگاہ نے اس کو دو آتشہ بنادیا تھا۔ عمر کے اس دور میں جس کو مراہقت فکری کا زمانہ کہا جاسکتا ہے، ایسی پالغ نظری، دوراندیشی، تاریخ پر گہری نگاہ اور اس سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت اور حساسیت کو سوائے توفیق الٰہی کے کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا کہ جب ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے "ہندوستان چھوڑو" کا نعرہ دیا اور اس سلسلہ میں صرف

اکثریت ہی کے لوگ سامنے آئے، اور دار ورسن کا نشانہ بنے، جبکہ دوسری طرف مسلمان خاموش تماشائی بنے رہے، برادران وطن کی قربانیوں پر ہنستے اور ان کی مصیبتوں پر خوش ہوتے، تو حضرتؒ کو اس کا شدت سے احساس ہوا کہ مسلمانوں نے آج ملک کی آزادی میں اگر قائدانہ نہیں تو دلیرانہ و مساویانہ کردار ادا نہیں کیا تو کل وہ آزادی کے بعد اس سرزمین پر سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہیں گے۔

حضرت اپنے اس درد کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کے اس طرز عمل سے میرے حساس دل کو چوٹ لگی کہ ہندوستان کی سلطنت انگریزوں نے مسلمانوں سے ہی چھینی تھی، وہی انگریزوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں قائدانہ مقام رکھتے تھے، انہیں کو برطانوی اقتدار اور غلبہ سے (جو ایک جاہلی تہذیب، لادینی نظام تعلیم اور ایسے مادی فلسفۂ زندگی کا حامل ہے جس کا اسلام سے پورا تضاد ہے) اس وقت سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے، انہیں مغربی طاقتوں نے جن کا سب سے بڑا نقیب اور نمائندہ برطانیہ ہے، خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کیا، اور تمام عرب و مسلم سلطنتوں کو اپنا غلام یا دست نگر بنایا، اس لئے ان کے اصل حریف و رقیب مسلمان تھے اور انہیں کو اصل میں میدان میں آنا اور قائدانہ کردار ادا کرنا چاہئے تھا کہ قومیں اور ملتیں، دلیری اور جان بازی، قربانی و خطر پسندی اور قائدانہ کردار ادا کرنے ہی سے عزت و سرفرازی حاصل کرتی ہیں۔" (۱)

یہ ایک عمومی صورت حال تھی مگر مخصوص طور پر بقول حضرتؒ کے علماء نے اس میں نہ صرف یہ کہ حصہ لیا بلکہ قائدانہ کردار ادا کیا جس کے نتیجہ میں آج مسلمان اپنے دینی اداروں کی آزادی، پرسنل لاء کے تحفظ، اردو زبان اور دینی تعلیم کی بقا و حفاظت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

اس مجموعی صورت حال سے متاثر ہو کر حضرت نے عربی میں "دعوتان

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۵۰

منافستان" کے عنوان سے ایک فکر انگیز مضمون تحریر فرمایا جس میں مسلمانوں کو میدان میں آنے کی موثر دعوت دی گئی ہے اور اخوان کا فرض منصبی یاد دلایا گیا ہے۔ اس تحریر سے حضرتؒ کے درد انگیز اور فکری و دعوتی مضامین کا آغاز ہوا جن سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے راہ ہموار ہوئی اور جنھوں نے اسلامی بیداری کی عمومی فضا پیدا کرنے میں بڑا موثر کردار ادا کیا۔ چودھویں صدی ہجری کی اصلاحی و تجدیدی تاریخ کا یہ ایک امتیازی باب ہے جس کو کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ادارہ "تعلیمات اسلام" کا قیام اور درس قرآن کا سلسلہ

۱۹۴۳ء میں مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی نے بعض مجبوریوں کے پیش نظر دارالعلوم سے علاحدگی اختیار کی۔ مولانا اپنے طور پر لکھنؤ کے ایک محلہ میں درس قرآن دیتے تھے جس میں شہر کے بعض بااثر اور سربرآوردہ لوگ شریک ہوتے تھے۔ ان کو جب مولانا کی یکسوئی کا علم ہوا تو انھوں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "انجمن تعلیمات اسلام" کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارہ میں ہفتہ واری درس قرآن کا انتظام کیا گیا اور حضرت نے اس کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ حضرت اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس درس میں (جس میں اپنے استاد اور مربی روحانی مولانا احمد علی صاحبؒ کے درس کے اس اصلاحی و دعوتی طرز کو اختیار کیا گیا تھا جو وہ تعلیم یافتہ طبقہ کو دیتے تھے) تعلیم یافتہ طبقہ اور اعلیٰ مسلمان عہدیداروں اور دینی ذوق رکھنے والے مسلمانوں کا ایسا رجوع ہوا کہ درس کے وقت اگر لکھنؤ میں کسی دینی ذوق رکھنے والے مسلمان افسر یا اعلیٰ عہدیدار کو تلاش کیا جاتا تو شاید جواب یہی ملتا کہ وہ اس وقت ادارہ تعلیمات اسلام کے درس قرآن میں ہوں گے۔" اس کا سلسلہ ۴۷ء کے بعد تک جاری رہا اور مرجعیت بڑھتی گئی۔

۱۹۴۸ء کو اسی ادارہ کی طرف سے "تعمیر" کے نام سے ایک دینی و دعوتی و فکری

رسالہ کا اجراء عمل میں آیا۔ مولانا قدوائی اور حضرتؒ ہی اس کے مدیر تھے۔ اسی رسالہ میں حضرت نے بڑے فکر انگیز اور ایمان افروز مضامین تحریر فرمائے۔ اسی رسالہ میں "ہماری قومی سیرت کے بعض کمزور پہلو" کے عنوان سے حضرتؒ نے ایک ناقدانہ مضمون تحریر فرمایا جس میں کھل کر مسلمانوں کی عمومی کمزوریوں کی نشان دہی کی گئی تھی اور مسلمانوں کی بے حسی پر شکوہ کیا گیا تھا جس کی چوٹ حضرت اپنے حساس دل پر محسوس کر رہے تھے۔ یہ مضمون رسالہ کی شکل میں شائع ہوا اور حقیقت پسند اسلامی حلقوں میں قدر و اعتراف کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

اس ادارہ کے مقاصد میں سے قرآن مجید کے ذریعہ کم سے کم قواعد کی مدد سے عربی سکھانا بھی تھا۔ اس کے لئے بھی حضرت نے بعض رسائل تیار فرمائے تھے۔ جس میں اسلامی تاریخ کے موثر واقعات کو آسان سلیس عربی میں قلمبند کیا گیا ہے۔ بعد میں یہ مجموعہ بعض اور دوسرے مضامین کے ساتھ "قصص من التاریخ الاسلامی" کے نام سے شائع ہو کر مدارس میں داخل نصاب ہوا۔

عربی زبان میں دعوتی وفکری مضامین کا آغاز

گذر چکا ہے کہ "دعوتان متنافستان" کے مضمون سے حضرتؒ نے اس مبارک، مفید اور انقلاب انگیز مضامین کا سلسلہ شروع فرمایا جن کی چھاپ پورے عالم اسلام پر پڑی۔ یہ دعوتی وفکری اسلوب جس میں درد و تاثیر بھی ہو اور زور قلم بھی، زبان کی حلاوت اور سلاست بھی ہو، اور دعوت کی طاقت بھی، اس کا کوئی نمونہ حضرت کے سامنے نہیں تھا، لیکن یہ وقت کی ضرورت تھی اور پورا عالم اسلام ایسے طاقتور اور فکر انگیز مضامین کا پیاسا تھا۔ اس وقت عربی میں سوائے علمی یا خالص ادبی یا تنقیدی اور تحلیلی مضامین کے دوسرا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ اخوان تحریک کے اثرات بھی اس وقت تک محدود تھے اور اسلامی مفکرین میں سے عربوں میں اس وقت تک کسی کا غلغلہ بلند نہیں ہوا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو جس طرح عالمی سطح پر

حضرتؒ سے اصلاحی و تجدیدی کام لینا تھا محض توفیق الٰہی تھی کہ حضرتؒ نے یہ اسلوب اپنے طور پر اختیار فرمایا۔ حضرت کی زبان میں بقول شاعر ؎

نے پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

یہ ایک ایسا نیا طرز تحریر اور اسلوب تھا جس میں خود اعتمادی، جوش، دردِ دل اور حرارت ایمانی کے ساتھ استدلال کی قوت، قلم کی متانت اور زبان کی حلاوت بھی تھی۔ توفیق الٰہی کے بعد یہ ڈاکٹر صاحب کی تربیت اور عربی النسل اساتذہ کی تعلیم و توجہ اور خصوصی شفقت کا فیض تھا کہ ہندوستان کے عجمی ماحول میں رہ کر عربی زبان پر ایسی قدرت اور روانی کہ عرب بھی پڑھ کر مسحور ہوئے اور داد دینے پر مجبور ہوئے۔

حضرتؒ خود تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے جب یہ سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت اپنے اس طرز تعلیم اور عربی زبان و ادب کے اس نصاب اور ماحول کی قدر آئی جو ہندوستان میں ایک نیا تجربہ تھا اور جس کی بظاہر اس وقت کوئی ضرورت اور معقولیت سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایک ایسے دور میں کہ ہندوستان کے نہ عالم عربی سے سیاسی، ثقافتی، اور معاشی روابط تھے، نہ آمد و رفت کی سہولتیں تھیں، نہ وفود کے تبادلے نہ سفارت خانوں کے قیام اور ممالک عربیہ کی دانش گاہوں سے ربط و تعلق کا دور شروع ہوا تھا، ایک ایسے خاندان کے (جس میں اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا رواج تھا) فرد کو عربی زبان و ادب کی اس پیمانہ اور معیار پر تعلیم دی جائے اور اس کو انشاء و تحریر، گفتگو کی مشق کرائی جائے جس سے مدارس عربیہ بھی نا آشنا تھے، اور دینی و علمی حلقے نہ صرف بیگانہ بلکہ اس کو اضاعت وقت کا مرادف سمجھتے ہوں گے، عربی زبان کو صدیوں سے یہاں صرف دینی کتب کے سمجھنے سمجھانے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ جب میں نے دعوتی تحریر کا یہ کام شروع کیا اور پھر جب تقدیر الٰہی نے ۱۹۵۱ء

میں مشرق وسطیٰ کے سفر کا سامان کیا تو اس وقت اپنے مربی اور ولی نعمت مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کی فراست اور دور بینی اور دینی بصیرت کی قدر آئی کہ انھوں نے میرے لئے یہ راستہ انتخاب کیا اور مجھے تعلیم و تعلم کے مروجہ طریقوں سے الگ کر کے عربی زبان و ادب اور عربی تحریر و انشاء اور خطابت کے ذریعہ عالم عربی کو خطاب کرنے اور ان کو "بضاعتکم رُدت إلیکم" کہہ کر جھنجھوڑنے اور ان کے جذبات خوابیدہ کو بیدار کرنے کی سعادت حاصل کرنے کا موقع دیا۔"(۱)

اس سلسلہ کا دوسرا تفصیلی مضمون "العدل و الجور فی تاریخ الاسلام" کے عنوان سے لکھا گیا جو کتابی شکل میں مصر اور ہندوستان سے شائع ہوا۔

ایک انقلاب انگیز کتاب کی تالیف

"مسلمان تاریخ کے ایک ایکٹر (Actor) نہیں، ایک طاقتور تاریخی بلکہ تاریخ ساز عامل (Factor) کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے تاریخ انسانی وابستہ ہے۔ انکے عروج و اقتدار سے اور ان کے قائدانہ اور موثر رول ادا کرنے کے مقام پر فائز ہونے سے پورے عالم انسانی کا رخ بدل رہا تھا اور انسانیت سعادت سے ہم کنار ہو رہی تھی، اور انکے زوال سے (جو خود ان کا لایا ہوا اور پیدا کیا ہوا تھا) انسانیت لاوارث، علم و تہذیب آوارہ، قومیں اور سلطنتیں شتر بے مہار، مساعی بے نتیجہ، علمی و صنعتی ترقیات باعث ہلاکت اور خودکشی کا سامان بن گئیں، اور دنیا اجتماعی اور منظم طریقہ پر ہلاکت و تباہی کے غار کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ اب پھر اگر صحیح منزل کی طرف بازگشت کی کوئی امید اور نجات کا راستہ ہے تو وہ یہی ہے کہ مسلمان پھر منصب قیادت پر فائز ہوں اور دنیا کی رہنمائی اسلام کے حصہ میں آئے۔"(۲)

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۵۳-۲۵۵

(۲) کاروان زندگی اول ص ۲۵۷

اس دور میں جبکہ مفکرین و مصنفین کا عمومی رجحان اور فکر صرف یہ تھا کہ دنیا میں پیش آنے والے واقعات کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑتا ہے، ان کے نزدیک مسلمانوں کی حیثیت تاریخ کے عامل کی نہیں بلکہ معمول کی تھی۔ یہ ایک انقلاب انگیز فکر اور تعجب خیز رجحان تھا۔ حضرت پر یہ فکر و رجحان ایسا غالب ہوا کہ اس کو ایک کتاب کے قالب میں ڈھالنے کا عزم فرمالیا۔ اس وقت تک اگرچہ دین پر مکمل اعتماد اور اس کے تمام شعبوں کو زندگی سے منطبق کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی اور یہ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی کہ تنہا اسلام ہی دنیا کی قیادت کرنے اور اس کو اپنی صحیح ڈگر پر لانے کی اپنے اندر صلاحیت اور پیغام رکھتا ہے۔ مطالعہ بھی خاصا وسیع ہو چکا تھا لیکن یہ موضوع ایسا اہم اور بالغ نظری کا طالب تھا کہ بقول حضرتؒ کے

''اس کے لیے زیادہ پختگی اور بالغ نظری اس سے زیادہ وسیع، عمیق مطالعہ اور اس سے زیادہ کہنہ مشق قلم کی ضرورت تھی۔ میرے جیسے آدمی کے لیے اس موضوع پر لکھنا ایک ''جرأت رندانہ'' یا ''اوائے قلندرانہ'' سے کم نہ تھا''۔

لیکن پھر حضرت ہی فرماتے ہیں

''انسانی کوششیں ہمیشہ منطق وریاضی کے تابع نہیں ہوتیں اور اسی میں خیر ہے، ورنہ انسان ایک بے جان مشین بن کر رہ جائے۔ میں اس خیال سے ایسا سرشار اور اس کے تقاضے سے ایسا مغلوب ہوا کہ میں نے نہ صرف اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت کی بلکہ عربی میں لکھنے کا فیصلہ کیا''(۱)

بقول شاعر مشرق علامہ اقبال۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرتؒ نے جب یہ کام شروع فرمایا تو اس وقت صرف تیس (۳۰) سال کی عمر

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۵۸

تھی، اسکی تکمیل و تذئیل کا سلسلہ ۱۹۴۲ء تک جاری رہا، اور اللہ تعالیٰ کی ایسی کھلی مدد ہوئی جو عام طور پر بلند مقاصد کو پیش رکھنے والے مخلص مصنفین کے ساتھ ہوتی ہے۔

جاہلیت عالیہ کے باب میں خاص طور سے حضرت فرماتے ہیں:

"یہ مواد علاحدہ علاحدہ ملکوں کی تاریخ اور کئی زبانوں میں منتشر ہے اور اکثر ان موضوعات کے ماتحت ہے جہاں مشکل سے نظر جاتی ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں ایک نئے سفر کا آغاز کرنا پڑا جسکی منزلیں پہلے سے معلوم اور متعین نہیں تھیں لیکن توفیق الٰہی سے (جس کا اس کتاب کی تالیف میں بار بار اور حیرت انگیز تجربہ ہوا) وہ کڑیاں ملتی چلی گئیں جن کی ضرورت تھی۔"(۱)

اس سلسلہ میں حضرت نے ایک دلچسپ واقعہ بھی کاروان زندگی میں نقل فرمایا ہے یہاں بھی اس کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہیں:

"۱۹۴۳ء میں میں مدینہ طیبہ میں قیام تھا اور میں اس کتاب کی تکمیل و تحسین میں مشغول تھا، مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یورپ میں جو اخلاقی مکتب خیال، رواقی، لذتی وغیرہ قائم ہوئے ان کی تاریخ معلوم ہو اور عربی میں ان کے لئے کیا اصطلاحات و تعبیرات استعمال کی جاتی ہیں ان کا علم ہو۔ میرے پاس کوئی ماخذ نہیں تھا۔ میں ایک دن اپنی قیام گاہ پر آیا تو گھر والوں نے بتایا کہ ایک عرب صاحب آئے تھے، وہ بہت دیر تک تم کو آواز دیتے رہے، جب کوئی جواب نہیں ملا تو دروازہ کی دراز سے یہ کتاب اندر ڈال گئے۔ میں نے دیکھا تو استاد جاد المولیٰ بک کی کتاب تاریخ و فلسفہ اخلاق پر تھی جس میں میری وہ تمام مطلوب معلومات موجود تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لانے والے میرے ایک ترک نوجوان دوست علی طلوی ترکی تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اس کا کیسے خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میری اس

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۵۹

کتاب پر نظر پڑی تو میرے دل میں آیا کہ شاید یہ کتاب آپ کی دلچسپی اور کام کی ہوگی اس لئے میں آپ کے گھر چھوڑ آیا۔ مصنفین کو جو بھی نیک مقصد کے لئے قلم اٹھاتے ہیں، ایسے بہت تجربے ہوئے ہوں گے۔" (۱)

کتاب تکمیل کو پہنچی تو اس کی طباعت کا مسئلہ پیش آیا۔ اس وقت تک حضرت نے عالم عربی کا کوئی سفر نہیں کیا تھا، اور ہندوستان میں اس کی طباعت کا مرحلہ دشوار بھی تھا، پھر اس سے بڑھ کر عربوں تک کتابوں کی منتقلی کا مسئلہ تھا۔ حضرت کو محسوس ہوا کہ شاید طباعت میں دیر لگے، تو حضرت نے خود اس کا اردو میں ترجمہ کیا اور "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا" کے نام سے کتاب شائع ہو گئی۔ اہل فکر نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، خاص طور پر علامہ سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ حضرت مدنی نے "نقش حیات" میں اس کے بعض اقتباسات بھی حوالے سے نقل فرمائے۔

۱۹۴۷ء میں جب حضرت نے حجاز کا سفر کیا تو اس وقت حرم مکی کے خطیب و امام شیخ عبد الرزاق حمزہ نے کتاب دیکھ کر سب سے پہلے اس کی داد دی اور بلند الفاظ میں اپنا تاثر ظاہر کیا اور یہ بھی تاکید کی کہ یہ کتاب جلد ہی طبع ہونی چاہیے۔

حضرت نے اس کی طباعت کے لئے مصارف کا تخمینہ مکہ مکرمہ کے ایک تجارتی مطبع سے حاصل کیا اور ایک افریقہ کے تیز مسلمان تاجر سے ملاقات کی، اور کتاب کا تعارف کرایا۔ وہ اس کی افادیت اور ضرورت کو محسوس نہ کر سکے اور ایک معمولی رقم اس کی طباعت کے لئے دی۔ حضرت فرماتے ہیں:

"میں نے قبول تو کر لی، مگر بہت دل شکستہ ہوا، میرا وضو تھا، میں سیدھا حرم شریف گیا اور اسی دل شکستگی کی عالم میں ملتزم پر کتاب کی طباعت کے سامان ہونے اور قبولیت کی دعا کی۔" (۲)

کتاب کی اہمیت و ضرورت اور افادیت اپنی جگہ مسلم تھی، مگر اس دعا کا اثر یہ ہوا

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۵۹ (۲) کاروان زندگی اول ص ۲۶۲

کہ اس کتاب نے خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ پر ایک انقلابی اثر ڈالا اور موجودہ صدی کی تصنیفات میں اس کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوا۔

حجاز سے واپسی پر حضرتؒ نے اس کی طباعت کے سلسلہ میں ڈاکٹر احمد امین سے مراسلت فرمائی جو مصر کے ایک اشاعتی و تصنیفی مرکز کے ذمہ دار تھے۔ انھوں نے کتاب دیکھ کر پسند کی اور لکھا کہ "کتاب کیا بلحاظ زبان کیا بلحاظ مواد ہر طرح سے مکمل ہے اور ہماری کمیٹی نے اس کی طباعت کا فیصلہ کیا ہے۔"

یہ منظوری کا خط ایسے موقع پر ملا جب حضرتؒ، حضرت رائے پوریؒ کے ساتھ موٹر میں دارالعلوم سے نکل کر تحصیل فتح پور کی دعوتی دورہ میں تشریف لے جارہے تھے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"مجھے یاد ہے کہ میری زندگی میں چند دن جو انتہائی مسرت کے گذرے ہیں ان میں ایک دن وہ بھی تھا جب عزیزی محمد رابع سلمہٗ نے مجھے چلتی کار میں وہ خط دیا۔"(۱)

مزید فرماتے ہیں:

"حقیقت میں اس کتاب کی اشاعت نے میرے دعوتی کام میں وہ آسانی اور مشرق وسطی کے علمی و دینی طبقہ میں میرے تعارف کا وہ کام کیا جو سیرت سید احمد شہیدؒ کی اشاعت نے ہندوستان میں کیا تھا۔"(۲)

کتاب شائع ہو گئی لیکن حضرت کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کا بھی دلچسپ واقعہ پیش آیا جو مضمون کی مناسبت سے یہیں ذکر کیا جاتا ہے۔

"میں نے جنوری ۵۱ء کی ابتدائی تاریخوں میں جب مکہ معظمہ میں طویل قیام رہ چکا تھا، مصر کے سفر کا عزم کیا تو شام کو بھی اس پروگرام میں شامل کرنے کا ارادہ ہوا۔ میں شامی سفارت خانہ جدہ میں شام کا ویزا لینے گیا، عزیزان مولوی معین اللہ صاحب ندویؒ (حال نائب ناظم ندوۃ العلماء) اور

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۶۶ (۲) ایضا

مولوی عبد الرشید ندوی جو سال ڈیڑھ سال سے دعوت و تبلیغ اور میرے دعوتی رسائل کو اہل علم تک پہنچانے کے لئے مکہ میں مقیم تھے اس سفر میں میرے ساتھ جانے والے تھے، میرے ساتھ سفارت خانہ گئے۔ مجھے جب شام کا ویزا مل گیا تو میں نے شامی سفیر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، حسن اتفاق سے اس وقت اس عہدہ پر استاد جواد المرابط متعین تھے، جو خود فاضل و ادیب تھے اور "المجمع العلمی العربی دمشق" کے رکن، انھوں نے ہم لوگوں کو اوپر بلالیا، ادبائے مصر اور وہاں کے اہل قلم پر بات نکلی تو انھوں نے کہا ہندوستانی علماء و مصنفین کی تحریر میں ہم کو جو اثر اور والہانہ پن محسوس ہوتی ہے وہ ان کے یہاں نہیں پائی جاتی مثلاً میں ابھی مصر گیا تھا وہاں ایک مکتبہ میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" میں لے آیا اور پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ میرے اندر یہ سن کر ایک بجلی سی دوڑ گئی اور میں نے بڑے اشتیاق و اضطراب کے ساتھ پوچھا کیا یہ کتاب آپکے پاس ہے اور ہمیں دکھا سکتے ہیں؟" انھوں نے کہا ہاں اور الماری میں سے نکال کر دی۔ میں نے چند دن کیلئے اس کو ان سے مستعار لے لیا۔" (۱)

کتاب پر ڈاکٹر احمد امین نے کچھ زیادہ ہی محتاط انداز میں مقدمہ لکھا جو عام طور پر پسند نہیں کیا گیا۔ پھر بعد میں سید قطب شہیدؒ نے پر زور اور طاقتور مقدمہ تحریر فرمایا۔ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ بھی از خود ایک مقدمہ لکھ چکے تھے، وہ کتاب کے بڑے مداح اور قدر داں تھے، کتاب انھوں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی اور سر ورق پر یہ جملہ لکھا "ہر ایسے شخص کے لئے اس کتاب کا مطالعہ لازم ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی ترقی چاہتا ہو۔"

یہ کتاب ان دونوں مقدمات اور شیخ احمد الشرباصی کے تعارف مصنف کے ساتھ بار بار شائع ہوئی۔ اور اس وقت محتاط اندازہ کے مطابق اس کے تقریباً سو

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۶۷

اوڈیشن نکل چکے ہیں، اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔
یہاں اس واقعہ کا تذکرہ مناسب ہے کہ ایک مرتبہ حضرتؒ نے بعض طلبہ سے اس کتاب کے مطالعہ کے بارے میں دریافت فرمایا۔ طلبہ نے کہا ابھی مطالعہ کی نوبت نہیں آئی۔ حضرت نے برجستہ فرمایا "عالم عربی میں جو یہ کتاب نہ پڑھے وہ پڑھا لکھا آدمی نہیں سمجھا جاتا" حضرت فرماتے تھے کہ میں نے یہ جملہ کہہ تو دیا مگر خود مجھے احساس ہوا کہ اس طرح کا تبصرہ میں نے کہیں نہیں سنا۔ حسن اتفاق کہ علامہ یوسف القرضاوی سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے "جب ہم مصر میں پڑھتے تھے تو عام طور پر یہ جملہ زبان زد تھا کہ جس نے یہ کتاب نہیں پڑھی وہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے۔"

تھانہ بھون کی حاضری

۱۹۴۳ء کے حضرت کے قیام لاہور کے زمانہ میں ڈاکٹر صاحبؒ نے یہ ہدایت فرمائی تھی کہ واپسی میں تھانہ بھون ہوتے ہوئے آئیں اور جانے سے پہلے حضرت تھانویؒ کو اپنے تھانہ بھون آنے کی اطلاع بھی کر دیں، اپنا تعارف بھی کرا دیں اور سفر کا مقصد اور مدت قیام بھی لکھ دیں۔ حضرتؒ نے اس پر عمل فرمایا، حضرت تھانویؒ نے جواب تحریر فرمایا "سر آنکھوں پر تشریف لائیں۔" حضرت نے حضرت تھانویؒ کو اس کے جواب میں پھر خط لکھا اور اس میں حضرت تھانویؒ اور حضرت لاہوریؒ کے علمی و نظریاتی اختلاف کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے یہ بھی تحریر فرمایا کہ "میرے نزدیک یہ اختلاف باپ چچا کے اختلاف کی طرح ہے۔" حضرت خود تحریر فرماتے ہیں کہ "میں نے بلا ضرورت یہ جملہ لکھ دیا اور مجھے یہ احساس ہوا کہ شاید اب اس کا یہ جواب آئے گا کہ آپ یہاں آنے کی زحمت نہ فرمائیں آپ کو کوئی نفع نہ ہوگا۔" لیکن حضرت جب لکھنؤ تشریف لائے تو حضرت تھانویؒ کا گرامی نامہ ملا جس کو بڑے اہتمام سے بھیجا گیا تھا، پتہ بھی حضرت تھانویؒ نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا تھا۔ اس میں یہ عبارت تحریر فرمائی تھی:

مشفق مکرم مولوی ابوالحسن علی صاحب سلمہٗ
بتوسط جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سلمہٗ
۳۷ امین آباد، لکھنؤ۔

مکتوب گرامی کا ایک اقتباس بھی نقل کیا جاتا ہے جو حضرت تھانوی کی شفقت و محبت اور قدر و اعتراف کا آئینہ دار ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"بخدمت مجمع الکمالات زید لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فرحت نامہ پہونچا، ہر ہر حرف حیات بخش تھا۔ جزاکم اللہ علیٰ هذه المحبة۔ آپکے صدق و خلوص و سلامت فہم کے اثر سے میری طبیعت بھی دفعتاً آپ سے بے تکلف ہوگئی ——— آپکے لئے دعا کرتا ہوں اور دعا چاہتا ہوں۔" (۱)

حاضری کی نوبت ۱۹۳۲ء میں آئی۔ حضرت، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ہمراہ شاہدرہ سے سہارنپور تشریف لے جارہے تھے، تھانہ بھون راستہ میں پڑتا تھا۔ حضرتؒ نے پہلے اپنی حاضری کی اطلاع ایک مکتوب کے ذریعہ سے فرمادی اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے اجازت لے کر تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ آگے کا حال حضرت ہی کی زبانی اختصار سے نقل کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"میں خانقاہ میں داخل ہوا، گرمی اور دوپہر کی وجہ سے سناٹا تھا، ایک طرف سامان رکھ کر بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی۔ مولانا تشریف لائے۔ میں نے اس وقت اپنا تعارف مناسب نہیں سمجھا۔ ظہر کی نماز کے بعد مجلس شروع ہوئی میں بھی حاضر ہوا اور کنارے بیٹھ گیا۔ داخل ہوتے ہی اس ڈیسک پر نظر پڑی جو مولانا کے سامنے تھی، اس پر سیرت سید احمد شہید بھی رکھی ہوئی تھی، اس سے اجنبیت کے احساس میں بہت کی

(۱) پرانے چراغ اول ص ۱۲۲-۱۲۳

ہوئی۔ مولانا خطوط کے جوابات دینے میں مصروف تھے۔ چند منٹ کے بعد خواجہ عزیز الحسن صاحب سے فرمایا کہ ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے بھائی آنے والے تھے، آئے نہیں؟ میں آگے بڑھا اور عرض کیا کہ حاضر ہوں۔ فرمایا آپ نے بتایا نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت کے حرج کے خیال سے عرض نہیں کیا۔ فرمایا اس سے بڑھ کر کیا حرج ہوتا کہ مجھے آپ کی آمد کا علم نہ ہوتا، خجلت ہوتی، ندامت ہوتی، افسوس ہوتا۔ مکرر کئی لفظ فرمائے۔ خلاف معمول اپنا مہمان بنایا اور دونوں وقت پر تکلف کھانے کا اہتمام فرمایا۔ فرمایا کہ میں نے آپکی وجہ سے خطوط کا بہت سا کام پہلے کر لیا تھا تاکہ اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے۔ یہ حضرت کی طرف سے انتہائی اعزاز تھا۔" (۱)

ایک روز قیام کے بعد حضرتؒ اسی گاڑی سے جس پر مولانا محمد الیاس صاحبؒ کاندھلہ سے رامپور تشریف لے جا رہے تھے، سوار ہو کر رامپور تشریف لے گئے۔ یہ حضرت کی تھانہ بھون کی پہلی اور آخری حاضری تھی۔

(۱) پرانے چراغ اول ص ۱۴۸-۱۴۹

ساتواں باب

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت سے تعلق وارتباط، تبلیغی مساعی اور مولانا کے بعد حضرتؒ کا طرزِ فکر اور موقف

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں پہلی حاضری

گذشتہ باب میں گذر چکا ہے کہ حضرتؒ نے اپنے دو رفقاء حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور حاجی عبد الواحد صاحب ایم۔ اے کے ہمراہ دینی مرکزوں کا دورہ فرمایا تھا۔ ۱۹۳۰ء کا آغاز تھا کہ یہ مبارک قافلہ دہلی میں داخل ہوا۔ مولانا نعمانی تو اپنی اہلیہ کی علالت کی بناء پر وطن تشریف لے گئے، یہ دو حضرات نظام الدین حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کہیں سفر پر تشریف لے گئے تھے۔ مولانا احتشام الحسن صاحب نے ان حضرات کو میوات بھیج دیا۔ جس کا ذکر کیا تھا وہاں سے واپسی ہوئی اس کا ذکر بھی گذر چکا۔ مولانا کے انتظار میں یہ لوگ دہلی میں رہے۔ جس دن مولانا تشریف لانے والے تھے اس کے فارغ وقت میں حاجی عبد الواحد صاحب اپنے ایک غیر مسلم دوست سے ملنے گئے، حضرتؒ بھی ہمراہ تھے اس وقت حضرتؒ پر انجذاب کی جو غیر معمولی کیفیت طاری ہوئی اور پھر مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے پہلی ہی ملاقات میں جس خصوصی توجہ والتفات کا معاملہ فرمایا اس کا تذکرہ حضرت ہی کی زبانی کاروانِ زندگی سے نقل کیا جاتا ہے:

"حاجی عبدالواحد صاحب اپنے پرانے دوست کے ساتھ گفتگو میں منہمک تھے، میرے اندر بے چینی کی ایک مبہم لیکن طاقتور کیفیت پیدا ہوئی اور میں اس سے ایسا مغلوب ہوا کہ قریب تھا کہ دیوانہ وار دروازہ کھول کر کے نظام الدین کی طرف دوڑوں، اسی کے ساتھ دعا و انابت کی بھی ایسی حالت پیدا ہوئی جو کبھی برسوں میں اور خاص روحانی فضا میں پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اپنے کو بہت سنبھالا کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مجھ پر دماغی دورہ پڑا ہے۔ اللہ اللہ کر کے وہ گفتگو اور ملاقات سے فارغ ہوئے اور ہم دونوں نظام الدین پہنچے، ہمارے پہنچنے کے کچھ دیر بعد مولانا تشریف لائے اور اس شفقت اور گرم جوشی سے ملے جیسے برسوں کی جان پہچان تھی یا انتظار ہی میں تھے۔ خاص طور پر جب ان کو معلوم ہوا کہ میں "سیرت سید احمد شہید" کا مصنف ہوں اور میرا صاحب سیرت سے خاندانی تعلق ہے، تو شفقت و محبت اور یگانگت میں اور اضافہ ہوا۔ سب سے پہلی چیز جس نے ہم لوگوں کو متاثر کیا اور جس کا کم سے کم مجھے اپنی عمر میں پہلا تجربہ ہوا وہ مولانا کی شفقت اور جذب دل کی خاص کیفیت تھی۔ پہلی ملاقات کے باوجود کہیں سے بھی کوئی اجنبیت، تکلف اور اپنی ذات اور مرتبہ کا احساس نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے دن صبح کی مجلس میں بھی وہی دل نوازی کی شان تھی جو روبہ ترقی تھی۔ میری رخصت کے دن جو میں نے دارالعلوم سے لی تھی ختم ہو رہے تھے۔ دوسرے یا تیسرے دن مجھے واپس ہونا تھا۔ مولانا نے روانگی کے وقت ایسی طویل اور اثر میں ڈوبی ہوئی دعا کی کہ جس سے دل و دماغ متاثر ہوئے اور دوبارہ اور جلد حاضری کا عزم پختہ ہوا۔ مولانا نے غالباً اسی قیام کے زمانہ میں فرمایا کہ مولانا میں نے آپ کی کتاب (سیرت سید احمد شہید) پڑھی لیکن اس سے میری معلومات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، میں اپنے خاندان کی بیبیوں اور بزرگوں سے اس سے زیادہ ہی سن چکا ہوں۔ بات سے بات یاد آتی ہے، ایک مرتبہ

میں مسجد کے بالائی حصہ میں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں صاحبزادہ گرامی مولانا محمد یوسف صاحب کا قیام رہتا تھا۔ مولانا چائے کی ایک پیالی ہاتھ میں لے کر تشریف لائے، میری طرف پیالی بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ "مولانا ابھی تک ہم لوگ حضرت سید احمد شہید کی تجدید کے سایہ ہی میں ہیں۔" میں لکھنؤ واپس آگیا لیکن دل کا حال وہ تھا جو شاعر نے بیان کیا ہے

ع دیرینہ سال بیرے بردش بیک نگاہے"(۱)

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے خصوصی انجذاب و مناسبت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا کی طرف انجذاب اور ان کے مقام سے ہلکی سی شناسائی میں اس کو بڑا دخل تھا کہ میں ان سے ملنے سے پہلے "مکتوبات امام ربانی" "ازالۃ الخفا" "صراط مستقیم" اور "منصب امامت" پڑھ چکا تھا اور (اپنے تاریخی و ادبی مطالعہ و ذوق کے باوجود) اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ میں یہ سمجھ سکوں کہ ان دو دعوتوں اور کوششوں، قیادتوں اور طرز فکر و تفہیم میں کیا فرق ہوتا ہے۔ جن میں سے ایک کا سرچشمہ، ذہانت مطالعہ، وسعت علم اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورت حال کا ردعمل ہوتا ہے۔ اور دوسرے کا سرچشمہ کثرت عبادت، انابت و دعا، قرآن مجید میں عمیق تدبر، سیرت نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور اجتباء اور ہدایت ربانی ہوتی ہے۔ مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو دیکھ کر اور ان کی صحبت میں رہ کر عارف شیرازی کے اس شعر کی تصدیق ہوئی۔

ایں ہمہ مستی و مدہوشی نہ حد بادہ بود
با حریفاں انچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

دوسری طرف مولانا کی مجھ پر خصوصی عنایت اور تھوڑے وقت میں

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۸۰

جو قرب و اختصاص حاصل ہوا اس کی ایک وجہ تو وہ عجیب و غریب تعلق و عقیدت ہے جو سلسلۂ رشیدی کے تمام مشائخ کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ رہا ہے اور جس کا اندازہ کرنا ان لوگوں کے لئے دشوار ہے جنھوں نے ان حضرات کو قریب سے اور زیادہ نہیں دیکھا۔"(۱)

لکھنؤ میں کام کا آغاز اور اس کے ثمرات

حضرتؒ نے لکھنؤ آتے ہی ان طلبہ کو لیکر جو ذاتی تعلق و مناسبت رکھتے تھے، کام شروع فرمادیا۔ جمعرات کو ضروری سامان لے کر بعد نماز عصر اکثر لمبو ر پیدل ہی جانا ہوتا جو تقریباً دس بارہ کلومیٹر ہے۔ وہاں سے جماعتیں تقسیم ہو جاتیں اور نواحی دیہاتوں اور قصبات میں جاتیں۔ حضرت ان کوششوں کی روداد بھی مولانا کی خدمت میں بھیجتے رہتے، جس کے جواب میں مولانا بڑی محبت و شفقت بلکہ بڑی عظمت و قدردانی کے خطوط ارسال فرماتے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کو گوہر مقصود حاصل ہو گیا جسکی ان کو تلاش تھی۔ ایک خط میں "عمدة الآمال و الأماني" کے ساتھ خطاب فرمایا، جس سے خصوصی محبت اور توقعات کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرتؒ نے جب والدہ صاحبہ اور ڈاکٹر صاحب کے بارے میں یہ تحریر فرمایا کہ اس کام کو ان دونوں نے تائید و پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تو اس کے جواب میں مولانا نے لکھا:

"یہ امر مجھ ناچیز تہی دست کے لئے ایک مبارک دامن تلے آنے کی جھلک دکھلا رہا ہے۔"

لکھنؤ میں دو تین سال تک اسی طرح طلبہ کے ذریعہ کام آگے بڑھتا رہا، طلبہ کی اس نقل و حرکت سے خود ان کے اندر دینی فکر اور اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا، دینی ترقی ہوئی، سادگی و جفاکشی کی عادت پڑی، آپس میں ربط و تعارف اور اساتذہ سے

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۸۳-۲۸۲

ذاتی تعلق کا فائدہ ہوا پھر عوام کی دینی پسماندگی اور جہالت سامنے آئی اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوا۔

دوسری طرف شہر میں بھی لوگوں کو توجہ ہوئی اور دینی ذوق رکھنے والے حلقہ میں کام پھیلنے لگا، بڑی بڑی جماعتیں نظام الدین جانے لگیں اور ان حصہ لینے والوں کی زندگی میں بھی تغیر پیدا ہوا اور کھلی ہوئی دینی ترقی نظر آنے لگی۔

لکھنؤ کے اس کام میں اساتذہ میں سے خاص طور پر مولانا محمد ناظم صاحب ندوی نے رفاقت فرمائی، جو حضرت کے رفیق درس بھی تھے اور رفیق تدریس بھی، اور دونوں میں ذوق وفکر کی ہم آہنگی بھی تھی اور عمل کی یکجائی بھی۔

اسی زمانہ میں نظام الدین کے کسی زمانہ قیام میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ سے تعارف ہوا، اور شیخ نے غیر معمولی اپنائیت کا معاملہ فرمایا، پھر یہ تعلق یوماً فیوماً بڑھتا ہی رہا۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دارالعلوم میں آمد

حضرت نے لکھنؤ میں کام کی جو بنیاد ڈالی تھی الحمد للہ اس کے اثرات مرتب ہونے لگے تھے اور اہل لکھنؤ کو یہ استحقاق ہو گیا تھا کہ مولانا یہاں قدم رنجہ فرمائیں اور براہ راست اہل لکھنؤ کو مستفید فرمائیں۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں آپ نے دعوت منظور فرمائی اور ۱۸؍ جولائی کو علماء واعیان کی ایک جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے اور دارالعلوم ہی میں قیام فرمایا۔ ایک روز قبل علامہ سید سلیمان ندویؒ بھی تشریف لا چکے تھے۔ دوسرے روز حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور بعض دوسرے علماء ومشائخ بھی تشریف لائے۔ اسطرح دارالعلوم میں زہد وورع اور علم وفضل کی یہ کہکشاں ایک مدت کے بعد سجی۔ حضرت سید صاحب بھی اس کام کی طرف متوجہ ہوئے اور مولانا کو بھی دارالعلوم اور یہاں کے ذمہ داروں سے گہرا تعلق ہوا۔ مولانا نے خاص طور پر ڈاکٹر صاحب اور سید صاحب کا خصوصی اکرام فرمایا۔

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ:

"ایک دن مجھ سے فرمایا مجھے ایسی جگہ لے چلو جہاں سے دارالعلوم کا پورا ماحول نظر آئے میں مولانا کو دارالعلوم کی چھت پر جہاں سے ایک طرف دریا کا منظر اور دوسری طرف دارالعلوم کی مسجد، شبلی دارالاقامہ اور دوسری عمارتیں نظر آتی ہیں لے گیا، اس وقت صرف مولانا اور میں تھا۔ مولانا نے فرمایا حضرت میں دارالعلوم کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں، بتائیں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ اللہ تعالیٰ نے اس وقت رہنمائی فرمائی اور میں نے کہا صرف یہ کہ آپ دارالعلوم کو بھی اسی نظر عنایت واختصاص سے دیکھیں اور سرپرستی فرمائیں جس سے آپ مدرسہ مظاہر العلوم کو دیکھتے ہیں۔ مولانا نے دعائیہ الفاظ فرمائے اور نیچے تشریف لے آئے۔"(۱)

حضرتؒ دارالعلوم میں جو دینی رنگ دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے لئے کوشاں تھے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے اس قیام سے اس میں بڑی مدد ملی اور عمومی طور پر دینی فضا قائم ہوئی۔

آخری روز کچھ وقت کے لئے اپنے رفقاء کے ساتھ دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی تشریف لائے اور مسجد جا کر تلاوت میں مشغول رہے۔ حضرت شاہ علم اللہؒ کی قبر پر تشریف لے گئے اور بڑے بلند کلمات فرمائے۔ اسی روز لکھنؤ ہوتے ہوئے کانپور تشریف لے گئے اور دو تین روز ٹھہر کر دہلی واپسی ہوئی۔

حضرتؒ پر خصوصی شفقت و توجہ

اس پورے عرصہ میں مولانا کی توجہ بڑھتی رہی۔ خطوط میں اس طرح خطاب فرماتے کہ اس سے صرف شفقت و محبت ہی نہیں بلکہ عظمت و عقیدت کا

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۹۱، لکھنؤ کے سفر اور قیام کے مفصل حالات شہر کے اجتماعات اور علماء و اعیان شہر سے ملاقات کی تفصیل مولانا کی سوانح "حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت" میں ملاحظہ کی جائے۔ ص ۱۲۶-۱۳۰

بھی اظہار ہوتا تھا۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "جناب کا گرامی نامہ کنول قلب کے کھلنے کا سبب ہوا۔" ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں: "جناب کی تشریف آوری کا مژدہ روئیں روئیں کو تروتازہ کر رہا ہے، حق تعالیٰ ہمیں آپ کی ذات گرامی سے دارین میں متمتع فرمائیں"۔ ایک خط میں "سیدی وسید عالم" سے خطاب فرمایا۔

حضرت کا بھی حال یہ تھا کہ ہر مہینہ نظام الدین تشریف لے جاتے، اہم دوروں اور اجتماعات میں شرکت فرماتے۔ ڈاکٹر صاحبؒ بھی مولانا اور ان کی دعوت وتحریک کے بڑے موید اور قدرداں تھے۔

نظام الدین حاضری اور پھر دوروں میں رفاقت کے موقعوں پر بھی مولانا بڑی محبت اور اکرام فرماتے۔ حضرتؒ کی محنت وجانفشانی کی بڑی قدر فرماتے۔ ایک دن فرمایا کہ "مولانا میں آپکا شکریہ وتعریف کیا کروں، تعریف محبت کا اوچھاپن ہے۔" ایک دن فرمانے لگے "میں آپ سے کیا کہوں، اچھا دولت قرآن مبارک ہو!۔"

میوات کے کسی دورہ میں میں قیام گاہ پر کسی نے مولانا کی چارپائی اس طرح بچھادی کہ اس کا پاستانہ حضرتؒ کی چارپائی کے سرہانے کی طرف ہو رہا تھا، یہ دیکھ کر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ساتھ رہنے والوں سے فرمایا کہ "تم اتنے دن ساتھ رہتے ہو مگر اتنی سی حس نہیں۔"

لکھنؤ تشریف آوری کے موقع پر پہلے قیصر باغ کے ایک سبزہ زار پر نوافل پڑھے، ایک رومال بچھادیا گیا تھا، مولانا نے اس پر حافظ فخر الدین صاحب کو بٹھایا اور حضرتؒ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ فرمایا، حضرتؒ کو اتنے مجمع میں تکلف ہوا تو فرمایا کہ "یہ حضرت سہارنپوری کا رومال ہے برکت کے لئے بیٹھ جایئے۔" حضرتؒ نے تعمیل فرمائی۔

اس پورے عرصہ میں حضرت کو بار بار ترجمانی کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا اور مولانا کا اعتماد بڑھتا رہا۔ اہم اہم مواقع پر حضرتؒ کو خطاب کے لئے فرماتے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ لکھنؤ سے رات کو نظام الدین پہنچا، صبح مولانا نے مجھی کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ سلام پھیرنے کے بعد فرمایا کہ کچھ کہیے۔ میں نے دیکھا، سامنے پہلی صف میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، قریشی صاحب، ملک دین محمد (دہلی کے ممتاز ترین مسلمان ٹھیکیدار اور تاجر) بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں بالکل خالی الذہن ہوں۔ فرمایا آپ کہنا تو شروع کیجئے۔ میں نے کہنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ مولانا متوجہ ہیں اور مضامین کا ورود ہو رہا ہے۔ اسی اعتماد اور تجربہ کی بنا پر میں نے مولانا کے گرامی ناموں اور ارشادات کو سامنے رکھ کر جو میرے نام آئے تھے، ایک رسالہ "ایک اہم دینی دعوت" کے نام سے مرتب کیا۔ مولانا نے اسکو من اول الی آخرہ لفظاً لفظاً سنا۔ چند جگہ خفیف سی لفظی ترمیمیں کیں، سننے کے بعد بہت دعائیں دیں۔

اسی مناسبت واعتماد کی بنا پر حضرت زیادہ سے زیادہ قرب اور مجالس میں میری شرکت پسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ شہر کے کسی گشت یا قرب وجوار کے کسی نظام میں ذمہ داروں نے مجھے بھی بھیج دیا، مولانا کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ایک آدمی میری باتیں سمجھنے والا تھا، تم نے اس کو بھی بھیج دیا۔ اب میں کس سے بات کروں؟" (۱)

مارچ ۱۹۴۴ء کو ڈاکٹر صاحب بھی نظام الدین تشریف لے گئے، مولانا ڈاکٹر صاحب کی آمد سے بہت مسرور ہوئے، جب چلنے لگے تو فرمایا:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تبلیغ ودعوت میں انہماک

حضرت دہلویؒ کی شفقتیں بڑھتی رہیں، اور حضرتؒ کا دعوت و تبلیغ میں

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۹۲-۲۹۳

انہماک بڑھتا گیا، یہاں تک کہ حضرت نے دارالعلوم سے ضابطہ کا تعلق اور ملازمت ترک کرنے کا ارادہ فرمالیا۔ حضرت دہلوی کے سامنے جب حضرت نے اپنے اس رجحان کا ذکر فرمایا تو فرمانے لگے: "ہمارے بزرگ کسی ذریعہ معاش اور ملازمت کو اس وقت تک ترک کرنے کا مشورہ نہیں دیتے جب تک اس کا نعم البدل مہیانہ ہو جائے۔" حضرت نے دوسری بار پھر عرض کیا تو مولانا نے وہی جواب دیا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:

"غالباً مولانا میری طبیعت اور عزم و فیصلہ کی پختگی کا اندازہ فرمارہے تھے، فجر کی نماز اور تقریر کے بعد مجھ سے خود فرمایا کہ مولانا آپ کو دارالعلوم سے کیا ملتا ہے؟ میں نے کہا پچاس روپیہ۔ یہ سن کر بڑے جوش کے ساتھ فرمایا الحمد حضرت! ایسے ہزاروں پچاس آپکے غلاموں کے قدموں پر نثار ہوں گے۔ یہ کہہ کر اجازت دے دی۔"(۱)

۱۹۳۳ء کے اختتام تک حضرت اعزازی طور پر دارالعلوم کی خدمت کرتے رہے، اس دوران تبلیغی دوروں کا سلسلہ پورے زور و شور سے جاری رہا، لیکن پھر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اصرار پر دوبارہ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کو دارالعلوم سے باضابطہ منسلک ہو گئے اور سید صاحب ہی کے حکم پر تنخواہ لینا بھی قبول فرمالیا جسکا سلسلہ صرف ایک سال جاری رہا۔

ان تبلیغی اسفار میں مختلف دینی مدارس میں جانا ہوتا، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدارس کے درمیان جو ایک خلیج حائل تھی، وہ دور ہوئی۔ خاص طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء اور قدیم دینی مدارس (جن میں دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سر فہرست ہے) کے درمیان جو ایک حجاب تھا وہ دور ہوا اور وہ قرب وارتباط اور تعارف واعتماد پیدا ہوا جس کی ایک مسلک و مقصد کی تعلیم کا ہوں اور دینی مرکزوں میں عرصہ سے ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۰۹

پشاور کا ایک تاریخی سفر

پشاور میں سیرت کمیٹی کے زیر اہتمام سالانہ جلسوں کا سلسلہ عرصہ سے جاری تھا، اور ہر سال مشاہیر علماء و مقررین کو اس میں دعوت دی جاتی تھی۔ کئی سالوں سے خاص طور پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو بلایا جارہا تھا۔ مارچ ۱۹۴۴ء کے جلسہ میں مجلس کے سکریٹری حاجی ارشد صاحب نے خصوصی طور پر دو ندوی فضلاء کو مدعو کیا، ان میں حضرتؒ کے علاوہ دوسرے ندوی فاضل مولانا شاہ جعفر صاحب پھلواروی ندویؒ تھے۔ حضرتؒ کو جب یہ دعوت نامہ موصول ہوا تو پشاور کی نسبت و تعلق سے خاص طرح کی مسرت اور انشراح محسوس ہوا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے بھی اجازت مرحمت فرمادی۔ مولانا عبد الغفار صاحب جونپوری ندوی مرحوم کی رفاقت میں حضرت نے سفر کا عزم فرمالیا۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی علالت کا زمانہ تھا۔ حضرتؒ نے پہلے نظام الدین حاضری دی، مولانا نے دعاؤں کے ساتھ رخصت فرمایا اور چلتے وقت یہ بھی فرمایا "اپنا کام مت بھولنا۔" حضرت فرماتے ہیں کہ "سفر بڑی فرحت و انبساط کے ساتھ ہوا، پشاور اسٹیشن پر حاجی ارشد صاحب اپنے احباب کے ساتھ استقبال کے لئے موجود تھے۔ قیام کا انتظام صوبہ سرحد اسمبلی کے اسپیکر ملک خدا بخش صاحب کی کوٹھی پر کیا گیا تھا۔

اگلے دن کے پہلے اجلاس میں دونوں تقریروں پر علمی رنگ نمایاں تھا۔ اسلئے عوامی سطح پر اسکا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا، اور وہاں کے ندوی فضلاء یا طلبہ کو اسکا احساس ہوا اور انھوں نے شریفانہ طریقہ پر اس کا اظہار بھی کیا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "قیام گاہ پر آیا تو دعا کی ایک اضطراری کیفیت طاری ہوئی جو اکثر رنگ لاتی ہے۔"

اگلے دن کا جلسہ اصل جلسہ تھا، اس میں پورا شہر امنڈ آیا، دفاتر میں بھی تعطیل کردی گئی اور بڑے بڑے اہم سرکاری عہدیداران بھی شریک ہوئے۔ حضرتؒ

جلسہ میں پڑھنے کے لئے ایک مضمون تحریر فرما کر لے گئے تھے، مگر حاجی ارشد صاحب نے کہا کہ عام طور سے یہ مضامین عوامی جلسوں میں نہیں جچتے۔ حضرتؒ نے برجستہ تقریر شروع فرمادی، مرکزی مضمون غزوہ بدر کی وہ دعا تھی جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا "اللهم إن تهلك هذه العصابة لا تعبد بعدها في الارض" (اے اللہ! اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کی ہلاکت کا فیصلہ کردے گا تو پھر اس کے بعد تیری عبادت نہیں ہو سکے گی)۔

تقریر میں ایسا جوش اور روانی تھی کہ پورا مجمع مسحور تھا، پھر حضرتؒ کے سوز دل اور اضطراب و کرب نے اس میں ایسی تاثیر پیدا کردی تھی کہ لوگوں پر گریہ طاری تھا۔ خود حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت مضامین کا ورود کہاں سے ہو رہا تھا، اور زبان میں طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ میں خود بھی اس کے زور میں بہہ رہا تھا اور مجمع بھی مست و سرشار تھا۔"

تقریر ختم ہوئی تو بہت سے نوجوان اٹھ کر آئے اور کہنے لگے "فرمایئے کیا حکم ہے؟" اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ پشاور میں ایک خاص دینی فضا قائم ہو گئی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرتؒ نے ان کو تبلیغی طریقہ پر دعوت دی، اور ایک نئی کالونی میں صوبہ سرحد کا پہلا تبلیغی گشت ہوا اور اسی وقت سے صوبہ سرحد میں تبلیغی کام کی بنیاد پڑی۔

حاجی ارشد صاحب کو حضرت سے ایسی محبت و مناسبت پیدا ہو گئی جو بڑے خاص تعلق رکھنے والے مخلصین کو ہوتی ہے، اور حضرت کو بھی مخلص یاو فا سر دکار ہاتھ آیا۔ دوسرے ہی مہینے حاجی صاحب حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرتؒ نے ان کے لئے جو تعارفی خط لکھا اس میں یہ بامعنی فقرہ بھی تھا کہ "ارشد صاحب صوبہ سرحد کے رجل رشید ہی نہیں رجل ارشد ہیں۔" اللہ تعالیٰ نے ان سے بڑا کام لیا، خاص طور پر جاپان میں ان کے ذریعہ

سے لوگوں کو ہدایت ہوئی اور قبول اسلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے علاوہ حجاز مقدس میں بھی ان کے ذریعہ سے تبلیغی کام کا وسیع تعارف ہوا اور خواص نے بھی توجہ کی۔ اللہ کو اگر منظور ہوتا تو ان سے اس کام کو بہت نفع ہوتا لیکن ان کی زندگی نے وفانہ کی اور ۱۲ر شعبان ۱۳۸۲ھ کو انہوں نے مدینہ منورہ سے واپسی پر ایک کار حادثہ میں شہادت پائی۔ غفر اللہ لہ و رفع درجاتہ

صوبہ سرحد کا دورہ

پشاور کے اس سفر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرتؒ نے ان علاقوں کا بھی دورہ کیا جن کو حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کے مرکز ہونے کا شرف حاصل رہا تھا، چونکہ حضرت سید صاحبؒ کی تحریک سے گہرا تعلق تھا۔ اس میں بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ سیرت سید احمد شہیدؒ کے آئندہ ایڈیشن میں یہاں سے حاصل کردہ مزید معلومات کا اضافہ کیا جائے اور مخصوص مقامات کی تصاویر اور نقشے لے کر کتاب میں شامل کئے جائیں جن سے علمی و جغرافیائی اعتبار سے کتاب کی وقعت میں اضافہ ہو، حاجی ارشد صاحب نے اس کے لئے ایک نقشہ نویس کو ساتھ کر دیا۔

حضرتؒ سب سے پہلے اکوڑہ خٹک تشریف لے گئے جہاں حضرت سید صاحب کی تحریک جہاد کی بنیاد پڑی تھی اور سب سے پہلی جنگ لڑی گئی تھی۔ وہاں سے شیدو، صوابی، تحصیل مانیری اور ضلع مردان کے کئی مقامات پر ہوتے ہوئے پنجتار پہنچنا ہوا۔ مانیری کے قصبہ ہنڈ میں ایک خطرناک لطیفہ پیش آیا جس کو حضرتؒ کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے:

''ہم لوگ سیدھے ہنڈ کی مسجد میں پہنچے، معلوم کیا کہ کوئی یہاں ایسے صاحب ہیں جن سے کچھ تاریخی معلومات حاصل ہو سکیں؟ لوگ سردار خادی خاں کے خاندان کے ایک معزز فرد کو بلا لائے جو لاہور میں ریلوے کے کسی عہدہ پر تھے، انھوں نے کہا آپ اتنی دور سے یہاں کس کام کے لئے

آئے ہیں؟ میں نے کہا کہ مجھے تاریخی ذوق ہے اور میں یہاں کے حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے اپنے کام کے لئے تو کوئی اتنی دور سے نہیں آتا۔ پھر کہنے لگے کہ لکھنؤ کے ایک صاحب ابوالحسن علی ندوی ہیں انھوں نے ایک کتاب "سیرت سید احمد شہید" لکھی ہے جس میں ہمارے بزرگوار سردار خادی خاں کے متعلق سخت الفاظ آئے ہیں جو غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میں نے ٹالنے کے لئے کہا کہ ہم لوگ کتابیں لکھتے ہی رہتے ہیں۔ اس وقت انھوں نے نہ میرا نام پوچھا اور نہ میں نے بتایا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ انھوں نے اپنا مہمان بنایا۔ شام کو انھوں نے کہا کہ چلئے آپ کو دریائے اٹک کی سیر کرائیں۔ میں اور مولوی عبدالغفار صاحب گئے۔ ایک جگہ مولوی عبدالغفار صاحب تو وضو کے لئے بیٹھ گئے۔ ہم اور وہ تنہا رہ گئے۔ انھوں نے کہا آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا کہ علی۔ کہا کہ آپ ہی تو ابوالحسن علی تو نہیں ہیں (خیال رہے کہ پٹھان حضرات بندوق ساتھ رکھتے ہیں) اور جگہ بالکل سناٹے کی تھی میں بڑے مخمصہ میں پھنسا۔ میں نے کہا کہ لکھنؤ شیعوں کا شہر ہے وہاں سنیوں کے نام بھی علی حسین کثرت سے ہوتے ہیں اس پر انھوں نے مزید جرح نہیں کی اور ہم لوگ مغرب کی نماز ادا کرکے قیام گاہ پر آگئے۔ رات کو انھوں نے رئیسانہ اور شریفانہ ضیافت کی۔ اگلے دن جب میں رخصت ہونے لگا میں نے ان کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کھیتوں پر گئے ہوئے ہیں، میں نے بلوایا میں کہا کہ اب میں یہاں سے جارہا ہوں، اب چھپانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں ہی "سیرت سید احمد شہید" کا مصنف ابوالحسن علی ندوی ہوں۔ وہ بڑے اخلاق سے ملے، اور کہا کہ ابھی تک انجان بن کر آپ ہمارے مہمان رہے۔ اب تعارف ہوا ہے اب آپ کچھ وقت یہاں رہئے، تاکہ ہمیں آپ کی میزبانی کا موقع ملے۔ انھوں نے یہ بات خلوص اور شرافت سے کہی تھی۔ مگر ہمارا پروگرام آگے کا بنا ہوا تھا، میں نے معذرت کی اور ماتیری کے لئے

روانہ ہو گیا۔"(۱)

پنجتار پہنچ کر حضرت پر جو تاثر ہوا اس کا تذکرہ بھی کاروان زندگی سے نقل کیا جاتا ہے:

"پنجتار جا کر طبیعت سب سے زیادہ متاثر ہوئی، خاص طور پر جب اس مسجد میں قدم رکھا جہاں حضرت سید صاحبؒ ان کے رفقاء عالی مقام اور مجاہدین باصفا نے برسوں نمازیں پڑھیں، اس کی فضا کو اپنی حرارت ایمانی سے گرم اور اس کی زمین کو اپنے اشکوں سے نم کیا تھا تو بے اختیار دل ایسا امنڈ آیا اور طبیعت دعا کی طرف اس طرح متوجہ ہوئی کہ حرمین شریفین اور زندگی کی مخصوص ساعتوں کے علاوہ کبھی اور کہیں اس کا تجربہ نہیں ہوا۔"(۲)

گنج شہیداں بالاکوٹ پہونچ کر حضرت فرماتے ہیں:

"یہ اس کاروان ایمان و عزیمت کی آخری منزل تھی جس کا سفر ہمارے ہی وطن رائے بریلی سے شروع ہوا تھا، یہاں کی زمین کا ہر ذرہ ہم کو عزیز تھا، اور آنے والوں کو حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی زبان میں پیام دیتا تھا۔

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں (۳)

سفر پر سفر

پشاور، لاہور، پٹھان کوٹ ہوتے ہوئے سہارنپور واپسی ہوئی ہی تھی کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا ایک مکتوب ملا جس میں حیدر آباد، سندھ کے ایک بڑے جلسہ میں حاضری دینے اور اس کام کو اہمیت کے ساتھ بیان کرنے اور

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۰۲-۳۰۳

(۲) کاروان زندگی اول ص ۳۰۷

(۳) ایضاً

لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کی شدید ضرورت کا اظہار کیا گیا تھا۔ ایک طویل سفر سے واپسی، صحت کی کمزوری، دارالعلوم میں حاضری کا تقاضا، یہ ایسے موانع تھے کہ شاید کوئی دوسرا ہوتا تو معذرت کردیتا، لیکن حضرت دہلویؒ سے نہایت درجہ عقیدت و محبت پھر اس کام کی اہمیت اور حضرتؒ کے درد و فکر کا نتیجہ تھا کہ حضرتؒ نے سفر کا عزم فرمالیا۔ مولانا عبدالغفار صاحب کو لکھنؤ بھیجا اور خود تنہا روانہ ہوگئے۔ جلسہ میں حضرتؒ نے تقریر فرمائی پھر دو روز کے لئے پیر جھنڈا کے مشہور مرکز تشریف لے گئے جس سے حضرت سید صاحبؒ کا خاص تعلق رہا تھا، پھر وہ اسی سلسلہ قادریہ راشدیہ کی خانقاہ تھی جس سے حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے واسطے سے حضرت وابستہ تھے۔ اس وقت کے سجادہ پیر ضیاء الدین شاہ صاحب نے بڑی شفقت و محبت کا معاملہ کیا۔ جلسہ میں حضرت کے استاذ الاستاذ مولانا عبید اللہ سندھی صاحبؒ بھی تشریف لائے تھے۔ اس وقت وہیں مدرسہ کی بالائی منزل پر مقیم تھے۔ انھوں نے حضرت پر بڑی شفقت فرمائی، پیرانہ سالی کے باوجود باصرار خود ہی حضرت کی قیام گاہ پر تشریف لاتے اور دیر تک بیٹھتے۔

حیدر آباد، کراچی میں مختصر قیام کے بعد دہلی ہوتے ہوئے لکھنؤ واپسی ہوگئی۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی علالت اور وفات

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی علالت شدت اختیار کرچکی تھی اور خطرہ منڈلا رہا تھا۔ حضرتؒ جون ۱۹۴۴ء میں طویل قیام کی نیت سے نظام الدین تشریف لے گئے۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی پہلے سے مقیم تھے۔ کچھ ہی دنوں میں حضرت شیخؒ اور حضرت رائے پوریؒ بھی تشریف لے آئے۔ اس وقت تک حضرتؒ کا حضرت رائے پوری سے ارادت کا تعلق نہیں ہوا تھا۔

اس مرض کی شدت میں بھی حضرت کی بار بار طلبی ہوتی اور بڑی شفقت و محبت کا اظہار ہوتا۔

حضرت فرماتے ہیں:

"ایک روز بعض خاص حالات کی بنا پر مجھ پر خیالات و وساوس کا ہجوم تھا اور طبیعت بہت متاثر تھی۔ مغرب کی نماز کے سلام پھیرتے ہی طلبی ہوئی۔ نہایت شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا اور دیر تک بالوں پر ہاتھ پھیرتے رہے، پھر معلوم نہیں کس طرح اس ضعف کی حالت میں (کہ چہرہ کو حرکت دینی بھی مشکل تھی) سر اٹھا کر میری پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ تم تھک گئے، تمہارا کوئی معین نہیں۔ اسی طرح تسلی کے الفاظ فرماتے رہے۔"(۱)

حضرت مولانا کو حضرت رائے پوریؒ سے بڑی عقیدت تھی، اس حال میں بھی اپنے تعلق والوں کو ان کی مجلس میں بیٹھنے اور فائدہ اٹھانے کی تاکید فرماتے تھے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ میری تلاش ہوئی، میں مجمع سے گھبرا کر پولیس چوکی سے آگے سڑک پر چلا گیا تھا۔ آخر مولانا انعام الحسن صاحب نے مجھے دریافت کر لیا، اور میں حاضر ہوا۔ مجھے اشارہ فرمایا کہ کان میرے لبوں کے پاس لاؤ پھر فرمایا کہ لوگوں کو ذکر کی تاکید اور مولانا عبد القادر صاحبؒ کی مجلس میں بیٹھنے کی ہدایت کرو۔"(۲)

یہ وفات سے چار پانچ روز پہلے کا واقعہ ہے۔

۱۲-۱۳ر جولائی کی درمیانی شب میں طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور صبح کی اذان سے پہلے پہلے حادثہ پیش آ گیا۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں: "سوانح کے الفاظ میں عمر بھر کا تھکا ہوا مسافر کہ شاید کبھی اطمینان کی نیند سویا ہو منزل پر پہنچ کر میٹھی نیند سویا۔"

حضرتؒ پر اس حادثہ کا گہرا اثر پڑا۔ سکون کے لئے تدفین کے بعد اپنے بعض

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۱۰

(۲) ایضاً

رفقاء کے ساتھ ہمایوں کے مقبرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ واپسی پر خود حضرت شیخ نے حضرتؒ سے تعزیت کی اور تسلی دی۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات کے بعد

حضرت کا موقف، طریق فکر اور عملی جدوجہد

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی حیات میں حضرتؒ پوری طرح تبلیغی کام میں منہمک رہے۔ حضرت دہلویؒ کی بے پایاں شفقتیں اور عنایتیں حضرت پر اتنی تھیں کہ کسی دوسری فکر یا تحریک کی طرف نظر کرنے کا یا قاعدہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا، لیکن حضرت دہلویؒ کی وفات کے بعد وہ کیفیت نہیں رہی۔

اس باب میں حضرتؒ نے امام غزالیؒ کے بارے میں جو دو سطریں تحریر فرمائیں ہیں وہ پوری طرح خود حضرت پر صادق آتی ہیں "طلوبت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز تھا، انھوں نے فکر و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہم عصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی، اور جس ترقی یافتہ مقام پر پہونچے ان کے کانوں میں یہی صدا آئی

ع مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں ہے"(۱)

حضرتؒ نے "میرا موقف اور طریق فکر" کے عنوان سے اس کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے یہاں قدرے اختصار کے ساتھ اسکو نقل کیا جاتا ہے۔

"حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی سے گہری عقیدت، ان کے فہم دینی و اخلاص پر کامل اعتماد، اس کام کی افادیت و ضرورت پر یقین اور نہ صرف عملی شرکت بلکہ ایک داعی و ترجمان کے فرائض انجام دینے کے ساتھ واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانچہ کی شکل شکست و ریخت عمل میں نہیں آئی تھی اور اسکی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول ص ۲۹

فکری سانچہ نے نہیں لی تھی۔

میرا ایک فکری و علمی پس منظر (Background) تھا۔ اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں اور ان کی مرکزی شخصیتوں کا میں نے نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان کے تعارف و تذکرہ نویسی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ میں ہر دور میں منصوصات و غیر منصوصات اور مقاصد و وسائل میں فرق کرتا رہا، اور میرے نزدیک خوب سے خوب تر کی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی طرح میرے نزدیک ہر تحریک، ہر دعوت اور ہر ادارہ میں جو دین کی خدمت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے قائم ہو، نمو و ارتقاء زندگی اور اس کے مسائل سے واقفیت، اور جائز اور ضروری حد تک ان کی تکمیل اور زندگی سے تطبیق کی کوشش ضروری ہے ورنہ وہ تحریک اور ادارہ نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم اور جمود کا شکار ہو جائے گا اور اس کی افادیت محدود سے محدود تر ہو کر رہ جائے گی۔

ان خیالات نے جو میرے خاص ماحول، مطالعہ اور ذہنی ساخت کا نتیجہ تھے کسی دور میں ساتھ نہیں چھوڑا، اور میں مولانا کی حیات میں بھی کبھی کبھی تنہائی میں اقبال کا یہ شعر پڑھتا تھا ؎

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

لیکن مولانا کی قوت نسبت اور بے پایاں شفقت اور عملی مشغولیت نے ان کی حیات کے پورے عرصہ میں اس فکر کو دبا رکھا تھا۔ مولانا کی وفات کے بعد وہ نمایاں طریقہ پر ابھرنے لگی، اس نے پہلے یہ شکل اختیار کی کہ کام کو جو اب سارے ہندوستان میں تقریباً پھیل چکا تھا اور دوسرے ممالک کی طرف بڑھ رہا تھا، کچھ زیادہ منظم، موثر اور ذہین و علمی طبقہ کے لئے اطمینان بخش اور پرکشش بنانے کے لئے اصول دعوت اور اس کے ان اجزاء کو قائم رکھتے

ہوئے (جن کو اس تحریک میں چھ نمبر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) کم تبدیلیوں اور زیادہ اضافوں کی ضرورت ہے۔ مختلف مجالس میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور ان کے اہل شوریٰ سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی مگر اندازہ ہوا کہ ان کا ذہن اس کا ساتھ نہیں دیتا اور وہ اس کی تائید میں نہیں ہیں اور شاید مولانا کی وفات کے بعد دعوت کے اس ابتدائی مرحلہ میں اسی احتیاط کی کسی قدر ضرورت بھی تھی۔ کئی بار متوجہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب تک خود اصل داعی کے ذہن میں جو دعوت کا روح رواں ہے کسی ضرورت کا احساس اور کسی تبدیلی کا تقاضا پیدا نہ ہو باہر سے مشورہ دینا مفید اور موثر نہیں ہوا کرتا۔"(۱)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے دل میں حضرتؒ کی پوری قدر و منزلت تھی، کام کے سلسلہ میں حضرتؒ کی قربانیوں کا اعتراف بھی تھا مگر وہ اس کام کو بالکل اسی طریقہ پر لے کر چلنا چاہتے تھے جو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اختیار فرمایا تھا اور کام کی وسعت کے باوجود وہ اس کے طریقہ کار میں وسعت کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ اسی زمانہ کے ایک طویل یادگار مکتوب کے بعض اقتباسات یہاں پر پیش کئے جارہے ہیں جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے حضرتؒ کو تحریر فرمایا تھا۔

"مخدوم و مکرم و معظم و محترم جناب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت عالی! مجھے دل سے اعتراف ہے کہ آپ نے حضرت مرحوم کی اس وقت قدر کی جس وقت یہ ناچیز ناقدری کر رہا تھا، آپ نے اس عمل کی طرف قدم اٹھایا جس وقت یہ حقیر اس سے پہلو تہی کر رہا تھا۔ آپ سنتے تھے، تعمیل کرتے تھے، سمجھتے تھے اور محفوظ رکھتے تھے اور اس کام کے انہماک اور دعوت کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے جارہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے

(۱) کاروان زندگی اول ۳۱۴-۳۱۶

آپکی دعوت میں تاثیر دی اور اضلاع متصلہ سے باہر یہ کام آپ ہی کی وساطت و دعوت سے پھیلا اور علمی حلقہ میں آپ ہی کی وساطت سے یہ چیز پہنچی۔

علماء میں جماعتوں کو لیکر پھرنے کی طرف آپ ہی نے سبقت فرمائی، علمی حلقہ کی طرف اس دعوت کو لیکر آپ ہی بڑھے، علماء کی طبائع کا جائزہ حضرتؒ مرحوم آپ ہی کی وساطت سے لیا کرتے اور ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ آپ ہی کے ذریعہ فرماتے۔

غرض کہ حق تعالیٰ شانہ آپ کو نہایت ہی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ نے خوب ساتھ دیا۔"(۱)

اس کے بعد حضرت نے یہ طے فرمالیا کہ مرکز نظام الدین سے تعلق اور دعوت کی مشغولیت کو جاری رکھتے ہوئے اپنے دائرہ کار میں اس کو زیادہ مفید بنانے اور دعوت و تفہیم کے لئے اپنی زبان استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ سلسلہ ۴۴ء سے لیکر ۵۲-۵۳ء تک جاری رہا۔ اس کے لکھنؤ اور اس کے اطراف پر بڑے اچھے اثرات مرتب ہوئے، اور یہاں کا صاحب علم و فکر طبقہ اس کام کی طرف متوجہ ہوا۔

اسی سلسلہ میں حضرت نے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی رفاقت میں صوبہ بہار، صوبہ سرحد پنجاب اور کشمیر کے دورے فرمائے اور ان علاقوں میں بڑے کامیاب اجتماعات ہوئے۔ ان کے علاوہ مراد آباد، بھوپال، سورت، بستی، سیتاپور، کانپور اور خود لکھنؤ میں اہم اجتماعات منعقد ہوئے جن میں حضرتؒ اور مولانا منظور نعمانیؒ کے خطابات ہوئے۔

۲۵ر جولائی ۱۹۴۵ء میں کشمیر کا دورہ ہوا۔ سری نگر میں میر واعظ مولانا محمد یوسف صاحب کے دولت کدہ پر قیام رہا۔ اسی سفر میں نسیم باغ میں مولانا ابو الکلام

---

(۱) حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مشاہیر امت کی نظر میں از مولانا [illegible] صاحب ص ۴۹-۵۰

آزاد سے ملاقات ہوئی۔

لکھنؤ کے بڑے اجتماعات میں لکھنؤ کے ایک قصبہ رحیم آباد کا اجتماع خاص طور پر قابل ذکر ہے جو ۶، ۷، ۸ر مئی ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ کی جماعت مرکز کے زیر انتظام اسی نقشہ پر منعقد ہوا اور اس میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے علاوہ خود حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے بھی شرکت فرمائی، ان حضرات کے علاوہ حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بھی جلسہ میں شریک ہوئے۔

اس زمانہ میں تبلیغی اجتماعات جمعہ کی شب میں دار العلوم کی مسجد میں منعقد ہوا کرتے تھے، جماعتیں مسجد میں قیام کرتی تھیں، شہر کے دینی ذوق رکھنے والے بھی شب گذاری کے لئے آجاتے تھے۔ مغرب بعد کی تقریر حضرت یا مولانا نعمانیؒ کی ہوتی تھی۔ حضرت کی مرتب کردہ کتاب جو سیرت رسول اکرمؐ کے نام سے طبع ہوگئی ہے، اس وقت پڑھ کر سنائی جاتی تھی۔ فجر بعد حضرت ہی کا خطاب عموماً ہوتا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ

”آخر شب نوافل وذکر سے مسجد میں عجب نورانی فضا نظر آتی تھی۔ اکثر اہل ادراک اس میں عجیب سکینت و نورانیت محسوس کرتے تھے۔ لوگوں میں ایک دوسرے کی خدمت کرنے، ایثار و تواضع اور محبت کے نمونے صاف نظر آتے تھے۔ دار العلوم کے طلبہ کو بھی ان اجتماعات سے بڑا فائدہ پہنچا اور اپنے اپنے وطن جاکر انھوں نے کام کی داغ بیل ڈالی۔“

ریاضت ومجاہدہ کا دور

حضرتؒ کی زندگی کے مختلف ادوار میں سخت دشوار گذار گھاٹیاں بھی آئیں اور بڑی ریاضتوں سے بھی گذرنا پڑا لیکن حضرت نے بڑے صبر، استقامت کے ساتھ ان کو برداشت کیا۔ جب حضرتؒ کے والد ماجد نے رحلت فرمائی اس وقت

حضرت کی عمر صرف نو سال تھی، کئی سال سخت تنگی کے گزرے پھر بھائی کو اللہ نے فراخی عطا فرمائی، تعلیم و تربیت کا انتظام ہوا، مگر اس وقت ماحول کچھ ایسا تھا کہ لوگ طعنہ دیتے تھے، اس کا دل پر اثر پڑنا طبعی ہے، حضرت برداشت فرماتے رہے۔ اپنوں نے بھی ملامت کی، غیروں نے بھی کہا، مگر استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ مختلف راستوں سے ریاضتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ دارالعلوم میں تدریس کا آغاز ہوا۔ حضرت میں وہی زاہدانہ رنگ تھا جو آباؤ کرام سے ورثہ میں ملا تھا۔ چالیس روپیہ تنخواہ تھی، وہ بھی چھوڑ دی۔ وہ زمانہ بڑے مجاہدہ کا گزرا، ناشتہ کا تو گذر ہی نہ تھا، فجر بعد ٹہلنے تشریف لے جاتے اور ایسے وقت آتے کہ ناشتہ کا وقت گذر چکا ہو، درجہ میں پڑھانے کے لئے بیٹھ جاتے، اسی زمانہ کے ایک شاگرد مولانا سید محمد طاہر صاحب منصورپوری خود اپنی آپ بیتی سناتے ہیں کہ

"ایک مرتبہ ہمیں شبہ ہوا اور یہ تقاضا ہوا کہ ناشتہ تیار کر کے لے جائیں جب ہم ناشتہ لے کر پہونچے تو ان کو ناشتہ نہ کرنے کی وجہ اس حال میں دیکھا کہ کمزوری کیوجہ سے اٹھنا مشکل ہو رہا تھا، اتفاق سے اس دن اور دنوں کے مقابلہ میں ناشتہ کی حاجت زیادہ تھی چنانچہ وہ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں اور کھایا بھی رغبت سے۔"(۱)

اسی زمانہ میں حضرتؒ ایک سال کے لئے دارالعلوم میں الگ مکان لے کر رہے تھے، حضرتؒ اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"۱۹۴۶ء کی ابتداء میں جب میں دارالعلوم سے ملازمت کا تعلق منقطع کر چکا تھا اور اپنے شوق سے بعض درجوں میں کچھ اسباق پڑھا دیا کرتا تھا، معلوم نہیں کیا خیال پیدا ہوا کہ دارالعلوم کی مسجد سے متصل جو چھوٹا سا مکان تعمیر ہوا تھا اس میں، میں نے بھائی صاحب سے ضابطہ کی اجازت لیکر رہنا شروع کر دیا اور والدہ صاحبہ اور گھر والوں کو بھی لے آیا، اس وقت

(۱) ماخوذ از تعمیر حیات مظہر اسلام نمبر ص ۲۸۶

معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، نہ کتابوں کے معاوضہ اور نفع کا کوئی سلسلہ۔ یہ سال اقتصادی طور پر سخت پریشانی کا گذرا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ امین آباد کے چوراہے پر نظیر آباد جانے والی سڑک کے کنارہ کھڑے ہو کر میں نے جیب سے کئی مرتبہ گھڑی نکالی کہ اس کو کسی گھڑی کی دوکان پر آدھے پونے دام پر بیچ دوں، اس سے کچھ دن کام چلے لیکن پھر اس خیال سے ہمت نہیں ہوئی کہ دوکان دار کہیں چوری کا نہ سمجھے۔ زیادہ قرض چڑھ گیا اور دفتر دارالعلوم نے مطالبہ کیا تو اللہ مغفرت کرے مولوی ظہیر الحسن صاحب رئیس کاندھلہ (شہید ۱۹۴۷ء) کو خط لکھا اور ایک رقم قرض منگوائی۔ انھوں نے بڑے اہتمام سے اور بڑی عجلت کے ساتھ بھیجی۔ یہ پورا سال بڑی پریشانی میں گذرا اور سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بے برکتی کیوں ہے؟

ایک روز معلوم ہوا کہ بھائی صاحب میرے اس علاحدہ قیام سے بہت مغموم اور متاثر ہیں، ان کو اس کا بڑا قلق ہے کہ ان کی زندگی میں، میں نے لکھنؤ میں رہتے ہوئے علاحدہ قیام کا انتظام کیا، میں نے ان سے رو کر معافی مانگی اور جبکہ تقریباً ایک سال گذر رہا تھا پھر اپنے اسی قدیم مکان میں آ گیا۔ پھر یاد نہیں کبھی ایسی تنگی اور پریشانی پیش آئی ہو۔"(۱)

دوہری آزمائش

اس تنگی و پریشانی کے حال میں ایک طرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کی طرف سے اور دوسری طرف عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کی طرف سے پیش کشیں ہوئیں۔ یہ آزمائش پہلی آزمائش سے بڑھ کر تھی مگر اللہ نے اس میں بھی حضرت کو ثابت قدم رکھا۔

یہاں امام احمد کا وہ واقعہ یاد آتا ہے کہ جب واثق کے بعد متوکل کا دور آیا اور اس نے واثق کے بالکل برخلاف بڑے اعزاز و اکرام کا معاملہ کیا تو امام صاحبؒ فرماتے

(۱) کاروان زندگی اول ۲۲۲-۲۲۳

تھے یہ آزمائش پچھلی آزمائش سے بھی زیادہ سخت ہے۔

حضرت خود تحریر فرماتے ہیں:

"مجھے جو چیز انکے قبول کرنے سے مانع اور دامنگیر ہوئی وہ یہ تھی کہ اگر دنیا میں کسی نے پوچھا یا آخرت میں سوال ہوا کہ تم نے اپنے گھر اور مدرسہ کی ملازمت اسلئے چھوڑی تھی کہ وہاں تنخواہ قلیل تھی اور دوسری جگہ کی ملازمت اسلئے قبول کی کہ اس میں اضعافاً مضاعفہ مل رہا تھا تو میں کیا جواب دونگا۔" (۱)

ایک مبارک قافلہ کی دائرہ شاہ علم اللہؒ آمد

فروری ۱۹۴۷ء کی کسی تاریخ کو حضرت رائے پوریؒ، حضرت شیخ الحدیثؒ مولانا محمد یوسف صاحبؒ علماء واعیان کی ایک جماعت کیساتھ لکھنؤ اور رائے بریلی تشریف لائے۔ رائے بریلی تشریف آوری کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں:

"۸ر ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ (۳۰ر فروری ۱۹۴۷ء) کو اس پورے قافلہ کا مستقل لاری کے ذریعہ رائے بریلی ورود ہوا۔ استقبال کے لئے بستی کے سارے حضرات نیز اصحاب شہر موجود تھے۔ ایک شب و روز قیام رہا جو عجیب کیف و سرور کا تھا۔ راقم سطور جب صبح حضرت شیخ کو وضو کرانے لگا (اسی دن واپسی تھی) تو شیخ نے بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا "مولوی صاحب! یہاں سے جانے کے لئے دل بہت برا ہو رہا ہے۔" (۲)

حیدر آباد کا سفر اور مولانا گیلانیؒ سے ربط و تعلق

حضرتؒ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف "نزهة الخواطر" کا ابھی تک دوسرا حصہ چھپ سکا تھا اور وہ بھی حافظ ابن حجر کی "الدرر الكامنه" کے ذیل کے طور پر شائع ہوا تھا۔ حسن اتفاق کہ مولانا مناظر

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۹۵، یہ ملحوظ رہے کہ حضرت نے جب ندوہ کی تنخواہ ترک فرمائی تو وہ صرف چالیس روپیہ تھی اور حیدر آباد و علی گڑھ کی طرف سے چار سو اور سات سو کی پیشکش تھی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ آج سے ۵۳ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ (۲) سوانح حضرت شیخ الحدیث ص ۱۱۳

احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ملاحظہ فرمایا تو حضرت کو بڑے گہرے تاثر کا خط لکھا اور اسکے شائع ہونے کی تحریک فرمائی۔ دائرۃ المعارف کے ذمہ داروں کو اس کی طباعت پر آمادہ کیا، جب اس کام میں تاخیر ہوئی تو مولانا ہی کی دعوت پر حضرتؒ نے حیدر آباد کا سفر کیا، اور براہ راست دائرۃ المعارف کے ذمہ داروں سے مل کر کتاب کی طباعت کی طرف توجہ دلائی۔ جس کے نتیجہ میں اسکا پہلا حصہ چند ہی مہینوں میں شائع ہو گیا۔ اس سفر میں حضرتؒ، مولانا ہی کے مہمان رہے۔ مولانا سے تعارف تو سالوں سے تھا۔ طالب علمی کے ابتدائی دور میں ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرت کو مولانا سے قرآن مجید میں استفادہ کے لئے حیدر آباد بھیجنے کا بھی ارادہ فرمایا تھا۔ اس کی نوبت نہیں آسکی لیکن حضرتؒ کا تعلق قائم رہا۔ اور ۱۹۴۱ء سے مراسلت کا سلسلہ بھی وقفہ وقفہ سے جاری رہا۔

حضرتؒ نے مولانا کی کتاب "النبی الخاتم" بڑے تاثر کے ساتھ پڑھی تھی۔ خود حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں "میں نے ساری عمر میں سیرت نبویؐ میں رحمۃ للعالمین اور النبی الخاتم سے زیادہ موثر کتاب نہیں پڑھی۔" اس سفر سے مزید قرب و ارتباط کی تقریب پیدا ہوئی۔ حضرت فرماتے ہیں:

> "اس سفر کا سب سے بڑا تحفہ مولانا کی علمی مجالس اور پر لطف و معلومات افزا صحبتیں تھیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے محترم مولانا عبد الباری صاحب ندویؒ سبکدوش وظیفہ یاب ہو کر لکھنؤ آچکے تھے۔" (۱)

اس سفر میں صوفی محمد اقبال صاحب مہاجر مدنیؒ بھی ساتھ تھے جو اس وقت حضرت کے دل گرفتہ اور بڑے معتقد تھے۔ بعد میں حضرتؒ ہی کے مشورہ سے حضرت شیخؒ سے وابستہ ہوئے اور اجازت و خلافت پائی۔

رمضان میں نظام الدین کا قیام اور حضرت رائپوریؒ کی خدمت میں

رمضان کی آمد آمد تھی، حیدر آباد سے گجرات اور بمبئی ہوتے ہوئے حضرتؒ

(۱) پرانے چراغ اول ص ۳۲۲

رائپور اور سہارنپور ایک ایک روز کے لئے تشریف لائے۔ سہارنپور میں معلوم ہوا کہ شیخ نظام الدین تشریف لے گئے ہیں، حضرت دو تین روز قیام کے ارادہ سے نظام الدین تشریف لے گئے۔ جب واپسی کا ارادہ ظاہر فرمایا تو شیخ نے بڑے درد سے فرمایا کہ "مولوی صاحب! ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟" حضرت نے مزید چند روز قیام فرمایا، پھر شیخ کی ایماء سے پورا رمضان نظام الدین میں گذارنے کا فیصلہ فرمالیا۔

اس قیام میں شیخ نے خصوصی توجہ اور شفقت فرمائی۔ عید کے بعد اپنے معمول کے مطابق رائے پور تشریف لے گئے تو حضرت کو بھی ہمراہ لے گئے۔ حضرت رائپوری سے بڑے اختصاص کیساتھ ملایا۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"محبت و اختصاص کے الفاظ کے ساتھ مجھے حضرت رائپوریؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرتؒ سے پہلے ہی سے عقیدت و مناسبت تھی اور ان کی شفقت خصوصی بھی اپنے حال پر پاتا تھا لیکن اس حاضری کے بعد سے اس تعلق میں اور استحکام اور استقلال پیدا ہو گیا۔" (۱)

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی طرف سے اجازت وخلافت اور خصوصی شفقت ومحبت

حضرتؒ نے حضرت لاہوریؒ کے شیخ حضرت خلیفہ غلام محمد دینپوریؒ سے بیعت کی تھی لیکن تربیت و سلوک کا تعلق حضرت لاہوریؒ سے ہی رہا۔ تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف، دعوت و تبلیغ اور حضرت دہلویؒ و حضرت رائپوریؒ سے عقیدت ومحبت کے باوجود حضرت لاہوریؒ سے وہ روحانی تعلق نہ صرف یہ کہ قائم رہا بلکہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ ۱۹۳۶ء میں حضرت لاہوریؒ نے حج کا سفر کیا۔ واپسی پر حضرتؒ نے اپنے شیخ کو تہنیت کا خط لکھا۔ اس کے جواب میں حضرت لاہوری نے حضرتؒ کو لاہور بلایا اور ایک روز تنہائی میں اپنے سلسلہ قادریہ میں

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۲۱

اجازت مرحمت فرمائی اور مسجد خیف منیٰ میں انھوں نے جو غیر معمولی دعا و استخارہ کا اہتمام کیا تھا اور جس کے نتیجہ میں اشارۂ غیبی پا کر انھوں نے اجازت و خلافت کا ارادہ فرمایا تھا اس کا بھی تذکرہ کیا۔

حضرت لاہوریؒ کی شفقتوں کا کچھ اندازہ ان خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے اپنے محبوب ترین مسترشد کو ارسال فرمائے ہیں۔

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"میرے دل میں آپ کی جو عزت ہے اسے ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں نے حج کی رات مسجد خیف میں آپ کے درجات کی ترقی کے لئے بارگاہ الٰہی سے استدعا کی اور الحمد للہ اس نے بارگاہ الٰہی میں قبولیت پائی۔"

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"چونکہ آپ میرے ہیں اسلئے اللہ تعالیٰ کا جو فضل آپ پر ہے وہ میرے لئے صد فخر ہے۔ مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہٗ (فرزند اکبر) کی ترقی سے فرحت ہو سکتی ہے اسی طرح بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر اس سے زیادہ خوشی اور سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے۔"

ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"آپ کی ہر کامیابی سے میرے دل میں جتنا سرور اور فرحت حاصل ہوتی ہے غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں جس کو اس درجہ کی راحت حاصل ہو۔ میرا دل آپ کی ترقی دارین کے لئے بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہے۔"

ایک مرتبہ شاہی مسجد میں تالاب کے کنارے مجلس ہو رہی تھی بلا کسی سابقہ تمہید کے اچانک فرمانے لگے "مولوی ابوالحسن صاحب! میں آپ کی شرافت کا قائل ہو گیا۔" تین دفعہ اس جملہ کو دہرایا۔

پنجاب کے ایک عالم مولانا عبد الحنان صاحب کہتے تھے کہ ہم لوگ ملتان جیل

میں تھے، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے حضرات تشریف رکھتے تھے۔ بلا کسی سابقہ تمہید و تقریب کے مولانا احمد علی صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا کہ آپ لوگ مولوی ابوالحسن صاحب کے لئے دعا کیجئے، سب نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی۔

حضرتؒ کے تعلق و محبت کا اندازہ اس مضمون سے کیا جا سکتا ہے جو پرانے چراغ میں حضرت لاہوریؒ پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مکتوبات کے متعلق حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"میں مولانا کے مکتوبات پڑھتا ہوں تو ان کی پدرانہ شفقت اور مربیانہ عنایت کو دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی ہے۔"

مزید فرماتے ہیں:

یہ خطوط قلب حزیں کی تسکین اور یاس و دل شکستگی کے شدید حملوں کے وقت سکون و تقویت کا بڑا ذریعہ ہیں۔

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو بوقت ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں تھی (۱)

(۱) پرانے چراغ اول ص ۲۶۱

آٹھواں باب

اسفارِ حج اور عربوں میں دعوت و تبلیغ کا باقاعدہ آغاز اور اسکی کوششیں

"إلى ممثلي البلاد الإسلامية" کی تصنیف

مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی امارت کا دور تھا اور حضرتؒ اس کام میں اپنی وسیع فکر اور مخصوص اسلوب و طریقۂ کار کے ساتھ مشغول تھے کہ اپریل ۱۹۴۷ء میں اس وقت کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی دعوت پر ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں عرب ممالک کے نمائندوں کو بھی دعوت دی گئی تھی، یہ اپنی فکر و دعوت پیش کرنے کا ایک زریں موقع تھا، مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے حضرتؒ سے دہلی آنے اور اس کانفرنس میں آئے ہوئے عربوں کو خطاب کرنے کی خواہش ظاہر کی، حضرتؒ نے اس کے لئے "إلى ممثلي البلاد الإسلامية" کے عنوان سے ایک مقالہ تیار کیا جسکا مرکزی خیال اور بنیادی مضمون ۱۹۴۳ء میں کی گئی پشاور کی سیرت کانفرنس کی تقریر سے ماخوذ تھا، جس کی تفصیلات گذر چکی ہیں۔

کانفرنس میں عرب ملکوں کے چند ہی نمائندے شریک ہو سکے جن میں شیخ عبد الوہاب عزام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو مصر سے اخوان کے نمائندے کے طور پر تشریف لائے تھے۔ ایک شام کو قریشی صاحب نے چائے کی دعوت کا اہتمام کیا، اس میں ایک یا دو عرب نمائندے شریک ہوئے، اسلئے اس مقالہ کو وہاں پیش

کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔ لیکن اس کے چند ہی مہینے کے بعد حجاز کا سفر ہوا، اور وہاں اس مقالہ نے بڑا کام کیا، اور اس سے وہاں پورا فائدہ اٹھایا گیا۔

پہلا سفرِ حج اور وہاں دعوتی کوششوں کا آغاز

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو ساری زندگی یہ فکر رہی کہ حجازِ مقدس ہی دعوت و تبلیغ کے اس کام کا سرچشمہ اور منبع ہے، وہیں سے یہ صدا بلند ہونی چاہئے، اور وہاں کے باشندوں کو اس کام کی طرف خاص توجہ کرنی چاہئے، مولانا محمد یوسف صاحبؒ کو بھی یہ جذبہ ورثہ میں ملا تھا اور انھوں نے اسی لئے مولانا عبید اللہ صاحب بلیاویؒ کو حجاز کے قیام اور وہاں کے کام پر متعین فرمایا، مولانا پوری جانفشانی کے ساتھ اس میں مشغول رہے، اور بڑی حد تک عوام اس کام سے متعارف ہوئے، مگر وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ اور علمی حلقوں میں ابھی تک اس کی آواز نہیں پہنچ سکی تھی اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس طبقہ کو جس سطح اور جس اسلوب و زبان سے مخاطب کرنا ضروری تھا، اس کی کمی تھی اس کو مولانا خود بھی محسوس کر رہے تھے، اسی لئے انھوں نے مولانا محمد یوسف صاحبؒ کو بار بار توجہ دلائی کہ یہاں کسی ایسے بااثر اور ادبی ذوق رکھنے والے داعی کی ضرورت ہے جو اس طبقہ کو متاثر کرسکے اور ان کو اس کام کی طرف مائل کرے۔ حضرتؒ کے خداداد ادبی ذوق، زبان و بیان پر زبردست قدرت اور پھر اس دعوتی فکر و درد سے یہ حضرات بخوبی واقف تھے۔ چند ہی مہینہ قبل "إلى ممثلي البلاد الاسلامية" کے عنوان سے حضرت نے جو مقالہ تحریر فرمایا تھا (جس میں زبان و بیان کا زور بھی ہے اور دعوت فکر و عمل بھی) وہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے مطالعہ میں آچکا تھا اور مولانا عبید اللہ صاحبؒ کو بھی اس کا علم تھا۔ مرکز نظام الدین میں حضرتؒ کا قیام حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے حجرہ ہی میں ہوتا تھا اور ان سے علمی مذاکرہ اور گفتگو ہوتی رہتی تھی، اسلئے پہلے ہی سے ان کو حضرتؒ کے اس ذوق کا علم تھا، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ

قرعۂ فال حضرت ہی کے نام پڑا، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے مشورہ اور ایماء سے یہ طے ہو گیا کہ حج اور تبلیغ ودعوت کی نیت سے حجاز مقدس کا سفر ہو، حضرت نے والدہ محترمہ اور اہلیہ صاحبہ کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ فرمایا، پھر چھوٹی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ بھی ساتھ ہو گئیں، اس لئے حضرت شیخ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مختصر قافلہ میں گھر کا کوئی ایسا فرد بھی ہونا چاہیے جو حضرت کو خانگی انتظامات سے فارغ رکھے اور یکسوئی کے ساتھ کام ممکن ہو، اس کے لئے حضرتؒ کے سب سے بڑے بھانجے مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کا انتخاب ہوا، جو ایک طرف تو حضرتؒ کے مزاج شناس دینی وعلمی کاموں میں دست راست تھے اور دوسری طرف ان کو تبلیغ ودعوت کا اچھا ذوق تھا، اور مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا اعتماد بھی حاصل تھا۔

۲۶؍جون ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ سے سفر کا آغاز ہوا۔ یہ اس مرد مومن کا سفر حجاز تھا جس کی گھٹی میں وہاں کی عظمت ومحبت پڑی تھی، ۹؍جولائی مطابق ۱۹؍شعبان ۱۳۶۶ھ کو کراچی سے مغل لائن کے اسلامی جہاز سے جدہ روانگی ہوئی، کیفیات کا احاطہ کون کر سکتا ہے، جس کو کئی کئی نسبتیں حاصل ہوں، اس کی قسمت نہ یاوری کرے گی تو پھر کون بخت آور ہوگا، عمر بھر کی تمنا پوری ہو رہی ہے، اپنے خوابیدہ ارمانوں کا کچھ تذکرہ حضرت ممدوح کے الفاظ میں یہ ہے کہ "اکثر "امین آباد" سے تیزی کے ساتھ اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے تانگوں کو دیکھ کر کبھی کبھی دل میں ارمان اٹھتا تھا کہ کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا کہ جب ہم بھی حج کے لئے اسٹیشن جا رہے ہونگے۔" (۱) اللہ نے دن پورے کیے، ضعیف والدہ بھی ساتھ تھیں، سفر بھی بحری جہاز سے اور خاصا طویل وپر مشقت تھا، مگر اللہ نے سہولت وراحت کا غیب سے سامان فرمایا، پھر اس راہ کی مشقتیں بھی اللہ والوں کے لئے عین راحت اور سراپا رحمت، پورا سفر وہاں کی تیاری کرنے کرانے میں گذارا، دعوتی

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۲۹

پروگراموں کا سلسلہ بھی جاری رہا، گھر کی خواتین نے بھی یہ مشن سنبھالا کہ وہاں پہنچ کر کوئی کسر نہ رہ جائے، کوئی رفیق محروم نہ رہے۔

دس روز میں سفر تمام ہوا جدہ کا ساحل آگیا، بندرگاہ پر قدم رکھتے ہی وہ کیف وسرور حاصل ہوا جو اللہ کے بہت سے خوش نصیب بندوں کو حرمین شریفین میں حاصل ہوتا ہے۔ جس بندہ نے اپنی پوری جوانی راہِ حق میں لگائی ہو اس کو نہ نوازا جائے گا تو کس کی قسمت جاگے گی؟ وہاں پہونچ کر حضرتؒ بزبان حال یوں فرماتے ہیں:

درودیوار سے عاشقیت ٹپکتی ہے، یہاں نہ بیت اللہ نہ مسجد نبوی، لیکن محبت کا آئین نرالا ہے، جدہ کی گلیوں سے بھی انس و محبت معلوم ہوتی ہے۔(۱)

جدہ ہی میں رمضان کا چاند ہو گیا، ایک روز وہیں قیام رہا، حج میں ابھی کئی مہینے باقی تھے اسلئے دوسرے دن مدینہ منورہ روانگی ہوئی، راستہ کے کیف و حال کا بیان کوئی کیا کرے۔ حضرت ہی فرماتے ہیں:

"درود شریف زبان پر جاری ہے، دل وفورِ شوق سے امنڈ رہا ہے، عرب ڈرائیور حیران ہے کہ یہ عجمی کیا پڑھتا ہے اور کیوں روتا ہے؟ کبھی عربی میں گنگناتا ہے، کبھی دوسری زبانوں میں!

بھینی بھینی ہوا ہے اور ہلکی ہلکی چاندنی، جس قدر طیبہ قریب ہوتا جارہا ہے، ہوا کی خنکی پانی کی شیرینی اور ٹھنڈک لیکن دل کی گرمی بڑھتی جارہی ہے۔(۲)

مدینہ منورہ پہونچنے سے پہلے بئر عروہ کے قریب حضرتؒ سواری سے اتر گئے، اور ادباً پاپیادہ چلنا ہی پسند فرمایا، قیام کی جگہ بھی مسجد نبویؐ کے زیر سایہ ملی، حضرت مدنیؒ کے برادر خورد مولانا سید محمود احمد صاحب نے بڑی خصوصیت برتی

---

(۱) اپنے گھر سے بیت اللہ تک ص ۲۹

(۲) اپنے گھر سے بیت اللہ تک ص ۳۲

اور مدرسہ علوم شرعیہ کا پورا مکان حوالے کر دیا۔ ایک رات شیخ الاسلام عارف حکمت بیگ کے کتب خانہ میں وہاں کے ناظم شیخ ابراہیم خربچی نے بڑے اہتمام سے یہ کہہ کر ٹھہرایا کہ یہ آپ کے جد امجد سید حسن مثنیٰ ابن سیدنا حسنؓ کا مکان ہے۔

وسط رمضان سے حضرتؒ کی طبیعت خراب ہوئی اور اسہال کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ رکنے کو نہ آتا تھا، اس کی وجہ سے ضعف بہت بڑھ گیا۔ حضرت اپنے ایک مکتوب میں مولانا نعمانی کو تحریر فرماتے ہیں:

"میری صحت ایسی گر گئی کہ بعض دن تو مجھے اپنی زندگی خطرہ میں نظر آنے لگی، اس سے تسکین ہوتی تھی کہ بقیع میں انشاء اللہ امام حسنؓ کے پاس جگہ مل جائے گی۔"(۱)

شوال کے اخیر تک الحمد للہ صحت بحال ہو گئی اور مدینہ منورہ کا یہ قیام بڑی کیفیتوں کے ساتھ پورا ہوا۔

۲۰ ذیقعدہ کو حج قران کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ روانگی ہوئی۔ بیت اللہ پر پہلی نگاہ کے وقت جو کیفیت ہوئی وہ الفاظ میں بیان کرنے کی نہیں، کریم رب نے جو بھی ضیافتیں فرمائی ہوں۔ حضرتؒ نے بعد کے کسی سفر حج میں اپنے ایک عزیز سے جو پہلی مرتبہ حج کیلئے آئے تھے یہ فرمایا تھا کہ تم ہمارے ساتھ حاضری دینا کہ پہلی حاضری کے وقت اللہ کی طرف سے خاص مہمانی ہوتی ہے۔ ان عزیز کا بیان ہے کہ میں ساتھ حاضر ہوا، حضرتؒ نے جب طواف کی ابتدا فرمائی اور حجر اسود کا استلام کیا تو بے ساختہ یہ دعا زبان سے نکلی "اللهم اعتق رقابنا و رقاب آباءنا و امهاتنا من النار" پھر ایسا گریہ طاری ہوا کہ میں نے کبھی بھی وہ کیفیت نہیں دیکھی تھی۔

تین ماہ مکہ مکرمہ میں قیام رہا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے انتظام فرمایا اور حرم شریف سے متصل مدرسہ خیریہ ثانیہ کے ذمہ دار مولوی قربان محی الدین صاحب نے (جو پہلے سے تعلق رکھتے تھے) مدرسہ میں ٹھہرایا۔ یہیں سے جنوری ۱۹۵۱ء کو

---

(۱) ماہنامہ الفرقان ذی قعدہ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

ہندوستان واپسی ہوئی۔ چونکہ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہو چکی تھی اور اس کے نتیجہ میں پورے ملک میں آگ لگی ہوئی تھی، جگہ جگہ خونریزی تھی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ اسلئے ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر بجائے کراچی کے واپسی بمبئی کے راستہ سے ہوئی اور وہاں سے بھی لکھنؤ تک بڑی احتیاط و تحفظ کے ساتھ سفر طے ہوا۔

قیام حجاز میں پیام حجاز

حج وعمرہ کے علاوہ سفر حجاز کا ایک بڑا مقصد وہاں کے باشندوں کو ان کا مقام یاد دلانا اور انکو ان کا پیغام سنانا بھی تھا، خاص طور پر دانشور اور تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ صدا اسی لے میں بلند کرنی تھی جس سے وہ مانوس ہوں۔ "کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم" (لوگوں سے ان کی سطح کے مطابق گفتگو کرو) کا اصول ہر جگہ اور ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہر داعی کے لئے ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے، تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے ان ہی کی زبان اور ان ہی کا اسلوب اختیار کرنا ضروری تھا۔ توفیق الٰہی کے بعد یہ ڈاکٹر صاحبؒ کی تربیت اور عرب اساتذہ کی صحبت کا فیض تھا کہ حضرتؒ کو زبان وبیان پر بڑی قدرت اور مخاطب کی نفسیات سمجھ کر اس کو خطاب کرنے کی بڑی صلاحیت تھی جس سے وہاں کے پورے قیام میں فائدہ اٹھایا گیا۔

سفر سے چند ہی ماہ پہلے حضرتؒ نے "إلیٰ ممثلي البلاد الاسلامية" کے عنوان سے جو مقالہ تحریر فرمایا تھا وہ شائع ہو چکا تھا اور سفر میں اس کے نسخے ساتھ تھے۔ حضرتؒ نے اس میں ایسا اسلوب اختیار فرمایا تھا جس میں پہلی مرتبہ پورے زور کے ساتھ طاقتور ادبی زبان میں دعوت پیش کی گئی تھی، اس میں دل کا سوز بھی تھا اور بیان کا ساز بھی، اور پہلی مرتبہ پوری جرأت و قوت کے ساتھ خاص طور پر عربوں کو خطاب کیا گیا تھا، یہ ان کے دل کی آواز تھی۔ اب تک اس طرح کا لٹریچر عربوں تک نہیں پہونچا تھا جس میں دل کے ساز کو چھیڑنے اور دماغ کو متاثر کرنے کی یکساں صلاحیت ہو، اس لئے اس رسالہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جہاز جب کامران

میں ٹھہرا تو وہاں بھی یہ رسالہ تقسیم کیا گیا، خاص طور پر شہر کے قاضی اور ممتاز علماء تک پہونچانے کا انتظام کیا گیا۔

مدینہ منورہ کے قیام میں وہاں کے بڑے علماء، امام حرم اور سر بر آوردہ لوگوں کو یہ رسالہ دیا گیا، ان لوگوں نے اس کو صرف یہی نہیں کہ قبول کیا بلکہ وہ اس کے داعی و ترجمان بن گئے۔ اس وقت مسجد نبوی کے ایک ممتاز استاذ حدیث شیخ علی الحرکان نے (جو بعد میں رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری بھی ہوئے) درس حدیث روک کر پورا رسالہ مسجد نبوی میں سنایا۔

مکہ مکرمہ میں وہاں کے کبار علماء سے ربط پیدا ہوا جس میں امام حرم شیخ عبد الرزاق حمزہ، علامہ سید علوی مالکی، شیخ امین کتبی، شیخ حسن مشاط، شیخ ابن عربی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے بھی رسالہ کو بڑی قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھا، مگر اس وقت کے نوجوان، ادباء، اہل قلم اور طبقۂ علماء کے درمیان گہری خلیج حائل تھی اور ان تک بھی اس پیغام کو پہونچانے کی ضرورت تھی۔ اس سفر میں اسکی بنیاد تو پڑ گئی، لیکن باقاعدہ اس طبقہ میں اس وقت کام شروع ہوا جب حضرتؒ نے ۱۹۵۰ء میں حجاز کا دوسرا سفر فرمایا۔ اس سفر کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ شیخ عمر بن حسن آل الشیخ سے ربط و تعلق قائم ہوا جنکا وہاں بڑا اثر و رسوخ تھا، اس وقت کے قاضی القضاۃ شیخ الاسلام مملکت سعودیہ شیخ عبد اللہ بن حسن کے وہ حقیقی بھائی اور خود ریاض کے "ہیئت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے رئیس تھے، ولی عہد امیر سعود کو ان پر بڑا اعتماد تھا، ان کو حضرتؒ سے ایسا قلبی تعلق پیدا ہو گیا کہ حضرتؒ کے رسائل خود پڑھتے اور دوسروں سے پڑھواتے اور اس کی ترویج کرتے، ان کے اس تعلق سے کام میں سہولت ہوئی اور خاص طور سے تبلیغ کے کام کی انھوں نے سرپرستی فرمائی، اور ان کی زندگی میں آزادانہ طور پر یہ کام وہاں ہوتا رہا۔

حضرتؒ سے ان کا یہ تعلق اخیر دم تک قائم رہا۔ اس سفر سے واپسی کے بعد ہی انھوں نے حضرت کو بڑی عقیدت و محبت کا خط لکھا جو آج بھی محفوظ ہے، اور

"رسائل الاعلام" کی زینت ہے۔ حضرتؒ کے رسائل و محاضرات پر اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کی تصنیفات و محاضرات دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں اور دل و دماغ کو فرحت ملی، عبارت کی روانی پھر اس میں لطیف اشارات، الفاظ کا حسن انتخاب پھر اس کی خوبصورت بندش، یہ وہ خوبیاں ہیں جو اور کہیں نہ سننے میں آتی ہیں نہ دیکھنے میں۔ اللہ تعالیٰ ہی آپ کو دنیا و آخرت میں اسکی جزاء عطا فرمائے اور اپنی نعمتوں سے مالامال کرے۔"(۱)

اس سفر میں حضرتؒ اپنے ساتھ "ماذا خسر العالم" کا مسودہ بھی لے گئے تھے، سب سے پہلے شیخ عبدالرزاق حمزہ نے اس کو دیکھ کر اس کی طباعت و اشاعت کی تاکید کی، اس سفر میں اس سلسلہ کی مزید تفصیلات "ماذا خسر العالم" سے متعلق مضمون میں گذر چکی ہیں۔

امیر سعود کے نام ایک تاریخی مکتوب

حجاز مقدس میں حضرتؒ کا قیام کئی ماہ رہا، یہ وہ زمانہ تھا کہ سعودی حکومت مستحکم ہو چکی تھی، دولت کی ریل پیل وہ تو نہیں تھی جو آج ہے لیکن اس کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، مغربی تہذیب و تمدن نے بھی اپنے پر نکالنے شروع کر دیے تھے، حضرتؒ نے اپنی ایمانی بصیرت سے اس خطرہ کو محسوس کیا کہ اگر آج اس پر قابو نہ پایا گیا اور حکومت جن بنیادوں پر قائم کی گئی تھی ان کو مستحکم نہ کیا گیا تو اسکا پورا خطرہ ہے کہ یہ حکومت یورپ کی دلدادہ اور فریب خوردہ ہو جائے گی، اس خطرہ کو محسوس کر کے حضرتؒ نے اس وقت کے ولی عہد امیر سعود کو ایک ایسا تاریخی مکتوب تحریر فرمایا جس میں ان حقائق کو کھل کر پیش کیا اور حکومت کے انتظامات کی ستائش کرتے ہوئے ان خطرات کی نشاندہی بھی کی جو اس وقت درپیش تھے۔

---

(۱) رسائل الاعلام ص ۳۵

حضرتؒ نے یہ خط اپنے قیام کے آخری دن یکم قیام گاہ پر، کچھ مکہ معظمہ اور جدہ کے راستہ میں اور کچھ بندرگاہ پر جہاز کے انتظار کے دوران تیار فرمایا، اور مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی کے سپرد کیا تاکہ وہ شیخ عمر بن حسن کو دے دیں، اور وہ خود اس کو امیر سعود تک پہونچادیں یا سنادیں۔ بعد میں شیخ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اسکی تعمیل کردی تھی۔

حضرتؒ نے اس زمانہ میں اپنی ایمانی بصیرت سے جن خطرات کا ادراک فرمالیا تھا اور اس کو صاف صاف اس طبقہ کے سامنے پیش کردیا تھا، جس کو آگے چل کر زمام قیادت سنبھالنی تھی، اگر اس کو بھی ان خطرات کا جو حقائق کی شکل میں پیش آنے والے تھے شعور پیدا ہوجاتا اور اسی وقت سے راستہ کی تبدیلی کی کوشش کیجاتی تو شاید آج صورتحال کچھ اور ہوتی، ولکن اللہ یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید۔

یہ خط معمولی ترمیم کے بعد "بین الجبایۃ و الھدایۃ" کے عنوان سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، اور بعد میں "إلی الاسلام من جدید" کے مجموعہ مضامین میں شامل کردیا گیا۔

عربوں میں دعوت کا جذبہ وفکر اور اس کی کوششیں

قیام حجاز کے دوران وہاں کے حالات دیکھ کر اور ان خطرات کو محسوس کرکے جو سروں پر منڈلا رہے تھے جنکو محسوس کرنے والے بہت محدود تعداد میں تھے، حضرتؒ کے حساس دل اور خوددار ضمیر پر ایک چوٹ لگی، کہ وہ حجاز مقدس جسکا پیغام سارے عالم کے لئے ہے اور جو تمام مسلمانوں کا قبلہ اور مرکز اسلام ہے، وہ دوسروں کا دست نگر بنتا جارہا ہے، مغربی تہذیب و تمدن نے اپنے پنجے گاڑنے شروع کردیے ہیں اور جو قوم دنیا کی امامت کے لئے پیدا کی گئی تھی وہ دوسری قوموں کے سامنے کاسۂ گدائی لئے کھڑی ہے۔

جنوری ۱۹۳۸ء کو حضرتؒ کی واپسی ہوگئی، لیکن یہ خیال و فکر دل و دماغ پر

طاری تھا کہ کس طرح عربوں کو ان کی بھولی ہوئی منزل پر لایا جائے، اور ان کا مقام وپیغام ان کو یاد دلایا جائے کہ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت اور اس وقت تجدید دین اور اصلاحِ امت کا اہم ترین کام تھا۔ اس وقت حضرتؒ کے اضطراب وکرب کا کچھ اندازہ اس مکتوب سے کیا جاسکتا ہے جو حضرتؒ نے اپنے دوست مولانا مسعود عالم ندویؒ کو اس وقت بھیجا تھا جب وہ عراق میں تھے، اس میں فرماتے ہیں :

"دین کی تخم ریزی کے لئے اس کشت ویراں میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھئے، حجت تمام کر دیجئے، دن رات ایک کر دیجئے، دل کو جلایئے اور بدن کو گھلایئے، خون دیدہ وخون جگر بہایئے اور اس طرح بہایئے کہ دجلہ وفرات اپنی تنگ ظرفی اور کم مائیگی پر ماتم کریں! ۔ ایک ایک کا گریبان تھام کر کہئے کہ اے صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو! اے عالم کی آبرو! اے براہیم ومحمد ﷺ کی آرزو! تو کہاں گم ہے؟ کیا سیدنا عمرؓ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی، مثنیٰ بن حارثہؓ کے خون شہادت، ابو عبید الثقفیؓ کی پامالی اور استخواں شکنی، سعد بن وقاصؓ کی علم برداری، علی بن ابی طالب کی جگر سوزی، اشک ریزی اور خطابت وتاثیر کی طوفان خیزی، آبروئے شہیداں جگر گوشہ رسول کی تشنگی، اور خاندان رسالت کے خون کی ارزانی، ابو حنیفہؒ کی دماغ سوزی، احمد بن حنبلؒ کی تعزیر جرم عشق، ابن جوزیؒ کی حمایت سنت، عبد القادر جیلانیؒ کی دردمندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ تو ائمہ ضلالت کا ادنیٰ غاشیہ بردار اور اس کی راہ کا غبار ہے؟؟ عراق کے اس مقبرہ میں صور پھونک دیجئے اور شور قیامت برپا کیجئے۔

گرفتہ چینیاں احرام ومکی خفتہ در بطحا" (۱)

حضرتؒ نے ہندوستان میں ہوتے ہوئے بھی یہ کوشش شروع فرمادی اور یہی حضرتؒ کی تحریک اصلاح وتجدید کا وہ نقطۂ آغاز ہے جسکے نتیجہ میں عالمی سطح پر

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۵۱-۳۵۲

اسلامی بیداری پیدا ہوئی اور دنیائے اسلام میں اب تک جو جمود و تعطل طاری تھا اس میں ایک طرح کا تموج پیدا ہوا۔

حجاز میں جن علماء و مشائخ سے ربط و تعلق قائم ہوا تھا ان سے مراسلت کا سلسلہ جاری رہا، ان حضرات نے حضرتؒ کی دعوت و فکر کو وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے بڑی عظمت و وقعت کے ساتھ دل میں جگہ دی، مگر اس کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ تنہا مراسلت اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے کافی نہیں ہے حجاز مقدس کی سرزمین پر دعوت و فکر کے جو نئے بیج ڈالے گئے تھے، ان کی آبیاری کے لئے مزید اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے مولانا ڈاکٹر سید عبد العلیؒ کے مشورہ اور تجویز سے یہ طے کیا گیا کہ دو نوجوان ندوی فضلاء کو طویل قیام حجاز کے لئے منتخب کیا جائے تا کہ وہ وہاں جا کر اس مشن کو آگے بڑھا سکیں اور مزید اُن دعوتی رسائل کو اہل علم و اہل فکر تک پہونچاتے رہیں جو سفر حجاز کے بعد تیار کئے گئے تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ (سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء) اور مولوی عبد الرشید صاحب ندوی کو جو حضرت کے ابتدائی دور کے شاگرد اور اسی فکر کے حامل تھے، اس کے لئے منتخب کیا گیا اور ان دونوں حضرات نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ یہ کام انجام دیا، اور اس طرح سے حضرتؒ اور وہاں کے علماء اور باوقار و بااثر شخصیتوں کے درمیان جو فکری و دعوتی ہم آہنگی اور اتحاد قائم ہوا تھا وہ نہ صرف یہ کہ باقی رہا بلکہ اس میں مزید استحکام پیدا ہوا۔

دوسرا سفر حج

پہلے اور دوسرے سفر حج میں تین سال کا وقفہ ہے، اور اس دوران بعض اہم واقعات پیش آئے لیکن ان کو ایک مستقل باب میں ذکر کیا جائے گا، مضمون کی مناسبت سے پہلے سفر حج اور اس وقت کی دعوتی سرگرمیوں کے بعد دوسرے سفر حج اور اس وقت کی ان دعوتی و فکری اور اصلاحی کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے کہ زمانی اعتبا

رے دونوں میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے اور موضوع کے اعتبار سے حقیقت میں یہ اسی کا امتداد اور اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

اس سفر کی تحریک اس طور پر ہوئی کہ ۱۹۴۹ء کو ایک قابل احترام شخصیت کی طرف سے حضرتؒ کو حج کی پیش کش ہوئی تھی، حضرتؒ نے اپنے شیخ حضرت رائپوریؒ سے اسکا تذکرہ فرمایا اور رائے لینی چاہی، تو حضرت رائپوریؒ نے اس وقت مصلحتاً منع فرمادیا لیکن اس کے دوسرے ہی سال ۱۹۵۰ء کو خود اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ وہ حضرتؒ کی تنگدستی کا زمانہ تھا، حضرتؒ نے اپنی عمر کے ابتدائی پچاس سال بڑی ریاضت و مجاہدہ میں گذارے تھے، حج کے لئے رقم کا انتظام آسان نہ تھا، مگر حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کاندھلوی نے اسکا انتظام فرمادیا۔ حضرتؒ کے چار عزیز شاگردوں جن میں دو قریبی عزیز بھی تھے اپنے اپنے مصارف پر اس سفر میں ساتھ ہوگئے تاکہ وہ حج کے بعد حجاز میں عربوں میں دعوتی کام کے لئے ٹھہر جائیں اور پہلے سے مقیم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر وہاں کے خواص میں تبلیغی کام کا تعارف بھی کرائیں اور حضرتؒ کے دعوتی رسائل کو بھی پہونچانے کا کام کریں، یہ حضرت کے خواہر زادہ عزیز مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی (حال ناظم ندوۃ العلماء) مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی (حال معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) مولانا سید محمد طاہر صاحب منصورپوری (سابق مددگار ناظم ندوۃ العلماء) اور ڈاکٹر سید رضوان علی صاحب (مقیم حال پاکستان) تھے۔

۲۰/ ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ ۴/ ستمبر ۱۹۵۰ء کو براہ بمبئی اسلامی جہاز سے روانگی ہوئی۔ حضرتؒ نے اپنے دعوتی و فکری رسائل جو پہلے سفر حج کے بعد شائع ہوئے تھے، ساتھ لے لئے تھے۔ جہاز خلاف معمول "مکلا" میں ٹھہرا تو حضرتؒ نے وہاں کے قاضی اور ممتاز علماء کو یہ رسائل بھجوائے جس کے جواب میں جہاز روانہ ہونے سے پہلے ہی تاثر و تشکر کا ایک خط بھی آیا، جس پر ان حضرات کی مہریں ثبت تھیں۔

۳/ ذی الحجہ کو جہاز جدہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا، حاجی عبدالقادر نوروِلی

صاحب کو پہلے سے اطلاع تھی، وہ موٹر لانچ لیکر آئے اور بندرگاہ سے اتار کر سیدھے اپنے گھر لے گئے۔ کچھ وقت ان کے یہاں قیام رہا، لیکن حضرت رائپوریؒ نے "حجاج منزل" جانے پر اصرار فرمایا، جہاں بقیہ رفقاء مقیم تھے، اگلے ہی روز مکہ مکرمہ روانگی ہو گئی۔ "مدرسہ صولتیہ" میں سامان رکھ کر طواف و سعی سے فراغت ہوئی، پھر ایک شب "مدرسہ فخریہ" میں قیام ہوا، اگلے روز مولانا محمد سلیم صاحب کی تجویز کے مطابق "باب باسطیہ" پر شیخ حمزہ کتبی کے اس مکان میں منتقل ہو گئے جو مولانا نے اسی لئے کرایہ پر لیا تھا۔ "دوران حج، وقوف عرفہ کے دن ایک عجیب قصہ یہ پیش آیا کہ عین اس وقت کہ جب توبہ وانابت ورجوع الی اللہ کی کیفیت میں کچھ محسوس کمی اور غفلت معلوم ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کے ازالہ اور اس کوتاہی کی تلافی کا عجب سامان کیا، اچانک آندھی آئی، افق سے ابر اٹھا اور اس زور کی ژالہ باری ہوئی کہ خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں، رونے والوں کی چیخیں نکل گئیں اور انابت کی عام فضا پیدا ہو گئی اور آنکھوں نے اشک باری اور دلوں نے اضطراب و اضطرار کی وہ مقدار چند لمحوں میں پوری کر دی جو پورے دن کے وقوف و قیام میں نہیں ہوئی تھی، تھوڑی ہی دیر میں مطلع صاف ہو گیا اور تھوڑی دیر کے اولے اور پانی کا چھینٹا وہ کام کر گیا جو بیسوں دینی ادارے اور واعظین اور سحر انگیز مقررین کی منظم جماعتیں نہیں کر سکتی تھیں۔ و ما یعلم جنود ربك إلا هو"(۱)

یکم محرم الحرام ۱۳۷۰ھ کو مدینہ منورہ روانگی ہوئی، بیس روز "مدرسہ شرعیہ" ہی میں قیام رہا۔ ۲۰ر محرم الحرام کو حضرت رائپوریؒ مع اپنے رفقاء و خدام کے واپس تشریف لے گئے۔ حضرتؒ نے عربوں میں کام کرنے کی نیت سے مزید قیام اختیار فرمایا، حضرتؒ حضرت رائپوری کو رخصت کرنے کے لئے بندرگاہ تک تشریف لائے، اس وقت کے دستور کے مطابق حضرت رائپوریؒ موٹر لانچ پر بیٹھ کر روانہ ہوئے، خادم خاص رائو فضل الرحمان خانصاحب بیان کرتے ہیں کہ جب

---

(۱) تلخیص از سوانح حضرت رائپوریؒ ص ۱۷۸-۱۷۹

تک حضرتؒ کی صورت اوجھل نہیں ہوئی حضرت رائپوریؒ برابر موٹر لانچ سے حضرت کو دیکھتے رہے، اس سفر میں حضرت رائپوریؒ نے اپنے محبوب مسترشد کے ساتھ جس محبت کا معاملہ فرمایا اسکی تفصیلات انشاءاللہ آئندہ باب کا موضوع ہونگی۔

عزوشرف کا مبارک دن

اسی سفر حج میں مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا جو حضرتؒ کے الفاظ میں "عزوشرف کا سب سے مبارک دن تھا جو نہ اس سے پہلے پیش آیا تھا نہ اس کے بعد"(۱) حضرتؒ کی دعوتی وتبلیغی خدمات اور تجدید واصلاح کی کوششوں کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے، تعلیم یافتہ اور ترقی پسند طبقہ بھی کسی حد تک ان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ پر جو انعامات کی بارشیں فرمائیں، اس کا سلسلہ بھی شروع ہو چلا تھا، اور حقیقت میں یہ واقعہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے، ہوا یہ کہ ایک روز کلید بردار کعبہ جناب شیبی صاحب نے خود ہی حضرتؒ کو بیت اللہ میں داخلہ کی دعوت دی، اور یہ بھی فرمایا کہ حضرتؒ جس کو چاہیں اپنے ساتھ لے آئیں، اس موقعہ پر حضرت رائپوریؒ اور ان کے قافلہ کے ہمراہیوں نے بھی یہ سعادت حاصل کی، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "میں بیت اللہ کے دروازہ پر کھڑا تھا اور جسکو اشارہ کرتا اس کو داخلہ کی اجازت ملتی۔" پھر بھی بہت سے اہل تعلق رہ گئے اور انھوں نے شکوہ کیا، دوسرے دن حضرتؒ نے شیبی صاحب سے کہا کہ اگر دوبارہ ممکن ہو تو اور لوگ بھی سعادت حاصل کرلیں، شیبی صاحب نے دوبارہ حرم کی پولیس کے ذریعہ یہ انتظام کیا، اور خود بھی تشریف لائے، حضرت رائپوریؒ نے بھی دوبارہ یہ سعادت حاصل فرمائی، اور اس دن بھی حضرتؒ کو وہ سعادت حاصل ہوئی کہ دروازے پر کھڑے ہو کر جسکو اشارہ فرماتے اس کو اجازت ملتی۔

(۱) یہ بات حضرتؒ نے کاروان زندگی جلد اول میں تحریر فرمائی ہے۔ واضح رہے کہ کلید کعبہ پیش کئے جانے کا واقعہ تحریر کے بہت بعد کا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس اعزاز سے بڑھ کر دنیا کا کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا لیکن حضرتؒ کی فطری شرافت نفس، تواضع وانکسار اور انکار ذات کا نتیجہ تھا کہ حضرتؒ نے اس واقعہ کو تحریر کرنے کے بعد اس کی نسبت حضرت رائپوریؒ کی طرف فرمائی، تحریر فرماتے ہیں:

"میں اس کو حضرتؒ ہی کی ایک کرامت سمجھتا ہوں کہ نہ اس سے پہلے اسکا موقع آیا تھا اور نہ اسکے بعد بار بار حاضری کے باوجود یہ شرف حاصل ہوا۔

مور مسکیں ہوس داشت کہ در کعبہ رسد

دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید(۱)

تعلیم یافتہ طبقہ پر خصوصی توجہ اور ان کا تاثر

حجاز کے پہلے قیام میں حضرتؒ نے جو خطرات محسوس کئے تھے اب وہ واقعات وحقائق کی شکل میں ظاہر ہونے لگے تھے اور صاف نظر آرہا تھا کہ مغربی تہذیب نے عرب ممالک کو پورے طور پر متاثر بلکہ مفلوج کر دیا ہے۔ اس دوسرے قیام میں حضرتؒ نے اس کا صاف صاف مشاہدہ کیا۔ ان تین سالوں میں جو نمایاں فرق نظر آیا حضرتؒ نے برادر اکبر ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کے نام ایک مکتوب میں اس کی منظر کشی کی ہے، اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"۴۷ء میں ہم پہلی بار یہاں آئے تھے، اب ۵۰ء میں آئے ہیں، تین برسوں میں کھلا ہوا فرق محسوس ہوتا ہے، بازار سے لیکر لوگوں کے دماغوں تک مغربی تمدن، تجارت، معاشیات اور افکار وخیالات کے پنجے اور زیادہ گڑ چکے ہیں، جدہ اترتے ہی اس کا احساس ہوتا ہے اور جس قدر حالات سے واقفیت ہوتی ہے اتنا ہی اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، کوئی نہیں جانتا، خوبصورت عربی لباس میں کتنے دل ودماغ خالص مغربی بن چکے ہیں، اور

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۵۶

قرآنی زبان کتنے مغربی خیالات اور خالص مادی تخیلات کا ذریعہ اظہار بنتی جارہی ہے، معاش کا انہماک، دولت آفرینی کی عادت بحرانی حد تک پہونچ چکی ہے، زندگی کا تصور اس کے بغیر ان کے نزدیک ممکن نہیں کہ اس کے سایہ میں پناہ لی جائے اور ترقی کی جائے، عالم اسلام کا قبلہ مکہ معظمہ اور بیت اللہ ہے اور مرکز اسلام کا قبلہ سر دست امریکہ ہے۔"(۱)

یہ صورتِ حال ہر صاحب درد و فکر کے لئے باعث تشویش تھی، اس کو دیکھ کر حضرتؒ کے اندر ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی اور شدت کے ساتھ ضرورت محسوس ہوئی کہ طبقہ خواص، ادباء، اہل قلم، اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو اس کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ابھی تک باقاعدہ اس طبقہ سے رابطہ کی کوئی شکل پیدا نہیں ہوئی تھی اور کسی ایسے فرد کی تلاش تھی جو اس حلقہ سے تعارف کا ذریعہ بن سکے، اسی غرض سے ایک دن تبلیغ کے ایک اہم کارکن مفتی زین العابدین صاحب کو لیکر حضرتؒ، حافظ سید محمود صاحب کے پاس گئے جو "مطبعۃ الحکومۃ" کے نائب مدیر تھے اور حضرتؒ سے تعلق و محبت رکھتے تھے، ان کے سامنے جب یہ بات آئی تو انھوں نے کہا کہ میں ایک ایسے شخص سے ملوا دیتا ہوں جو اس حلقہ کی کنجی ہے، انھوں شیخ احمد عبد الغفور عطار سے تعارف کرا دیا جو حجاز کے ایک معروف اہل قلم اور علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والے فاضل تھے، انھوں نے اس کا انتظام یہ کیا کہ "بستان بخاری" میں جو بڑی تقریبات اور اجتماعات کی جگہ تھی دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا اور اس میں اپنے ادیب اور اہل قلم دوستوں اور ریڈیو اور صحافت سے تعلق رکھنے والوں کو مدعو کیا، ان میں شیخ سعید العامودی، شیخ عبد القدوس انصاری، سید علی حسن فدعق، سید محسن باروم اور شیخ حسین عرب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس نشست میں ان ادباء نے حضرتؒ کی ادبی و ثقافتی سطح کا امتحان لینے کے لئے مختلف قسم کے سوالات کئے، حضرتؒ نے جس بلند سطح سے تعلیم حاصل کی تھی اور

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۵۹

پھر اپنی محنت سے جس طرح اس میں کمال پیدا کیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ نہ صرف یہ کہ مطمئن ہوئے بلکہ بڑے تاثر و تشکر کے ساتھ یہ نشست اختتام کو پہونچی اور ان کے تاثر کا اظہار اس طور پر ہوا کہ وہ حضرت کو اسی وقت شیخ محمد سرور الصبان کے پاس لے گئے اور ان سے یہ مطالبہ کیا کہ شیخ کی ریڈیو پر تقاریر کا انتظام ہونا چاہئے، انھوں نے اس کو بخوشی منظور کیا۔ حضرتؒ نے اس کے لئے "بین العالم و جزیرة العرب" کا عنوان تجویز کیا، پہلی تقریر "من العالم إلی جزیرة العرب" (جزیرۃ العرب سے دنیا کی شکایت) کے عنوان سے اور دوسری تقریر "من جزیرة العرب إلیٰ العالم" (جزیرۃ العرب کا دنیا کو پیغام) کے عنوان سے کی گئی، ان تقریروں کا وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ پر گہرا اثر پڑا اور ان کو حضرتؒ کی ذات اور دعوت و فکر سے دلچسپی بلکہ گرویدگی پیدا ہوگئی، فکر و نظر کی پختگی اور اس میں توازن، جدید ادبی اسلوب میں خطاب، زبان و بیان کا زور اور اقدامی قوت کے علاوہ جو چیز ان کے لئے جاذب نظر اور باعث کشش تھی وہ حضرتؒ کا زہد و استغناء اور خودداری و بے نیازی، اخلاص و للٰہیت، پھر انکسار و تواضع جیسی وہ صفات تھیں جن کا ایک فرد میں جمع ہونا ایک نادر بات تھی۔

ان تقریروں کا شیخ محمد سرور الصبان کی طرف سے خصوصی معاوضہ بھی پیش کیا گیا تھا مگر حضرتؒ نے اس کو قبول کرنے سے انکار فرمادیا۔

ان تقریروں سے پہلے حضرتؒ کے تعارف و اعتراف میں شیخ احمد عبد الغفور عطار کی ایک تقریر سعودی ریڈیو سے نشر ہوئی، جس سے ان کے گہرے تاثر و عقیدت کا صاف اظہار ہوتا ہے، یہ ملحوظ رہے کہ اس وقت حضرتؒ کی عمر صرف اڑتیس سال تھی، اور "ماذا خسر العالم" بھی اس وقت تک شائع نہیں ہوسکی تھی، اس تقریر کے چند اقتباسات یہاں پر پیش کئے جاتے ہیں:

"ہم قارئین اور ناظرین کے سامنے عصر حاضر کی ایک ایسی جامع صفات اور مذکورہ خصوصیات کی حامل منفرد شخصیت کو پیش کرنے جارہے

ہیں جو اسلامی دنیا کے لئے ایک بہترین نمونہ اور آئیڈیل ہے اور یہ شخصیت گذشتہ زمانوں کے لحاظ سے بھی قابل تقلید اور ہر زمانہ اور جگہ کے لئے موزوں اور مثالی شخصیت ہے، اس لئے کہ یہ ایک ایسے انسان عالم ہیں جو کسی زمانہ عصر یا قوم کے لئے مخصوص نہیں، اگرچہ وہ اس زمانہ کے عالم ہیں اور اسی زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں۔"

"یہ وہ عظیم ہستی اور جوہر نایاب ہے اور یہ وہ عبقری انسان ہیں جن کے دل میں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، ایسے پارسا اور دیندار ہیں جنہیں دیکھ کر سلف صالح کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جنھوں نے راہ خدا میں جان و مال کی قربانی دی اور انتہائی صبر و تحمل سے کام لیا اور ان سب کے ساتھ وہ اپنے کو حقیر و ناکارہ اور اپنی مساعی کو کم گردانتے ہیں، مولانا اپنے سلف ہی کے راستہ پر ہیں۔"

"علم کا حق جانتے ہیں، سیاسی نقطۂ نظر اور اختلافی چیزوں سے اچھی طرح واقف ہیں، اس کے ذرائع و وسائل، اہداف و مقاصد، اور پھر اس کے عواقب و نتائج کو سمجھتے ہیں، قوموں کے عروج و زوال پر گہری نگاہ رکھتے ہیں، ان کی خامیوں اور خوبیوں پر چشم نظر ہیں، اور کبھی سیاسی جماعتوں کی اوپری زیب و آرائش سے دھوکہ نہیں کھاتے، آپ کا ایک اہم وصف اور خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت کے وہ بڑے مسائل جو اصلاً پوری دنیا میں اضطرابی و ہیجانی کیفیت کا سبب بنے ہوئے ہیں سامنے لاکر اس کا حل بھی اپنی طاقتور اور سحر انگیز اسلوب میں کرتے ہیں، براہین قاطعہ اور ٹھوس دلائل کے ساتھ تاریخ و تجربات کی روشنی میں یہ بات ثابت اور واضح کرتے ہیں کہ دنیا کی تمام مشکلات و مسائل کا حل صرف اسلام ہے، وہ یہ کسی تعصب و تقلید یا کسی جماعت کے فرد و نمائندہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ مقارنہ و موازنہ کر کے اور تقابلی مطالعہ کی روشنی میں کہتے ہیں، وہ موضوع پر پوری طرح

حاوی ہو کر بولتے ہیں، اور جوش بھرے انداز میں طاقت و قوت کے ساتھ اپنی بات کہتے ہیں، علاوہ مذاہب کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے اور ان کی زبان و فلسفہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھتے ہوئے ایسے روشن حقائق پیش کرتے ہیں جس سے تاریکی چھٹ جاتی ہے، صحیح معنی میں دیندار کہلائے جانے کے مستحق آپ ہی ہیں، جن کی زندگی بدعات و خرافات اور لغویات سے پاک ہے۔" (۱)

اسی سفر میں شیخ عبد اللہ المحروح نے اپنے اس تاریخی رجسٹر پر حضرتؒ سے بھی تحریر لی جس پر وہ مشاہیر عالم اسلام سے نوجوانان مکہ کے نام پیغام لکھوایا کرتے تھے، یہ پیغامات باقاعدہ کتابی شکل میں شائع کر دیے گئے ہیں۔ حضرتؒ کی یہ ایک یادگار تحریر ہے اس لئے اس کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے جو مولانا عبد اللہ عباس صاحب ندوی کے قلم سے ہے۔

"عرب جہاں بھی ہیں اور جتنے بھی ہیں اگر سب ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھے ان سے خطاب کا موقع ملے، میری بات وہ سن سکیں اور ان کے دل میں اتر سکے تو عرض کروں گا:

بزرگو! اسلام جس کو سیدنا محمد ﷺ لائے ہیں یہی آپ کی زندگی کا سرچشمہ ہے، یہی آپ کی قوت ہے اور اسی سے آپ کی رگوں میں خون کی گردش ہے، اسی اسلام سے آپ کے وجود کی صبح صادق نمودار ہوئی، آپ دنیا میں روشناس ہوئے، نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی سے آپ کی سرفرازی ہے اسی نام نامی کے صدقے میں آپ کی نبض حیات میں گرمی اور قلب میں حرارت قائم ہے اور صرف آپ ہی نہیں بلکہ سارے عالم میں اگر خیر کا کوئی ذرہ ہے تو وہ اسی ذات گرامی کا عطیہ ہے، اور آپ سن لیجئے اسی نسبت سے آپ کی آج بھی عزت ہے، اسی رسول عربیؐ کے دامن سے وابستگی آپ کا

---

(۱) ماخوذ از کتاب "حضرت مولانا [illegible] مشاہیر امت کی نظر میں" [illegible] محمود حسنی [illegible] رحمۃ اللہ کا کیا ہوا ہے)

سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اگر خدانخواستہ اس ذات اقدس سے عرب کا رشتہ ٹوٹا یا کمزور ہوا تو اس کی حیثیت ایک ایسے دریا کی ہوگی جس میں پانی نہ ہو، عربوں کا سب سے بڑا عروج اس میں ہے کہ وہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنا امام و قائد رہبر و رہنما مان کر اسلام کو لیکر اٹھیں جیسا کہ عہد اول میں ان کے اسلاف اٹھے تھے (آج بھی ضرورت ہے کہ) اسلام کی دعوت کو اپنی سب سے بڑی دولت سمجھیں اور مظلوم انسانیت کو یورپ کے چنگل سے آزاد کرائیں جو اپنے جہل سے انانیت میں آکر ساری دنیا کو انارکی، ویرانی اور تباہ کاری کی طرف لے جا رہا ہے۔ عرب اٹھیں اور تہذیب و اخلاق کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالیں، دنیا کو بے چینی، اضطراب، خودرائی اور خود پسندی کے حصار سے نکل کر امن وسلامتی، بھائی چارگی اور محبت کے راستہ پر گامزن کریں۔

عالم عرب کا یہ فرض ہے جس میں اگر انھوں نے کوتاہی کی تو ان سے یہ پرسش ہوگی، وہ سوچ لیں کہ وہ کل اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے اور کیا جواب دیں گے؟؟؟" (۱)

سفر مصر

حضرتؒ نے وہاں کے قیام کے دوران یہ محسوس فرمالیا کہ یہاں کی تہذیب و تمدن، خیالات ورجحانات، ادب وفکر پر مصر کی چھاپ ہے، اور یہ سب چیزیں مصر کے راستے سے یہاں آتی ہیں، اس سے عالم عربی میں مصر کی مرکزیت وقیادت کا اندازہ ہوا اور یہ محسوس ہوا کہ اگر عالم عربی میں کسی فکر و دعوت کو پھیلانا، وسیع بنانا اور اس میں کوئی تغیر وانقلاب لانا ہو تو وہ مصر ہی کے راستے سے ممکن ہے، اس صورت حال کے پیش نظر حضرتؒ نے مصر جانے کا ارادہ فرمالیا، مگر حضرتؒ کی زاہدانہ زندگی میں اس کی گنجائش نہ تھی کہ اس کے لئے ضروری اسباب اور سفر کا کرایہ فراہم ہوسکے، برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ اور حضرت شیخؒ اور

(۱) میر کارواں ص ۲۰۲-۲۰۳

بعض اہل تعلق نے اس کا بندوبست کیا کہ حضرتؒ اپنے دو رفیقوں کے ساتھ پانی کے جہاز سے مصر جا سکیں۔

۱۲ ربیع الثانی ۷۰ ۱۳ ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو مولانا معین اللہ صاحبؒ اور مولوی عبد الرشید صاحب کی رفاقت میں جدہ سے روانگی ہوئی، اس وقت مصر اپنے شباب پر تھا، علم و ادب کا بازار گرم تھا، پچھلی نسل کے بہترین دماغ اور قدیم و جدید تعلیم کے بہترین ساختہ پرداختہ موجود تھے، ان میں بڑی تعداد ان ادباء علماء اور زعماء کی تھی جن کا آوازہ عالم عربی میں بلند تھا اور جن کی تقلید کو اس وقت کے نوجوان ادباء قابل فخر و مباہات سمجھتے تھے، مشہور علماء میں شیخ الازہر شیخ عبد المجید سلیم، شیخ محمود شلتوت، محدث و محقق شیخ احمد محمد شاکر، ادباء میں ڈاکٹر احمد امین، عباس محمود العقاد، احمد حسن زیات، اور زعماء و قائدین میں مفتی سید امین الحسینی، مشہور مجاہد امیر عبد الکریم ریفی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو پورے پورے مدرسہ ادبی اور مکتب فکر کے بانی اور رہنما تھے، الاخوان المسلمون کی تحریک سرگرم عمل تھی، اور حضرتؒ کے الفاظ میں:

"اس وقت تک دور ناصری کی وہ باد خزاں نہیں چلی تھی جس سے علم و ادب، فکر اسلامی، آزاد سیاست اور اخلاقی جرأت و تنقید کے ہر سبز و شاداب درخت برگ و بار سے محروم ہو گئے، اور پورے ملک پر انقلاب کی ایک جھاڑو پھری کہ گرد و غبار کے سوا کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔"(۱)

قاہرہ پہونچ کر مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی بھی قافلہ میں شامل ہو گئے، چند دن تو "فندق البرلمان" میں قیام رہا، پھر ایک انجمن کے دفتر میں جو "السکۃ الجدیدۃ" کی ایک بالائی منزل پر واقع تھا قیام فرمایا۔

حجاز مقدس میں جس طرح مختلف حلقوں میں اور خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ میں تعارف کی شکل پیدا ہو گئی تھی، قاہرہ کے اس ہنگامہ خیز اور پرشور شہر میں اس

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۶۷

کی زیادہ ضرورت تھی تاکہ لوگوں کو توجہ ہو، اللہ تعالیٰ نے غیب سے اس کا سامان یہ فرمایا کہ حضرتؒ کے پہونچنے سے پہلے "ماذا خسر العالم" شائع ہو گئی اور وہاں اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اس طرح سے یہ کتاب تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔ دوسری طرف بعض مؤقر مجالس اور جمعیات میں تقریروں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ اس سے لوگوں کے دل کھنچنے لگے اور وہاں کے اہم ترین ادباء و علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ بھی منعطف ہوئی۔ اسی کے نتیجہ میں جمعیات الشبان المسلمین کے رئیس اللواء صالح حرب باشا نے حضرتؒ کے اعزاز میں جلسہ منعقد کیا اور اس میں اس وقت کے اہم لوگوں کو مدعو کیا جن میں امیر عبدالکریم ریفی، شیخ حسنین محمد مخلوف، اور شیخ محمد الشربینی (صدر جمعیۃ علماء ازہر) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پانچ ماہ کے اس قیام میں ہر اہم ادارے، تنظیم اور دعوتی مرکز میں حضرتؒ کی تقاریر ہوئیں، ان میں وہاں کے مؤقر اور تاریخی ادارہ دارالعلوم اور قاہرہ یونیورسٹی اور جامع ازہر سے لے کر چھوٹی چھوٹی تنظیموں اور اداروں تک کوئی مرکزی مقام ایسا باقی نہیں رہا جہاں حضرتؒ نے اپنی اس فکر و دعوت کو اپنے مخصوص انداز میں پیش نہ کیا ہو، مصر کے قصبات و دیہات بھی اس سے محروم نہیں رہے، اخوان کے داعی و ترجمان شیخ محمد الغزالی کے ہمراہ مختلف علاقوں کے دورے بھی ہوتے رہے جہاں قدرتاً حضرتؒ کے خطابات ہوئے۔

ان محاضرات و خطابات کے علاوہ اس وقت موجود تقریباً تمام اہم لوگوں سے تفصیلی ملاقاتیں بھی ہوئیں، ان کے سامنے بھی حضرت نے اپنی فکر و دعوت پیش کی، ڈاکٹر احمد امین سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں، اور حضرتؒ نے ان کی تصنیفات سے اپنے تاثر واستفادہ کا بھی تذکرہ کیا، اور ان کو ان کی فکری فروگذاشتوں سے بھی آگاہ فرمایا۔ اسی طرح شیخ الازہر شیخ عبدالمجید سلیم کو بھی ازہر سے متعلق اہم اور مفید مشورے دیئے، جو انھوں نے بڑی توجہ سے سنے اور یہ خواہش بھی کی کہ ان کو تحریری شکل میں شیخ احمد شلتوت کے حوالہ کر دیا جائے، حضرتؒ نے اس کو مرتب

کر کے حوالہ کیا، جامعہ ازہر کے طلبہ سے بھی ربط و تعلق قائم ہوا، خاص طور پر "كلية الشريعة" کے طلبہ نے بڑی عقیدت و محبت کا ثبوت دیا، متعدد مرتبہ ان کے سامنے تقریر کرنے کی نوبت آئی، ان میں سے بعض ذہین اور دینی فکر رکھنے والے طلبہ حضرتؒ کی قیام گاہ پر ملنے آتے رہے۔ ان میں خاص طور پر شیخ یوسف القرضاوی قابل ذکر ہیں، جو اسوقت ازہر میں "كلية الشريعة" کے طالب علم تھے۔

تحریکات میں سب سے زیادہ "اخوان" سے ربط رہا، اس کے ذمہ داروں نے بڑی قدر و محبت کا معاملہ کیا اور اپنے بڑے اہم اور مخصوص جلسوں میں حضرتؒ کو خطاب کے لئے دعوت دی، حضرتؒ نے اپنے خطاب میں ان کی خوبیوں کا کھل کر اعتراف کیا اور ان خامیوں کی نشاندہی فرمائی جو اس تنظیم کے لئے مضر ہو سکتی تھیں، تنظیم کے ذمہ داروں نے اس کا اعتراف کیا اور ایک تقریر کے بعد جو ایک بڑے مخصوص جلسہ میں ہوئی تھی یہاں تک کہا کہ "شیخ جس وقت خطاب کر رہے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ شیخ حسن البناء ہمارے درمیان موجود ہیں اور وہ ہم کو خطاب کر رہے ہیں"۔ یہ تقریر بعد میں "أريد أن أتحدث إلى الاخوان" (اخوان سے دو دو باتیں) کے عنوان سے خود اخوان نے شائع کی اور اسکے پہلے ایڈیشن پر شیخ محمد الغزالی اور دوسرے ایڈیشن پر استاذ حسن الهضیبی (مرشد عام) نے مقدمہ لکھا۔

مصر کے زمانہ قیام ہی میں حضرتؒ کے متعدد رسائل شائع ہوئے جن میں "إسمعي يا مصر" امتیازی شان رکھتا ہے جس میں حضرتؒ نے مصر کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا اور اس کو اس کی ذمہ داریاں بھی یاد دلائیں۔ یہ مضمون وہاں کے مقبول ترین رسالہ "الرسالة" میں شائع ہوا، اور ایک الگ رسالہ کی شکل میں اس کو شائع کیا گیا، اور لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اسکے علاوہ تین رسالے اس زمانہ قیام میں اور شائع ہوئے۔ ایک سعودی ریڈیو پر کی گئی دونوں تقریروں کا مجموعہ "بين العالم و جزيرة العرب" دوسرے "شاعر الاسلام الدكتور محمد اقبال" اور تیسرے "المد و الجزر في تاريخ الاسلام" ان رسائل سے بھی حضرت کی

فکر و دعوت کی اشاعت ہوئی اور علمی و ادبی حلقوں میں بھی اسکو قبول کیا گیا۔

اس طرح یہ قافلہ جس نے مصر کی سرزمین پر جب قدم رکھا تھا تو اس کی صدا نامانوس تھی اس حال میں بیدا ہو رہا تھا کہ اس کی صدائے بازگشت پورے مصر میں سنائی دے رہی تھی۔

سوڈان میں

مصر سے حضرتؒ دس روز کے لئے مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی کی رفاقت میں سوڈان تشریف لے گئے، وہاں کے اہم ذمہ داروں اور معززین سے تفصیلی ملاقاتیں کیں، اور ان کو خاص طور پر افریقہ میں دعوت اسلام پر آمادہ فرمایا۔

یہاں جن اہم ذمہ داروں سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں وہاں کے دینی و روحانی قائد سید میرغنی باشا، استاذ اسماعیل بک (جو بعد میں سوڈان کے وزیر اعظم ہوئے) شیخ شوقی اسد (سکریٹری جمعیۃ التبشیر الاسلامی) کے علاوہ جامع مسجد کے امام شیخ محمد عوض، جمعیۃ الشبان المسلمین کے صدر الحاج محمد موسیٰ سلیمان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کی عالم اسلام پر بڑی وسیع اور گہری نظر تھی، انکا مطالعہ وسیع اور جامع اور ان کا دل اسلام کی دعوت و عروج کے جذبہ سے معمور تھا، حضرت فرماتے ہیں کہ "لکھنؤ میں بیٹھ کر وہ ایسے خطوط مجھ کو لکھتے رہے جن سے مجھے مصر کی داعیانہ اور قائدانہ اہمیت اور افریقہ میں دعوت کے وسیع میدان ہونے کا احساس پیدا ہو اور میں اسکی کوشش کروں کہ مصر کا دینی طبقہ افریقہ میں دعوت و اشاعت اسلام کی ذمہ داری قبول کرے۔" ان کے خط کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ افریقہ کو اللہ تعالیٰ نور اسلام سے منور فرمادے اور تمھیں اس کا ذریعہ بنا کر اپنے شان و کرم کے مطابق اجر عطا فرمائے، بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں قدیم زمانہ سے تمدن رہا ہے، مثلاً ہند، ایسے ملک کے غیر مسلموں میں استکبار قبول حق سے بڑا مانع ہے۔ افریقہ میں

مصر کے علاوہ تمام ملک تمدن سے خالی رہا ہے اور اب تک بڑا حصہ بالکل ابتدائی جاہلانہ بت پرستی کے سوا متمدن مذہب سے نا آشنا ہے، گویا تقریباً پورا براعظم سادہ تختی ہے۔ قرین عقل یہ ہے کہ حق کے قبول کرنے کی ان میں ایسی صلاحیت ہو جیسی عرب جاہلیت اور بربر اور ترکوں میں تھی، اور تمہاری کوششوں کو اللہ عزوجل قبول فرمالیں اور اہل افریقہ کے قلوب کو قبول حق کے لئے کھول دیں۔ مصر افریقہ کا دروازہ ہے، اگر اہل مصر کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جائے اور اپنے ملک میں بیٹھے ہوئے بھی ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں، اور مغرب صحرائے اعظم اور صحرا کے جنوب کے علاقوں سے جو حجاج جن میں اکثر پیادہ ہوتے ہیں مصر ہو کر گزریں تو ان کو دینی جدوجہد میں مشغول ہونے پر آمادہ کریں اور اپنے اپنے ملکوں میں اور قریب کی غیر مسلم آبادی میں تبلیغ کے لئے نکلنے پر تیار کریں، تو انشاء اللہ ایک دن پورا افریقہ نور اسلام سے منور ہو سکتا ہے۔"(۱)

شام کا سفر

سوڈان سے قاہرہ ہوتے ہوئے شام کا سفر ہوا، ۹؍رمضان کو دمشق کی سرزمین پر قدم رکھا، وہاں پہونچ کر حضرت کو بوئے انس آئی اور دل میں عقیدت و محبت کے جذبات امنڈنے لگے کہ یہ سرزمین صحابہ کرام کا مدفن اور کبار اولیاء و علماء کا مولد و مسکن رہی ہے۔ پھر حضرت کے بچپن میں واقدی کی "فتوح الشام" کا جو منظوم ترجمہ "صمصام الاسلام" گھر میں پڑھا جاتا تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ وہاں کے شہروں قصبوں اور محلوں کے ناموں سے کان اسی طرح مانوس تھے جس طرح اپنے وطن کے شہر اور قصبات ہوں۔

دمشق پہونچ کر چند روز "قصر الاندلس" میں قیام رہا، پھر شیخ محمود الحافظ

---

(۱) حیات عبدالحی ص ۳۹۶-۳۹۷

صاحب کے اصرار پر ان کے خسر شیخ عبدالوہاب صلاحی کی ضیافت قبول فرمائی جو قصر جمہوری کے امام تھے، اور شہر کے معززین اور صلحاء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اس زمانے میں حضرتؒ کا معمول فجر بعد ٹہلنے کا تھا وہاں زمانہ قیام میں ایک لطیفہ یہ پیش آیا کہ ایک روز حضرتؒ جب چہل قدمی کر کے واپس آئے تو اتفاق سے شیخ کہیں گئے ہوئے تھے ان کو آنے میں تاخیر ہوئی، حضرتؒ کو یہ خیال ہوا کہ خود ہی ناشتہ کا انتظام کر لیں لیکن چونکہ حضرت کو کبھی اس سے سابقہ نہیں پڑا تھا اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ "نہ ہی انڈا تلا جا سکا اور نہ ہی چائے بن سکی" جب شیخ واپس آئے تو اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے "یا سیدی ما خُلقت لهذا" (حضرت آپ کو تو دوسرے ہی کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے)

شام میں کل اڑتالیس دن قیام رہا جس میں چوبیس دن دمشق کے حصہ میں آئے، اس پورے عرصہ میں حضرتؒ نے اپنی دعوت و مشن کو جاری رکھا، حجاز و مصر کے قیام اور وہاں مختلف طبقوں سے تعارف اور پھر ان کے تاثر کا نتیجہ یہ تھا کہ اب یہ آواز نامانوس نہیں رہی تھی، اور شام کے مختلف حلقے حضرتؒ کی ذات اور پیغام سے پہلے ہی مانوس تھے، وہاں جن ممتاز علماء سے ملاقاتیں ہوئیں اور تبادلہ خیال کی نوبت آئی ان میں علامہ بہجۃ البیطار، شیخ ابوالخیر میدانی، شیخ احمد الدقر، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، علامہ محمد کرد علی، شیخ عبدالقادر مغربی اور علامہ شامی کے پوتے مفتی جمہوریہ ڈاکٹر ابوالیسر عابدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نوجوان اور صحیح الفکر اساتذہ میں سید عبدالرحمان البانی سے خاص ربط رہا اور وہ دمشق کے پورے قیام میں ایک معاون و رفیق کی حیثیت سے حضرتؒ کے ساتھ رہے۔ وہاں کے دینی و علمی اور ادبی مرکزں میں بھی جانا ہوا، اور وہاں پارلیمنٹ کے ایک اہم اجلاس میں شرکت کی نوبت آئی۔ رمضان المبارک کے آخری ایام بیت المقدس میں گزارنے کے لئے حضرتؒ فلسطین تشریف لے گئے اور عید کی نماز بھی وہیں پڑھی، شیخ صادق مجددی کی دعوت پر ان کے ساتھ ہی ان کی قیامگاہ پر ٹھہرنا

ہوا، عید کے بعد دو دن کے لئے "الخلیل" بھی جانا ہوا، اس کے علاوہ دوسرے شہروں اور مقامات پر بھی تشریف لے گئے ان میں حمص، حماۃ اور حلب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بیت المقدس کی واپسی پر شرق اردن کے حکمراں شاہ عبد اللہ سے بھی ملاقات ہوئی، شیخ محمد صادق مجددی کے ذریعہ سے ان کو حضرتؒ کی آمد کا علم ہو چکا تھا۔ حضرتؒ نے ان سے دعوتی انداز میں بے تکلف گفتگو کی۔ قیام عمان ہی کے دوران تین دن کے بعد ان سے دوبارہ پھر ملاقات ہوئی اور انھوں نے حضرتؒ کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس عرصہ میں وہ "ماذا خسر العالم" پڑھ چکے تھے جو حضرت نے ان کو گذشتہ ملاقات پر دی تھی، اس پر انھوں نے اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا، اس ملاقات میں حضرت نے اپنے دو رسالے "بین العالم و جزیرۃ العرب" اور "شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال" ان کو دیے اور خاص طور سے مسجد اقصیٰ کی دیکھ بھال کرنے اور پناہ گزینوں کی طرف توجہ کرنے کی دعوت دی۔ تقدیری بات ہے کہ اگلے جمعہ کو وہ مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کے لئے گئے اور وہیں شہید کر دیے گئے۔

قیام شام میں سب سے اہم وہ مقالہ تھا جو ۲۳؍ جولائی ۱۹۵۱ء کو حضرتؒ نے دمشق یونیورسٹی کے ہال میں ایک ممتاز اور صاحب فکر مجمع کے سامنے پڑھا، عمان اور بیت المقدس کے سفر کے دوران حضرت نے یہ مقالہ تیار کیا تھا جو مسئلۂ فلسطین سے متعلق تھا، جلسہ کی صدارت یونیورسٹی کے عیسائی وائس چانسلر استاذ قسطنطین زُریق نے کی، حاضرین میں علامہ بہجۃ البیطار، شیخ احمد الدقر، استاذ سعید الافغانی، اس وقت کی شامی پارلیمنٹ کے اسپیکر ڈاکٹر معروف دوالیبی اور مشہور ادیب و شاعر ڈاکٹر عمر بہاء الامیری جیسے لوگ شامل تھے، مقالہ سے پہلے علامہ بہجۃ البیطار نے حضرتؒ کا تعارف کرایا اور مقالہ کے بعد ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے مقالہ پر تبصرہ کیا اور اس کے بنیادی خیالات کی تائید کی۔ اس تقریر کے علاوہ بھی متعدد مرکزی مقامات پر حضرت نے خطاب فرمایا۔ دمشق یونیورسٹی کی جامع مسجد میں وہاں کے ذمہ داروں

کے اصرار پر حضرت نے جمعہ کا خطبہ بھی دیا۔ اس کے علاوہ حمص میں اخوان المسلمین کے مرکز میں ۲۹ / جولائی کو ایک ولولہ انگیز اور مؤثر تقریر ہوئی۔

شام کے قیام میں وہاں کے مدفون متعدد صحابہ کرام، علماء و مشائخ کی قبور پر بھی حاضری ہوئی۔

۱۲ / اگست ۱۹۵۱ء کو یہ سفر مکمل ہوا اور دمشق سے ہوائی جہاز کے ذریعہ مدینہ طیبہ واپسی ہو گئی (۱)۔ حضرت فرماتے ہیں کہ "چند دن مدینہ طیبہ میں قیام کر کے ہم لوگ مکہ مکرمہ آئے جو اس پورے سفر کا "نهاية المطاف" تھا۔" (۲) مکہ مکرمہ میں مزید پانچ مہینہ قیام رہا اور اسی دوران حضرت نے تیسرا حج بھی فرمایا اور ان تعلقات کی تجدید بھی ہوئی جو مکہ معظمہ کے پہلے قیام میں خاص طور پر بستان بخاری کے اجتماع کے بعد پیدا ہو گئے تھے۔ اسی دوران سعودی ریڈیو پر حضرت کی دو اور تقریریں نشر ہوئیں اور وہاں کے واحد عربی اخبار "البلاد السعودية" میں "كيف توجه المعارف" (تعلیم کی پالیسی اور طریقہ کار) کے عنوان سے ایک اہم مضمون بھی شائع ہوا، بعد میں اس کو کتابی شکل میں امام حرم شیخ عبد المہیمن نے اپنے خرچ پر شائع کیا۔ اسی دوران شیخ محمد سرور صبان کی دعوت پر طائف کا ایک یادگار سفر بھی ہوا اور امیر طائف کی ایک خصوصی دعوت میں بھی شرکت ہوئی اور ان کے سامنے بھی دعوت پیش کرنے کا موقع ملا۔

مکہ معظمہ میں "وادی فاطمہ" کا ایک تبلیغی سفر بھی ہوا اور وہاں تعلیم یافتہ طبقے، مشہور ادباء اور صحافیوں کے سامنے حضرت نے خطاب فرمایا۔

---

(۱) یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت مشرق وسطیٰ کے طویل سفر سے اس شان کے ساتھ واپس ہوئے کہ وہاں جگہ جگہ حضرت کی دعوت و پیام کی بازگشت تھی لیکن اس کے ساتھ زہد و استغناء کا یہ حال تھا کہ جب مدینہ منورہ کے مطار پر تشریف لائے تو ضرورت کے لئے پاس رقم نہیں تھی، حضرت نے اپنے بھانجے مولانا محمد رابع صاحب سے تقاضا فرمایا اور انہوں نے بھی رقم کا کسی سے قرض لے کر انتظام کیا۔

(۲) کاروان زندگی ص ۳۹۱

یہ طویل سفر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ختم ہوا اور اس طرح تقریباً تیرہ چودہ مہینے کے بعد حجاز و مشرق کے سفر سے ہندوستان واپسی ہوئی۔ (۱)

چونکہ ایک طویل عرصہ کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی تھی اس لئے بھی لکھنؤ اسٹیشن پر تعلق والوں کی ایک جماعت استقبال کے لئے موجود تھی، ان لوگوں کے اصرار پر حضرتؒ نے اسٹیشن سے قریبی مسجد میں مختصراً سفر کی روداد سنائی اور اس میں بڑے درد کے ساتھ یہ اشعار بھی پڑھے۔

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

حضرت مدنیؒ کا ایک تاریخی مکتوب

حضرتؒ کی اقبال مندی اور ترقی سے برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور وہ اس میں مزید ترقی کے لئے کوشاں رہتے۔ اسی سلسلہ میں اس سفر کے دوران انھوں نے حضرت مدنیؒ کو دعائی درخواست کے لئے ایک خط تحریر فرمایا تھا اور اس میں یہ جملہ بھی لکھا تھا کہ "آپ دعا فرمائیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت سید احمد شہیدؒ سے تجدید و اصلاح کا کام لیا اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ علی سے یہ کام لے۔" اس کے جواب میں حضرت مدنیؒ نے جو والا نامہ تحریر فرمایا وہ یہاں ایک تاریخی امانت کے طور پر نقل کیا جاتا ہے۔

"محترم المقام زید مجدکم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(۱) حضرت نے اس پورے سفر کی تفصیلی عربی زبان میں روداد بھی تصنیف فرمائی جو "مذکرات سائح فی الشرق العربی" کے نام سے شائع ہوئی۔ حضرت کا یہ سفرنامہ عربی ادب النثر و ادبی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ "مشرق وسطیٰ کی ڈائری" کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔

مزاج مبارک، والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔

مولوی علی میاں صاحب کی خبریں روسا۔ تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب اور دیگر حضرات سے معلوم ہوتی رہتی تھیں، مگر آپکی تحریر سے تفصیلات معلوم ہوئیں اور مزید اطمینان ہوا، اللہ سے دعا ہے کہ وہ کریم کارساز موصوف کو مفتاح خیر اور مغلاق شر بنائے، اور حضرت سید صاحب شہید قدس اللہ سرہ العزیز کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت علیہ کا علمبردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالا مال کرے۔ آمین!

والسلام

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہ

۱۵ ربیع الاول ۷۰ ۱۳ھ

نواں باب

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوریؒ کی محبت و شفقت، خلافت و اجازت، اندرون ملک دینی و ملی خدمات اور اس کے لئے حضرتؒ کا درد و سوز۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کے اہم حوادث و واقعات

حضرت رائپوریؒ کی غایت درجہ شفقت و محبت اور حضرتؒ کو اجازت و خلافت

۱۹۳۹ء میں حضرتؒ نے جن دینی مرکزوں کا دورہ فرمایا تھا ان میں رائپور کی خانقاہ بھی تھی۔ حضرت رائپوریؒ نے اس پہلی ہی ملاقات میں جس اپنائیت کا معاملہ فرمایا تھا اس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔

حضرت رائپوریؒ کی بزرگانہ شفقت، سیاسی فہم و فراست، دین و دنیا کی جامعیت، وسیع النظری، وسیع القلبی، ذہن کی وسعت اور حقیقت پسندی اور پھر فنائیت و بےنفسی کا حضرتؒ کے قلب و دماغ پر گہرا اثر پڑا کہ سرگروہ مشائخ میں ان صفات کا پایا جانا ایک نادر بات تھی، حضرتؒ کی جس ماحول میں ذہنی و فطری تربیت ہوئی تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت رائپوریؒ سے حضرتؒ کو خاص مناسبت پیدا

ہوئی، حضرتؒ نے اپنے قلبی و فکری رجحان کو صاف محسوس کیا، دوسری طرف حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ حضرتؒ کو حضرت رائپوریؒ کی خدمت میں جانے اور ان سے استفادہ کرنے کی برابر تاکید فرماتے رہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ بھی اپنے مرض الوفات میں بار بار لوگوں کو حضرت رائپوریؒ کی خدمت میں بیٹھنے اور ان سے استفادہ کرنے کی تاکید کرتے تھے اور اکثر و بیشتر حضرت ہی کو اس کام پر مامور فرماتے کہ لوگوں کو توجہ دلائیں۔ اس سے قدرتی طور پر خود حضرت کو بھی توجہ ہوئی۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرت رائپوریؒ سے ربط و تعلق میں مزید استحکام پیدا ہوا اور حضرت رائپوریؒ کی شفقت و توجہ بڑھنے لگی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "رائپور جا کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ مادیت و عقلیت کے بحر ظلمات میں جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، یہی ایک جزیرہ ہے جہاں ذکر و فکر کے علاوہ کوئی موضوع گفتگو اور مشغلہ زندگی نہیں اور جہاں پتہ پتہ سے اللہ اللہ کی آواز آتی ہے۔"(۱)

۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہو گیا تو حضرتؒ کے لئے بار بار لاہور جانا اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی خدمت میں حاضری دینا مشکل ہو گیا، حضرت لاہوریؒ نے جو خود بھی حضرت رائپوریؒ کے بڑے قدر شناس اور عقیدت مند تھے، حضرتؒ کو ان کی خدمت میں جانے اور استفادہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اسطرح حضرتؒ کا تعلق بڑھتا گیا اور حضرت رائپوریؒ کی شفقت و عنایت اور محبت بھی بڑھتی گئی، اور اس کی نوبت یہاں تک پہونچی کہ حضرت رائپوریؒ کو حضرت کی آمد کا علم ہوتا تو انتظار شروع ہو جاتا اگر حاضری میں تاخیر ہوتی تو ملاقات کا اشتیاق ظاہر فرماتے اور قیام کے دوران بڑی خصوصیت کا معاملہ فرماتے۔

مولانا محمد منظور نعمانی اس تعلق کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اگرچہ یہ ناچیز ہی مولانا علی کے رائپور جانے اور حضرت سے تعلق

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۵۳

قائم ہونے کا اول ذریعہ بنا، اور حضرت سے بیعت کا شرف بھی پہلے ناچیز ہی کو حاصل ہوا، لیکن موصوف کی ان خداداد صفات اور خصوصیات کی وجہ سے جن کی اللہ کے یہاں اور اس کے مقبول بندوں کے ہاں بھی زیادہ قدر و قیمت ہے، حضرت کے یہاں محبوبیت کا جو مقام ان کو حاصل ہوا وہ اس ناچیز کے لئے موجب مسرت ہونے کے باوجود ہمیشہ رشک و غبطہ کا باعث بھی بنا رہا۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء"(۱)

حضرتؒ سے اسی تعلق و محبت کا اثر تھا کہ لکھنؤ کو سات مرتبہ حضرت رائپوریؒ کی تشریف آوری کا شرف حاصل ہوا، دو مرتبہ حضرتؒ کے وطن رائے بریلی بھی تشریف لائے۔ اور دوسرے سفر میں جو ۱۹۴۳ء میں ہوا تھا، ایک روز مسجد سے نکلتے ہوئے حضرت کو چاروں سلسلوں خاص طور سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ میں اجازت و خلافت عطا فرمائی۔ حضرت کا بھی حال یہ تھا کہ حضرت رائپوریؒ کے مشورہ کے بغیر کوئی اقدام نہ فرماتے اس کا آخری درجہ کا واقعہ یہ ہے کہ پہلے حج کے بعد دوسرے ہی سال ایک قابل احترام شخصیت کی جانب سے حج کی پیشکش ہوئی، پہلی حاضری کے بعد دوبارہ حاضری کی جو تمنا ہوتی ہے وہ جانے والا ہی جانتا ہے، پھر حضرت کو جو تڑپ رہی ہوگی اس کا کچھ اندازہ اس کو ہو سکتا ہے جو حضرتؒ کے حرمین سے عشق و محبت کو جانتا ہو۔ حضرت رائپوریؒ دہلی کے محلہ قصاب پورہ میں مقیم تھے، حضرت بھی حاضر خدمت تھے، اس کا تذکرہ فرمایا تو فرمانے لگے "اگر میں روک دوں تو طبیعت پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟" مشائخ کے یہاں اطاعت و انقیاد راہِ سلوک کی بنیاد ہے، حضرت اس راہ کے رہرو ہی نہیں بلکہ اس کے رہبروں کی صف میں داخل ہو چکے تھے۔ فرمایا اگر حضرت روک دیں گے تو ان شاء اللہ اثر نہیں پڑے گا۔ حضرت فرماتے ہیں "حضرت نے میرے چہرہ کی طرف دیکھا، الحمد للہ اس پر کوئی اثر نہیں تھا"۔

(۱) مقدمہ سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائپوریؒ ص ۴۳

اس واقعہ کے دوسرے ہی سال حضرت رائپوریؒ نے حضرتؒ ہی کے لئے حج کا سفر فرمایا۔ ایک طرح سے یہ اس بات کے ماننے کا انعام تھا جسکی ان حضرات کے یہاں بڑی قدر تھی۔

پورے سفر میں حضرت رائپوریؒ نے حضرتؒ کو اپنے ساتھ ہی رکھا اور نہایت درجہ شفقت فرمائی، جسکو شفقت مادری کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں:-

"نماز کے اوقات میں حضرتؒ کا قیام حرم شریف کے ایک خلوہ میں رہتا تھا، دوپہر کا کھانا بھی وہیں تناول فرماتے تھے۔ میں تبلیغی اجتماعات اور علماء وخواص کی ملاقاتوں میں ایسا منہمک رہتا کہ اکثر کھانے کے وقت دیر سے حاضری ہوتی، خیمہ میں قدم رکھتا تو دیکھتا کہ حضرت بیٹھے ہوئے ہیں، سامنے رومال میں روٹیاں لپٹی ہوئی رکھی ہیں، مجھ کو دیکھ کر فرماتے "علی میاں! تم کو کھانے کا بھی ہوش نہیں! دیکھو میں تمہارے لئے چپاتیاں لئے بیٹھا ہوں کہ خمیری روٹی تم کو نقصان کرتی ہے۔" مدینہ طیبہ حاضری کا موقعہ آیا تو مجھ سے فرمایا..... "بس اب حضرت شیخ کی ضیافت اور انتظام ختم ہوا اب تم ہمارے ساتھ رہو گے" حضرت نے ہوائی جہاز سے سفر کا فیصلہ کیا اور میرا ٹکٹ بھی لیا۔ مدینہ طیبہ میں قیام حضرتؒ کے ساتھ مدرسہ علوم شرعیہ میں رہا۔

۲۰ محرم ۱۳۷۰ھ ۲ نومبر ۱۹۵۰ء کو حضرت کی مع اپنے رائے پوری رفقاء وخدام کے محمدی جہاز سے روانگی ہوئی۔ مجھے حجاز میں مزید قیام کرنا تھا اور کچھ مصر کے سفر کی بھی نیت تھی اس لئے واپسی کے سفر میں ہمرکابی نہیں رہی۔ ہم لوگوں نے جدہ کی بندرگاہ پر حضرت کو رخصت کیا۔ قدیم دستور کے مطابق حضرت ایک موٹر لانچ میں بیٹھ کر جہاز کے لئے روانہ ہوئے جو فاصلہ پر ٹھہرتا تھا، حضرت کے ایک خادم خاص راؤ حاجی فضل الرحمٰن خاں رائے پوری بیان کرتے ہیں "جب تک تمہاری صورت اوجھل

نہیں ہوئی، حضرت موٹر لانچ پر سے برابر تم کو دیکھتے رہے۔" (۱)

حضرت رائپوریؒ کے دو یادگار مکاتیب

حضرتؒ سے حضرت رائپوریؒ کے تعلق قلبی اور محبت کا اندازہ ان مکاتیب سے بھی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے حضرتؒ کو ارسال فرمائے۔ یہاں پر ان میں سے دو منتخب خطوط نقل کئے جاتے ہیں۔

حضرت اپنے خط میں حضرت رائپوری کے لئے سیدی و مرشدی کے الفاظ تحریر فرماتے تھے اسی جیسے کسی خط کے جواب میں حضرت رائپوری نے تحریر فرمایا

"از احقر عبدالقادر

سیدی و مولائی حضرت اقدس دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت! آپ مجھے کیا سیدی و مرشدی لکھتے ہیں؟ احقر تو حضرت کا خادم ہے، اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجہ نصیب فرماویں۔ حضرت والا کے والا نامہ کا تو بہت ہی انتظار رہتا ہے، اور اکثر اوقات حضرت کا خیال رہتا ہے، اب بہت شدت سے جناب کا انتظار ہے کہ کب جناب والا تشریف لاویں ــــــــ (۲)

ایک خط میں حضرت سے اشتیاق و ملاقات کو اس طرح ظاہر فرمایا کہ مولانا روم نے اپنے مرشد حضرت شمس تبریز کے اشتیاق میں جو اشعار کہے تھے وہ تحریر فرمائے، پھر لکھا کہ "یہ اشعار اسلئے تحریر کئے ہیں کہ ہم نے آپ کو مولانا شمس تصور کر رکھا ہے اور تشریف لانے کے تقاضے کے لئے وہی اشعار لکھ دیئے ہیں۔ (۳)

اندرون ملک ملی تحفظ کی فکر اور اس کی کوششیں

حضرتؒ کے پہلے سفر حجاز کے موقع پر جو ۱۹۴۷ء میں ہوا جس کا ذکر تفصیل

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۵۷ تا ۳۵۸
(۲) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مشاہیر امت کی نظر میں ص ۹۲ (۳) ایضاً

سے گذر چکا، ہندوستان میں تقسیم کا وہ واقعہ پیش آیا جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا، قدرتی طور پر ہندوستان میں باقی رہ جانے والے مسلمانوں کو سب و شتم کا نشانہ بننا پڑا، ایک عرصہ تک ان پر مایوسی کی فضا طاری رہی، کوئی ملی تشخصات اور جداگانہ تہذیب کا مذاق اڑاتا، کوئی ہندی رسم الخط اختیار کر لینے کا مشورہ دیتا، تو کوئی قومی دھارے میں ضم ہو جانے کی بات کہتا۔ حضرتؒ جب سفر سے تشریف لائے تو ان حالات سے دل پر ایک چوٹ لگی اور شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہوا کہ یہ غیر فطری صورت حال ہے، اس کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے ورنہ مسلمانوں کا اپنے ملی تشخص کے ساتھ باقی رہنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے لئے حضرتؒ نے مضامین بھی لکھے، اور دوسری طرف فکر مند دانشوروں اور مختلف مکتب خیال دردمندوں کا ایک اجتماع بلایا تاکہ ان کے سامنے دل کا یہ درد رکھا جا سکے۔

۲۰ر شوال ۱۳۶۷ھ ۲۶ر اگست ۱۹۴۸ء کو دارالعلوم میں یہ ملی مشاورتی اجتماع منعقد ہوا، اور اس میں علماء اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ حضرتؒ نے اس میں پڑھنے کے لئے "نشان راہ" کے عنوان سے ایک فکر انگیز اور موثر مقالہ تیار فرمایا جس میں ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کی روشنی میں موجودہ صورت حال کا حل پیش کیا گیا ہے۔ ان کی ملی غیرت کو جھنجھوڑا گیا ہے اور تبلیغ و دعوت کی عملی کوششوں کے ساتھ مخلوط مجمعوں میں حکیمانہ طرز پر خطاب، ہندی اور انگریزی میں دعوتی و تعارفی لٹریچر کی تیاری اور آزاد اسلامی درسگاہوں کے قیام کی افادیت و ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ مقالہ لوگوں نے توجہ سے سنا، خاص طور پر جگر مرادآبادی صاحبؒ نے دوسری نشست میں دوبارہ یہ مقالہ پڑھنے کی فرمائش کی جو پوری کی گئی۔

مذکورہ بالا تین تجاویز میں سے مخلوط اجتماعات سے خطاب کا سلسلہ ایک ہی دو سال بعد ۱۹۵۱ء سے باقاعدہ شروع ہو گیا۔ آزاد مدرسوں کے قیام کی کوششیں بھی بعض حلقوں کی طرف سے محدود پیمانہ پر ہو رہی تھیں، لیکن ہندی انگریزی میں

لٹریچر کی تیاری کا کام نہ ہونے کے برابر تھا، اس کی فکر کی گئی۔ ہندی ترجمہ کا کچھ کام مولوی عابد علی صاحب بلہوری اور انگریزی ترجمہ کا جناب مظہر الدین صاحب صدیقی نے کیا، کچھ لٹریچر شائع ہوا، لیکن سب سے بڑا مسئلہ اس کی اشاعت کا تھا، مولانا اسحاق سندیلوی نے اس کی ذمہ داری قبول کی اور ایک سال کسی نہ کسی طریقہ پر یہ کام چلتا رہا، لیکن بالآخر مناسب جگہ نہ ملنے اور افراد کی کمی کے باعث یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر طویل عرصہ کے بعد "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" اور "پیام انسانیت" کے پلیٹ فارم سے اس کو دوبارہ جاری کیا گیا، اور حضرتؒ کی سرپرستی میں اس کو خاصی ترقی اور قبول عام حاصل ہوا۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۰ء کے دوران تبلیغی اجتماعات سے خطابات بھی ہوتے رہے جس میں سب سے اہم تقریر ۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء میں "صورت و حقیقت" کے عنوان سے ہوئی اور لوگوں پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ اس کا عربی ترجمہ حضرت کے برادر زادہ مولانا سید محمد الحسنی صاحب نے فرمایا جن کی عمر اس وقت ۱۴ سال کی تھی، مگر ان کی خداداد صلاحیت اور ذہنی تحریری طاقت کا نتیجہ تھا کہ ترجمہ میں تقریر کی پوری روانی اور طاقت موجود ہے۔ ۱۹۵۰ء کے سفر حجاز میں یہ رسالہ ذوق و شوق سے پڑھا گیا اور بعض عرب فضلاء نے اتنی بار پڑھا کہ ان کو تقریباً حفظ ہو گیا۔

ندوۃ العلماء کی رکنیت و معتمدی

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی وفات اور دار العلوم میں ان پر سیمینار

حضرتؒ کی شہرت و مقبولیت اب ہندوستان سے تجاوز کر چکی تھی، عالم عربی میں بھی حضرتؒ کی دعوت و فکر کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا اور حضرتؒ کی تحریریں اپنا اثر کر رہی تھیں۔ دار العلوم اس کا مستحق تھا کہ اس سے فائدہ اٹھائے اور حضرت کی توجہ اس کو حاصل ہو۔ ۱۹۴۸ء کے وسط میں مجلس منتظمہ نے حضرتؒ کو رکن مجلس انتظامی و مجلس دار العلوم منتخب کیا اور ۱۹۴۹ء کی ابتدا میں علامہ سید

سلیمان ندویؒ کی تحریک پر تاب معتمد تعلیم بنایا گیا۔ حضرت سید صاحبؒ کا تعلق اخیر میں ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ اور حضرتؒ سے بہت بڑھ گیا تھا، خاص طور پر "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا مقدمہ تحریر فرمانے کے بعد حضرتؒ پر وہ بڑی شفقت فرمانے لگے تھے، کتاب پر انھوں نے کھل کر داد دی اور یہاں تک لکھا کہ "یہ کتاب مسلمانوں کے ہاتھ میں رشد وہدایت اور عزم وہمت کا ایک صحیفہ ہے۔" ۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان تشریف لے گئے اور وہیں نومبر ۱۹۵۳ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد بالاتفاق حضرتؒ کو معتمد تعلیم منتخب کیا گیا۔ حضرتؒ نے وفات کے دوسرے ہی مہینہ دار العلوم میں ان کی شخصیت اور کارناموں پر ایک سیمینار منعقد کیا اس کی صدارت کے لئے مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کو دعوت دی، ضعف وعلالت کے باوجود وہ تشریف لائے جلسہ کی صدارت بھی فرمائی اور سیرۃ النبی جلد ششم پر ایک طویل اور پر مغز مقالہ بھی پڑھا۔

مخلوط اجتماعات

حضرتؒ، حضرت مولانا منظور نعمانی صاحبؒ کی رفاقت میں تبلیغی سفروں اور اس کے اجتماعات میں اپنے طریقہ "فکر ولائحہ" عمل کے ساتھ مشغول تھے، اسی دوران یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسے مخلوط اجتماعات بھی کئے جائیں جن میں خاص طور پر تعلیم یافتہ غیر مسلم حضرات کو دعوت دی جائے اور ان کے ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے خطاب ہو، تقریر بھی ایسی زبان میں کی جائے جو ان کیلئے زیادہ قابل فہم اور پر کشش ہو، ہندی انگریزی کے آسان الفاظ اس میں استعمال کئے جائیں۔

حضرت فرماتے ہیں:

"لیکن یہ کام بہت نازک تھا، اس کے لئے بڑے سلیقہ، احتیاط، اظہار خیال پر قدرت اور مخاطبین کی نفسیات کو سمجھنے کی ضرورت تھی، ذرا سی بے احتیاطی سے یہ دعوت "وحدت ادیان" کے لئے راستہ ہموار کرسکتی تھی،

دوسری طرف مخاطبین کے اس شوق کو ختم کر سکتی تھی جو ایک مرتبہ جلسہ میں آ چکے ہوں، اس لئے یہ نازک کام زیادہ میں اور کم تر مولانا منظور صاحب نعمانی انجام دیتے تھے اور الحمدللہ یہ تجربہ بہت کامیاب ہوا۔

مصر اور شام سے واپسی پر لکھنؤ کی تبلیغی جماعت کے زیر اہتمام امین الدولہ پارک میں جس کو جھنڈے والا پارک بھی کہتے ہیں اور جہاں تحریک خلافت کے وقت سے لے کر اس وقت تک اہم سیاسی جلسے ہوتے رہے اور گاندھی جی اور موتی لال نہرو سے لیکر مولانا محمد علیؒ اور جواہر لال نہرو نے ہمیشہ تقریریں کی، ایک عمومی اور مخلوط جلسہ ہوا جس میں مسلم اور غیر مسلم بھی شریک تھے۔ میں نے وہاں "خدا پرستی اور نفس پرستی" کے عنوان سے ان دو متوازی فلسفہ حیات اور عالمگیر مذہبوں پر تقریر کی جنھوں نے دنیا کو منقسم کر رکھا ہے اور دونوں کے نتائج اور زندگی پر اثرات کی وضاحت کی۔ بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ اس جلسہ میں حاضرین کی اتنی تعداد تھی جو بڑے سے بڑے سیاسی رہنما حتی کہ جواہر لال نہرو صاحب کے خطاب میں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ من جانب اللہ یہ بات تھی کہ مضامین کی ایسی آمد اور تقریر میں ایسی روانی اور جوش تھا کہ سامعین ایک سکتہ کے عالم میں تھے۔ اور ایسی خاموشی تھی جس کو (Pin Drop Silence) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہت سے رکشہ والوں نے جن کا اڈہ قریب تھا، سواری لینے سے انکار کر دیا اور کھڑے سنتے رہے۔ اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ تھی جو میرے لئے بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ بھائی صاحب مرحوم بھی پاس کی ایک عمارت میں بیٹھے ہوئے تقریر سن رہے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی محنت اور تربیت ذہنی پر مسرور و مطمئن ہوئے ہوں گے۔"(۱)

اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور مختلف مقامات پر اسکے کامیاب اجتماعات

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۹۷ تا ۳۹۸

ہوئے۔ اسی نے بعد میں "تحریک پیام انسانیت" کی شکل اختیار کر لی اور اس سے پورے ملک میں جس طرح فضا سازی کا کام ہوا وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں۔

دار العلوم دیو بند میں پہلی تقریر

دار العلوم میں سجاد لائبریری کے نام سے طلبہ بہار کی ایک انجمن تھی جن میں بعض طلبہ حضرتؒ سے مانوس تھے جن میں خاص طور پر مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی قابل ذکر ہیں، جو اس وقت دار العلوم کے طالب علم تھے۔ ان طلبہ نے حضرت کو وہاں خطاب کی دعوت دی اور ایک سفارشی خط حضرت مدنیؒ سے لکھوا کر حضرت کو بھیجا۔ اس پر مولانا اعزاز علی صاحب سے بھی سفارشی کلمات لکھوائے، بطور یادگار وہ خط یہاں نقل کیا جاتا ہے:

جناب مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب زید مجدہ...... بعد از سلام مسنون

عرض آنکہ طلبائے دار العلوم سجاد لائبریری کی پر زور خواہش ہے کہ وہ آپ کی گراں قدر نصائح اور ہدایات سے مستفید ہوں۔ امیدوار ہوں کہ ان تمناؤں کو قبولیت سے نوازیں۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۲۰ر جمادی الاول ۱۳۷۳ھ (۱۴ر جنوری ۱۹۵۴ء)

انچہ استفاذ ازل (مولانا مدنی عمت فیوضہم) گفت

ہماں می گویم

محمد اعزاز علی امروہی (۱)

حضرت نے "طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر فرمایا، جو حضرت کی شاہکار تحریروں میں سے ہے اس کا ایک اقتباس یہاں بطور نمونہ کے پیش کیا جاتا ہے:

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۰۲

"دنیا میں ہر ادارہ، ہر مرکز، ہر فرد کو راحت و فراغت کا حق ہے، اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں دنیا میں ہر مسافر کے لئے آرام ہے، لیکن اس مسافر کے لئے راحت حرام ہے۔ اگر زندگی میں ٹھہراؤ ہو، سکون اور وقوف ہو تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لے، لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے تو مدرسہ میں جمود و تعطل کی گنجائش کہاں؟! اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں، نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے، بھٹکے ہوئے قدموں کو راستے پر لگانا ہے، ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے یا کسی منزل پر قیام کرے یا اس کو کوئی مقام خوش آجائے تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے؟ سرود ازلی اور پیغام محمدیؐ اسے کون سنائے؟ مدرسہ کا تعطل اور قیادت سے کنارہ کشی، کسی منزل پر قیام، خودکشی کا مرادف ہے اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کے ہم معنی ہے اور کوئی خود شناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور نہیں کر سکتا۔"(۱)

مارچ ۱۹۵۴ء کو یہ جلسہ ہوا۔ اور طلبہ نے بڑے ذوق و شوق اور تاثر کے ساتھ یہ مقالہ سنا۔ بعد میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے تعارفی کلمات کے ساتھ یہ پورا مقالہ الفرقان میں شائع کیا۔ یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نعمانیؒ کے اس تعارف و اعتراف اور تاثر کو یہاں نقل کر دیا جائے کہ وہ ایک شب و روز کے رفیق کی شہادت ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"(یہ مقالہ اگرچہ مقالہ ہی ہے) کوئی کتاب نہیں ہے لیکن اپنا یہ احساس اور تاثر بے تکلف ظاہر کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ اس عاجز کی نظر میں اسکی قیمت و اہمیت سینکڑوں صفحات والی بہت سی کتابوں سے بھی زیادہ ہے۔ یہ مقالہ لکھنے والے قلم کی صرف قوالی نہیں ہے بلکہ اسکے دل کا درد اور اسکا یہی حال ہے، اور جن باتوں کی طرف دینی مدارس کے طلبہ اور فضلاء کو اس میں توجہ دلائی

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۰۳ تا ۳۰۴

گئی ہے اللہ کی خاص عنایت اور توفیق سے مقالہ نگار خود اس کا زندہ نمونہ ہے۔

دوسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ اس عاجز کا سن تو اگرچہ ابھی پچاس سے بھی کم ہے لیکن زندگی مختلف میدانوں میں کچھ ایسی رواں دواں گذری کہ اتنی ہی عمر میں بہت کچھ دیکھ لیا اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا تجربہ اور میری واقفیت اتنی ہے کہ اپنی اس رائے کے اظہار کا مجھے بجا حق ہے، ہماری اس دنیا میں ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذہن ثاقب بھی ملا ہو اور دل روشن بھی، جو اس دوڑتی ہوئی اور کروٹیں بدلتی ہوئی دنیا کے حالات و مزاج اور اس کے نت نئے تقاضوں سے پورے باخبر بھی ہوں اور دینی و ایمانی حقائق کے بارے میں وارثین انبیاء کی طرح صاحب یقین بھی۔ .... الغرض ہماری اس دنیا میں یہ جنس بہت ہی کمیاب ہے اور اللہ کے ایسے بندے جو ان دونوں صفتوں کے جامع ہوں، اس عاجز نے غالباً اتنے بھی نہیں دیکھے جتنی کہ اپنے ایک ہاتھ میں انگلیاں ہیں، لیکن جو دو چار دیکھے ہیں ان میں ایک ذات رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی کی بھی ہے۔ اللہ کی خاص عنایت اور توفیق سے وہ صاحب نظر و فکر بھی ہیں اور صاحب قلب بھی، وہ اپنے علم و معلومات کے لحاظ سے جدید بھی ہیں، اور ایمان و یقین اور رسوخ فی الدین اور طرز زندگی کے لحاظ سے قدیم بھی، ان کی ذات میں مدرسہ بھی ہے اور خانقاہ بھی، ان کی گہری علمی بصیرت اور دقت نظر کی شہادت کے لئے ان کی ایک کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کافی ہے، جو گذشتہ دو ڈھائی برس ہی میں مصر میں بار بار چھپ کر ختم ہو چکی ہے، اور اس وقت پھر چھپ رہی ہے۔"(۱)

قیام پاکستان کے بعد دو سفر

۱۹۵۴ء کو حضرت رائپوریؒ نے "کوہ مری" میں رمضان گذارا۔ حضرتؒ نے

(۱) رسالہ ماہنامہ الفرقان جلد ۲۱، شمارہ ۸، ص ۶-۷

بھی وہیں رمضان گذارنے کے لئے پاکستان کا سفر کیا۔ پورے مہینہ حضرت رائپوریؒ کی خصوصی توجہات اور شفقتیں حضرتؒ کو حاصل رہیں۔ آمدورفت میں لاہور بھی کچھ روز کیلئے قیام فرمایا، اور حضرت لاہوریؒ کی خدمت میں حاضری دی، اور حضرتؒ کے الفاظ میں "انکی سرپرستانہ و بزرگانہ شفقت کا حظ و کیف حاصل ہوا"۔

دوسرا سفر اگلے ہی سال مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کی رفاقت میں ہوا، اور حضرتؒ پشاور اور کوہاٹ تک تشریف لے گئے۔ اسی سفر میں مولانا شاہ حلیم عطا صاحب سلونویؒ (شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے حادثۂ وفات کی خبر ملی، اور دوسری خوش کن خبر "البعث الاسلامی" کے اجراء کی تھی، حضرت کو اسکا پہلا نسخہ اسی سفر میں ملا۔

ان ہی سفروں میں سے کسی سفر میں مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے حضرتؒ کے اعزاز میں جامعہ سلفیہ میں ایک تقریب منعقد کی، اور اس وقت کے بزرگ ترین فرد جماعت مولانا داؤد غزنوی نے اس میں سپاس نامہ پڑھا۔ یہ حضرت کے ذاتی کمالات کے علاوہ اس روحانی تعلق و ربط کا بھی نتیجہ تھا جو ان کے خاندان کو حضرت سید صاحبؒ اور ان کے خاندان و مسلک کے ساتھ رہا تھا۔

"تاریخ دعوت و عزیمت" کی تصنیف

جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں جو اپنے اندر دینی جذبہ بھی رکھتا تھا بعض تحریکوں کے اثرات کی وجہ سے یہ خام خیالی پیدا ہونے لگی تھی کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوششیں مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتیں اور درمیان میں ایسے طویل وقفہ بھی گذرے ہیں جو مصلحین و مجددین سے خالی رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ تصور احساس کہتری اور ذہنی شکست خوردگی اور تاریخ اسلام پر سطحی نگاہ کا نتیجہ تھا، حضرتؒ نے یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید کو ایسے تسلسل کے ساتھ نئی زبان میں پیش

کیا جائے جس سے یہ بدگمانی اور مایوسی دور ہو اور اسلام کی حقانیت، اس کی اندرونی طاقت اور صلاحیت پر اعتماد پیدا ہو۔ اسی دوران حضرتؒ، حضرت رائپوریؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ حضرت "بیٹ ہاؤس" میں شاہ مسعود صاحب کے دولت خانہ پر مقیم تھے۔ صبح ہوا خوری میں حضرتؒ بھی حضرت رائپوریؒ کے ساتھ ہوگئے، حضرت رائپوریؒ نے اپنے ایک غیر مسلم اہل تعلق سے فرمایا کہ اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اسلام کو جس زمانہ میں جیسے مردان کار کی ضرورت پیش آئی، اللہ تعالیٰ ان کو پیدا کرتا رہا اور جب کسی فتنہ نے سر اٹھایا اللہ نے اس کی سرکوبی کے لئے کسی کو کھڑا کردیا۔ حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت کے اس مختصر جملہ نے میرے سامنے تاریخی و علمی شواہد کا ایک لشکر کھڑا کردیا اور اس موضوع پر مفصل لکھنے کی تحریک پیدا کی۔"(۱)

اس کے بعد ہی حضرتؒ کو لکھنؤ کے مرکز تبلیغ و دعوت میں "اصلاح و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتوں" کے عنوان سے ایک ہفتہ تک مسلسل خطاب کرنے کی نوبت آئی، جماعت کے ایک رفیق عبد الصمد صاحب بریلوی نے ان کو اسی وقت منضبط کرلیا، پھر حضرتؒ نے اسی مسودہ کو سامنے رکھ کر علمی و تاریخی اسلوب میں ایک کتاب کے قالب میں ڈھال دیا۔ اس طرح سے "تاریخ دعوت و عزیمت" کی پہلی جلد مرتب ہوئی۔ اس تصنیف کے وقت حضرت اپنے انہماک کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"یہ موضوع (مصنف کے مزاج اور افتادِ طبع کے مطابق) اس کے ذہن و اعصاب پر مستولی ہوگیا تھا، حالت یہ ہوئی کہ مرشد محترم حضرت رائپوریؒ مرکز میں مقیم ہیں اور میں ہی اصل داعی اور میزبان ہوں، لیکن صبح کے ضروری کاموں سے فراغت کرکے مرکز کے بالائی حصہ پر چلا جاتا اور حضرت کے کھانے کے وقت تک لکھنے میں مشغول رہتا۔ کئی بار خیال آیا کہ

---

(۱) کاروانِ زندگی اول ص ۳۱۲

حضرت میری اس غیر حاضری کو محسوس کرتے ہوں گے، لیکن پھر اطمینان ہوتا تھا کہ اس کوشش کی تکمیل جب سامنے آئے گی تو حضرت ہی سب سے زیادہ خوش ہوں گے۔"(۱)

اکتوبر ۱۹۵۴ء کو یہ پہلی جلد دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔ دینی و علمی حلقوں میں اسکو بڑی قدر و وقعت کے ساتھ قبول کیا گیا لیکن سب سے زیادہ حضرت رائپوریؒ نے اس پر اپنی مسرت ظاہر فرمائی اور بار بار مکاتیب عالیہ میں اس کا تذکرہ فرمایا۔ اسی سے متعلق چند خطوط کے اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"احقر آج کل آپ کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" سن رہا ہے، شاہ صاحب (۲) کے یہاں سے مل گئی تھی۔ ماشاءاللہ بہت اچھی کتاب ہے۔ آپ کو اللہ تبارک تعالیٰ جزائے خیر مرحمت فرمائے، آپ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کتاب لکھی ہے، واقعی یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ قبول فرمائیں۔ کیا عرض کروں ایسا ذوق معلوم ہوتا ہے اس کا کچھ اندازہ ہمیں کو ہے۔"

۲۸ نومبر ۱۹۵۶ء کے ایک مکتوب گرامی میں ارشاد فرماتے ہیں:

"آپ کی کتاب دوسری تیسری دفعہ سن رہا تھا کہ آج اس کو قاضی احسان صاحب نے مانگ لیا، وہ لے گئے ہیں، آپ کی کتاب سے سیری نہیں ہوتی ہے۔"

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"بہت ہی اچھا ہوگا کتاب کی دوسری جلد بھی شائع ہو جائے۔"(۳)

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۴۳

(۲) شاہ مسعود صاحب مرحوم بہٹ سہارنپور

(۳) کاروان زندگی اول ص ۳۴۳

علماء اہل قلم و مصنفین میں سے سب سے زیادہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے کتاب کی داد دی، جو خود اس موضوع پر شاید عالم اسلام میں اور کم سے کم ہندوستان میں لکھنے کا سب سے زیادہ حق رکھتے تھے اور جن کی تحریروں سے خود مصنف نے بڑا فائدہ اٹھایا تھا۔ مولانا نے کتاب پاکر جو خط لکھا اس کا ایک اقتباس درج ہے:

"دعوت و عزیمت" کی تاریخ ملی ہے، اپنی گم گشتہ چیز ہاتھ آگئی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کتنی دفعہ اس کے مطالعہ سے استفادہ کرتا ہوں گا، پڑھ رہا ہوں اور جی سیر نہیں ہوتا، خدا ہی جانتا ہے میرے کتنے خوابوں کی تعبیر آپ کے ذریعہ پوری ہوگی۔"(۱)

۱۹۵۶ء میں اسکی دوسری جلد مکمل ہوئی اور دارالمصنفین ہی سے شائع ہوئی، تیسری جلد جو مشائخ ہندوستان پر مشتمل تھی اس کی تصنیف میں خاصی تاخیر ہوئی۔ حضرت رائپوری کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا بھی تذکرہ ہے، تو حضرت رائپوریؒ کو اس کا بڑا تقاضا اور اشتیاق پیدا ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں یہ جلد مکمل ہوئی اور حضرتؒ اس کا مسودہ لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت رائپوریؒ نے پہنچتے ہی کتاب سنانے کا تقاضا کیا، ظہر سے عصر تک اور عصر سے مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہتا، اور جب تک کتاب پوری نہیں ہوئی کوئی دوسرا کام ان وقتوں میں نہیں ہوا۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا تذکرہ حضرت رائپوریؒ کے مرض الوفات میں لکھا گیا اور یہ کتاب ان کی وفات کے بعد "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" سے شائع ہوئی، جس کا قیام ۱۹۵۹ء میں ہو چکا تھا۔ حصہ چہارم جو حضرت مجدد صاحبؒ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے اٹھارہ سال کے بعد ۱۹۸۰ء میں طبع ہوا، پھر اس کے چار ہی سال کے بعد حصہ پنجم بھی مرتب ہو گیا۔ جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے عالی مرتبت صاحبزادگان اور احفاد و خلفاء کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۱۵

حضرت سید احمد شہیدؒ کی سیرت پہلے ہی لکھی جا چکی تھی۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، حضرت رائپوریؒ اور حضرت شیخ کے تذکرے بھی حضرتؒ نے تحریر فرمائے۔

اس طرح پندرہویں صدی ہجری تک اصلاح و تجدید کی پوری تاریخ حضرتؒ کے قلم سے مرتب ہو گئی۔

دمشق یونیورسٹی میں محاضرات کا سلسلہ

۱۹۵۱ء کے سفر مصر و شام میں حضرت نے جو نقوش چھوڑے تھے اور وہاں کے مختلف طبقوں، خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ نے حضرت کی فکر و دعوت سے اپنی جس شیفتگی و گرویدگی کا اظہار کیا تھا کہ گویا وہ ان کے دل کا ساز اور اندر کی آواز ہے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے زعماء و قائدین اور علماء و مشائخ کی توجہ بھی حضرتؒ کی ذات اور دعوت کی طرف منعطف ہونے لگی اور ان کو اس کی ضرورت و افادیت کا احساس ہونے لگا کہ حضرتؒ کا دوبارہ سفر ہو اور اس پیغام کو تازہ کیا جائے جو حضرتؒ کی اصل سوغات تھی۔ تین چار سال تک اس کی نوبت نہیں آسکی، بالآخر اسکی ایک تقریب یہ پیدا ہوئی کہ دمشق یونیورسٹی میں "كلية الشريعة" کا قیام عمل میں آیا، اس کے صدر ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی سے شام کے زمانہ قیام میں دوستانہ و برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، انھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ یہ درخواست کی کہ دو سال یا ایک سال کے لئے "كلية الشريعة" میں باقاعدہ استاذ کی حیثیت سے حضرتؒ ذمہ داری قبول کر لیں تاکہ حضرتؒ کی فکر و دعوت اور گہری فہم و بصیرت سے وہاں کے طلبہ پوری طرح مستفید ہو سکیں۔ حضرتؒ کی پوری زندگی جس زہد و استغناء اور صبر و تحمل کے ساتھ گذری تھی جو ہر مصلح و مجدد کی امتیازی شان اور اس کا شعار ہوتا ہے، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرتؒ نے معذرت فرمائی، البتہ اپنی دعوت کو پیش کرنے کے لئے اس پر آمادگی ظاہر فرمادی کہ دو تین مہینوں کے

لئے یہ سفر ہو اور اس میں کسی خاص موضوع پر مقالات پڑھے جائیں۔ ڈاکٹر سباعی صاحب نے اس کو غنیمت جان کر منظور فرمالیا۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے بڑا شفقت آمیز مکتوب تحریر فرمایا اس میں یہ بھی لکھا کہ

"اللہ کے مبارک اسم میں انقطاع عن الخلق اور احتیاج الی اللہ کا زبردست اثر ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں بارہ تیرہ سو کی ماہوار رقم حسبۃً للہ چھوڑ دینا معمولی بات نہیں ہے۔ اس پاک نام کی ہزاروں برکتوں میں سے ایک برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مبارک نام کی برکتوں سے اور بھی آپ کو مالا مال فرمائے۔"

ڈاکٹر سباعی صاحب سے خط و کتابت کے دوران ہی حضرت رائپور حاضر ہوئے اور حضرت رائپوریؒ سے اجازت طلب فرمائی۔ حضرتؒ نے بخوشی اجازت دی اور اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔

حضرتؒ کو بھی طبعی طور پر اس دینی و علمی اعزاز سے مسرت ہوئی اور اہل تعلق بھی خوش ہوئے۔ خاص طور پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بڑی مسرت کے خطوط تحریر فرمائے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اخبار "الجمعیۃ" اس کے بعد "مدینہ" میں بھی اس تاریخی امتیاز کی خبر پڑھی جو صدیوں کے بعد ہندوستان کو حاصل ہوا۔ علامہ صفی الدین بدایونی کے بعد شاید آپ دوسرے ہندی عالم ہیں جن کو شام میں پڑھانے اور اپنے علوم سے شامیوں کو فائدہ پہنچانے کا موقعہ ملا، بلکہ صفی ہندی تو خود گئے تھے اور آپ کو تو وہاں کی حکومت اور جامعہ نے طلب کیا ہے۔ وشتان بینھما یہ امتیاز آپ کی شخصیت تک محدود نہیں ہے بلکہ سارے ہندی علماء کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔ یا لیت کثر اللہ امثالکم فینا۔ ڈاکٹر صاحب اور آپ کے سارے خاندان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہوئے جو خوشی مجھے ہو رہی ہے اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا"۔

حضرتؒ نے محاضرات کے لئے "تاریخ دعوت وعزیمت" کا موضوع منتخب فرمایا تاکہ یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ، فضلاء واساتذہ کے سامنے تاریخ کے مطالعہ کا وہ ماحصل پیش کیا جائے جو اس تاریخ ساز سرزمین کو نئے سرے سے دینی فکر وعمل اور اصلاح وانقلاب حال پر آمادہ کر سکے اور ایک مہمیز کا کام دے۔

۱۹۵۶ء کو اپریل کی بالکل ابتدائی تاریخوں میں یہ سفر ہوا، مطار پر ڈاکٹر مصطفی السباعی کے علاوہ استاذ محمد المبارک اور استاذ مصطفی الزرقاء استقبال کے لئے موجود تھے۔ سباعی صاحب نے فندق الیرموک میں قیام کا سرکاری نظم کیا تھا، چند روز حضرتؒ وہاں ٹھہرے، پھر اپنی پرانی قیام گاہ شیخ عبدالوہاب الصلاحی کے مکان پر ان کی خواہش واصرار پر تشریف لے آئے۔

اس پورے قیام میں آٹھ محاضرات ہوئے۔ یونیورسٹی کے مرکزی ہال میں اس کا انتظام کیا گیا تھا، پورا ہال حاضرین سے بھر جاتا اور سامعین کی بڑی تعداد کھڑے ہو کر سنتی۔ دمشق کے ممتاز فضلاء اور اساتذہ جامعہ مثلاً استاذ محمد المبارک، استاذ محمد الزرقاء، ڈاکٹر معروف دوالیبی اور علماء میں علامہ بہجۃ البیطار جیسے فضلاء عام نوجوانوں اور طلباء کی طرح پابندی سے شریک ہوتے۔ محاضرات کے دوران ہی رمضان شروع ہو گیا، وقت بھی ساڑھے آٹھ بجے کا ہوتا جو عام طور پر آرام کرنے کا ہوتا ہے مگر جلسوں کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا، اور لوگ پورے ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کرتے رہے۔

آخری محاضرہ سے ایک دن پہلے یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر احمد السمان کی طرف سے حضرتؒ کے اعزاز میں ظہرانہ کا انتظام کیا گیا، اس میں یونیورسٹی کے فاضل اساتذہ اور بہت سے معززین شہر مدعو تھے۔ الجزائر کے مجاہد وفاضل علامہ محمد بشیر الابراہیمی بھی اتفاق سے وہاں مقیم تھے، وہ بھی اس دعوت میں شریک ہوئے۔

حسن اتفاق کہ حضرتؒ کے بڑے محبوب دوست ڈاکٹر سعید رمضان بھی اس

زمانہ میں وہیں مقیم تھے، ان کی قیام گاہ پر تقریباً ہر روز نشست ہوتی جس میں متعدد اسلامی فکر رکھنے والے نوجوان اور علماء شریک ہوتے۔

شیخ حارون العسل المجار سے ملاقات

شام میں قیام کے دوران بعض اہل تعلق نے حضرتؒ سے شیخ حارون کا تعارف کرایا کہ وہ یہاں کے بڑے عارف بزرگ اور شیخ اکبر ابن عربی کے علوم کے بڑے مداح و محقق ہیں۔ حضرت ایک روز ان کی مجلس میں تشریف لے گئے، وہاں مجلس کا رنگ ہی دوسرا تھا، لوگ بجائے شیخ کے افادات سننے کے آپس میں گفتگو کر رہے تھے، شیخ بھی اپنی زبان سے ناگواری کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ مجلس کے اختتام پر کسی نے کہا شیخ ابوالحسن بھی یہاں تشریف رکھتے ہیں وہ کچھ خطاب فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا میں تو خود سننے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ "پھر بڑے حکیمانہ انداز میں لوگوں کو شیخ کی طرف متوجہ ہونے اور ان سے استفادہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس خطاب میں شیخ نے اپنے دل کی ترجمانی اور حقیقت حال کی تصویر محسوس کی۔

جو چیز وہ خود اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہتے تھے، وہ اللہ نے حضرتؒ سے کہلوائی، اس کے بعد سے وہ حضرت سے بڑی محبت فرمانے لگے، خود ملاقات کے لئے تشریف لاتے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ بار بار ملنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ:

"مجھے ان کے کشف اور ادراک باطنی کا تجربہ اس طرح ہوا کہ شیخ اکبر کے رسالہ "روح القدس" کی مجھے ضرورت تھی، وہ انہوں نے مجھے عنایت فرمایا، میں نے کہا کہ اس پر ہدیہ کے الفاظ لکھ دیں۔ وہ مجھے ابوالحسن الندوی کے نام سے جانتے تھے، جب وہ ہدیہ کے الفاظ لکھنے لگے تو اچانک سر اٹھا کر فرمایا کہ "تم فلاں خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟" میں نے کہا ہندوستان میں لوگ یہی کہتے ہیں۔ فرمایا کہ "ابھی خوشبو آئی۔" (۱)

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۲۸

حضرتؒ کے تعلق سے وہاں کا روشن خیال علمی طبقہ بھی ان سے مانوس ہوا، اور خاص طور پر ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی ان کی خدمت میں حاضری دینے لگے، پھر اپنی وصیت کے مطابق انہیں کے جوار میں مدفون بھی ہوئے۔

دمشق ریڈیو پر بھی حضرت کی دو تقریریں ہوئیں: پہلی تقریر "اسمعی یا سوریہ" کے عنوان سے اور دوسری "محمد اقبال فی مدینة الرسول" کے عنوان سے۔

لبنان اور ترکی کا سفر

شام کے قیام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرتؒ نے پہلے لبنان کا سفر کیا اور وہاں کے اہم علماء و قائدین سے ملاقات کی، اہم دینی مراکز و مدارس کے دورے کیے، طرابلس تشریف لے گئے، اور وہاں مرکز المولویہ (جو مولانا روم کی طرف منسوب ہے)، مدرسہ ابن خلدون اور مدرسۃ الغزالی کا معائنہ فرمایا اور وہاں نوجوانوں سے خطاب کیا۔ واپسی میں خلیۃ الملک سعود میں ایک منتخب مجمع کے سامنے ایک اہم تقریر ہوئی جس کا موضوع تھا کہ "قومیں تمدنوں کے بل پر زندہ نہیں رہتیں، پیغاموں کے دم سے زندہ رہتی ہیں اور روح اور خصوصیات ان کی محافظ و معاون ہوتی ہیں۔"

لبنان سے شام واپسی کے بعد ترکی کے سفر سے پہلے حضرت کی ایک اہم تقریر "حاجتنا إلی إیمان جدید" کے عنوان سے حلب میں اخوان کے مرکز میں ہوئی، اس میں حضرت نے قومیت عربیہ پر سخت تنقید کی اور عربوں کا کھل کر احتساب کیا۔ عربوں نے اس کا صرف اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ بڑے تشکر و تاثر کے ساتھ اس کو قبول کیا، اس میں ایک طرف عربوں کی حقیقت پسندی فراخ دلی و تحمل تھا تو دوسری طرف حضرت کے اخلاص، درد و فکر اور جوش دروں کا اثر تھا۔

حضرت تحریر فرماتے ہیں:

''تقریر ختم ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ محبت کا دریا امنڈ آیا، کم کسی مجمع نے اپنی محبت کا اس طرح والہانہ اظہار کیا ہوگا۔ یہ عربوں کی فراخ دلی اور عالی ظرفی کا ثبوت ہے جس کی مثال (ایسی سخت تنقید کے موقع پر) کسی اور قوم اور ملک میں ملنا مشکل ہے۔''(۱)

حلب ہی سے حضرتؒ نے ترکی کا سفر کیا، وہاں پہنچ کر جو آزمائش پیش آئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے فتح باب فرمایا، وہ حضرتؒ نے اپنے سفر نامہ ترکی میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے، کاروان زندگی سے اس کا اختصار، یہاں پر پیش کیا جارہا ہے۔

حلب سے حیدر پاشا تک (جو ترکی حدود کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے) Tarus Express سے سفر ہوا، ترکی کے اس دو ہفتے کے سفر میں ہم نے استنبول (قسطنطنیہ) انگورہ، قونیہ (مولانا محمد روم کا مسکن و مدفن) کی زیارت کی۔ قسطنطنیہ میں ہنڈی کے بھاڑے جانے، جن دوستوں کے یہاں ٹھہرنا تھا اور ان سے مدد ملنے کی امید تھی، ان کے اسٹیشن پر نہ پہنچنے اور پریشانی و سرگردانی کا وہ تاریخی واقعہ پیش آیا جس سے زیادہ پریشان کن واقعہ اس تک زندگی میں پیش نہیں آیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ کی جس طرح مدد ہوئی اور جس محبت، ضیافت، گرم جوشی اور جذبے کا اس سفر میں عملی تجربہ ہوا اس کا بھی مشاہدہ کیا، ترکی کی سرزمین رنگ و بو بھی دیکھی جو خون شہداء سے بارہا لالہ زار بنی اور صدیوں تک عالم اسلام کی آبرو، یورپ کے صلیبی ملک میں اسلامی میخ، حرمین کی پاسبان، مقامات مقدسہ اور ممالک عربیہ کے لئے حصار بنی رہی۔ ''شکوہ ترکمانی'' کا بھی نظارہ کیا اور اس غیور ملت کے شاہینوں اور شہبازوں کو بھی دیکھا، پھر اتاترک کے اسلامی و عربی اثرات کے یکسر مٹا دینے کے باعزم و پر نظم کوششوں کے نتائج بھی دیکھے، رسم الخط کے بدل جانے سے اسلامی ثقافت سے دوری اور اسلامی کتب خانہ سے محرومی کا منظر

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۲۳۲

بھی دیکھا، اس سفر کی مفصل روئداد اور مسلسل روزنامچہ میری کتاب "دو ہفتے ترکی میں" آچکا ہے۔ اس لئے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ (۱)

شام کے قیام کے آخری دن

ترکی سے دوبارہ دمشق واپسی ہو گئی، اس کے دوسرے ہی دن موتمر اسلامی کا انعقاد ہوا، ڈاکٹر سعید رمضان اس کے داعی و محرک تھے، اور حکومت کی تائید بھی اس کو حاصل تھی۔ پاکستان سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا مودودی صاحب اور مولانا ظفر احمد صاحب انصاری بھی شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ انڈونیشیا کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر ناصر صاحب بحیثیت صدر اور حضرتؒ اور مولانا مودودی کا بحیثیت نائب صدر انتخاب ہوا۔ "ارتباط قضية فلسطين بالوعي الاسلامي" (مسئلہ فلسطین کا مسلمانوں کے اسلامی شعور سے تعلق) کے عنوان سے حضرت نے مقالہ پیش فرمایا، جو بڑی عجلت میں قلم برداشتہ لکھا گیا تھا لیکن وہ اپنی اثر انگیزی اور موضوع پر سیر حاصل بحث کے اعتبار سے ایک امتیاز رکھتا ہے۔

آخر میں شام کے اسپیکر ڈاکٹر ناظم القدسی کی طرف سے اور اخیر میں صدر جمہوریہ شکری القوتلی کی طرف سے ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔

دمشق کے یہ تین مہینہ بڑی فرحت و انبساط کے ساتھ گذرے۔ حضرت کے بقول

"وہ زندگی کے خوشگوار ترین ایام تھے، جو ابھی تک (حرمین شریفین کو مستثنیٰ کر کے) کہیں میسر نہیں آئے، قلبی فرحت و انبساط، جسمانی صحت، موسم کی خوشگواری، دوستوں کی محبت و گرم جوشی، ملک کا قدرتی حسن اور ایک خاص طرح کی روحانیت (جو غالباً صحابہ کرامؓ اور اولیاء عظامؒ کے مدفن اور اسلامی جہاد و فتوحات کا مرکز ہونے کی وجہ سے) تھی سب کے امتزاج

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۳۲-۳۳۳

نے لطف و مسرت کی ایک عجیب فضا پیدا کر دی تھی۔"(۱)

اسی سفر میں حضرتؒ کو جو کھانسی کی قدیم شکایت تھی اور بڑی تدبیروں کے بعد بھی اس سے چھٹکارا نہیں مل سکا تھا، اس قیام میں ایسی غائب ہوئی کہ حضرتؒ کو کئی روز کے بعد اس کا خیال آیا۔

اس سفر کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ دمشق کی موقر ترین علمی اکیڈمی "المجمع العلمی" نے حضرتؒ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب حسنیؒ کی محققانہ تصنیف "عوارف المعارف فی أنواع العلوم و المعارف" کی طباعت منظور کی اور پھر ۱۹۵۸ء میں اس کو "الثقافة الاسلامیة فی الهند" کے نام سے شائع کیا۔

بغداد میں

شام سے واپسی میں حضرتؒ نے بغداد و کراچی کا راستہ اختیار فرمایا۔ بغداد میں تین دن ٹھہرنا ہوا، یہاں حضرت سلمان فارسیؓ، امام موسیٰ کاظمؒ، امام ابو حنیفہؒ، حضرت معروف کرخیؒ کی قبور پر حاضری ہوئی۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے سلسلہ کی نسبت اور کچھ نسبی تعلق کی وجہ سے خصوصی انجذاب محسوس ہوا، اور عقیدت و محبت کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی کہ اس سے سفر کا گرد و غبار چھٹ گیا۔

بغداد میں حضرت نے اپنے استاد شیخ تقی الدین ہلالیؒ سے بھی ملاقات کی اور وہ بڑی شفقت و محبت سے پیش آئے۔ اخوانیوں نے یہاں حضرت کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک جلسہ کا نظم کیا جس میں حضرت نے "أزمة إيمان و اخلاق" کے عنوان سے تقریر فرمائی۔

بغداد سے کراچی ہوتے ہوئے ہندوستان واپسی ہوئی، کراچی میں بھی تین روز قیام فرمایا اور اپنے مشفق استاد شیخ خلیل عربؒ کی خدمت میں حاضری دی۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۳۵

تحریر فرماتے ہیں:

"اپنے علمی مربی اور استاد خلیل عرب صاحب کی زیارت وملاقات سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا، جو تقسیم کے بعد کراچی منتقل ہو گئے تھے، یقین ہے کہ انکو اپنے اس نااہل شاگرد کی (جس سے وہ اولاد کی طرح محبت کرتے تھے) اس عزت افزائی سے خوشی ہوئی ہوگی اور انھوں نے اس کو اپنی تعلیم اور خلوص کا فیض سمجھا ہوگا، جو انکی جامعہ دمشق کی دعوت سے ہوئی۔"(۱)

اسی قیام میں ایک دن سفیر شام استاد جواد المرابط نے حضرتؒ کے اعزاز میں سفارت خانہ میں دعوت کی جس میں علامہ محمد بشیر الابراہیمی جو کراچی آئے ہوئے تھے، اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے شرکت کی اور اسی قیام میں ماہر القادریؒ سے پہلی ملاقات ہوئی اور وہ سید خلیل صاحب تنہوری کے مکان پر جہاں حضرت مقیم تھے برابر ملنے آتے رہے۔

بخاری شریف کا درس

دمشق سے واپسی پر حضرتؒ نے دار العلوم میں بعض اسباق پڑھانے شروع کئے، کچھ ہی عرصہ پہلے دار العلوم کے شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ کی وفات ہو گئی تھی، حضرتؒ نے اس زمانہ میں بخاری شریف کا درس اپنے ذمہ فرمالیا، دار العلوم کے موجودہ شیخ الحدیث مولانا ناصر علی صاحب ندوی نے اسی زمانہ میں حضرت سے بخاری شریف پڑھی ہے۔ دوران تدریس حضرت کو نظر کی کمزوری کا شدت کے ساتھ احساس ہوا، اسکی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ معائنہ کرانے پر معلوم ہوا کہ موتیا بند (Kataract) کی شکایت پیدا ہو گئی ہے، پورے طور پر تیار نہ ہونے کی وجہ سے آپریشن کرانے سے گریز فرمایا، لیکن اسی وقت سے براہ راست لکھنے کے بجائے املا (Dictation) کا سلسلہ شروع فرمایا، جو اخیر تک جاری رہا۔

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۳۰

”القادیانی و القادیانیة“ کی تالیف

دسمبر ۱۹۵۷ء کے اواخر یا جنوری ۱۹۵۸ء کے آغاز میں حضرتؒ نے ”برار“ کا ایک دعوتی و تبلیغی دورہ فرمایا، وہاں تبلیغی اجتماعات کے ساتھ پیام انسانیت کے بھی متعدد کامیاب جلسے ہوئے، اسی زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام مجلس مذاکرات اسلامی (اسلامی کلوکیم) منعقد ہوئے، حضرتؒ کو اس کی دعوت دی گئی، لیکن ”برار“ کے دورہ کی وجہ سے شرکت نہ ہو سکی۔ اسی کلوکیم میں عرب مہمانوں نے پاکستانی علماء سے قادیانیت کے موضوع پر عربی کتاب کا مطالبہ کیا مگر باقاعدہ کسی عربی کتاب کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسکو پیش کرنے سے قاصر رہے، حضرت رائپوری کو اس کا علم ہوا، تو فرمانے لگے ”علی میاں آئیں گے تو میں ان سے اصرار کے ساتھ کتاب لکھواؤں گا“ حضرت جب ان سفروں سے فارغ ہو کر حاضر ہوئے تو حضرت کو اس موضوع پر لکھنے کا حکم ہوا۔ حضرت فرماتے ہیں ”اس موضوع سے میرا ابھی تعلق نہیں رہا تھا، اسلئے معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے سر پر پہاڑ رکھ دیا ہو۔“ حضرتؒ نے فرمایا کہ

”میں خاکہ بنائے دیتا ہوں تصنیف مولانا محمد یوسف صاحب بنوری فرماویں گے وہ صاحب نظر عالم ہیں، ان کو عربی پر پوری قدرت ہے اور موضوع سے مناسبت بھی لیکن یہ شاید حضرت کی توجہ قلبی کا نتیجہ تھا کہ میرا ذہن خود بدل گیا اور میں نے اس کام کی ذمہ داری لے لی۔ ایک مہینہ صوفی عبد الحمید صاحب کی کوٹھی میں جہاں حضرت کا قیام تھا، اس علمی و تصنیفی اعتکاف میں اس طرح گذرا کہ گویا دنیا کی خبر نہ تھی۔ مرزا صاحب کی تمام کتابیں پڑھیں، نوٹس لئے، تقریباً ۲۲-۲۴ دن میں کتاب تیار ہو گئی۔ حضرت روز کا روز سنتے اور مسرور ہوتے“۔(۱)

اگلے سال حاضری ہوئی تو اردو میں ترجمہ کی ہدایت فرمائی۔ اس طرح تھوڑی

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۴۸، معمولی حذف و اضافہ کے ساتھ

مدت میں اس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا۔ اللہ نے اس کو بڑی مقبولیت عطا فرمائی، اور اردو، عربی، انگریزی اور اس کے علاوہ متعدد زبانوں میں اس کے دسیوں ایڈیشن نکلے۔

کتاب شائع ہوئی تو حضرتؒ نے اس وقت قادیانیوں کے پیشوا مرزا طاہر کو کتاب یہ کلمات لکھ کر بھیجی "بجواب تحفۃ الندوہ تاخیر کی معذرت کے ساتھ" یہ ملحوظ رہے کہ یہ اشارہ غلام احمد قادیانی کی اس کتاب کی طرف ہے جو اس نے ندوہ اور اہل ندوہ کے رد میں لکھی تھی، اور اس کا نام "تحفۃ الندوہ" رکھا تھا۔

یہاں یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے جو حضرتؒ نے مجلس میں بار بار سنایا کہ "ہم حضرتؒ کو کتاب سنا رہے تھے، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تشریف فرما تھے۔ ہم نے جب کئی بار کہا کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں تو وہ ناراض ہو گئے تو میں نے ان کے کان میں کہا کہ یہ کتاب آپ کے لئے نہیں لکھی گئی ہے"۔

سفر پاکستان سے واپسی پر حیدر آباد میں ہونے والے عظیم الشان سالانہ جلسہ سیرت میں شرکت اور خطاب کا دعوت نامہ موصول ہوا جو مجلس کے سکریٹری جناب ایچ ایم حسین صاحب کی جانب سے تھا، انھوں نے مولانا محمد علی صاحب (صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی) کے مشورہ سے یہ دعوت نامہ بھیجا تھا۔ حضرت نے دعوت قبول فرمائی۔ حیدر آباد میں متعدد مفید پروگرام ہوئے۔ سکندر آباد کی جامع مسجد میں عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا اور حضرت نے اس میں بڑی موثر تقریر فرمائی، تقریر فرما کر ایک پروگرام میں شرکت کے لئے نظام آباد تشریف لے گئے۔ واپسی پر اچانک معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی صاحب کا انتقال ہو گیا، سکندر آباد کی جامع مسجد میں نماز جنازہ ہے، حضرت تشریف لے گئے تو مولانا کے خسر نواب حکیم مقصود جنگ صاحب نے حضرتؒ ہی سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی۔ حضرت کے بقول ایسا معلوم ہوا کہ "گویا قدرت نے اسی کا سامان کیا تھا۔"

اسی قیام میں ایک روز پرنس مکرم جاہ بہادر (نبیرۂ میر عثمان علی خاں) نے

دعوت کی اور وہیں پروفیسر الیاس برنی صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔

"مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کا قیام

۵۹-۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر سعید رمضان جو رسالہ "المسلمون" کو دمشق سے نکال رہے تھے، ڈاکٹریٹ کرنے جرمنی چلے گئے، حضرت کئی مہینہ تک ان کی خواہش پر المسلمون کا اداریہ لکھتے رہے۔ اس سلسلہ میں پہلا مضمون "ردة جديدة" کے عنوان سے اور اس کی دوسری قسط "دعوة جديدة" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ بعد میں یہ مضمون رسالہ کی شکل میں "ردة و لا أبا بكر لها" کے عنوان سے بار بار شائع ہوا اور جگہ جگہ تقسیم کیا گیا۔ اسی وقت حضرت کو شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اعتقادی وتہذیبی ارتداد اور فکری واخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مستقل مجلس اکیڈمی قائم ہونی چاہئے۔ مئی ۱۹۵۹ء میں "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کے نام سے اسکی تاسیس عمل میں آئی اور حضرت ہی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔

الحمد للہ اس نے اس عرصہ میں بڑی دینی وعلمی خدمت انجام دی، اور دنیا کے مختلف حصوں میں اس کی مطبوعہ کتابیں نہ صرف یہ کہ پہونچیں بلکہ اثرانداز ہوئیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں حضرتؒ کا موقف اور اسکے تحفظ کی فکر وکوشش

اندرون ملک یا بیرون ملک کوئی بھی ملی مسئلہ سامنے آتا اور امت اسلامیہ پر کسی قسم کی ضرب لگتی، یا کسی ملی ادارے یا دانش گاہ کا تحفظ خطرہ میں پڑتا تو حضرتؒ کے حساس دل پر اسکی چوٹ لگتی، اور حضرت اپنی متوازن فکر اور معتدل طریقۂ عمل کے ذریعہ اس کو حل کرنے کی پوری کوشش فرماتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسیوں، خیالات ورجحانات سے کلی طور پر اتفاق نہ ہونے

کے باوجود حضرتؒ نے اس کو مسلمانوں کا بیش قیمت ملی اثاثہ سمجھا اور جب بھی اس کا اقلیتی کردار متاثر ہوا اور وہ بنیادی مقاصد جس کے لئے وہ قائم کی گئی تھی خطرہ میں پڑے تو حضرتؒ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی، مختلف ادوار میں وہاں کے ذمہ داروں کو مشورے دیئے، خاص طور پر بدرالدین طیب جی کے دور میں حضرتؒ نے ان کو ایک مفصل خط تحریر فرمایا جس کا انھوں نے اثر قبول کیا، اس تحریک کے ساتھ اخیر تک حضرتؒ کا یہ تعاون جاری رہا اور حضرتؒ نے اس کو ایک ملی خدمت اور وقت کا تقاضا سمجھ کر انجام دیا۔ پروفیسر نفیس صاحب نے اس واقعہ کو تفصیل سے اپنے مضمون میں تحریر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا علی میاں صاحب کو ایک سیمینار میں جو شعبۂ دینیات کی طرف سے منعقد ہوا تھا مدعو کیا گیا، اسی دعوت پر مولانا تشریف لائے، اور ۱۹؍دسمبر ۱۹۵۹ء کو یونین ہال میں اپنا مقالہ بعنوان "نبوت کا کارنامہ" پڑھا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین نے مولانا کو یونین کا لائف ممبر بھی بنایا، اسی موقع پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اور مولانا کے درمیان یونیورسٹی کے حالات پر تفصیلی مذاکرہ ہوا، مولانا یہاں کے حالات سے بے چین ہو اٹھے، یہ کرنل حسین زیدی صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا، زیدی صاحب کے بعد بدرالدین طیب جی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے، باوجودیکہ یہ شہرت عام تھی کہ بدرالدین طیب جی جواہر لال نہرو کے بہت ہی قریب ترین شخص ہیں اور یہ بھی کہ حکومت خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لفظ "مسلم" نکال کر اس کو ایک قومی یونیورسٹی کا درجہ دینا چاہتی ہے، تاہم مولانا علی میاں صاحب کو شدید فکر تھی کہ آنے والے وائس چانسلر سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالات کے سلسلہ میں گفتگو کی جائے، خدا کی مرضی کچھ ایسی ہوئی کہ طیب جی کو خود مولانا علی میاں صاحب سے گفتگو کرنے کی ضرورت پیش آگئی، حالانکہ طیب جی اس وقت

تک مولانا علی میاں صاحب سے بالکل واقف نہیں تھے، واقعہ یہ ہوا کہ مولانا نے مصر کے کرنل ناصر کے ذریعہ پھیلائے گئے فتنہ عرب قومیت کے خلاف قلمی جہاد شروع کرر کھا تھا اور ان کی تحریروں سے نہ صرف ان کا طلسم ٹوٹ کر بکھر رہا تھا بلکہ ان کے خلاف پورے مصر اور عرب ممالک میں ایک فضا بن رہی تھی، کرنل ناصر نے نہرو جی سے اپنی دوستی کے ناطے چاہا کہ وہ مولانا علی میاں صاحبؒ کو اس کام سے روکیں اور اس سلسلہ میں کوئی ایسی تحریر ان سے جاری کروادیں جس سے کرنل ناصر کے نیچے سے کھسکتی ہوئی زمین پر قابو حاصل ہو سکے، جواہر لال نہرو، طیب جی کے ذریعہ مولانا علی میاںؒ سے یہ کام لینا چاہتے تھے، دہلی میں حضرت مولانا اور طیب جی کی گفتگو ہوئی، پہلے تو طیب جی نے اپنا مدعا بیان کیا اور اس مسئلہ کو قومی مفاد اور نیشنلزم سے تعبیر کیا، مولانا نے صفائی سے فرمایا کہ نیشنلزم محض یہ نہیں ہے کہ جو نہرو جی کہیں اس کی تائید کی جائے بلکہ صحیح نیشنلزم یہ ہے کہ اگر کوئی فیصلہ نہرو جی غلط لے رہے ہیں اس کی نشاندہی کی جائے، بلکہ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو اس غلط کام سے روک لیا جائے، میں اس مسئلہ میں نہرو جی کی مدد سے معذرت خواہ ہوں، طیب جی مولانا کی اس گفتگو سے نہ صرف یہ کہ ناراض نہیں ہوئے بلکہ بہت زیادہ متاثر ہوئے کیونکہ یہ بات ان کی سوچ سے بالاتر تھی کہ کوئی مولوی بھی نہرو جی کی مرضی کو اپنے اصول کے واسطے اس طرح رد کر سکتا ہے، اسکے بعد مولانا نے یونیورسٹی کے سلسلہ میں گفتگو کی اور ایک یادداشت بھی ان کے حوالہ کی جس میں اس یونیورسٹی کی اہمیت، ان کے عہدہ کی ذمہ داریوں اور نزاکتوں کو مفصل طور پر بیان کیا، طیب جی کے تاثر کا عالم یہ تھا کہ اسکے بعد جب انہوں نے چارج لیا اور ۱۷ اکتوبر کو سر سید ڈے کے موقع پر اسٹریچی ہال میں اپنی پہلی تقریر کی تو جن لوگوں نے اس تقریر کو سنا ہے اور وہ مولانا کی دی ہوئی یادداشت سے واقف تھے وہ حیرت زدہ رہ

گئے کہ طیب جی کی تقریر من و عن انہیں نکات پر مبنی تھی جو نکات مولانا نے لکھ کر ان کو دیے تھے، طیب جی کے آتے ہی یونیورسٹی سے کمیونزم کی آئیڈیالوجی کمزور ہونا شروع ہو گئی اور شہر کے برادران وطن کی ریشہ دوانیاں بھی کمزور ہونے لگیں، اس وقت کے قائدین کی عام روش کے خلاف طیب جی نے مسلمانوں کے مسائل برملا اٹھائے، اور اپنی تقریر میں انہوں نے ایسا طرز اختیار کیا کہ نوجوان طلباء علی گڑھ میں آزادی کے بعد سے پیدا شدہ پژمردگی ختم ہو کر ایک قومی جذبہ اور نیا ولولہ پیدا ہوا، طیب جی کے ڈھائی سال کے قیام میں میں نے ان کی ایک بھی تقریر ایسی نہیں سنی جس میں انہوں نے قرآن کا حوالہ نہ دیا ہو، پوری یونیورسٹی میں ایک انقلابی کیفیت نظر آتی تھی، اس تبدیلی کے پیچھے ایک خاموش شخصیت کارفرما تھی، جس سے شاید چند افراد کے علاوہ کوئی واقف نہیں ہے، اور وہ شخصیت مولانا علی میاںؒ صاحب کی تھی۔"(۱)

برما کا سفر

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مالی حالت کمزور چل رہی تھی، تقسیم ملک کے بعد دشواریاں اور بڑھ گئیں اور یہ ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی کہ بیرون ملک بھی لوگوں کو اسکی اعانت کی طرف متوجہ کیا جائے۔ حسن اتفاق کہ رنگون کے بعض اہل تعلق نے حضرتؒ کو برما آنے کی دعوت دی تاکہ وہاں دینی حلقوں میں نئی حرکت اور بیداری پیدا ہو اور وہاں کے متمول طبقہ کو دارالعلوم کی طرف متوجہ کیا جا سکے۔ حضرتؒ نے مذکورہ صورت حال کے پیش نظر دعوت قبول فرمائی اور ۱۸ر دسمبر ۱۹۶۰ء کو مولانا معین اللہ صاحبؒ کی رفاقت میں رنگون کا سفر کیا۔ رنگون میں حضرتؒ کا عدیم المثال استقبال ہوا، مختلف علاقوں میں بیسیوں تقریریں ہوئیں، حضرتؒ نے اپنی ایمانی فراست سے بھانپ لیا کہ آج وہاں جو خوش

---

(۱) افکار و آثار، ص ۳۵۳، ۳۵۴

حالی اور فارغ البالی ہے اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ تقریروں میں صاف صاف کہا کہ "اسکو باقی رکھنے کی شکل یہ ہے فکر کے ساتھ زندگی گذاری جائے، برمی زبان میں مہارت پیدا کی جائے اور غیروں میں تبلیغ اسلام کا کام انجام دیا جائے اور ملت ابراہیمی سے رشتہ جوڑا جائے ورنہ یہ ساری خوش حالی جو آج نظر آرہی ہے، کل اسکا دور دور پتہ نہ ہوگا اور اس پر جھاڑو پھر جائیگی"۔ اللہ کی شان کہ حضرتؒ کی واپسی کے کچھ ہی عرصہ کے بعد وہاں انقلاب آیا اور وہ سب سامنے آگیا جسکا خطرہ ظاہر کیا گیا تھا۔

اس سفر سے دار العلوم کا مالی فائدہ تو کم ہوا کہ اس انقلاب کی وجہ سے رقوم منتقل نہیں کی جاسکیں لیکن برما کا دینی فائدہ بہت ہوا، لوگوں کے اندر دینی جذبہ پیدا ہوا، اور اسکے اثرات انقلاب کے بعد بھی محسوس کئے جاتے رہے۔

"دینی تعلیمی کونسل" کا قیام

حضرتؒ کے اسی ملی درد کا نتیجہ تھا کہ جب تقسیم ملک کے بعد یہاں مسلمانوں کی بنیادی تعلیم، ان کے عقائد، ایمانیات اور ان کے تشخص وامتیاز کا باقی رہنا مشکل ہوگیا تو حضرت نے باضابطہ صوبائی سطح پر یہ تحریک چلائی کہ اپنے آزاد مدارس و مکاتب قائم کئے جائیں جن میں بنیادی تعلیم کا انتظام ہو۔ مولانا نعمانیؒ کی رفاقت اور قاضی عدیل عباسی اور ظفر احمد صدیقی کی معاونت سے باضابطہ اس تحریک کی بنیاد پڑی اور اس کا پہلا اجلاس قاضی صاحب کی دعوت پر بستی میں ۳۰ / ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو منعقد ہوا، اجلاس کی صدارت کے لئے حضرتؒ ہی کا انتخاب ہوا۔ پھر دینی تعلیمی کونسل کے نام سے تنظیم قائم ہوئی تو اسکی صدارت بھی حضرتؒ کے سپرد کی گئی۔ کونسل کی سرگردگی میں صوبائی سطح پر ہزاروں مکاتب قائم ہوئے، جن میں مجموعی طلباء کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کر گئی۔ بلاشبہ یہ اتنا بنیادی اور ٹھوس اقدام تھا جس کے بڑے دوررس نتائج سامنے آئے اور اب بھی الحمد للہ حضرت کے جانشین مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب کی صدارت اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے انتظام میں یہ سلسلہ جاری ہے۔

۵ر فروری ۱۹۶۱ء میں کالی کٹ کی ایک فعال تنظیم ندوۃ المجاہدین کا سالانہ اجلاس ہوا، تنظیم کے ذمہ داروں اور بعض اہل تعلق کی سفارش پر حضرت نے اسکی صدارت قبول فرمائی اور "ملة ابراهيم و حضارة الاسلام" کے عنوان سے مقالہ پیش فرمایا، جسکا اردو ترجمہ "اسلام مکمل دین مستقل تہذیب" کے نام سے شائع ہوا۔

برادرِ معظم مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحب رحؒ کی وفات

ڈاکٹر صاحبؒ حضرتؒ کے لئے صرف ایک بڑے بھائی ہی نہیں بلکہ والد کے قائم مقام اور سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے، انہیں کے زیر سایہ حضرتؒ کی پرورش ہوئی اور ان کے حکیمانہ انداز تربیت نے حضرتؒ پر گہرے نقوش چھوڑے تھے، ان کی وفات پر حضرتؒ کے تاثرات خود حضرت کے الفاظ میں خود نوشت سوانح حیات کاروان زندگی سے نقل کئے جاتے ہیں:

"۷ر مئی ۱۹۶۱ء کو بھائی صاحب کی وفات کا وہ حادثہ پیش آیا جو میری شعوری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا اور میں نے یتیمی کی وہ کیفیت محسوس کی جو کمسنی کی وجہ سے والد صاحب کی وفات پر نہیں محسوس کی تھی۔ اس حادثہ کی المناکی کو اس بات نے اور بڑھادیا کہ رائے پور اور سہارن پور کے سفر کی وجہ سے میں نہ وفات کے وقت موجود تھا نہ جنازہ اور تدفین میں شریک ہوسکا۔ اسی دن سہارنپور میں شدید اور نازک علالت کا تار ملا اور میں پہلی گاڑی سے شام کو (دہرہ ایکسپریس سے) لکھنؤ کے لئے روانہ ہوگیا، یہ سفر جس طرح طے ہوا اور راستہ جس حال میں گذرا، خدا اس طرح کا دن پھر نہ لائے۔ ہونے والے واقعہ کا دھڑکا لگ گیا تھا، میں ڈر رہا تھا کہ راستہ میں خود میرے ساتھ کوئی واقعہ نہ پیش آئے۔ لکھنؤ پہنچا تو عزیزی مولوی معین اللہ صاحب اور چند احباب پلیٹ فارم پر موجود تھے، جنھوں نے واقعہ کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ یہ کہا کہ آپکو رائے بریلی چلنا ہے۔ میں سب سمجھ گیا۔ باہر سید صدیق حسن صاحب (آئی سی ایس) کی موٹر کھڑی تھی۔ میں رائے بریلی پہنچا تو یہاں سب کچھ

ہو چکا تھا۔ تدفین کو دو ہی تین گھنٹے ہوئے تھے، ابھی تک جس گریہ کو ضبط کئے ہوئے تھا عزیزی محمد میاں کو دیکھ کر وہ امنڈ پڑا۔ اسی طرح کا واقعہ (سفر اور غیبت میں والد و سرپرست کی وفات و تدفین) بھائی صاحب کے ساتھ والد صاحبؒ کے معاملہ میں اور میرے دادا مولوی حکیم سید فخر الدین صاحبؒ کا اپنے والد مولانا سید عبد العلی صاحبؒ کے معاملہ میں پیش آچکا تھا۔" (۱)

نظامت کے لئے انتخاب اور کویت کا ایک سفر

ڈاکٹر صاحبؒ کی وفات کے بعد نظامت کے لئے بالاتفاق حضرتؒ کا انتخاب ہوا، اور ۱۸ر جون کے جلسہ انتظامیہ میں یہ تجویز پاس کر دی گئی۔ دار العلوم کی مالی حالت عرصہ دراز سے کمزور چلی آرہی تھی، برما کے سفر سے بھی رقوم منتقل نہ ہونے کی وجہ خاطر خواہ فائدہ نہ ہو سکا تھا۔ کویت میں بعض اہل تعلق حضرتؒ کو سفر کی دعوت دے رہے تھے کہ وہاں اس سلسلہ میں خاطر خواہ تعاون ہو سکے گا۔ حضرت کا خاص و عوتی ذہن اس کو پوری طرح قبول کرنے کو تیار نہیں تھا مگر اس شرط پر کہ حضرتؒ کو خود کچھ نہیں کرنا ہوگا، اس نیت سے سفر کا ارادہ فرما لیا کہ وہاں کے لوگوں کے سامنے بھی دعوت کی صدا بلند کرنے کا موقع ہاتھ آئیگا۔

۲۲ر جنوری ۱۹۶۲ء کو مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ، مولانا محمد رابع حسنی صاحب کی معیت میں یہ سفر ہوا۔ حضرتؒ کے اصل داعی ڈاکٹر عبد اللطیف صاحب اپنے بعض عرب اہل تعلق کے ساتھ مطار پر موجود تھے۔ قیام ایک ہوٹل میں رہا۔ کھانے کا انتظام ڈاکٹر صاحب کے یہاں سے ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ وہاں کے ایک ممتاز عالم تاجر عبد الرزاق الصالح اور پر جوش داعی و فاضل شیخ عبد الرحمن الدوسری نے بڑی عقیدت و محبت کا معاملہ کیا، اور تعاون میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

کویت کے قیام میں حضرت کی متعدد تقریریں ہوئیں، جن میں ایک ممتاز تقریر وہاں کی ایک بڑی مسجد میں ایک بڑے مجمع کے سامنے ہوئی۔ ایمان و یقین کی

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۶۵-۳۶۶

قوت، حکمت و موعظت پھر زور خطابت کا اثر تھا کہ پورا مجمع مسحور تھا، لوگ بے اختیار ہو کر نعرہ لگاتے۔ دوران تقریر ایک صاحب شدت تاثر میں بے ہوش ہو گئے اور ان کو اٹھا کر لے جایا گیا۔ اس طرح حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے وعظ کی یاد تازہ ہو گئی جن کی مجلس وعظ میں یہ واقعات بار بار پیش آتے تھے۔

ایک دن کویت ریڈیو سے بھی "إسمعي يا زهرة الصحراء" کے عنوان سے تقریر نشر ہوئی جس میں کویت کو اس کا مقام یاد دلایا گیا اور پھر اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا۔

حاکم کویت کے نام بھی حضرتؒ نے ایک یادداشت کے طور پر مکتوب تحریر فرمایا جس میں عربوں کی ترقی، وحدت، قیادت اور ان کی مشکلات کا حل بتایا اور آخر میں اس ملک میں غیر مسلم عبادت گاہوں کی تعمیر کے خطرہ سے آگاہ فرمایا جو کویت اور خلیج کی ریاستوں میں بننا شروع ہو گئی تھیں۔

تین ہفتہ کویت میں قیام کر کے رمضان کے دوسرے عشرہ میں یہ سفر تمام ہوا، اس سفر میں بھی حضرت کا جو اعزاز و اکرام ہوا، حضرتؒ نے اپنے مزاج و مذاق کے مطابق جو حضرت کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، اس کو حضرت رائپوریؒ کی طرف منسوب کیا، اور واپسی پر حضرت رائپوریؒ کو ایک مکتوب تحریر فرمایا جس میں اس کا اظہار کیا گیا تھا، اخیر میں یہ شعر بھی تحریر فرمایا جس سے حضرت کی تواضع و انکسار اور انکار ذات کی عکاسی ہوتی ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا تھی

دسواں باب

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا قیام ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۵ء تک اہم اسفار، واقعات اور حوادث

جامعہ اسلامیہ ورابطہ عالم اسلامی کا قیام اور حضرت کا بحیثیت رکن تاسیسی کے انتخاب

۱۹۶۲ء کے اوائل میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا قیام عمل میں آیا۔ شاہ سعود نے بذات خود حضرت کو ایک خط تحریر کیا اور ہندوستان میں سعودی سفارت خانہ کو ہدایت کی کہ وہ حضرت کو جامعہ میں تدریسی خدمات کے لئے تیار کرے، حضرت کا یہاں بھی وہی جواب تھا جو دمشق یونیورسٹی کی پیش کش کے موقع پر تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد حضرت کو مجلس استشاری کا رکن اساسی منتخب کیا گیا، حضرت نے اس کو منظور فرمالیا، اور اس کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لئے مئی ۱۹۶۲ء میں حجاز کا سفر کیا۔ اس سفر میں قصر ملکی میں ایک موتمر اسلامی منعقد ہوئی، جس میں حضرت کو خصوصی طور سے مدعو کیا گیا، اور عالم اسلام کے اہم ترین لوگ شریک ہوئے۔ وہیں رابطة العالم الاسلامی کے نام سے ایک عالمی تنظیم کا قیام عمل میں آیا اور حضرت کو اس کا رکن تاسیسی منتخب کیا گیا، اس کے اجلاس میں

اس کے مستقل صدر شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ اگر کسی ضرورت سے انحو کر جاتے تو حضرت کو ہی صدر منتخب کیا جاتا۔ حضرت نے اس کے پہلے اجلاس میں "الاخوة الاسلامية فوق العصبيات" کے عنوان سے ایک موثر مقالہ پڑھا۔

حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں جامعہ کی مجلس استشاری میں شرکت فرمائی اور اس میں "خطوط عريضة لجامعة للدعوة والارشاد" کے عنوان سے محاضرہ پیش فرمایا۔ اس مرتبہ مدینہ منورہ میں الحاج محمد نور نور ولی صاحب کے اصرار و خواہش پر "بستان نور ولی" میں قیام فرمایا، پھر یہ مستقل معمول بن گیا، حضرت کو مدینہ منورہ میں کسی ہوٹل میں قیام کرنا گوارہ نہیں ہوتا تھا۔

اسی سفر میں حضرتؒ نے ایک حفلہ تکریم (جس کا انعقاد مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب نے کیا تھا اور جس میں بڑے اہم لوگ شریک ہوئے تھے) میں کھل کر قومیت عربیہ پر تنقید کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عرب نوجوان ایک حرف بھی صدر ناصر کے خلاف سننا گوارہ نہیں کرتے تھے لیکن چونکہ بات دل سے کہی گئی تھی اور اس میں پوری جرأت ایمانی اور قوت و صداقت تھی اسلئے وہ اثر انداز ہوئی اور شیخ محمد محمود صواف نے جو شریک محفل تھے اس کا اعتراف کیا۔

سعودی ریڈیو کی فرمائش پر حضرت نے "وفود الامة بين يدى نبيها" کے عنوان سے ایک ولولہ انگیز، ایمان افروز تقریر تیار کی اور وہ کئی مرتبہ سعودی ریڈیو سے اور اس کا اردو ترجمہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔

حضرت کا یہ سفر ایک طویل عرصہ کے بعد ہوا تھا، اس کے بعد ہر سال سفر کی سعادت حاصل ہوتی رہی اور اکثر کئی مرتبہ اس کی نوبت آئی۔

جامعہ اسلامیہ میں محاضرات کا سلسلہ

اگلے ہی سال ۱۹۶۳ء میں جامعہ کی طرف سے حضرت کو محاضرات کے لئے

مدعو کیا گیا۔ حضرتؒ نے مدینہ منورہ کی مناسبت سے "النبوة و الانبیاء فی ضوء القرآن" کے موضوع کا انتخاب فرمایا، مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کی رفاقت میں یہ سفر ہوا۔ محاضرات میں جامعہ کے اس وقت کے وائس چانسلر شیخ بن باز خود بھی شرکت فرماتے اور محاضرہ کے بعد کلمات تحسین فرماتے۔

اس سفر میں حضرتؒ نے پانچواں حج فرمایا۔ حج ہی کے ایام میں ایک روز حرم شریف میں بیت اللہ کے سامنے حجاج کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ حضرت فرماتے ہیں :

"یہ عجیب منظر تھا جو کبھی نہ بھولے گا کہ حج سے دو تین دن پہلے جبکہ حج کا مجمع اپنے عروج پر اور طواف کا مبارک عمل اپنے اوج پر تھا، تقریر کی سعادت اور بیت اللہ شریف کے دید کی لذت بیک وقت حاصل ہو رہی تھی۔"(۱)

حجاز مقدس میں مغربی تہذیب کے طوفان بلاخیز کو روکنے کی بڑی ضرورت تھی۔ حضرتؒ کو شروع سے اس کا احساس تھا، حضرتؒ نے اس کے لئے ابتدائی سفروں میں بڑی کوششیں فرمائی تھیں اور براہ راست شاہ سعود کو بھی بذریعہ مراسلت متوجہ کیا تھا۔ اس ۱۹۶۳ء کے سفر میں حضرت کو اس لئے اسکی اور زیادہ فکر ہوئی کہ اس کے ساتھ ایک نیا فتنہ "قومیت عربیہ" کا (جس کو "فتنہ ناصریہ" سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے) تیزی سے ابھر رہا تھا، بالائے ستم یہ ہوا کہ وہاں کے ذمہ داران مملکت نے صدر ناصر اور مصر کے اس فتنہ اور وہاں کے ذرائع ابلاغ سے توجہ ہٹانے کا علاج یہ سمجھا کہ حجاز مقدس میں بھی وہ آزادی دے دی جائے جو مصر میں عریانیت تک پہنچی ہوئی تھی تاکہ کسی کو مصر جانے یا وہاں کے ریڈیو، ٹیلیویژن سے دل بہلانے کی ضرورت نہ پڑے۔

اس صورت حال نے حضرتؒ کو مضطرب کر دیا اور حضرتؒ نے مدینہ منورہ کے قیام ہی میں ایک روز امیر فیصل سے (جو اس وقت ولی عہد مملکت تھے)

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۷۹

خصوصی ملاقات کی، ان کو اس طرف توجہ دلائی اور ان سے صاف صاف بات کی۔ انھوں نے حضرتؒ کو اس سلسلہ میں اطمینان دلایا، اور اپنی کوششوں کا ذکر کیا، پھر جب انھوں نے زمام سلطنت سنبھالی تو حضرتؒ نے ان کو خطوط کے ذریعہ خطرات سے آگاہ کیا، انھوں نے اس کا جواب بھی دیا۔ اس کے علاوہ بھی بعد میں حضرتؒ نے دو مرتبہ اور ان سے ملاقات کر کے خدشات ظاہر کئے اور مشورے دیئے جن کو انھوں نے کھلے دل سے سنا اور اپنے موقف کی وضاحت کی۔ پہلی ملاقات میں حضرتؒ کے رفیق مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ اور بعد کی ملاقاتوں میں مولانا محمد واضح رشید ندوی صاحب تھے۔ ان ملاقاتوں میں قصر ملکی کے اندر بھی جانا ہوا اور دنیا کی آرائش وزیبائش کے آخری مظاہر بھی سامنے آئے لیکن حضرتؒ نے کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اور گفتگو کے دوران اشارہ و کنایہ سے بھی کسی ملی ادارے یا دارالعلوم کے لئے جو اس وقت مالی اعتبار سے بڑی آزمائش میں تھا اور حضرت ہی اس کے ذمہ دار تھے، کبھی کچھ نہیں فرمایا۔ حضرت کے اسی زہد واستغناء اور صاف گوئی کا نتیجہ تھا کہ حضرتؒ کی بات کا جو وزن تھا وہ کم کسی عالم یا داعی کا ہوگا۔

دو عظیم حادثے

۱۹۶۲ء اس طور پر حضرت کے لئے عام الحزن ثابت ہوا کہ اس میں چھ مہینہ کے وقفہ سے پہلے حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ اور پھر حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوریؒ کی وفات ہوئی۔ حضرت رائپوری کی شدید علالت کی خبر سن کر حضرتؒ لاہور تشریف لے گئے۔ حضرت رائپوری علالت کے باوجود بار بار پوچھتے اور کھانے پینے کا خیال رہتا۔ بعض خدام کا کہنا ہے کہ حضرت رائپوری نے آخری کلام بھی حضرت سے متعلق ہی فرمایا اور خدام سے حضرت کی راحت کا خیال رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ بالآخر ۱۳ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء کو یہ چراغ گل ہو گیا اور حضرتؒ کو ان آخری ایام میں ساتھ رہنے پھر نعش مبارک کے ساتھ

وطن جا کر تدفین میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

یورپ کا پہلا سفر

ستمبر ۱۹۶۳ء میں حضرتؒ نے یورپ کا پہلا سفر کیا۔ اس سفر کا اصل محرک جنیوا میں اسلامک سنٹر کے جلسوں میں شرکت اور خطاب تھا۔ ڈاکٹر سعید رمضان حضرت کے قدیم دوست اور محب تھے، انھوں نے خاص طور پر حضرت کو اس سفر کی دعوت دی۔

حضرتؒ نے اس سفر میں رفاقت کے لئے جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کا انتخاب فرمایا جو حضرت سے محبانہ و مخلصانہ تعلق رکھتے تھے اور اپنی علمی تعلیم کے سلسلہ میں یورپ میں طویل قیام کر چکے تھے۔

جنیوا کے علاوہ اس سفر میں حضرت نے یورپ کے مختلف علاقوں کا دورہ فرمایا اور وہاں خطاب کیا۔ ایڈمبرا یونیورسٹی کی اسلامی مجلس میں تقریر ہوئی۔ لندن یونیورسٹی کے یونین ہال میں خطاب ہوا۔ اس کے علاوہ بی بی سی پر دو تقریریں نشر ہوئیں، ان میں سب سے اہم تقریر لندن یونیورسٹی کے ہال میں ہوئی، جس کا عنوان "بین الشرق و الغرب" تھا، اس کا انگریزی ترجمہ بھی اسی وقت ایک انگریز نو مسلم نے بڑے جوش و تاثر کے ساتھ پڑھا۔

حضرت فرماتے ہیں:

"اس سفر کا سب سے اہم اور عزیز حصہ اندلس مرحوم (اسپین) کی زیارت تھی۔ کوئی ایسا ملک یاد نہیں کہ جہاں مسلمان رہے ہوں پھر ان کا نام و نشان مٹ گیا ہو اور وہاں جا کر ایسا انس، ایسی محبت، ایسی دلکشی محسوس ہوئی ہو کہ معلوم ہوتا تھا کہ فضائیں لپٹ رہی ہیں اور ذرہ ذرہ انس کا پیغام دے رہا ہے جیسا اسپین میں محسوس ہوا، وہاں نمازوں اور ذکر میں بھی وہ رقت اور لذت محسوس ہوئی جو کم تر مقامات پر محسوس ہوئی تھی۔" مزید فرماتے ہیں

کہ "اس سفر میں داغ کہن بلکہ زخم دل تازہ ہو گئے"۔(۱)

وہاں اسلامی آثار کی زیارت کے موقع پر گائیڈ تعارف کراتا تھا اور بار بار یہ جملہ کہتا تھا کہ "جب ہم نے عربوں کو یہاں سے نکالا"۔ حضرتؒ کی ایمانی حمیت اس کو گوارہ نہ کر سکی اور حضرت نے صاف فرمایا کہ آپ یہ جملہ نہ دہرائیں اس سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے، اس نے معذرت کی۔

مسجد قرطبہ پہنچ کر حضرتؒ کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، خون حیدری جوش مارنے لگا، اسکی محراب میں (جس کے بارے میں گائیڈ نے بتایا تھا کہ اسکی آواز پوری مسجد میں گونجتی ہے) پہونچ کر حضرتؒ کی زبان سے بے ساختہ یہ آیت جاری ہو گئی اور حضرتؒ نے بلند آواز سے اسکی تلاوت فرمائی "قل جاء الحق و زھق الباطل إن الباطل کان زھوقا" (کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل تو مٹنے ہی کے لئے تھا) حضرتؒ نے مسجد میں ممانعت کے باوجود دوگانہ ادا فرمایا اور باہر نکل کر مسجد کے صحن میں اذان و جماعت کے ساتھ عصر کی نماز ادا کی۔

غرناطہ قیام کے دوران جمعہ کا دن آگیا، حضرتؒ نے عرب طلبہ کے ایک کمرہ میں سب کو جمع کر کے جمعہ کی نماز ادا فرمائی، صدیوں کے بعد اس سرزمین پر جو کسی زمانہ میں اولیاء اور علماء کی سرزمین تھی پہلا جمعہ پڑھا گیا۔ پھر اللہ نے راستہ کھول دیا اور کسی نہ کسی حد تک وہاں نمازوں کی آزادی ہو گئی اور جمعہ کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

اس سفر سے مغربی تہذیب کی جو خامیاں اور بے اعتدالیاں نظریاتی طور پر حضرتؒ کو معلوم تھیں اور عرصہ سے حضرتؒ اس پر تبصرہ و تنقید فرماتے رہے تھے وہ نظروں کے سامنے آگئیں۔ حضرتؒ نے اپنے اس سفر کے تاثرات اپنے عزیزوں کے نام خطوط میں تحریر فرمائے ہیں جن کا مجموعہ "مکاتیب یورپ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اسی سفر میں حضرت نے "الصراع بین الفکرة الاسلامیة و الفکرة الغربیة" کا مقدمہ تحریر فرمایا، یہ کتاب حقیقت میں ماذا خسر العالم کی

---

(۱) کاروان زندگی اول ص ۳۸۹

ایک تکمیلی کڑی ہے، جس میں حضرت نے اسلامیت و مغربیت کی مسلم ممالک میں کشمکش کی روداد اور اس کے نتائج اور اس معرکہ میں مسلم ممالک کے طرز عمل اور موقف کا وسیع جائزہ لیا ہے، جو ان ملکوں کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں دار الفکر بیروت سے شائع ہوئی اور اس کے بار بار ایڈیشن نکلے۔

اس سفر کے اگلے ہی سال دوبارہ اسلامک سنٹر جنیوا کے جلسہ میں شرکت کے لئے یورپ کا دوسرا سفر ہوا، مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ رفیق سفر تھے۔ اس سفر میں فرانس کے بجائے جرمنی جانا ہوا اور وہاں اشتراکی نظام کے غیر فطری، مصنوعی اور جبریہ ہونے کا مشاہدہ ہوا۔ اس طرح دنیا کی دونوں بڑی طاقتوں کے نقائص و معائب حضرتؒ کے سامنے آگئے۔

اس سفر کی اہم تقریروں میں "اسلامک سنٹر بیکر اسٹریٹ لندن" کی تقریر ہے جو طلبہ اور نوجوانوں کے سامنے ہوئی۔ برلن میں انجینئرنگ یونیورسٹی میں جرمن قوم سے خطاب فرمایا، اور اسی وقت اس کا جرمن ترجمہ پیش کیا گیا۔ واپسی میں ایک روز استنبول میں قیام رہا اور وہاں بھی ایک اہم مجمع میں خطاب ہوا۔

الٰہ آباد کا ایک سفر اور شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خصوصی عنایت و محبت

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے حضرتؒ کی پہلی ملاقات تو ۱۹۵۴ء ہی میں ہو چکی تھی، اسی ملاقات میں شاہ صاحبؒ نے بڑی محبت کا معاملہ فرمایا تھا، کھانے میں اپنے پاس بٹھاتے اور لقمہ بنا بنا کر اپنے ہاتھ سے حضرت کے منھ میں دیتے تھے۔ اسکے بعد مختلف مناسبتوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور شاہ صاحبؒ کی محبت و شفقت بڑھتی گئی۔ ایک خط میں یہاں تک فرمایا کہ "جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد و رفت فرماتے ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے۔"

ایک ایسی مجلس میں جس میں حضرتؒ تشریف فرما نہیں تھے بلا کسی سابقہ تمہید کے اچانک بڑے جذب کے ساتھ فرمانے لگے "بہت دل دیکھے لیکن جیسا

شفاف علی میاں کا دل دیکھا کسی کا نہیں دیکھا۔"

شاہ صاحبؒ کی محبت و شفقت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت نے ایک مکتوب میں شیخ سعدی کا یہ مصرعہ بھی تحریر فرمادیا کہ

ع کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

شاہ صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ "اسکا صحیح مصداق تو یہ تھا کہ میں پڑھتا کیونکہ ایک بادشاہ نے کسی دہقان کے یہاں نزول فرمایا تھا اس پر اس نے یہ کہا تھا تو آپ کی مثال شاہوں کی سی ہے کہ کبھی یہاں اور کبھی وہاں نزول فرماتے رہتے ہیں چنانچہ ایک دہقان کے یہاں بھی نزول فرما کر اسکو شرف بخشا اسی لئے اگر میں کہوں تو حق بجانب ہوں

ع کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

۲۰/۲۱/ جون ۱۹۶۴ء کو الٰہ آباد میں دینی تعلیمی کونسل کا جلسہ طے ہوا، حضرت اس میں شرکت کے لئے الٰہ آباد تشریف لے گئے۔ ۲۰/ جون کو صبح گاڑی الٰہ آباد اسٹیشن پر پہونچی تو استقبال کرنے والوں میں حضرت شاہ صاحب بھی موجود تھے، فرمانے لگے کہ میں ناشتہ بھی ساتھ لایا تھا کہ تاخیر نہ ہو لیکن اب تو وقت زیادہ ہو چکا ہے، گھر تشریف لے چلیں وہیں پر ناشتہ ہوگا۔ موٹر پر حضرتؒ کے بیٹھنے کے لئے اپنے دست مبارک سے گدا بچھانے لگے، اسی میں شاہ صاحبؒ کو گاڑی کے کسی حصہ سے سر مبارک میں کچھ ضرب بھی لگی لیکن انکے اعلیٰ ترین اخلاق اور حضرت سے قلبی محبت کا اثر تھا کہ محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ حضرتؒ کو ندامت نہ ہو۔(۱)

حضرتؒ کو مع رفقاء کے شاہ صاحبؒ نے اپنا ہی مہمان بنایا اور حضرت کی راحت کا مستقل خیال رکھا۔ حضرتؒ کو بھی حضرت شیخ کے بعد سب سے زیادہ شاہ صاحب ممدوح سے عقیدت و محبت تھی، ۲۴/ نومبر ۱۹۶۷ء کو شاہ صاحبؒ کی وفات ہوئی، اور قدرتی طور پر حضرتؒ کی طبیعت متاثر ہوئی، تعزیت کیلئے حضرتؒ الٰہ آباد تشریف لے گئے اور خانقاہ میں پسماندگان کی فرمائش پر بڑی موثر اور مفید تقریر فرمائی۔

(۱) یہ واقعہ مخدومی سید مسلم حسنی صاحب نے سنایا جو سفر میں ساتھ تھے۔

"مسلم مجلس مشاورت" کا قیام

پورے عالم اسلام خاص طور پر عالم عربی سے پوری دلچسپی اور فکر و توجہ کے باوجود حضرتؒ ملکی و ملی مسائل سے نہ صرف آشنا بلکہ اس کے لئے بھی فکر مند رہتے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں اکثریت ایک دوسرے فرقہ کی ہے، حضرتؒ کو ہمیشہ یہ خیال رہا کہ جب تک اس فرقہ میں مسلمانوں کے بارے میں اعتماد کی فضا نہیں قائم ہوگی اور مسلمان اپنی اخلاقی قدروں سے اپنی بالادستی نہیں ثابت کریں گے اس وقت تک اس ملک میں عزت اور اپنے ملی تشخص کے ساتھ باقی رہنا مشکل ہوگا۔ حضرتؒ نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہی سے اس کے لئے کوششیں شروع فرما دی تھیں، جن کا ذکر کتاب کے گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ پھر جب ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہوا (جن میں سب سے بھانک فساد و خوں ریزی جمشید پور اور راوڑ کیلا میں ہوئی تھی، جس میں تین ہزار سے زائد مسلمان مارے گئے تھے) تو حضرتؒ کی حساس طبیعت بے چین ہو گئی اور درد و فکر رکھنے والا دل مضطرب ہوا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں :

"اس واقعہ نے میرے اور میرے ساتھیوں کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ہر سوچنے والے اور سمجھنے والے کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ اگر اس طرح کے واقعات کا سلسلہ جاری رہا اور ان کے سدباب کی کوئی موثر کوشش نہیں کی گئی تو مسلمانوں کا ملی وجود بھی مشکوک ہو کر رہ جائے گا، اس لئے سب سے پہلے اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔"(۱)

حضرت کو یہ خیال بھی ہوا کہ اس تحریک میں کچھ فکر رکھنے والے غیر مسلم دانشوروں کو بھی شریک کیا جائے بلکہ ان ہی کو آگے کیا جائے تو بات زیادہ موثر ہوگی، حضرت اس سلسلہ میں جے پرکاش نرائن اور ونوبا بھاوے جی سے ملاقات کے لئے اپنے رفقاء مولانا نعمانیؒ اور مولانا عمران خاں صاحبؒ کے ساتھ دہلی اور

(۱) کاروان زندگی اول ص ۴۹۹ باختصار

ناگپور تشریف لے گئے لیکن دونوں سے ملاقات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ حضرتؒ نے خود ان فساد زدہ علاقوں کا دورہ فرمایا، پھر ڈاکٹر سید محمود صاحب (جو اس صورت حال سے زیادہ فکر مند اور مغموم تھے) مولانا نعمانیؒ، مفتی عتیق الرحمن صاحب، مولانا ابو اللیث صاحبؒ (امیر جماعت اسلامی ہند) کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ ایک کل ہند مسلم مشاورتی اجلاس بلایا جائے جس میں یہ صورت سامنے رکھی جائے اور کوئی لائحہ عمل طے ہو۔ ۸/۹/ اگست ۱۹۶۴ء کی تاریخیں اس کے لئے طے کردی گئیں، لیکن اسی عرصہ میں حضرت کو آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں اچانک بمبئی جانا پڑا، مولانا سید مرتضٰی صاحب نقوی (سابق ناظر کتب خانہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء) بحیثیت رفیق کے ساتھ تھے۔ آپریشن سے فراغت کے بعد محمد بھائی (مالک بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ) کے یہاں قیام رہا، اور اس کے بعد سے بمبئی میں ان ہی کا مکان حضرت کی مستقل قیام گاہ بن گیا۔ اگست کے پہلے ہفتہ میں وطن واپسی ہوئی، وہیں مولانا نعمانیؒ کا پیغام پہونچا کہ جلسہ مشاورت کے لئے کوئی مضمون لکھوا دیں تو مناسب ہے، حضرتؒ نے تکلیف کے باوجود مضمون لکھوادیا۔

۸/ اگست ۱۹۶۴ء کو لکھنؤ میں یہ اجتماع ہوا جس میں مکمل نمائندگی تھی۔ حضرت کا مضمون مولانا ابو العرفان خاں صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اس میں مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل ہوئی اور حضرت کے اصرار پر ڈاکٹر سید محمود صاحب کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

حضرتؒ کا ایثار و قربانی

آپریشن کے بعد ڈاکٹروں نے آرام کرنے کی تاکید کی تھی، لیکن حضرت کے دل میں جو ملت کا درد تھا یہ تکلیفیں اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ جلسہ مشاورت کے لئے مضمون لکھانے کے دوران آنکھ میں شدید تکلیف ہوئی، کچھ دیر کے لئے آرام فرمایا لیکن پھر مضمون مکمل فرمادیا۔

جلسہ میں شرکت فرمائی، ڈاکٹروں نے زیادہ گفتگو کرنے یا زور سے بولنے سے پرہیز بتایا تھا لیکن جب جلسہ میں انتشار کی کیفیت پیدا ہونے لگی اور خطرہ ہوا کہ شیرازہ منتشر ہو جائے گا، تو حضرتؒ ضبط نہ فرما سکے، اتحاد ملت کا مسئلہ تھا، موثر و پرجوش تقریر فرمائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ تو کامیابی پر ختم ہوا لیکن حضرتؒ کی آنکھ محفوظ نہ رہ سکی اور حضرتؒ نے اس اہم ملی مسئلہ کے لئے اس کو صبر و عزیمت کے ساتھ برداشت فرمایا۔

مختلف علاقوں کے دورے

اسی مجلس میں یہ بھی طے ہوا کہ اس کے لئے ایک وفد مختلف علاقوں کے دورے کرے۔ وفد میں حضرت کا نام سر فہرست تھا، حضرت نے اس کو بھی قبول فرمایا اور اپنی مجروح آنکھ کے ساتھ رانچی، چکردھر پور، چائی باسا، جمشید پور کا دورہ فرمایا اور جابجا ایسے مجمعوں میں تقریریں کیں جن میں بڑی تعداد غیر مسلموں کی بھی ہوتی تھی۔

دسمبر ۱۹۶۴ء میں اس وفد نے گجرات کا دورہ کیا۔ حضرتؒ کے ساتھ اس سفر میں برادر زادہ مولانا سید محمد الحسنی صاحب اور خادم خاص حاجی عبدالرزاق صاحب بھی شریک تھے جو اب مستقل حضرتؒ کی راحت و آرام کیلئے ساتھ رہنے لگے تھے۔ اس سلسلہ کا سب سے اہم اور طویل دورہ ریاست میسور کا تھا جو نومبر ۱۹۶۶ء میں کیا گیا، یہ ساڑھے چار ہزار میل کا طویل دورہ تھا، جو اس وفد نے کیا، اس میں تمام ارکان اور مختلف جماعتوں کے نمائندے شریک تھے، ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت بس سے طے کی گئی۔ ۱۵ بڑے شہروں میں عظیم الشان جلسے ہوئے۔ قدرتی طور پر تقریباً ہر جگہ حضرت کا بھی خطاب ہوتا۔ اسکی آخری منزل گلبرگہ تھی جہاں ایک عظیم الشان مخلوط اجتماع سے حضرتؒ نے پرزور پر تاثیر خطاب کیا۔

ان دوروں میں ہر جگہ وفد کا ایسا پرجوش استقبال ہوا اور ہر جگہ ایسے ایسے

عظیم اجلاس منعقد کیے گئے کہ خلافت تحریک کی یاد تازہ ہو گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کے ایسے مناظر سامنے آئے جس کی کوئی امید قریبی زمانہ میں بظاہر دشوار نظر آتی تھی۔ اس طرح حضرتؒ نے جس مقصد کی خاطر مشاورت کی تشکیل میں بنیادی کوشش فرمائی تھی وہ بڑی حد تک حاصل ہوا، مسلمانوں کے بارے میں غیر مسلموں کے ایک طبقہ کا ذہن صاف ہوا، اور اعتماد کی فضا بحال ہوئی۔

حجاز مقدس کا سفر

رابطہ عالم اسلامی نے اپنی تجویز کے مطابق اپریل ۱۹۶۵ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ کو اپنی پہلی مؤتمر کا انعقاد کیا۔ حضرتؒ نے اس میں شرکت کے لئے مولانا معین اللہ صاحبؒ کی رفاقت میں سفر کیا۔ مؤتمر میں حضرتؒ نے اس بلد امین میں رہنے والوں کو ان کے فرائض یاد دلائے، حضرتؒ نے یہ مقالہ بحرین کے ہوائی اڈہ پر لکھوایا تھا جو ضعف بصارت کی وجہ سے استاذ عمر الداعوق (بانی جماعت عباد الرحمٰن لبنان) نے حضرتؒ کی طرف سے پڑھ کر سنایا۔ حج و موتمر سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ حاضری ہوئی اور وہاں جامعہ اسلامیہ کی مجلس استشاری میں شرکت فرمائی۔ اس سفر میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی کے اچانک حادثہ ارتحال کی خبر حضرت پر بجلی بن کر گری اور حضرت پر اس کا بڑا اثر ہوا۔

صبر و عزیمت کے دن

آنکھ کی تکلیف مستقل جاری تھی لیکن حضرتؒ اپنے جوش ایمانی اور قوت ارادی کے ساتھ دعوتی و تبلیغی سفروں میں مشغول تھے۔ ایسے ہی ایک دورہ میں جو دینی تعلیمی کونسل کی طرف سے مغربی یوپی کا تھا سخت لو چل رہی تھی، گرمی اپنے شباب پر تھی، حضرت ایک شب تقریر سے فارغ ہو کر آرام فرمانے لگے، جب تہجد میں بیدار ہوئے تو محسوس ہوا کہ جس آنکھ میں کئی بار آپریشن ہو چکا ہے اس کی بصارت ختم ہو گئی ہے، قدرتی طور پر اس کا اثر پڑا۔ اور حضرت دار العلوم دیوبند کی مجلس

شوریٰ کے پہلے دن کے اجلاس میں شرکت فرماکر حضرت شیخ کی ہدایت پر فوراً لکھنؤ تشریف لے آئے، اور سیتاپور کے مشہور آنکھ کے اسپتال میں داخل ہوگئے۔ ڈیڑھ مہینہ اسپتال میں رہنا پڑا، کسی طرح انجکشن وغیرہ کے ذریعہ اس پر قابو ہوا تو حضرت والا بریلی تشریف لے آئے۔ چھ مہینہ کسی حد تک سکون سے گذرے، اس دوران حضرت علمی کاموں اور لکھانے میں مشغول رہے۔

اسی زمانہ میں مشاورت کا ایک اہم اجلاس ڈاکٹر فریدی صاحب کے مکان پر طے ہوا، حضرت کو اس کے لئے مضمون قلمبند کروانا تھا، نزلہ کی شدت کی وجہ سے حضرت نے تیز دوائیں استعمال فرمائیں تاکہ اس کا زور کم ہو اور مضمون لکھوایا جاسکے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مضمون تو تیار ہوگیا لیکن اس کے دو تین روز کے اندر سنبل پانی کا شدید حملہ ہوا، اگلے ہی روز ۷ر دسمبر کو دوبارہ اسپتال میں داخل ہونا پڑا، آنکھ میں ایسی شدید تکلیف ہوتی تھی کہ دیکھنے والوں کے لئے اس کا برداشت کرنا مشکل تھا، اس دوران پانچ آپریشن ہوئے، بار بار انجکشن لگائے جاتے لیکن مستقل کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا، اس طرح تقریباً تین مہینے گذر گئے۔ حضرتؒ نے جس صبر و استقلال کے ساتھ وہ تکلیف برداشت کی اور یہ دن جس عزیمت و استقامت کے ساتھ گذارے توفیق الٰہی کے سوا اس کو کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اہل سیتاپور نے بڑی محبت و عقیدت کا معاملہ کیا۔ خدام نے خدمت وراحت رسانی کا پورا اہتمام رکھا۔(۱)

والدہ صاحبہ کو اسکی اطلاع ہوتی تھی، وہ سراپا دعا تھیں۔ اسکے علاوہ حضرت شیخ، حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری بھی اس کے لئے بے قرار تھے اور دعاؤں میں مصروف۔

---

(۱) سیتاپور کے متعلق والوں میں جناب ظفر احمد صاحب صدیقی، حاجی محمد حسین صاحب سوائی، جناب تفضل حسین صاحب، جناب تجمل حسین صاحب ایوبی اور شیخ ضیاء حسین صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، خدمت کرنے والوں میں حاجی عبدالرزاق صاحب کے علاوہ مولانا علی آدم صاحب ندوی افریقی اور مولانا سعید خوندوی افریقی نے بڑی دلسوزی کے ساتھ خدمت کی۔

آخر میں شاہ وصی اللہ صاحب کی ہدایت و مشورہ پر ۲۰ فروری کو لکھنؤ واپس تشریف لاکر ہومیو پیتھک علاج شروع کیا جس سے الحمدللہ وہ تکلیف دور ہوئی۔

بعض اہم کتابوں کی تصنیف

شروع ہی سے حضرت کی زندگی بڑی منظم اور مشغول گذر رہی تھی۔ وقت کی قدر و قیمت کا احساس اور اسکا صحیح استعمال، حضرت کی ایک نمایاں صفت تھی۔ خاندان میں تصنیف و تالیف کا ذوق نسل در نسل چلا آرہا تھا۔ حضرت کا بھی اصلی ذوق تصنیف و تالیف کا تھا بقیہ دوسرے کام وہ دینی ضرورت اور وقت کا تقاضا سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ تصنیف و تالیف کے مقررہ وقت میں دوسرا کام حضرت پر بار ہوتا تھا۔

سیتاپور اسپتال میں قیام کے دوران حضرت کو شدت سے یہ احساس ہوا کہ اسلام کے بنیادی ارکان (نماز، زکوۃ، روزہ اور حج) کی روح، ان کی حکمتوں، حقیقتوں اور مقاصد کے سمجھنے اور بیان کرنے میں اس دور کے مصنفین و اہل قلم سے یہاں بڑی بے اعتدالی نظر آرہی ہے، اور یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اس سے متاثر ہونے والے کہیں ان ارکان کی حقیقت اور اسکی طاقت سے محروم نہ ہو جائیں اور جدید مادی تعبیر اور عصری تشریح کے دائرہ اثر میں آکر ایمان و احتساب کا مفہوم ہی ان کے ذہنوں سے نہ نکل جائے کہ یہ بات امت کے لئے ایک بڑا خطرہ اور تحریف معنوی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا شدید تقاضا پیدا ہوا کہ اسپتال سے فارغ ہوتے ہی اسلام کے ان عملی ارکان اربعہ پر ایک مکمل کتاب تیار کی جائے۔ حضرت فرماتے ہیں

"یہ خیال قلب و ذہن پر ایسا مستولی ہوا کہ اس کو اسپتال کا بیمارہ سوگوار ماحول اور آنکھ کی بار بار تکلیف بھی نہ ہٹا سکی۔"(۱)

اسپتال سے فارغ ہو کر رائے بریلی تشریف لائے، اس موضوع پر مواد جمع فرمایا اور دائرہ شاہ علم اللہ کی مبارک مسجد میں بیٹھ کر اس کا املا شروع کرایا۔ حضرت

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۹

کے کاتب خاص مولانا نثار الحق صاحب لکھتے جاتے تھے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"ذہن و دماغ پر کتاب کا موضوع اس طرح طاری ہو گیا کہ دوسرے اوقات میں بھی وہ ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ یہ عرصے سے میری زندگی میں ہر اہم تصنیف کا خاصہ بن گیا ہے۔ یہ ایک طرح کا ایک تصنیفی اعتکاف ہوتا ہے، جس سے نکلنا اسی وقت ہوتا ہے جب کتاب کی تائے تمت ہلال عید بن کر نمودار ہوتی ہے۔"(۱)

۱۸ / اپریل ۱۹۶۶ء کو یہ کام شروع ہوا تھا، ۱۳ / فروری کو اس کی تکمیل ہوئی، اور اسی سال دار القلم کویت سے یہ کتاب "الأركان الأربعة" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ حضرت کے برادر زادہ مولانا سید محمد الحسنی نے بڑی خوبی سے فرمایا کہ کتاب کی اصل روح اور طاقت اس میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ علماء، مفکرین اور ادباء نے اس کو بڑی قدر و وقعت کے ساتھ قبول کیا۔ حضرت شیخؒ نے دیکھ کر فرمایا کہ اگر میری جوانی ہوتی تو میں اس کتاب کا درس دیتا۔

حضرتؒ نے سیرت کے موضوع پر بیش قیمت و موثر مقالات لکھے اور تقریریں فرمائیں، اس کی ضرورت تھی کہ ان محاضرات کو یکجا شائع کر دیا جائے۔ عالم عربی کا جو تعلق ذات رسول ﷺ سے ہونا چاہئے تھا، اور عشق و محبت کی جو آگ ان کے سینوں میں بھڑکنی چاہئے تھی اسکی کمی حضرت کو صاف محسوس ہوتی تھی، اس میں بڑا دخل مغربی تہذیب کے عام ہونے اور پھر قومیت عربیہ کے فتنہ کا تھا، اسلئے حضرت کو اس مجموعہ کی اشاعت کی مزید ضرورت محسوس ہوئی، اور حضرت نے بعض اردو مضامین جو اس موضوع سے خاص تعلق رکھتے تھے، عربی ترجمہ کے ساتھ کتاب میں شامل فرمائے اور "الطريق إلى المدينة" کے نام سے پہلی مرتبہ کتاب مدینہ منورہ سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ شیخ علی طنطاوی کتاب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"جب میں نے آپکی کتاب پڑھی تو میں نے محسوس کیا کہ شوق میرے اندر انگڑائی لینے لگا، اور میرے سینے میں پھر وہی تپش ہے، اسطرح مجھے

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۸

اطمینان ہوا کہ میرا دل جوہر محبت سے بالکل خالی نہیں ہوا لیکن افکار زمانہ اور وقت نے اس جوہر کو گرد آلود کر دیا تھا، آپکی کتاب نے اس گرد کو ایک بار پھر صاف کر دیا۔"(۱)

اسی زمانہ میں حضرت نے والد نامدار مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی کی سوانح مرتب فرمائی، جس میں ضمیمہ کے طور پر اخیر میں برادر معظم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کے حالات بھی درج فرمائے، یہ کتاب "حیات عبدالحی" کے نام سے ۱۹۷۰ء میں ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بامعنی فقرہ بھی تحریر فرمایا: "حیات عبدالحی کا مصنف زندہ باد!"

والد مرحوم کی تصنیفات کی تکمیل واشاعت

"إن من أبر البر بر الرجل أهل ود أبيه" (آدمی کی بڑی نیکیوں میں سے یہ ہے کہ والد کے تعلق والوں کے ساتھ سلوک کرے) کے فرمان نبویؐ میں والد کے آثار و باقیات اور وہ تصنیفات و تالیفات جو اس کو دل وجان سے عزیز ہوں، بدرجہ اولیٰ شامل ہیں۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ کی اچانک وفات ہوئی، حضرت کی عمر کم تھی، ڈاکٹر صاحب سفر پر تھے، لیکن اللہ مخلصین کے عمل کو ضائع نہیں فرماتا۔ ان کی ساری تصنیفات جو مخطوط تھیں محفوظ رہیں، اور شروع میں ڈاکٹر صاحبؒ نے ان کی نگہداشت رکھی پھر حضرتؒ نے ان کی اشاعت کی فکر و سعی کی، "عوارف المعارف" "الثقافة الاسلامية في الهند" کے نام سے دمشق سے شائع ہوئی۔ "جنة المشرق" "الهند في العهد الاسلامي" کے نام سے دائرۃ المعارف سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعض جغرافیائی مقامات کی نئی تقسیم کے اعتبار سے تصحیح فرمائی تھی و یک خوردہ مقامات کی تکمیل بھی کی تھی لیکن اس کی

---

(۱) کاروان مدینہ مقدمہ شیخ علی طنطاوی

اشاعت سے پہلے دوبارہ اس پر دیمک کا حملہ ہوا پھر حضرتؒ نے اس کی تکمیل فرمائی اور قابل اشاعت بنایا۔

"نزھة الخواطر" کے سات حصے حضرت ہی کی فکر و سعی سے دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہو چکے تھے، آٹھویں حصے میں ساڑھے تین سو شخصیات ایسی تھیں جن کے تراجم مصنف کی اچانک وفات کی وجہ سے ناقص رہ گئے تھے، حضرتؒ نے بڑی عرق ریزی سے ان کی تکمیل فرمائی، اور قلم سے قلم ملا دیا، لیکن ادبا پنی عبارت قوسین میں رکھی۔ اس سلسلے میں اللہ نے خصوصی مدد فرمائی جو عام طور سے مخلصین کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ اس کا ایک واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ پائلی کا سن وفات نہیں مل رہا تھا، اچانک رائے بریلی میں ایک صاحب آئے، باتوں باتوں میں ان سے اسکا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ عجیب بات ہے کہ میں نے سفر میں ایک جگہ "شحنہ ہند" کا ایک پرانا فائل فروخت ہوتے ہوئے دیکھا، مجھے اسکی ضرورت نہ تھی مگر میں نے لے لیا، اس میں اسکے انتقال کی پوری تفصیل اور تاریخ موجود ہے۔

۱۹۹۲ء میں حضرت نے دوبارہ پوری کتاب کا مقابلہ اور تصحیح فرمائی اور دار عرفات سے "الإعلام بمن فی تاریخ الهند من الأعلام" کے نام سے اسکو اپنے ذاتی خرچ پر شائع فرمایا۔ پھر حضرت ہی کی توجہ سے ۱۹۹۹ء میں یہ کتاب عالم عربی میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی۔

قومیت عربیہ کا فتنہ اور اس کی سرکوبی

قومیت عربیہ کا فتنہ جس کی قیادت جمال عبد الناصر کر رہے تھے، اس زور سے اٹھا کہ اچھے اچھے صاحب فکر و صاحب قلم اس کی رو میں بہہ گئے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ فلسطین کی جنگ میں سات عرب ملکوں نے جس طرح شکست کھائی تھی، وہ زخم بڑا کاری تھا، پھر جب جمال عبد الناصر نے نہر سویز کے قومیانے کا کام کیا اور اتحاد ثلاثہ (برطانیہ، فرانس اور اسرائیل) کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا تو اس نے

عرب نوجوانوں میں ایسا نشہ پیدا کر دیا کہ نوجوان ہی نہیں عرب صحافی، اہل قلم، ادیب ان کی "عصمت و تقدیس" کن گانے لگے، اور اس کا اثر عقائد و اعمال پر بھی پڑنے لگا اور یہ جادو ایسا سر چڑھا کہ ۱۹۶۷ء کی ہزیمت کے باوجود ان کی اس مقتدائیت و محبوبیت میں کوئی بڑا فرق نہیں آیا۔ یہ فکر صرف یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کی سیادت و امامت کا عقیدہ اور آپکے واتائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل ہونے کا اعتقاد بھی کمزور ہونے لگا، اور اس کے آثار و شواہد بعض سنجیدہ ادیبوں اور اہل قلم کی تحریروں میں نظر آنے لگے اور صاف محسوس ہونے لگا کہ مسئلہ صرف قومیت عربیہ کا نہیں، اور ناصر صرف قومیت عربیہ کے علمبردار نہیں بلکہ وہ عالم عربی میں ایک بنیادی ہمہ گیر اور دور رس تبدیلی کے علمبردار ہیں اور وہ اسکو ہمہ گیر مادیت اور ناخدیت کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔

حضرت نے اس خطرہ کو جو پورے عالم عربی پر منڈلا رہا تھا نہ صرف یہ کہ محسوس کیا بلکہ اس وقت اپنی زبان و بیان کی پوری طاقت اور زور تحریر کو صدر ناصر کی مخالفت و تنقید پر مرکوز کر دیا، اور ایسے کرب و اذیت اور قلب و ضمیر کے ایسے احتجاج و اضطراب کا اظہار فرمایا جو بہت سے لوگوں کے لئے باعث تعجب بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ لیکن بقول حضرت کے واقعہ یہ تھا ؎

دل عبث لب بہ شکوہ وانہ کند
شیشہ تانہ شکند صدانہ کند

یہ حضرت کی بصیرت ایمانی، حقیقت شناسی کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ حضرتؒ کے عالم عربی سے (جو عالم اسلام کے دل کی حیثیت رکھتا ہے) قلبی لگاؤ اور تعلق کا بھی اثر تھا۔ جب حضرتؒ پر یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ عالم عربی کا اپنا مسئلہ ہے، مولانا کو اس سے کیوں اتنی دلچسپی ہے تو اس کے جواب میں حضرتؒ نے قلم برداشتہ ایک مضمون تحریر فرمایا جس میں عربوں سے اپنی گہری وابستگی ظاہر فرمائی۔ تحریر

فرماتے ہیں :-

"میں نہ عربی دنیا سے بیگانہ اور اجنبی ہوں، نہ میری معلومات سکنڈ ہینڈ ہیں، اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ، ان کے مصائب اور ان کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب واسرائیل کی اس جنگ کے موقع پر شروع کیا ہے، اور نہ میں اچانک و بے وقت اس میدان میں آگیا ہوں، میں اپنے کو ایک مسلمان کے رشتہ سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطے سے بھی اس وسیع و عظیم عرب خاندان کا جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے، ایک فرد سمجھتا ہوں، میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، میری قسمت ان کی قسمت سے وابستہ ہے، ان کی عزت سے میری عزت اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے، میری تخیلات کی دنیا میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان وادب اور اس کی تہذیب و ثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر میرا حق کسی طٰہٰ حسین، کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں، میرا خمیر اور میرا آب و گل ہندوستان کی سرزمین سے ہے، مجھے اس کا اعتراف بھی ہے، اس پر فخر بھی لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے اور مجھے اقبال کے الفاظ میں یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ

میرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی (۱)

البعث الاسلامی نے (جو حضرتؒ کی سرپرستی میں حضرتؒ کے برادر زادہ مولانا سید محمد الحسنیؒ نکالتے تھے) اس سلسلہ میں بہت اہم کردار ادا کیا اور اس فتنہ کے خلاف ایک محاذ کھول دیا، اسکی گونج پورے عالم اسلام میں سنی گئی، مصری

---

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۷۳

سفارت خانہ نے حکومت ہند سے اس کے بارے میں احتجاج بھی کیا، اور یہ خطرہ بھی ہوا کہ حضرت اور مولانا محمد الحسنی کو اس سلسلہ میں زیادہ پریشانی اٹھانی پڑے۔(١) لیکن یہ حضرات کلمۂ حق بلند فرماتے رہے۔ حضرتؒ کے اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل نے اس فتنہ پر کاری ضرب لگائی، یہاں تک کہ خود علماء عرب نے اس کا اعتراف کیا۔ ایک مشہور عرب مجاہد و رہنما شیخ محمد محمود صواف نے کہا کہ "البعث نے ناصر کو بے نقاب کرنے کے سلسلہ میں جو کردار ادا کیا ہے وہ کسی سے نہ ہو سکا"۔(٢)

بعض اہم بیرونی اسفار

١٩٦٦ء میں چونکہ حضرتؒ کا پاسپورٹ حکومت کی تحویل میں تھا اسلئے کوئی بیرونی سفر نہیں ہو سکا۔ ١٩٦٧ء میں پھر اس کا سلسلہ شروع ہوا۔ شعبان میں رابطہ کا اجلاس طے ہوا۔

حضرتؒ نے اس سفر میں مولانا محمد الحسنی کو ساتھ لیا، اور رابطہ کے اجلاس کی تاریخوں سے کئی روز پیشتر حجاز مقدس پہنچ گئے۔ اسی دوران ایک سنگین حادثہ پیش آیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے بال بال حفاظت فرمائی۔ ہوا یہ کہ شیخ محمد محمود صواف (جو وزارت تعلیم میں مشیر بھی تھے) نے ان حضرات کو وزیر تعلیم شیخ حسن بن عبداللہ سے ملنے کی دعوت دی۔ اس کے لئے یہ حضرات طائف تشریف لے گئے، وہاں وزیر موصوف بڑی محبت و عقیدت اور گرمجوشی سے ملے۔ واپسی میں جب کہ یہ حضرات احرام میں تھے، ڈرائیور کی آنکھ جھپک جانے کی وجہ سے گاڑی الٹ گئی، چھت زمین پر تھی اور چاروں پہیے اوپر، دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ اس گاڑی کے سب مسافر جاں بحق ہو چکے، لیکن محض قدرت الٰہی کا کرشمہ تھا، اللہ نے مدد فرمائی اور پوری حفاظت کی، حضرتؒ کو معمولی خراش آئی تھی لیکن نہ وضو شکست ہوا تھا نہ

(١) اس سلسلہ میں حضرتؒ کا پاسپورٹ بھی ضبط کیا گیا اور وزارت خارجہ کی طرف سے کارروائی بھی کی گئی۔
(٢) پرانے چراغ دوم ص ٣٩٥

ہاتھ سے تسبیح چھوٹی تھی۔ مفتی امین الحسینی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مبارک باد دی اور کہا کہ "آپ گاڑی سے ایسے نکلے جیسے حضرت یونسؑ شکم ماہی سے نکلے تھے"۔

اسی قیام مکہ معظمہ میں "نادی الوحدۃ الریاضی" کے ذمہ داروں کی خواہش پر سربراہ آوردہ حضرات، ادیبوں، صحافیوں ور کالجوں کے اساتذہ اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے سامنے خطاب فرمایا اور کھل کر صدر ناصر کی ناکامیوں کے اسباب بیان فرمائے اور از سر نو اسلام کی طرف بازگشت کرنے اور اسکا نمونہ بننے کی دعوت دی۔

اگلے ہی سال شعبان ۱۳۸۸ھ نومبر ۱۹۶۸ء میں پھر حجاز کا سفر ہوا اور مدرسہ ثانویہ طیبہ مدینہ منورہ میں اسی موضوع پر خطاب ہوا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ حضرت کے استاذ شیخ تقی الدین ہلالیؒ بھی اس میں شریک تھے۔ واپسی میں دو روز کویت میں قیام فرمایا، اور وہاں بھی "جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی" کے ہال میں اسی موضوع پر تقریر فرمائی۔

اپریل ۱۹۶۹ء میں جامعہ اسلامیہ کی مجلس استشاری میں شرکت کے لئے سفر ہوا، اسکی خصوصیت یہ تھی کہ یہ سفر حضرت شیخ الحدیثؒ کی ہمرکابی میں ہوا تھا۔ پورے سفر اور پھر حرمین شریفین کے قیام میں حضرت شیخ نے خصوصی محبت و شفقت فرمائی اور حضرتؒ کی راحت و آرام کا خیال رکھا۔

اسی سال شعبان میں رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے سفر ہوا، اس سفر میں دوبارہ مدینہ منورہ کے مدرسہ ثانویہ میں "المیۂ فلسطین کے تین سبق" کے عنوان سے خطاب ہوا۔ جلسہ میں رابطہ کے اہم ارکان، جامعہ کے اساتذہ و طلبہ اور شہر کے معزز افراد موجود تھے۔

مستقل ان تنقیدی، احتسابی خطبات و مضامین کے بعد حضرتؒ نے "الفتح للعرب المسلمین" کے عنوان سے ایک طاقتور اور پرزور مضمون تحریر فرمایا تاکہ مایوسی کے بادل چھٹیں اور عربوں میں نیا اعتماد، ولولہ اور جوش پیدا ہو۔ یہ رسالہ بار بار شائع ہوا اور اس کے بڑے گہرے اور مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

مفتی امین الحسینی صاحب نے اس کو "العاقبة للمتقين" کے عنوان سے بیروت سے شائع کیا۔

انگلستان کا ایک طویل سفر

اپریل ۱۹۶۹ء کے سفر حجاز ہی میں مفتی امین الحسینی صاحب نے جو حضرت سے بڑی محبت رکھتے تھے باصرار ایک رقم خدمت میں پیش کی اور اصرار کیا کہ حضرتؒ اپنی آنکھ کے علاج کے سلسلہ میں انگلستان کا سفر کرلیں۔ حضرتؒ نے ان کے تعلق اور اصرار کی وجہ سے شیخ سے مشورہ کر کے رقم قبول فرمالی۔ انہیں دنوں میں جنیوا سے ڈاکٹر سعید رمضان صاحب کا دعوت نامہ پہونچا۔ انہوں نے اس میں اسلامک سنٹر کے جلسہ میں شرکت پر اصرار کیا تھا۔ حضرتؒ نے مولانا معین اللہ صاحبؒ کو ساتھ لیا اور ۶/جون کو جدہ سے جنیوا کے لئے روانہ ہوگئے، چند روز ٹھہر کر انگلستان تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صاحب نے بھی حضرتؒ کی تشریف آوری کی خبر سن کر وہاں مزید قیام کرلیا۔ ڈاکٹر مظہر علی خاں صاحب کے ذریعہ سے دو ماہر سرجنوں سے وقت لیا گیا، ڈاکٹر فریدی صاحب نے ڈاکٹروں کو پوری تفصیلات سے آگاہ کیا، معائنہ کے بعد ڈاکٹروں نے کسی آپریشن کے ذریعہ سے نظر واپس ہونے کی امید ظاہر نہیں کی۔ البتہ انہوں نے ایسی دوا تجویز کی جس کے ڈالنے سے ٹینشن بند ہوجائے اور فوری سکون مل جائے۔

اس سفر میں انگلستان کا طویل دورہ ہوا اور متعدد مقامات پر جانا ہوا۔ جن میں برمنگھم، مانچسٹر، بلیک برن، شیفیلڈ، ڈیوزبری، لیڈس اور گلاسگو خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ہر جگہ حضرت کے خطابات ہوئے اور اس طرح یہ سفر طبی سے زیادہ دعوتی و تحریکی سفر بن گیا۔

سفر حیدرآباد

جنوری ۱۹۶۸ء میں جامعہ نظامیہ کے نصاب و نظام کی اصلاح کے لئے ایک

کمیٹی تشکیل دی گئی، جس میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ، مولانا صبغت اللہ صاحب بختیاریؒ جیسے سر بر آوردہ علماء شامل تھے۔ حضرتؒ کو اس کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا حضرت اس میں شرکت کے لئے حیدر آباد تشریف لے گئے۔ اس سفر میں حضرتؒ کے خادم اور مجاز طریقت مولانا علی آدم ندوی صاحب اور نواسہ مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی صاحب (حال ناظر عام دار العلوم ندوۃ العلماء) ساتھ تھے۔ اس کمیٹی نے ضروری اور فوری اصلاحات کا مشورہ دیا اور اس کی مفصل رپورٹ پیش کر دی گئی۔ مولانا ابوالوفاء افغانی حیدر آبادی نے اس کو پسند فرمایا لیکن بعض رکاوٹوں کی وجہ سے اس پر عمل در آمد نہیں ہو سکا۔

قدرِ جوہر شاہ داند

سفر حیدر آباد سے واپسی پر حضرتؒ نے ایک رات بھوپال رہ کر صبح روانگی کا ارادہ فرمالیا اور اس کی اطلاع بھی مولانا محمد عمران خاں صاحبؒ کو دیدی، اتفاق سے گاڑی رات آٹھ بجے پہنچنے کے بجائے نصف شب میں ۲-۳ بجے پہنچی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:

"مجھے خیال تھا کہ مولانا عمران خاں صاحبؒ نے ٹیلیفون سے دریافت کرلیا ہوگا اور جب معلوم ہوا ہوگا کہ گاڑی غیر معمولی طریقہ پر لیٹ ہے تو اسٹیشن آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہوگا۔ جب بھوپال کا اسٹیشن آیا تو میں احتیاطاً اٹھ کر بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا کہ ان کا کوئی قاصد پیغام لیکر تو نہیں آیا۔ میری نظر مولانا کے صاحبزادہ رضوان سلمہٗ پر پڑی، میں نے گھبرا کر پوچھا کہ مولانا تو نہیں آئے؟ انھوں نے کہا مولانا تو کیا حضرت صاحبؒ (حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی پیر ننھے میاں صاحب) بھی تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حضرت پیر صاحب؟ کہنے لگے کہ ہاں۔ جب گاڑی لیٹ ہوئی تو لوگوں نے بہت کہا کہ آپ تشریف لے جائیں لیکن انکار کر دیا اور فرمایا کہ

جس کو جانا ہے، چلا جائے میں تو رہوں گا۔ اتفاق سے ژالہ باری یا کسی اور وجہ سے ان دنوں سردی بھی تیز ہو گئی تھی، حضرتؒ اسی طرح پلیٹ فارم پر رہے، اتنے میں میں نے دیکھا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں، کھڑکی کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے، دو خادم سہارا دیئے ہوئے تھے، میں شرم و ندامت سے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے کہا کہ حضرت نے کیوں تکلیف فرمائی؟ فرمایا کہ میری رات تو ایسی مبارک گذری کہ کم راتیں ایسی گذری ہوں گی (او کما قال)۔ اتنے میں اور مجمع بھی آگیا۔ مجھے حکم دیا کہ میں اپنی سیٹ سے نہ اتروں۔ فرمایا کہ آپ سفر کر کے آرہے ہیں اور خود بدولت کھڑے رہے۔ اللہ اللہ کر کے گاڑی چلی اور میں ان بزرگوں کے اخلاق عالیہ، تواضع و ایثار، خورد نوازی کو یاد کر کے ورطۂ حیرت میں ڈوبا رہا۔ اور آج بھی جب خیال آتا ہے تو حیران رہ جاتا ہوں۔"(۱)

والدہ صاحبہؒ کی وفات

۶/ جمادی الآخر ۱۳۸۸ھ مطابق ۳۰/ اگست ۱۹۶۸ء میں حضرت کی والدہ صاحبہؒ نے ترانوے (۹۳) سال کی عمر میں وفات پائی اور وہ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی جو ہمہ وقت دعا و مناجات میں مشغول رہتی تھی، ساری عمر انھوں نے حضرتؒ کی مقبولیت، محبوبیت، امامت و قیادت کی جو دعائیں کی تھیں اس کے مظاہر دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور وہ مزید ترقیات باطنی و ظاہری کے لئے دعا گو رہتیں، حضرت کے لئے انھوں نے ہمیشہ خوب سے خوب تر چاہا اور دل کی گہرائیوں سے اس کے لئے دعا کرتی رہتیں۔ حضرت کو ابتداء ہی میں انھوں نے یہ تعلیم دی تھی کہ جب بھی کوئی مضمون لکھیں تو سرورق پر یہ دعا ضرور لکھا کریں۔

اللهم آتني بفضلك أفضل ما توتي عبادك الصالحين (اے اللہ تو اپنے نیک بندوں کو افضل سے افضل ترین جو کچھ عطا فرماتا ہے، وہ مجھے بھی

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۵۳-۵۵

عطا فرما)

اللہ نے اس دعا کو بھی جس طرح حضرتؒ کے حق میں قبول فرمایا، وہ ہر صاحب نظر جانتا ہے۔ یہ ایک نہایت جامع دعا ہے، اس کے علاوہ بھی انھوں نے حضرتؒ کے لئے جو جو مانگا اللہ تعالیٰ نے ان کی ہر دعا قبول فرمائی۔ ان کا وجود سارے خاندان کے لئے نہیں حضرتؒ کے واسطہ سے سارے عالم کیلئے باعث رحمت تھا۔

اس کتاب کے باب دوم میں تفصیل سے انکے حالات وواقعات گذر چکے ہیں۔ حضرتؒ کی جس طرح انھوں نے تربیت ونگہداشت کی اور ساری عمر دعا کرتی رہیں اسکی تفصیل بھی گذر چکی ہے، روزآنہ وہ استخارہ کی نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت کی صحیح رہنمائی کی دعا کرتیں، اور ہمیشہ یہ بھی دعا کرتیں کہ ان سے کوئی غلط کام نہ ہو۔

حضرت بیان فرماتے ہیں:

"انتقال کے بعد والی رات عجیب رحمت وبرکت کی رات معلوم ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سکینت کا شامیانہ سروں پر تنا ہوا ہے، کوئی وحشت اور بے رونقی نہیں تھی، میں سحر کے وقت ذکر ودعا کے ساتھ انہیں کے اشعار پڑھتا رہا، جو حسب ذیل ہیں ؎

تیرا شیوہ کرم ہے، اور میری عادت گدائی کی
نہ ٹوٹے آس اے مولیٰ تیرے در کے فقیروں کی
ادھر بھی ابر رحمت آئے اور جم جم کے یوں برسے
کہ ہو سرسبز کھیتی ہم غریبوں بد نصیبوں کی
خزاں میں بھی شجر سرسبز ہو کر پھول پھل لائیں
ہو شہرت باغباں کی باغ کی غنچوں کی پھولوں کی" (۱)

دار العلوم میں قیام

تبلیغی ودعوتی انہماک کی وجہ سے حضرتؒ کا ۱۹۵۳ء کے بعد سے مستقل تبلیغی مرکز

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۴۹

ہی میں قیام رہتا تھا، دونوں وقت گھر سے کھانا وہیں جاتا تھا۔ مولانا نعمانی صاحبؒ بھی قریب ہی مکان میں رہتے تھے۔ دعوتی دوروں اور ملی کاموں میں دونوں حضرات شریک رہتے۔ مرکز کے قیام کے دوران سید مسعود علی آزاد فتحپوری (جو حضرت رائپوریؒ کے خواص اصحاب میں سے ہوئے اور حضرت کی آخری نماز جنازہ بھی انھوں نے پڑھائی) سے بڑی یکجائی رہی۔ وہ حضرتؒ سے بڑی محبت فرماتے اور خیال رکھتے۔ خدمت وراحت کا خیال رکھنے والوں میں مسجد کے خادم و منتظم مولوی محمد سلیم صاحب مرحوم، بھائی عبدالسلام صاحب اور مولوی ڈاکٹر اشرف علی ندوی لکھنوی صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مرکز ہی کے قیام میں ڈاکٹر محمد آصف قدوائی مرحوم سے ربط و تعلق ہوا اور انھوں نے حضرتؒ کی اہم کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

تقریباً ۱۵-۱۶ سال مرکز میں رہنے کے بعد حضرتؒ دارالعلوم کے مہمان خانہ میں منتقل ہو گئے اور اخیر وقت تک لکھنؤ میں دارالعلوم کا مہمان خانہ ہی حضرتؒ کی قیام گاہ رہا۔

تحریک "پیام انسانیت"

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا لیکن جس تیزی کے ساتھ اخلاقی گراوٹ، انسانی پستی اور انسانی قدروں کی پامالی کا سلسلہ شروع ہوا، اس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ ملک تو آزاد ہو گیا لیکن ضمیر اندر سے غلام ہے، برطانیہ یا کسی غیر ملکی طاقت کا نہیں بلکہ ہوا و ہوس، دولت و قوت، عزت و اقتدار اور تنگ نظری و تنگ دلی کا۔ اتنے وسیع و عریض ملک میں ڈھونڈنے سے ایسے افراد نہیں ملتے تھے جن کو دل و ضمیر کو بیدار کرنے کی فکر ہو، جو لوگوں کو ان چیزوں سے آگاہ کریں، جو ملک کے لئے حقیقی خطرہ ہیں۔

حضرتؒ کے وسیع ذہن اور دردمند دل نے ملک کے آزاد ہونے کے بعد ہی

اسکو محسوس کرلیا کہ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو نہ ملک بچے گا اور نہ اسکے رہنے والے بچیں گے، نہ مدارس محفوظ رہ سکیں گے، نہ مساجد، نہ ادارے بچ سکیں گے نہ کتب خانے، کشتی ڈوبے گی تو سب ڈوبیں گے۔ حضرتؒ نے صاف محسوس فرمالیا کہ اگر اکثریتی فرقہ کے لوگ اس کام کے لئے آگے نہیں بڑھتے تو مسلمانوں کو اس کے لئے آگے آنا چاہئے اور اس خلاء کو پر کرنا چاہئے، مسلمانوں کے پاس جو نبوی تعلیمات اور اخلاقی قدریں ہیں، ہر مذہب اس سے خالی ہے اور اس ملک کے مسلمانوں کے باعزت رہنے کا راستہ یہی ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں اور اخلاقی قیادت کے اس خلاء کو پر کریں جو عرصہ دراز سے اس ملک میں چلا آرہا ہے۔

حضرتؒ نے اس ضرورت کے پیش نظر تقسیم اور ملک کے آزاد ہونے کے بعد ہی سے اپنے ان خیالات اور ملک کی اخلاقی گراوٹ اور بگڑتی ہوئی صورتحال پر اپنی گہری تشویش کا اظہار اپنے بعض مضامین ورسائل میں کرنا شروع کردیا تھا۔ اس کوشش کا باقاعدہ آغاز ۱۹۵۴ء میں ہوا، اور اس کی پہلی تقریر گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ہوئی، اسکے علاوہ تبلیغی دوروں کے ساتھ اس جزء کو شامل کرلیا گیا تھا، اس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں ہوچکا ہے۔

حضرت کو کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ محسوس ہوا کہ تبلیغی دوروں کے ساتھ اس کا ملانا بعض غلط فہمیوں کا موجب ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف مستقل بیرونی ممالک کے سفروں کی وجہ سے بھی یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر ۱۹۷۴ء کو الٰہ آباد سے باقاعدہ "پیام انسانیت" (Message of Humanity) کے نام سے اس تحریک کا آغاز کیا گیا۔

اسکے بعد سے پورے ملک میں اس کے چھوٹے بڑے پروگرام ہوتے رہے، بعض بڑے شہروں میں عظیم اجلاس بھی منعقد ہوئے اور الحمد للہ یہ سلسلہ جاری ہے۔

اس میدان میں نمایاں طور پر مولانا اسحاق جلیس ندوی صاحبؒ نے حصہ لیا، اللہ نے ان کو اس کی بڑی صلاحیت دی تھی اور انھوں نے اس کام کے لئے اپنے

وقت کے بڑے حصہ کو فارغ کرلیا تھا۔ حضرتؒ کو خاص طور سے اس کام میں ان سے بڑی تقویت ملتی تھی۔

مولانا محمد الحسنیؒ حضرت ہی کے فکر کے حامل اور ترجمان تھے، انھوں نے اور مولانا اسحاق صاحبؒ نے مل کر اس تحریک کا وہ حلف نامہ تیار کیا جو ہر طبقہ پر حاوی ہے تحریک کا تعارف کرانے کے لئے دونوں کا قلم یکساں رواں دواں تھا۔ ان دونوں حضرات کے بعد تیسری شخصیت مولانا الحاج عبدالکریم پاریکھ صاحب کی ہے جنھوں نے اس تحریک میں پوری طرح حصہ لیا اور اس میدان میں حضرتؒ کی ترجمانی کی۔ حضرتؒ نے ان کو اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی تھی۔

حضرتؒ نے اس سلسلہ میں بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ، پنجاب اور یوپی کے طویل طویل دورے فرمائے اور مخلوط اجتماعات کو خطاب فرمایا۔

۲۲ر مئی ۱۹۷۵ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں ہزاروں مسلم وغیر مسلم تعلیم یافتہ عوام وخواص نے شرکت کی۔ حضرتؒ نے اس میں بڑی تاریخی تقریر کی جو بعد میں "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" کے عنوان سے بار بار شائع ہوئی۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۷۸ء کو سیوان میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں بڑے اہم اور تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ اسی سال دسمبر میں مراد آباد کے ٹاؤن ہال میں جلسہ ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب علیگڑھ میں فسادات ہورہے تھے اور کشیدگی تھی۔

نومبر کی آخری تاریخوں اور دسمبر ۱۹۷۷ء کی ابتدائی تاریخوں میں مدھیہ پردیش کا دورہ ہوا، اس میں بھوپال، اندرو، اجین، دھار، دیپال پور اور مہو میں بڑے بڑے جلسے ہوئے اور اس تحریک کا زبردست استقبال کیا گیا۔

۳۱ر مارچ ۱۹۷۸ء کو ہریانہ اور پنجاب کا اس سلسلہ میں بڑا کامیاب دورہ ہوا اور چنڈی گڑھ میں عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں غیر مسلموں کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔

۲۷، ۲۸ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو قیصر باغ کی بارہ دری میں پیام انسانیت کانفرنس

منعقد ہوئی جس میں حضرتؒ نے بڑی پر اثر، پر جوش اور الہامی تقریر فرمائی۔

ان جلسوں اور دوروں سے ملک کی فضا پر گہرا اثر پڑا، غیر مسلم دانشوروں کے دلوں میں مسلمانوں کی وقعت پیدا ہوئی اور ان کی افادیت کا احساس ہوا اور خود مسلمانوں کو آزاد فضا میں کام کرنے کا موقع ملا۔

آج ملک کی بگڑتی ہوئی صورتحال میں اس تحریک کی افادیت و ضرورت بہت بڑھ گئی ہے اور حضرتؒ کی وسعت ذہنی، بالغ نظری اور حقیقت شناسی کا ہر صاحب نظر معترف ہے کہ حضرتؒ نے ان حالات میں اسکی ابتداء فرمائی تھی جب عام طور پر لوگوں کو اسکی افادیت کا احساس بھی نہ تھا۔

مشرقی پاکستان میں لسانی و تہذیبی تعصب کا طوفان اور حضرتؒ کی ایک اہم تقریر

دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہندوستان اور پاکستان جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان الگ ہوا اور وہاں لسانی تہذیبی تعصب کا وہ مظاہرہ کیا گیا جو صرف جارحیت ہی نہیں بلکہ جاہلیت پر مبنی تھا، اور جس کا اس اسلامی ملک میں کوئی جواز نہیں تھا۔ حضرت کا دل اس کے زخموں سے چور چور ہو گیا، اس سے متاثر ہو کر حضرتؒ نے ۲۳ مئی ۱۹۷۲ء کو کلکتہ کے ایک عظیم جلسہ میں اس المیہ پر اپنے درد دل کا اظہار کیا اور سخت زبان میں کھل کر اس جاہلیت پر تنقید کی۔ یہ تقریر بعد میں "لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق" کے عنوان سے شائع ہوئی۔

"مسلم پرسنل لاء بورڈ" کی تاسیس

ہندوستان میں مسلمانوں کے ملی تشخص کے تحفظ و بقاء کا مسئلہ اس وقت پھر خطرہ میں پڑتا نظر آنے لگا جب حکومت ہند اور خود نام نہاد مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے طبقہ میں یہ رجحان پیدا ہونے لگا کہ ہندوستان میں سارے فرقوں کا

ایک مشترک عائلی قانون ہو، پھر یہ خطرہ واقعات کی شکل میں سامنے آنے لگا۔ جن مسلمان علماء و قائدین نے اس خطرہ کو محسوس کیا ان میں مولانا منت اللہ صاحب رحمانی (سابق امیر شریعت بہار واڑیسہ) پیش پیش تھے، ان ہی کی تحریک اور تمام مسلمان جماعتوں، اداروں اور مدرسوں کی تائید سے ۲۷/۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں "پرسنل لا کنونشن" بلایا گیا۔ حضرت اس زمانہ میں حجاز مقدس کے سفر پر تھے اور حج کے ایام قریب تھے لیکن مسئلہ کی حساسیت و نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے اور یہاں کے تعلق رکھنے والے علماء و قائدین کے اصرار پر حضرت نے کنونشن میں شرکت فرمائی۔ اس کنونشن میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل ہوئی اور بالاتفاق حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کو اس کا صدر اور مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

حضرتؒ کو مسلم یونیورسٹی سے اس حیثیت سے ہمیشہ دلچسپی اور فکر رہی کہ وہ ملت کی ایک امانت ہے۔ یکم جون ۱۹۷۲ء کو جب لوک سبھا میں مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ پاس کر دیا گیا اور اسکی آزادی خطرہ میں پڑ گئی تو یونیورسٹی کے بہی خواہوں نے اسکے احتجاج میں دہلی میں ۱۰/۱۱ مارچ کو ایک کنونشن منعقد کیا اور حضرت کو اسی تعلق و فکر کی وجہ سے اس کے افتتاح کے لئے مدعو کیا، حضرتؒ نے اس میں اپنا افتتاحی خطبہ پڑھا جس میں صاف صاف کمیونسٹ ملکوں کی روایت کے مطابق دانش گاہوں کو اپنے انتظام میں لینے کے خلاف آگاہی دی اور واضح طریقہ پر فرمایا:

"تاریخ کا شاید سب سے بڑا سانحہ اور سیاست کی انسانیت کے حق میں سب سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ ذہن و اخلاق کے سرچشمے، شخصیت و کردار کی کارگاہیں اور زندگی کی رہنمائی کرنے والے مرکز، بے رحم، بے ضمیر سیاسی مقاصد اور انتخابی مصالح کے تابع ہو جائیں۔" (۱)

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۳۱

افغانستان وایران کا ایک سفر

۱۹۷۳ء میں ۱۴؍جون سے ۲۰؍اگست تک حضرتؒ نے رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر مشرق وسطیٰ کے چھ مسلم ممالک کا طویل دورہ فرمایا جن میں افغانستان، ایران، لبنان، شرق اردن، شام اور عراق شامل تھے۔ استاد احمد محمد جمال (سابق رکن مجلس شوریٰ سعودی عرب) اور مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی کو رابطہ ہی کی طرف سے رفاقت کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

اس زمانہ میں حضرت کو نقرس (Gout) کی شدید تکلیف تھی۔(۱)

لیکن حضرتؒ نے سفر منظور فرمالیا، اور خود حضرتؒ کے الفاظ میں "احساس فرض احساس مرض پر غالب آیا"۔ اس سفر کی پہلی منزل افغانستان تھی، وہاں تقریباً ایک ہفتہ قیام رہا۔ یہ اس ملک کا حضرت کا پہلا سفر تھا حضرت نے تحریر فرمایا ہے کہ "سب سے زیادہ جی افغانستان میں لگا، شاید اس وجہ سے بھی کہ یہ افغانستان کے اس دور کا جو اسلام کے داخلہ کے بعد وہاں قائم ہوا تھا دم واپسیں تھا۔" (۲) اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد وہاں انقلاب آیا اور کمیونسٹ اقتدار قائم ہو گیا۔

حضرتؒ نے انقلاب سے پہلے ہی اس خطرہ کا احساس فرمالیا تھا اور اپنے سفر نامہ میں سردار محمد داؤد خاں کے متعلق اندیشے ظاہر کئے تھے جو بعد میں حقائق کی شکل میں سامنے آئے۔

کابل کے قیام میں دو اہم تقریریں ہوئیں: ایک کابل یونیورسٹی کی تقریر جو یونیورسٹی کے ہال میں ۶؍جون ۱۹۷۳ء کو طلباء اساتذہ اور دانشور طبقہ کے ایک مجمع

---

(۱) اس مرض کی ابتداء ۱۹۶۰ء ہی سے ہو گئی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کا حملہ ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی زندگی میں ہوا، حضرت اس کی وجہ سے تکلف سے چل رہے تھے، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا تو فرمایا کہ پاؤں میں تکلیف ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میاں (مولانا حکیم عبدالحی صاحب حسنی) کو بھی تھی۔ حضرت فرماتے تھے کہ بھائی صاحب نے اسی وقت کہا محمد جاؤ مطب سے فلاں دوا لے آؤ۔ میں نے دوا استعمال کی، درد زائل ہو گیا۔ پھر بھائی صاحب کی زندگی میں نہیں ہوا۔ بعد میں اس کے حملے شروع ہوئے تو دوا یاد نہیں رہی تھی۔

(۲) کاروان زندگی دوم ص ۱۳۹

میں ہوئی۔ دوسری تقریر سعودی سفارت خانہ کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ میں کی گئی۔

افغانستان کے قیام میں صرف کابل اور غزنی دو ہی مقامات پر جانا ہوا۔ حکیم سنائی اور سلطان محمود غزنوی کے مزارات پر تشریف لے گئے۔ محمود غزنوی کی قبر پر پہنچ کر قلم سے بے اختیار یہ سطریں نکلیں:

"ہم مزار شاہی پر تصویر حیرت بنے کھڑے رہے، یہاں وہ شیر سو رہا ہے جسکی ہیبت سے افغانستان وہندوستان کے بادشاہوں کی نیند اڑ جاتی تھی۔ آج وہ خود محو خواب ہے۔

بادشاہوں کے جاہ و حشم کے اس انجام کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب بچوں کا کھیل اور اسٹیج کی نقالی ہے ~

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے بس وہی باقی بتان آزری"(۱)

افغانستان کے پورے قیام میں پروفیسر عبد الرسول سیاف صاحب (سابق وزیر اعظم افغانستان) وفد کے رفیق و ترجمان رہے۔ شیخ صبغۃ اللہ مجددی (سابق صدر افغانستان) بھی حضرت سے بڑی محبت و عقیدت سے ملتے رہے۔

اس سفر کی دوسری منزل ایران تھی، وہاں دس روز قیام رہا۔ طہران، قم، مشہد، اصفہان، طوس اور شیراز جانا ہوا، وزراء علماء سے ملاقاتیں رہیں، دینی و تاریخی مقامات دیکھے۔ مجالس مذاکرہ اور استقبالیہ جلسوں میں شرکت رہی، امام غزالی شیخ سعدی، حافظ شیرازی، امام علی رضا اور خلیفہ ہارون رشید کے مزارات و قبور پر بھی حاضری ہوئی۔

لکھنؤ میں رہنے کی وجہ سے حضرتؒ اہل تشیع اور ان میں خاص طور پر "فرقہ اثنا عشریہ" کے عقائد و خیالات سے بخوبی واقف تھے کہ وہ ذات نبوی کے مقابلہ میں اہل بیت کو اپنا مقتدا و پیشوا مانتے ہیں۔ آیت اللہ العظمیٰ مرزا محمد خلیل کمرئی کی

---

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۵۳

طرف سے دیئے گئے ایک استقبالیہ میں حضرتؒ نے صاف صاف اس پر نقد فرمایا اور کھل کر کہا کہ :

"محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی، بنی آدم میں سے جس کو بھی سعادت و خیر کا کوئی ذرہ ملا، خواہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ کے مرتبہ کا ہی کوئی شخص کیوں نہ ہو سیدنا محمد بن عبد اللہ ﷺ کے واسطہ ہی سے نصیب ہوا۔"(۱)

یہ واضح رہے کہ حضرت کا یہ سفر ایرانی انقلاب سے آٹھ نو سال قبل ہوا تھا اور اس وقت ظاہری طور پر اسکے آثار و شواہد نہیں تھے۔

۲۱؍جون کو یہ وفد مکہ معظمہ واپس ہوا اور وہاں پانچ ہفتہ قیام کے بعد ۲۹؍جولائی کو بیروت روانگی ہو گئی۔ اس سفر میں مولانا عبد اللہ عباس صاحب ندوی کی جگہ پر حضرت کی معاونت و رفاقت کے لئے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کا انتخاب ہوا۔

لبنان میں

لبنان میں بیروت کے علاوہ طرابلس، صیر، صیدا تشریف لے گئے اور استقبالیہ جلسوں کو خطاب فرمایا۔ لبنان کے دار الافتاء میں مفتی لبنان شیخ حسن خالد نے استقبالیہ دیا۔ اس میں مفتی امین الحسینی صاحب کے علاوہ وزیر اعظم، سابق وزیر اعظم، وزراء و عمائدین مملکت علماء و ادباء کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ حضرتؒ نے اس تقریب میں "مسلم قوم کے کردار" کے عنوان سے بڑی موثر تقریر کی اور علماء و ماہرین فقہ کو بھی ان کی ذمہ داری یاد دلائیں۔

عجیب واقعہ

۳؍اگست کو یہ وفد دمشق پہنچا، شام کا یہ حضرت کا چوتھا سفر تھا، وہاں کچھ روز

---

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۵۶

قیام کرنے اور قدیم دوستوں اور اہل تعلق سے ملاقاتوں کا پروگرام تھا۔ سفر کی ترتیب میں حمص، حماۃ اور حلب کا بھی پروگرام تھا، اتوار کو سعودی سفارت خانہ نے استقبالیہ کا بھی اہتمام کیا تھا کہ اچانک سنیچر اور اتوار کی درمیانی شب میں عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ نصف شب میں مخابرات (سی آئی ڈی) کے لوگ "فندق امیہ" میں داخل ہوئے، جہاں یہ حضرات آرام فرمارہے تھے، اور حکم دیا کہ سامان باندھئے اور روانہ ہو جائیے۔ موٹر روانہ ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ لبنانی سرحد کی طرف جارہے ہیں۔

دوسرے دن ریڈیو اخبارات میں یہ خبر نشر ہوئی اور اس پر عمومی طور پر ناپسندیدگی ظاہر کی گئی۔ بیروت میں لوگ آتے، خیریت دریافت کرتے، حیرت کرتے اور واقعہ سے دلچسپی کا اظہار کرتے۔

بغداد میں

۷ اگست کو یہ وفد بغداد میں داخل ہوا، وہاں حکومت عراق کے مہمان کی حیثیت سے قیام ہوا۔ اس وقت عراق انقلاب کی زد میں آچکا تھا، ہر چیز پر سخت پہرے داری تھی، لوگ بھی الفاظ تول تول کر بولتے تھے۔

حکومت نے جمعہ پڑھنے کے لئے "جامعہ شہداء" کا انتخاب کیا تھا، جو بغداد سے کئی کلومیٹر دور ہے۔ اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ لوگ زیادہ نہ پہنچ سکیں۔ لیکن حضرتؒ کی آمد کی خبر لوگوں کو ہو گئی اور لوگ جوق در جوق پہونچنے لگے۔ حاضرین نے خطاب کی درخواست کی۔ ذمہ داروں کو لوگوں کی شدید خواہش کے پیش نظر اجازت دینی پڑی۔ حضرتؒ نے آیت قرآنی "لقد أنزلنا إليكم كتاباً فيه ذكركم افلا تعقلون" (ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے، تم غور کیوں نہیں کرتے؟) کو موضوع بنا کر صاف صاف تقریر کی۔ تقریر کے بعد لوگ مصافحہ، معانقہ کے لئے ٹوٹ پڑے۔ حضرتؒ کے کان میں کسی نے چپکے سے کہا کہ "ہجوم دس گنا ہوتا اور پورا بغداد امنڈ آتا اگر

حالات معمول پر ہوتے"۔ امام ابو حنیفہؒ اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے مزارات پر بھی حاضری ہوئی۔

سفر کی آخری منزل

سفر کی آخری منزل اُردن تھی۔ ۱۳ر اگست کو وفد عمان میں داخل ہوا۔ ۱۴ر اگست کو شاہ حسین سے ملاقات ہوئی، وہ حضرت سے بڑے احترام و عقیدت سے ملے، خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا، رخصت کرنے بھی کچھ دور آئے۔

حضرت نے خطاب کرتے ہوئے پوری جرأت کے ساتھ ان سے فرمایا:

"ان معصوم روحوں کے بارے میں خدا سے ڈریئے، جنھوں نے ابھی عالم اجسام میں قدم نہیں رکھا، اگر آپ نے ان کی مقدس اور قابل احترام چیزوں کی حفاظت کی اور انہیں ایک تابناک ماضی عطا کیا، تو وہ آپ کی ممنون ہوں گی اور اگر آپ نے ان مقامات مقدسہ کو کھو دیا اور ان کے لئے ذلت و رسوائی کا ترکہ چھوڑا تو وہ بارگاہ خداوندی میں فریاد کریں گی۔"(۱)

مختلف مقامات پر حضرتؒ کے خطابات ہوئے۔ عمان کے قریب اس غار کو بھی دیکھا جس کے بارے میں آثار قدیمہ کے ماہر رفیق وفا دجانی کی تحقیق ہے کہ وہ اصحاب کہف کا غار ہے۔ شہدائے موتہ کے مزارات پر بھی حاضری ہوئی۔

اس سفر کا سب سے اہم واقعہ یہ ہوا کہ حضرت کو سرحد پر سعودی فوجی مرکز کا معائنہ کرنے اور خطاب کرنے کی دعوت دی گئی، اس کو حضرت ہی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے۔

زندگی کا ایک پر اثر منظر

"میری زندگی کا بڑا اہم واقعہ اور دل پر گہرا اثر ڈالنے والا وہ منظر تھا جو ۱۹ر اگست ۱۹۷۳ء کو پیش آیا، ہمیں موقعہ دیا گیا کہ اس سعودی فوجی مرکز کا

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۱۹۶

معائنہ کریں جو سرحد کی حفاظت کے لئے متعین ہے اور ان فوجیوں سے خطاب بھی کریں، جب یہ مسلح نوجوان صف بستہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق ہم کو سلامی دی تو جسم میں عزم وایمان اور مسرت وخوشی اور سرشاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور طرب واہتزاز کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی، آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے زبان دہن کے بجائے زبان دل سے گفتگو کی۔" (۱)

اس طویل دورہ کا سفرنامہ حضرتؒ نے عربی میں تیار فرمایا اور اس کا نام "من نهر كابل إلى نهر يرموك" رکھا۔ اردو میں "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" کے عنوان سے اس کا ترجمہ شائع ہو کر مقبول ہوا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی خاص طور پر انکے بڑے معترف ومداح تھے اور اپنے اہل تعلق کو اس کے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ "اس کتاب کو رشک کے ساتھ پڑھنا چاہئے"۔

خلیج کے دو سفر

جنوری ۱۹۷۷ء کو حضرتؒ نے رابطہ کے اجلاس میں شرکت فرمائی اور اس مرتبہ بھی حج سے مشرف ہوئے۔ واپسی میں حاکم شارقہ شیخ سلطان القاسمی کی خصوصی دعوت پر شارقہ، دبئی اور ابو ظہبی کا ایک مختصر سفر ہوا۔ حضرتؒ کے بھانجے مولانا واضح رشید ندوی صاحب اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب (مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء) ساتھ تھے۔ اس سفر میں خاص طور پر دو تقریریں اہم ہیں: ایک مسجد علی بن ابی طالب میں "الخليج بين الاسلام و المسلمين" کے عنوان سے ہوئی اور دوسری دبئی کی پبلک لائبریری میں "كيف دخل العرب التاريخ" کے موضوع پر کی گئی، اور اس میں عمائدین شہر اور علماء وفضلاء کی بڑی تعداد شریک

---

(۱) کاروانِ زندگی دوم ص ۲۲۶

ہوئی۔

۱۹۷۶ء میں پھر ان ہی دونوں رفیقوں کے ساتھ خلیج کا سفر ہوا۔ ابوظبی کے دیوان امیری میں ۲۳؍دسمبر ۱۹۷۶ء کو ایک اہم اور یادگار تقریر ہوئی جس کا عنوان تھا "نظرة مومن واع إلى المدنيات المعاصرة" (ایک صاحب شعور مسلمان موجودہ تہذیبوں کو کس نظر سے دیکھتا ہے)۔

شاہ فیصل کی شہادت اور حضرت کا تاثر

سعودی حکومت کے فرمانروا شاہ فیصل مرحوم حضرت سے اسی وقت سے محبت و عقیدت رکھتے تھے جب وہ ولی عہد تھے۔ انہوں نے حضرت کے دعوتی رسائل اور بعض اہم تصانیف کا مطالعہ بھی کیا تھا، حضرت کو بھی ان کی حمیت دینی اور بصیرت پر اعتماد تھا۔ مختلف ملاقاتوں اور مکاتیب میں حضرت نے ان کے سامنے صحیح اسلامی حکومت کا نقشہ پیش کیا تھا، عالمی سطح پر اسلامی بیداری پیدا کرنے کی تدابیر انکو بتائی تھیں اور حرمین شریفین کی تولیت کی نسبت سے ان کی ذمہ داریاں ان کو یاد دلاتے رہتے تھے، حضرت کو ان سے بڑی امیدیں تھیں کہ ۲۵؍مارچ ۱۹۷۵ء کو اچانک ان کو شہید کر دیا گیا، حضرتؒ پر اس خبر سے وہ اثر پڑا جو کسی قریبی عزیز کے حادثہ وفات پر نہ پڑا ہوگا۔

گیارہواں باب

دار العلوم ندوۃ العلماء حضرت کے چالیس سالہ دورِ نظامت میں، اہم واقعات، تاریخی اجلاس اور ترقیات

نظامت سے پہلے

ندوۃ العلماء سے حضرتؒ کا تعلق موروثی اور جذباتی بھی تھا اور عقلی و فکری بھی۔ حضرتؒ نے اپنے شعور و تعقل کی ابتدا ہی سے اس کا نام سنا اور اس کے کام اور پیغام سے آشنا ہوئے، پھر اسی فکر و ماحول میں حضرتؒ کی ذہنی و فکری تربیت ہوئی، اس کی فکر کی وسعت و آفاقیت، توازن و اعتدال، ہمہ جہتی و شمولیت پر حضرتؒ کو پورا یقین تھا، اور حضرتؒ ابتدا ہی سے اس کی فکر و دعوت کے ترجمان اپنے حال سے بھی تھے اور اپنے قال سے بھی۔

تدریس کے دس سالہ دور میں حضرتؒ نے تعلیمی نصاب و نظام میں اصلاحات فرمائیں اور عربی زبان و ادب کا پورا نصاب تیار فرمادیا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے اخیر دور میں حضرت کو نائب معتمد تعلیم بنایا (۱) اور حضرتؒ ہی پر پورا اعتماد کرنے لگے۔ حضرتؒ نے اسی زمانہ میں نصاب کا خاکہ بنا کر بھیجا تو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ: "اس دور کے لئے آپ کا خاکہ موزوں ہوگا، مجھے چونکہ آپ پر اعتبار و اعتماد ہے اس لئے دیکھے بغیر بھی اس کو پسند کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نافع فرمائے۔" (۲)

---

(۱) ۷ر جنوری ۱۹۴۹ء میں یہ تجویز شوریٰ میں پاس ہوئی تھی۔

(۲) پرانے چراغ اول، ص ۳۶

حضرت سید صاحب کی وفات کے بعد حضرتؒ کو معتمد تعلیم منتخب کیا گیا، پھر برادر معظم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی کی وفات کے بعد بالاتفاق نظامت کے لئے حضرت کا انتخاب ہوا۔ یہ ۱۸ رجون ۱۹۶۱ء کی تاریخ تھی، پھر ۳۱ ردسمبر ۱۹۹۹ء تک مسلسل آپ نے اس عہدہ کو رونق بخشی، ہجری سنہ کے حساب سے یہ تقریباً چالیس سال ہوتے ہیں، اس سے پہلے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مسلسل تیس سال اور والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ تقریباً سات سال اس عہدہ پر رونق افروز رہے تھے۔

حضرتؒ کے دور نظامت کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: ابتدائی پندرہ سال بڑی مشقت و جانفشانی اور مسلسل فکر و سعی میں گزرے، لیکن اخیر کے پچیس سالوں میں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح سے فتح باب فرمایا، اور دارالعلوم ایک ایسے مدرسہ سے جس کی طرف بار بار لوگوں کو متوجہ کرنا پڑتا تھا، ایک ایسی عالمی شہرت یافتہ دانشگاہ بن گیا جس کی طرف پورے عالم اسلام کی نظریں مرکوز ہو گئیں، اور بلاشبہ بنیادی طور پر یہ حضرت کی فکر و توجہ اور خداداد محبوبیت و مقبولیت کا نتیجہ ہے۔

ابتدائی دور نظامت

حضرتؒ جس زمانہ میں دارالعلوم کے ناظم منتخب ہوئے وہ زمانہ مالی وسائل کے اعتبار سے بڑی دشواریوں کا تھا، مسجد کے علاوہ دارالعلوم میں صرف دو عمارتیں تھیں، تنخواہیں بھی بہت معمولی تھیں، حضرتؒ نے اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کی تجویز رکھی۔ بعض ذمہ داروں نے اس پر یہ اشکال کیا کہ زائد رقم کہاں سے آئے گی۔ حضرت کی طبیعت بڑی متوکلانہ تھی فرمایا کہ اللہ اس کا انتظام کرے گا۔ خدا کا کرنا کہ تنخواہوں کے بڑھانے سے جو رقم زائد ہو رہی تھی اس سے بھی کہیں زیادہ کسی صاحب خیر نے بھیج دی۔

حضرتؒ کے مزاج میں جو استغناء و خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اپنے

ادارہ کے لئے بھی کسی سے مانگنا یا کچھ کہنا گوارہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی نظامت کے دور میں اپنے مزاج کے خلاف حضرتؒ نے بعض مواقع پر قوم کی فراہمی کے لئے سفر بھی کئے، اور چندہ بھی کیا، لیکن اپنے دور نظامت میں یہ خودداری اور بڑھ گئی، خاص طور پر عالم عربی سے اس کا تعلق سخت ناگوار تھا اور حضرتؒ یہ چاہتے تھے کہ ان سے یہ تعلق صرف دعوتی ہو۔ نظامت کے بعد کویت کے سفر میں ایک مرتبہ حضرتؒ کے خاص معاون جناب مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ نے کسی صاحب خیر سے فرمائش کر دی تھی کہ اس وقت ندوہ کو اس کی بڑی ضرورت بھی تھی، مگر حضرتؒ نے اس کو بھی اپنی موجودگی میں پسند نہیں فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس محبوب بندے کی محبت لوگوں کے دلوں میں ایسی ڈال دی کہ دارالعلوم کو بحمد اللہ پریشانی نہیں ہوئی اور اہل خیر کو خود ہی توجہ ہونے لگی، علامہ یوسف القرضاوی اسی زمانہ کا واقعہ اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"مجھے یاد ہے کہ جب انھوں نے تیس سال قبل قطر کا سفر کیا وہ زمانہ دارالعلوم کی مالی پریشانی کا تھا، بعض اہل تعلق نے ان کو اہم شیوخ اور تجار سے ملاقات کی رائے دی کہ ان سے مل کر دارالعلوم کے مسائل ان کے سامنے رکھے جائیں اور تعاون طلب کیا جائے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم نے پوچھا کیوں؟ تو انھوں نے فرمایا کہ "یہ لوگ مریض ہیں، انکا مرض دنیا کی محبت ہے اور ہم ان کے معالج ہیں، آخر طبیب اپنے مریض کے آگے ہاتھ پھیلا کر کیسے ان کا علاج کر سکتا ہے؟" ہم نے ان سے کہا کہ آپ اپنے لئے تھوڑی مانگ رہے ہیں بلکہ آپ تو دارالعلوم اور اس کے اساتذہ و طلبہ کے تعاون کے خواہاں ہیں، تاکہ وہ ادارہ اسی طرح علم کی روشنی پھیلاتا رہے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ "یہ لوگ اس کا فرق نہیں کرتے، اور وہ ہمیشہ بات رکھنے والے کو بھی طالب اور دست سوال دراز کرنے والا سمجھتے رہیں گے"۔

ایک بار ہم نے رمضان میں ان سے کہا کہ آپ آخری عشرہ تک ہمارے پاس ٹھہریئے ہم آپ کے ساتھ تعاون کا کام انجام دیں گے، تو انھوں نے کہا آخری عشرہ میں ہمارا ایک خاص معمول ہے جس کو ہم کسی بھی طرح چھوڑنا پسند نہیں کرتے، ہم اس موقع کو اپنے اور اپنے خدا کے لئے فارغ کر لیتے ہیں۔

اس سے ہمیں بخوبی معلوم ہو گیا کہ شیخ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص معاملہ ہے جس سے ان کو کوئی بھی سرگرمی باز نہیں رکھ سکتی۔"(۱)

حضرتؒ کے اسی استغناء کا نتیجہ یہ ہوا کہ الحمد للہ آج دار العلوم میں دسیوں نئی عمارتیں بن گئیں، کتب خانہ علامہ شبلیؒ کی پانچ منزلہ عمارت تیار ہوئی، اس میں کتابوں کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی، بیشتر قیمتی مخطوطات کتب خانہ کو حاصل ہوئے۔ مسجد کی تین مرتبہ توسیع کی گئی، اور دار العلوم کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔

حضرتؒ کی نظامت کے بعد دوسرا مسئلہ طلبہ میں صحیح دینی فکر و شعور پیدا کرنے، دعوتی مزاج بنانے اور خوابیدہ جذبات وصلاحیتوں کے بیدار کرنے کا تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کے زمانہ ہی میں ان کی اور حضرت سید سلیمان ندویؒ کی سرپرستی میں یہ کام شروع ہو گیا تھا، لیکن حضرتؒ کے دور میں یہ کام تیزی سے آگے بڑھا۔ اس مسئلہ میں بھی حضرتؒ کو شروع میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، نوبت یہاں تک بھی پہنچی کہ اپنی صحیح فکر و مزاج منتقل کرنے میں بعض رکاوٹوں، اپنی تبلیغی ودعوتی مصروفیات اور ضعف بصارت کی وجہ سے حضرتؒ نے دار العلوم سے سبکدوشی کا فیصلہ فرما لیا تھا، ۲۰/ اگست ۱۹۶۹ء کے جلسہ انتظامیہ میں اپنا استعفیٰ بھی پیش فرما دیا، جس میں حضرتؒ نے تفصیل سے اپنی مجبوریاں اور اعذار تحریر فرما دیئے تھے، لیکن مجلس انتظامیہ نے اسکو منظور نہیں کیا، اور شاہ معین الدین احمد صاحب رائے بریلی تشریف لائے، اور حضرتؒ سے فرمایا کہ "آپ ہی کو یہ ذمہ داری سنبھالنی ہے

---

(۱) تعمیر حیات نمبر۔ ص ۱۳۹۔

اور آپ جس طرح چاہیں اپنے فکر ورجحان کو طلبہ میں منتقل فرمائیں، اگر آپ اس پر تیار نہیں ہوتے تو میں بھی دارالمصنفین چھوڑ کر یہیں بیٹھ جاؤں گا۔" حضرتؒ نے ان کے اصرار بلکہ حکم پر یہ ذمہ داری باقی رکھی۔

اس واقعہ کے آٹھ مہینہ کے بعد مئی ۱۹۷۰ء کو دارالعلوم میں ایک معمولی مطالبہ نہ تسلیم کرنے پر طلبہ نے اسٹرائک کر دی، اور اس نے جلد سنگین صورت اختیار کرلی، سید اسد حسین صاحب نے خصوصی تعاون کیا اور معاملہ ختم گیا۔ اس واقعہ سے حضرتؒ کے دل ودماغ پر گہرا اثر پڑا، حضرتؒ نے حضرت شیخ کو ایک خط میں یہاں تک لکھا کہ "میں نہیں کہہ سکتا کہ والدہ کی وفات کا صدمہ زیادہ ہوا یا اس ناشدنی واقعہ کا۔"

اس زمانہ میں طلبہ کی تعداد بھی محدود تھی اور صرف خواص ہی کے طبقہ میں دارالعلوم کی شہرت تھی، خالص دینی حلقوں میں اس کو دوسری ہی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، عوامی حلقے ابھی تک اس کے کام اور پیغام سے ناآشنا تھے، حضرتؒ اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش فرماتے رہے، آہستہ آہستہ اس کے نتائج بھی نکل رہے تھے، مگر انقلابی تبدیلی اس وقت پیدا ہوئی جب ۱۹۷۵ء میں حضرتؒ کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کا انعقاد ہوا۔ یہاں سے حضرتؒ کی نظامت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح سے کشادگی عطا فرمائی اور دارالعلوم ہر طرح کی ظاہری وباطنی خوبیوں اور کمالات سے آراستہ ہوا، صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں اس کو ایک امتیازی مقام حاصل ہوا، دُنیا کے مختلف علاقوں سے طلبہ دارالعلوم کا رُخ کرنے لگے اور ندوہ کی فکر کو پورے عالم اسلام میں قدر ووقعت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

پچاسی سالہ جشن تعلیمی

ندوۃ العلماء درحقیقت ایک ہمہ گیر علمی، دینی، فکری، اصلاحی وتعلیمی تحریک کی

حیثیت سے ۱۳۱۰ھ میں قائم ہوا تھا، اس تحریک کے بلند و عظیم مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کے چھ سال بعد دار العلوم قائم ہوا، بعد میں اس دار العلوم نے تحریک ندوۃ العلماء سے زیادہ شہرت حاصل کرلی، اور اس تحریک کی ولولہ انگیز سرگزشت پس منظر میں چلی گئی۔

ان بلند مقاصد کے تعارف اور اس عظیم تحریک کی توسیع میں ندوۃ العلماء کے عظیم الشان سالانہ جلسہ ہوتے رہے، جو بہت دنوں تک لئے خوشگوار یادیں اور روشن نقوش چھوڑ جاتے اور ندوۃ العلماء کے مقاصد کی تبلیغ و تشہیر کے ماسوا مسلمانوں کی دینی زندگی اور علمی ترقی میں ایک حرکت پیدا کردیتے، اس سلسلہ کا آخری اجلاس ۱۹۲۷ء میں امرتسر میں ہوا، اسکے بعد مختلف وجوہ کی بنا پر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا اور اس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس تحریک کی رفتار اچانک دھیمی پڑ گئی، اس کا احساس ذمہ داران ندوۃ العلماء کو ہوتا رہا، لیکن یہ خیر بھی حضرتؒ کے مقدر میں تھا، حضرتؒ نے نظامت سنبھالنے کے بعد جلسہ کی تحریک فرمائی، اور اس کیلئے بعض ابتدائی کوششیں بھی فرمائیں، تعمیر حیات کے اجراء میں جس کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۶۳ء میں مولانا محمد الحسنیؒ کی ادارت میں شائع ہوا یہی جذبہ کار فرما تھا کہ اس سے اجلاس کی عمومی فضا اور ذہن تیار کرنے میں مدد ملے گی لیکن بات آگے نہ بڑھ سکی اور ایک عرصہ گزر گیا۔

۲۳ / مارچ ۱۹۷۴ء کو مجلس انتظامی میں حضرتؒ نے بحیثیت ناظم دوبارہ اس کی تحریک فرمائی اور یہ طے کرلیا گیا کہ اسی سال نومبر میں یہ اجلاس منعقد کیا جائے لیکن بعد میں وقت کی کمی کے باعث اس کو مزید ایک سال کے لئے مؤخر کردیا گیا اور اس کے لئے نومبر ۱۹۷۵ء کا مہینہ تجویز ہوا۔ اور مولانا محمد عمران خاں صاحبؒ کو اجلاس کا عمومی ناظم منتخب کرلیا گیا۔

اجلاس کے قریبی اور فوری محرکات

رُوداد چمن کے مصنف مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :

"اجلاس کے قریبی اور فوری محرکات میں سب سے بڑا حصہ (جس سے اس کا اولین تقاضا پیدا ہوا اور شدت اختیار کر گیا) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کے ممالک عربیہ و اسلامیہ کے مسلسل دوروں اور وہاں کی جامعات، علمی مجالس اور عمومی اجتماعات میں ان کی تقریروں اور خطبات کا ہے، جنکا آغاز ۱۹۵۰ء میں سفر حجاز، شام اور مصر و سوڈان سے ہو گیا تھا، مصر میں جو اس وقت علم و ادب کے لحاظ سے اپنے پورے شباب اور عروج پر تھا مولانا کا کئی ماہ مسلسل قیام رہا اور ندوۃ العلماء کے نام اور کام سے (جس سے ابھی تک چند نفوس آشنا تھے اور بہت مخصوص و محدود علمی حلقوں میں اس کا تعارف تھا) ایک بہت بڑا حلقہ اچھی طرح واقف ہو گیا، جس میں ہر طبقہ کے ممتاز و نامور افراد، تعلیم یافتہ، ذہین و بے چین نوجوان، لائق اساتذہ اور صفِ اوّل کے اہلِ فکر و اہل قلم بلکہ دیہات کے سادہ لوح اور مخلص مسلمان بھی شامل تھے، شیخ یوسف القرضاوی جن کی تقریر کی بازگشت اہل لکھنؤ کے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے اس وقت ایک طالب علم تھے، اور مولانا سے خوردانہ و عزیزانہ تعلق رکھتے تھے، ان کی مجلسوں میں حاضر ہوتے اور مولانا کی گفتگو سننے کے ہمہ وقت مشاق رہتے۔

یہ ندوہ کا پہلا عمومی اور ہمہ گیر تعارف تھا، اس کے بعد مولانا کے سفر برابر جاری رہے، اور نہ صرف ممالک عربیہ اسلامیہ بلکہ یورپ کے متعدد ملکوں تک اس کا سلسلہ دراز ہو گیا، اور رابطۂ عالم اسلامی اور مدینہ یونیورسٹی وغیرہ کے سالانہ جلسوں میں تقریباً مسلسل شرکت نیز مولانا کی عربی تصنیفات کی عالم عربی میں بڑے پیمانہ پر اشاعت و مقبولیت کی وجہ سے ندوہ کو قدرتی طور پر عام مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کے فکر و نظر کی بلندی، تخیل و نصب العین کی جامعیت اور دماغ و دل کے توازن نے علمی و دینی حلقوں کو خاص طور پر اور وسیع پیمانہ پر متاثر کیا، اور کہا جا سکتا ہے کہ شاید آج عالم

اسلام میں ندوہ سے جتنے لوگ واقف ہیں اتنے خود اس ملک میں نہ ہوں گے۔(۱)

دارالعلوم سے نکلنے والے عربی رسائل ماہنامہ "البعث الاسلامی" اور پندرہ روزہ "الرائد" نے بھی جو عالم اسلامی میں بہت قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اس تعارف میں اور ندوۃ العلماء کی مناسب ودلآویز تصویر پیش کرنے میں پورا حصہ لیا، خود اس جشن تعلیمی میں آنے والے متعدد عرب مہمانوں نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا، جاپان کے مندوب عراقی فاضل ڈاکٹر سامرائی نے کھلے اجلاس میں اس کا اظہار کیا کہ "البعث الاسلامی" کا فکر اسلامی اور دعوتِ اسلامی کی ترجمانی اور خدمت میں خاص کردار وامتیاز ہے، اور اس کے مضامین انڈونیشیا، ترکی، فارسی، مالیزی مختلف زبانوں میں ترجمہ کئے جاتے رہے ہیں"۔(۲)

ان تمام باتوں کے پیش نظر محسوس کیا گیا کہ اب جو اجلاس ہو وہ کل ہند نہیں بین الاقوامی سطح پر منعقد ہو، خاص طور پر ممالک عربیہ کے علمی وتعلیمی حلقوں کو اس میں خاص طور پر اور بڑے پیانہ پر شرکت کی دعوت دی جائے تاکہ وہ اس ندوہ کو جس کے وہ نادیدہ مشتاق ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

بعض دشواریاں

۳۱/ اکتوبر تا ۳/ نومبر ۱۹۷۵ء اجلاس کی تاریخیں طے ہو گئیں لیکن اس میں ایک بڑی آزمائش یہ پیش آئی کہ اجلاس سے چند مہینہ پہلے اچانک ملک میں ایمرجنسی لگادی گئی جس سے یہ اندیشہ ہو گیا کہ شاید بیرونی مہمانوں کو آنے میں دشواری ہو، لیکن الحمدللہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

دوسری دشواری یہ پیش آرہی تھی کہ اترپردیش کے اس وقت کے وزیراعلیٰ

(۱) یہ واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے تقریباً پچیس سال پہلے کی ہے۔
(۲) روداد چمن ص ۱۸ تا ۱۹

ہیم وتی نندن بہوگنا حضرتؒ سے عقیدت رکھتے تھے، وہ بار بار سرکاری طور پر تعاون پیش کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ سرکاری بجٹ سے انھوں نے ایک خطیر رقم دارالعلوم کیلئے منظور کی، لیکن حضرتؒ نے معذرت فرمادی، ان سے بار بار معذرت کرنا بھی بعض غلط فہمیوں کا پیش خیمہ بن سکتا تھا، لیکن حضرتؒ نے بڑی حکمت وخوبی سے وزیر اعلیٰ کو مطمئن فرمادیا۔

تیسرا مرحلہ اجلاس کی صدارت کا تھا، اس کے لئے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کا نام طے ہو گیا اور انھوں نے دعوت قبول کرلی تھی لیکن حتمی طور پر ان کے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی اور اجلاس کی تاریخیں قریب تھیں۔ حضرتؒ کا اس وقت یہ معمول بن گیا تھا کہ روز آنہ ٹیلے والی مسجد پر (جہاں حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے مخلص مجاہدینؒ نے قیام کیا تھا) تشریف لے جاتے اور وہیں صلاۃ الحاجۃ پڑھ کر دُعا فرماتے، اجلاس سے ایک ہفتہ قبل جمعہ کے دن حضرتؒ نے حاجی عبدالرزاق صاحب سے فرمایا کہ ہم تیار ہو کر ٹیلے والی مسجد جائیں گے، رکشہ موجود رہے، جب جانے کے لئے حضرتؒ باہر تشریف لائے تو اسی وقت مولانا محمد رابع صاحب نے یہ اطلاع دی کہ شیخ الازہر کا تار آیا کہ وہ اگلی جمعرات کو فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں، حضرتؒ کو اطمینان ہوا، لیکن پھر بھی مسجد تشریف لے گئے اور صلاۃ الحاجۃ پڑھ کر دُعا فرمائی۔

۳۰ راکتوبر کو جمعرات کے دن مہمانوں کا پہلا قافلہ شیخ الازہر کی قیادت میں لکھنؤ پہنچا، حضرتؒ خود استقبال کے لئے ہوائی اڈہ تشریف لے گئے، ان مہمانوں کا لکھنؤ والوں نے ایسا عدیم المثال استقبال کیا کہ شاید لکھنؤ نے اس سے پہلے ایسا منظر نہ دیکھا ہوگا، پورا ایئرپورٹ نعرہ سے گونج اٹھا، جمعہ کی صبح تک اکثر مہمان آگئے۔

چار روزہ اجلاس کی مختصر رُوداد

جمعہ کے دن ہی صبح اجلاس کا آغاز ہوا، اس کا نقشہ روداد چمن کے ادیب

مصنف نے اس طرح کھینچا ہے:

"اس تحتی برا عظم کی تاریخ میں شاید پہلا موقع تھا جب علم وفضل اور جمال وکمال کی یہ کہکشاں یہاں دیکھی گئی، تمہا جامعات اسلامیہ کے نمائندے، ان کے سربراہ اور ذمہ دار آج جس طرح شانہ بشانہ اور قطار اندر قطار یہاں نظر آرہے تھے اور دل فریب منظر پیش کر رہے تھے وہ تاریخ کی ایسی امانت ہے جس کو کوئی مورخ اور وقائع نگار نظر انداز نہیں کر سکتا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ذاکس نہیں عالم اسلام کا حسین وجمیل گلدستہ ہے، جس میں اس کے وسیع قلم رو سے ہر رنگ و بو کے پھول اٹھا کر کے بہت خوبصورتی اور خوش ذوقی کے ساتھ سجا دیئے گئے ہیں۔"(۱)

ممالک عربیہ کے فاضل نمائندوں کی اتنی بڑی تعداد اس ملک میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، قاری وددو انجنی صاحب کی تلاوت سے جلسہ کا آغاز ہوا، پھر مولانا محمد ثانی حسنیؒ کا تیار کیا ہوا ترانہ ندوہ پڑھا گیا، اس کے بعد حضرتؒ کا پُر مغز خطبہ استقبالیہ عربی اور اُردو میں پڑھ کر سنایا گیا، پھر شیخ الازہر کا صدارتی خطاب ہوا، اسی میں جمعہ کا وقت ہو گیا اور ایک عظیم مجمع نے شیخ الازہر کی امامت میں نماز ادا کی۔

مغرب بعد کی دوسری نشست میں مولانا عبد السلام صاحب قدوائی نے ندوہ کی پچاسی سالہ رپورٹ پیش کی، اور بعض اہم عرب مہمانوں کے خطابات ہوئے، جن میں مصر کے وزیر اوقاف وامور مذہبی ازہر ڈاکٹر محمد حسین ذہبی اور ابوظبی کے رئیس القضاۃ شیخ احمد عبد العزیز بھی تھے۔

دوسرے دن جلسوں میں پہلے اہم لوگوں کے پیغامات سنائے گئے، جن میں سعودی عرب کے شاہ خالد کا پیغام بھی تھا۔ پھر حضرتؒ نے "اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت" کے عنوان سے خطبہ استقبالیہ پیش فرمایا، پھر شیخ الازہر نے اپنا مقالہ پڑھا، اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر علی محمد خسرو نے تقریر

---

(۱) روداد چمن ص ۷۹-۸۰

کی، اور بعض دوسرے ملکوں کے نمائندوں کی تقریریں ہوئیں، اس کے بعد مقالات کی نشستیں ہوئیں۔

۱۷ر نومبر کو شام کی نشست میں متعدد فاضل عرب مہمانوں کے علاوہ حضرتؒ نے ندوۃ العلماء کے موقف اور حکومت وسربراہان مملکت کے ساتھ اس کے رویہ ومسلک کی وضاحت ضروری سمجھتے ہوئے ایک بروقت موثر اور ولولہ انگیز تقریر کی، اس کی وجہ سے وہ شکوک وشبہات جو ذہنوں میں پیدا ہوسکتے تھے نہ صرف ختم ہوگئے بلکہ ان کی جگہ ایک خوشگوار اور دیرپا نقش قائم ہوگیا، اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"مدتوں سے یہ آرزو تھی کہ خدا ایک ایسا موقع لائے کہ عرب فضلاء اسلام کے داعی اور ہمارے محسن ہمارے گھر آئیں، ہم اپنے سینے کے داغ ان کو دکھائیں اور بتائیں کہ ہندی مسلمانوں نے ایمان واسلام کی اس دولت کو (جو ان سے حاصل ہوئی تھی) کس طرح سینہ سے لگائے رکھا ہے، جو سبق انھوں نے ہم کو پڑھایا تھا وہ ہمیں اب بھی یاد ہے، ہمارا آموختہ سن لیجئے، حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہم ان کے سامنے دست سوال دراز کریں گے، ہم نے ان کو خود ان کے ملکوں میں جاکر ہمیشہ ان کا (داعیانہ وقائدانہ) مقام یاد دلایا، اور میں صفائی سے کہتا ہوں کہ میں نے اس بارے میں ان کو بڑا عالی ظرف پایا، ہم نے ان کو یہاں اس لئے بلایا کہ ان کو اپنے اسلاف کرام کی تجدیدی وتربیتی کوششوں کے نتائج دکھائیں اور اس سے ان کو بھی کچھ فائدہ پہنچے، نہ کہ یہ کہ ان کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کریں، میں نے سب سے دولت مند اور سب سے زیادہ قابل احترام عرب ملک کے ایک عالی مرتبت سفیر کے سامنے ان کی آمد کے موقع پر اقبال کے یہ شعر پڑھے تھے، اور آج بھی ہمارا اسی اصول پر ایمان ہے۔"

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں	غلام طغرل وسنجر نہیں میں
جہاں بینی میری فطرت ہے لیکن	کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

حضرات! یہ سونے کی سب چڑیاں اڑ جائیں گی، ہم اور آپ یہاں رہیں گے، آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو چھٹی مل گئی، ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں، ہمارے مدرسے آپ ہی کے چار چار آنھ آٹھ آنے پر چل رہے ہیں، آپ کے چار آنے اور آٹھ آنے ہم کو زیادہ عزیز ہیں، اس لئے کہ آپ ایثار کرکے دیتے ہیں، آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ ہم نے ان لوگوں کو اسلئے بلایا ہے کہ ہم اپنا دامن بھر لیں۔"(۱)

۳ر نومبر کو شیخ ابو ظبی کے رئیس القضاۃ شیخ احمد عبد العزیز آل مبارک کے ہاتھوں کتب خانہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور انھوں نے بہت موثر اور رقت آمیز دعا کرائی، یہی دن اجلاس کے اختتام کا تھا۔ متعدد عرب فضلاء نے تقریریں کیں جن میں شیخ عبد اللہ زائد اور محدث شام شیخ عبد الفتاح ابو غدہ بھی تھے۔ آخر میں حضرت نے وہ تاریخی تقریر فرمائی جس کی صدائے بازگشت پورے ملک میں سنی گئی، یہ تقریر اپنی اثر انگیزی حق شناسی اور جرأت ایمانی کی ایک نمونہ تھی جس سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔(۲)

اس تقریر کے بعد تجاویز پیش کی گئیں، صدر اجلاس نے ان کی پوری تائید کی، پھر برکۃ العصر ریحانۃ الشام شیخ حسن حبنکہ المیدانی کی پُر اثر دعا پر یہ جلسہ ختم ہوا۔

شام کو آخری نشست مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ (جن کو بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے نسبت فرزندی بھی حاصل ہے) کی صدارت میں منعقد ہوئی، بعض عرب مہمانوں کی بھی اس میں تقریریں ہوئی اور بعض مقالات بھی پڑھے گئے۔ اخیر میں صدر اجلاس کی مختصر تقریر اور دعا پر یہ چار روزہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

اس پچاسی سالہ جشن تعلیمی کی صدائے بازگشت پورے عالم اسلام میں سنی گئی،

---

(۱) کاروان زندگی ج دوم ص ۱۹۲-۱۹۳

(۲) یہ تقریر روداد چمن ص ۲۳۹-۲۴۷ پر ملاحظہ ہو۔

مختلف رسالوں اور اخبارات میں اس پر خراج تحسین پیش کیا گیا اور یہ اجلاس دار العلوم کی تاریخ میں ایک ایسا نقطۂ آغاز ثابت ہوا کہ جس کے نتیجہ میں عالمی سطح پر اور وسیع پیمانہ پر دار العلوم اور اس کی تحریک ندوۃ العلماء کا تعارف ہوا اور ملکی سطح پر بھی ان حلقوں سے جو اب تک اس کی صدا سے متوحش اور اس کے پیغام سے نا آشنا تھے غلط فہمیاں دور ہوئیں اور عوامی سطح پر اس کا اچھا تعارف ہوا۔

امام حرم شیخ عبدالعزیز کی آمد

پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے جو بڑے دوررس، عمیق اور وسیع اثرات مرتب ہوئے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالم اسلام کی اہم شخصیات کو دار العلوم سے مزید دلچسپی پیدا ہو گئی اور حضرت کی شخصیت سے تأثر کے نتیجہ میں دار العلوم سے تعلق کی جو بنیاد پڑی تھی اس میں استحکام پیدا ہوا، اجلاس کے ڈیڑھ ہی سال بعد امام حرم مکی اور خطیب عرفات شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ اپنے رفقاء کے ساتھ از خود اپنی خواہش پر ۲۰ر فروری ۱۹۷۷ء کو دار العلوم تشریف لائے، لکھنؤ میں ان کا عدیم المثال استقبال کیا گیا، وہ جمعہ کا مبارک دن تھا، اسی دن گیارہ بجے امام موصوف کے استقبال میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا، دار العلوم کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا گیا، اس کے بعد امام صاحب نے خطاب فرمایا، اس میں انھوں نے بڑی محبت و عظمت کے ساتھ حضرت کا تذکرہ کیا، اس میں ان کے قدیم تعلق کا بھی بڑا دخل تھا کہ ان کے والد محترم شیخ عبداللہ بن حسن آل الشیخ حضرت کے بڑے قدر داں اور حضرت کی دینی، دعوتی خدمات کے بڑے معترف تھے۔ امام صاحب نے تقریر ہی میں فرمایا کہ "اسلامیان ہند کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ندوۃ العلماء ایک منارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے ہر شخص کو فیضان حاصل کرنا چاہئے۔"(۱)

امام صاحب کی تقریر کے بعد ان کے رفیق شیخ سعید ابو الجعد ول (نائب وزیر

(۱) ماہنامہ تعمیر حیات جلد ۱۵ شمارہ مشترکہ ۷-۸-۹

تعلیم مملکت سعودیہ) نے تقریر کی اور اپنا تاثر ظاہر کیا۔ اخیر میں حضرتؒ کی نہایت موثر بڑی ولولہ انگیز اور پُر زور تقریر ہوئی، اس میں حضرتؒ نے فرمایا کہ

"آج یہ نظر کے سامنے انسانی جسموں کا جو سیلاب امنڈ رہا ہے بیتاب جذبات، عقیدت و محبت کے اشکوں اور بیدار دل و ضمیر کی سوغات لے کر آیا ہوا تاحد نظر فرزندان اسلام کا یہ عظیم اجتماع اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مہمانان کرام جس پیغام کے امین اور جس دعوت و تبلیغ کے باعث، لائق صد احترام ہیں ہم مسلمانان ہند کا حق اس اسلام پر کسی اسلامی ملک سے کم نہیں" (۱)۔ مزید فرمایا کہ "محمد بن قاسم کی اس سرزمین پر آمد سے لیکر آج تک ہم نے اس ملک کو سنوارنے میں اپنی پوری توانائی اور بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں، ایسی صورت میں فطرت کا تقاضا ہے کہ ہم اس ملک کو تاراج ہوتے، اسکا نقشہ بگڑتے، اس کا کوئی نقصان ہوتے گوارہ نہیں کر سکتے" (۲)۔ لاکھوں فرزندان توحید نے امام محترم کی اقتداء میں جمعہ کی نماز ادا کی، دارالعلوم کا وسیع میدان اس کے سبزہ زار نمازیوں کے لئے تنگ ہوگئے، چہار دیواری سے باہر دور دور تک لوگوں کی صفیں تھیں۔

شام کو اہالیان شہر کی جانب سے بڑے پیمانے پر ایک استقبالیہ دیا گیا، اس میں بھی امام موصوف نے خطاب کیا اور حضرتؒ نے بڑی پر جوش اور موثر تقریر فرمائی۔ ایک روز ٹھہر کر یہ کارواں واپس ہوا، لیکن اپنے پیچھے گہرے نقوش چھوڑ گیا، آج بھی اس منظر کو دیکھنے والے اس کی اثر پذیری کو نہیں بھولتے اور دل میں اس کی کسک محسوس کرتے ہیں۔

"ادب اسلامی" پر عالمی سیمینار

حضرتؒ نے مختلف میدانوں سے اصلاح و تجدید کا فریضہ انجام دیا ان میں ایک بڑا میدان ادب کا ہے، حضرتؒ کو شروع سے اس کا احساس تھا کہ ادب اپنے اندر عظیم

(۱) ایضاً

(۲) ماخوذ از تعمیر حیات جلد ۱۵ شمارہ مشترک ۷-۸-۹

تعمیری و تخریبی طاقت رکھتا ہے، ہر دور میں اس کی ناقابل انکار اور روشن شہادتیں ملتی ہیں لیکن حضرتؒ کو ادھر یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ اس دور میں ادب کی جدید طاقتور وسائل کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے جہانگیری اور فرمانروائی بہت بڑھ گئی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"جس طرح کبھی فلسفہ کے راستے سے الحاد اور تشکیک کا سیلاب مسلمانوں کے علمی و فکری طبقہ میں آتا تھا اس کے بعد سائنس (خاص طور پر علوم طبعیہ) کے راستے سے تعلیم یافتہ طبقہ میں آنے لگا۔ اور کہیں کہیں نفسیات (سائیکالوجی) اجتماعیات (سوشیالوجی) اور اقتصادیات و سیاسیات کے راستے آتا تھا اب بہت سی جامعات اور دانش گاہوں میں ادب کے ذریعہ سے آرہا ہے۔ اور سب سے زیادہ یلا دعربیہ اس کا شکار ہو رہے ہیں۔" (۱)

یہ بات فکر و دعوت اسلامی کے حاملین کے لئے باعث تشویش تھی خاص طور پر حضرتؒ نے سب سے پہلے اس کا خطرہ محسوس کیا اور یہ ضرورت محسوس کی کہ ادب عربی کے ایسے اساتذہ، اہل قلم اور دانشوروں کو جمع کیا جائے جو عربی ادب وانشاء اور تنقید و تاریخ ادب کو صحیح رخ پر لگانے کی کوشش کریں اور جدید نسل کو صالح غذا پہنچانے کے لئے ایک نیا ذخیرہ کتب اور نیا درسِ فکر (مکتب خیال) پیدا کر سکیں، اس کے لئے ادبیات اسلامی کے موضوع پر کسی ایسے عالمی سیمینار کی ضرورت تھی جس میں علمی مقالات اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ آئندہ کے لئے کام کا منصوبہ اور نقشہ بنایا جا سکے، دار العلوم حضرتؒ کی فکر و توجہ کا مرکز تھا، وہاں آزادانہ طور پر اپنی فکر و خیال کے مطابق ایسا سیمینار منعقد کرنا دوسرے مقامات کی بہ نسبت آسان بھی تھا اور مفید بھی، اس لئے یہ طے کر لیا گیا کہ دار العلوم ہی میں سیمینار منعقد ہو اور اس کے لئے ۱۷-۱۸-۱۹ اپریل ۱۹۸۱ء کی تاریخیں طے کر دی گئیں، حضرتؒ ہی کی طرف سے دعوت نامے جاری ہوئے، حضرتؒ کی پرکشش شخصیت کا اثر

---

(۱) کاروانِ زندگی دوم۔ ص ۳۲۸

تھا کہ سیمینار میں بڑی تعداد میں اہم عرب ادباء شرکت کے لئے تشریف لائے، جن میں شیخ عبدالعزیز رفاعی (سابق سکریٹری مجلس وزراء مملکت سعودیہ) ادیب کبیر ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت الباشا حکومت قطر کے دینی امور کے ناظم شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری کے علاوہ چھ مؤقر عرب یونیورسٹیوں کے عربی شعبوں کے سربراہ اور مصر کے وزیر اوقاف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۷/اپریل کو افتتاحی اجلاس ہوا، حضرتؒ نے بحیثیت صدر استقبالیہ مقالہ تحریر فرمایا تھا، لیکن فاضل عرب مہمانوں کے اصرار پر حضرتؒ ہی کو صدر اجلاس منتخب کیا گیا اور وہ مقالہ حضرتؒ نے خطبۂ صدارت کے طور پر پیش کیا۔

یہ مذاکرۂ ادبی بڑا مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوا، اسی کے نتیجہ میں ایک مجلس کی تشکیل ہوئی جو سیمینار کی مجوزہ قراردادوں کے مطابق کام کرے۔ دارالعلوم اس کا مرکز قرار پایا اور مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ ہی اس کے ذمہ دار قرار دیئے گئے۔ پھر اسی مجلس مذاکرہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۸۴ء میں عرب ادباء نے "رابطہ ادب اسلامی" کے نام سے ایک عالمی تنظیم قائم کی اور حضرتؒ کو اس کا سربراہ منتخب کیا، مختلف ملکوں میں اس کے جلسے ہوئے جن کے بڑے مفید اور قیمتی نتائج سامنے آئے اور ان ادباء کی ایک بڑی تعداد الحاد و دہریت سے محفوظ ہو گئی جو پوری نسل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

دارالعلوم میں "رابطۂ ادب اسلامی" کے اجلاس

مئی ۱۹۸۴ء میں "رابطۂ ادب اسلامی" کی باقاعدہ تشکیل ہوئی اور اسی میں یہ بھی طے ہوا کہ اسی سال اخیر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اس کا عالمی سیمینار منعقد کیا جائے۔ یہ سیمینار اس سال تو نہ ہو سکا البتہ ڈیڑھ سال کے بعد ۷-۹/ جنوری ۱۹۸۶ء کو یہ سیمینار دارالعلوم میں منعقد ہوا، یہ باقاعدہ "رابطہ ادب اسلامی" کا پہلا سیمینار تھا جس میں متعدد اہم عرب ادباء و فضلاء شریک ہوئے۔ اس میں حضرتؒ نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشا کو نائب صدر منتخب فرمایا اور بھی دوسرے عہدیداران کا

انتخاب ہوا، اور اس طرح رابطہ نے باقاعدہ اپنا سفر شروع کیا، دُنیا کے مختلف خطوں سے مسلمان ادباء کو اس کا رکن منتخب کیا گیا ۱۹۸۶ء کے اختتام پر اس کا دوسرا اجلاس دارالعلوم میں منعقد ہوا جس میں متعدد عرب فضلاء شریک ہوئے جن میں مشہور اسلامی شاعر عمر بہاء الامیری اور شیخ عبداللہ بن ابراہیم انصاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، شیخ عمر بہاء امیری جب جب تقریر میں حضرت کا نام لیتے تو بڑے ادب و احترام کے ساتھ اور امام، حکیم الاسلام جیسے القاب کے ساتھ۔ پھر سال بسال اس کے سیمناروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اس سلسلہ کا تیسرا اجلاس ۱۹۸۷ء کو نومبر کے پہلے ہفتہ میں ہوا، یہ اجلاس ملکی پیمانے پر ہندوستانی مرکز و دفتر کی دعوت و اہتمام میں ہوا، سیمینار کا موضوع "اُردو ادب پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا اثر" منتخب کیا گیا تھا، اس اجلاس میں مختلف یونیورسٹیوں اور مدارس کے فضلاء عربی، فارسی اور اسلامیات کے شعبوں کے سربراہ اور تحقیقی و علمی کام کرنے والے شریک ہوئے جن میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب (ناظم دارالمصنفین) خواجہ احمد صاحب فاروقی (سابق صدر شعبۂ اُردو ادب دہلی یونیورسٹی) اور پروفیسر مشیر الحق (وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے نام کی برکت و نسبت اور حضرت کی سرپرستی تھی کہ موضوع کے خالص علمی و ادبی ہونے کے باوجود پورے سیمینار پر رُوحانیت و نورانیت کا ایک شامیانہ تنا رہا۔

۱۸ر نومبر ۱۹۹۲ء کو "رابطۂ ادب اسلامی" کا دارالعلوم میں چوتھا اجلاس "خطوط و مراسلات" کے ادب کے عنوان پر منعقد ہوا جس میں بعض عرب ادباء بھی شریک ہوئے اور انھوں نے مقالات پڑھے، سیمینار کا افتتاح آیات قرآنیہ کی تلاوت اور علامہ اقبالؒ کی ایک نظم کے بعد حضرتؒ کے اس بلیغ اور حقیقت خیز مقولہ سے کیا گیا کہ "تحریروں کی جان خلوص، بے ساختگی، اللہ کے یہاں

مقبولیت کا خیال اور ضمیر کے صحیح تاثر کی پیشکش ہوتی ہے اور ان کی تحریروں کو "خطوط"، "خواطر" اور "مراسلات" میں تلاش کرنا چاہیے جو ان خوبیوں کے حامل ہیں لیکن نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔"(۱)

سیمینار کا اختتام حضرتؒ کی مؤثر تقریر سے ہوا جس میں حضرتؒ نے ملت کو درپیش چیلنجوں کا ذکر فرمایا اور اس کا جواب دینے، مقابلہ کرنے اور اس کے لیے ہمہ وقت تیار اور بیدار رہنے کی ہدایت فرمائی۔

امام حرم اور "رابطۂ عالم اسلامی" کے جنرل سکریٹری کی آمد

"رابطہ ادب اسلامی" کے ان جلسوں کا دارالعلوم کو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف طبقوں کے لوگوں کو قریب سے دارالعلوم کو دیکھنے اور وہاں قیام کرنے کا موقع ملا، اور ان کے دلوں میں دارالعلوم کی وقعت پیدا ہوئی، ان جلسوں کے علاوہ بھی عالم اسلام کی اہم دینی و علمی شخصیات کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تاکہ وہ براہ راست دارالعلوم کو دیکھ سکیں اور اب تک دارالعلوم کی دینی و علمی خدمات کا انھوں نے جو تذکرہ سنا ہے اس کا مشاہدہ کرسکیں۔ اسی سلسلہ کی ایک دعوت پر امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل اور "رابطۂ عالم اسلامی" کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف یکم نومبر ۱۹۸۵ء کو دارالعلوم تشریف لائے، ان کے ساتھیوں اور رفقاء کے علاوہ سعودی سفیر بھی تھے، ایرپورٹ پر ان کا شایان شان استقبال کیا گیا، حسن اتفاق کہ وہ جمعہ کا دن تھا، اسی دن دارالعلوم کے وسیع میدان میں ان کے استقبال میں عظیم الشان جلسہ ہوا، اس کے بعد ہی امام حرم کی اقتداء میں لاکھوں فرزندانِ اسلام نے نماز جمعہ ادا کی۔

دارالعلوم پر پولیس کا چھاپہ اور اس پر ردِ عمل

۱۹۸۳ء سے یہ معمول بن گیا تھا کہ دارالعلوم کے آخری درجات کے طلبہ

(۱) کاروان زندگی جلد ۳ ص ۷۰

حضرتؒ کے وطن میں حضرت کی قیام گاہ پر حاضر ہو کر ہفتہ دس دن قیام کرتے جس میں باقاعدہ حضرت اپنی اہم تصنیفات کے مفید تر حصوں کا درس دیتے اور طلبہ مستفید ہوتے(۱)۔ نومبر ۱۹۹۴ء کے آخر عشرہ میں فضیلت دوم کے طلبہ حضرت کی خدمت میں رائے بریلی ہی میں مقیم تھے کہ اچانک ۲۲؍ نومبر کو علی الصباح یہ خبر ملی کہ شب میں دارالعلوم میں پولیس نے چھاپہ مارا اور فائرنگ بھی کی جس میں تین طالب علم زخمی بھی ہوئے ہیں اور بعض طلباء کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ یہ خبر حضرتؒ کے لئے بڑی متاثر کن تھی، حضرتؒ فوراً ہی لکھنؤ تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر تفصیلات معلوم کیں اور اس سلسلہ میں آئینی و جمہوری طور پر جو کچھ کرنا چاہئے اس پر غور و مشورہ کیا گیا اور دو طرح کے اقدامات کئے گئے: ایک تو پریس کانفرنس بلائی گئی جس میں غیر مسلم آئین پسندوں، صاحب ضمیر شہریوں اور سیاسی کارکنوں کو دعوت دی گئی، اسی دن دارالعلوم کے احاطہ میں یہ پریس کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سب نے اس واقعہ پر غم و غصہ کا اظہار کیا، اس میں حضرتؒ نے مدارس کی اہمیت اور ملک کے لئے ان کی افادیت پر تقریر فرمائی اور صاف کہا کہ "ندوۃ العلماء صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا ایک بڑا دینی ادارہ ہے، اس کی خدمات دینی اور پیغام انسانی سے ہمارا یہ ملک اور ساری دنیا واقف نہیں ہے، اس ادارہ کی جو توہین کی گئی ہے وہ پوری ملت کی توہین ہے اور مسلمانوں کے تمام دینی اداروں کیلئے خطرہ کی گھنٹی ہے۔ حیرت و افسوس کی بات ہے کہ مرکزی اور ریاستی پولیس نے بے بنیاد اطلاعات کی بنا پر اتنا بڑا اقدام کیا اور اب ہر ذمہ دار کہہ رہا ہے کہ سب کچھ اس کے علم کے بغیر ہوا، ریاستی حکومت کے ذمہ داروں نے مجھے بتایا کہ یہ تمام کارروائی ان کی اطلاع کے بغیر کی گئی ہے۔ وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو نے اس مسئلہ میں ضرور ذاتی دلچسپی لی اور ان کی ہدایات پر مثبت انداز میں عملدر آمد شروع ہوا تمام

---

(۱) اس کا اہتمام ایک دینی و علمی اور اشاعتی ادارہ "ادارہ وحدت" کی طرف سے ہوتا ہے جو مولانا محمد معتمد عتیق کی صدارت میں عرصے سے خدمت انجام دے رہا ہے۔

گرفتار طلباء رہا کردیے گئے پولیس ان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں کرسکی"(۱)۔ دوسرا اقدام یہ کیا گیا کہ ۵؍جنوری ۱۹۹۵ء کو دارالعلوم ہی میں تحفظ مدارس کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پورے ملک سے اہم مدارس کے نمائندے شریک ہوئے، جلسہ میں احتجاجی ومشاورتی تجاویز پاس ہوئیں۔ حضرت کی فکر وتوجہ اور دارالعلوم کے مہتمم مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کی حکمت عملی اور فہم وبصیرت سے مسئلہ کو خوش اسلوبی کے ساتھ حل کرلیا گیا۔ اس سلسلہ میں ملائم سنگھ یادو نے تعاون کیا اور خاص طور پر اس وقت کے اقلیتی کمیشن کے چیئرمین احمد حسن صاحب نے بڑی کوششیں کیں۔ اس واقعہ کا پورے عالم اسلام میں شدید ردّ عمل ہوا، بعض ملکوں کے سربراہوں نے بھی اس سلسلہ میں نوٹس لیا اور ہندوستانی سفارت خانہ کو توجہ دلائی "رابطہ عالم اسلامی" نے عالمی ادارہ یونسکو کو ایک یادداشت بھیجی اور اس کو اس مسئلہ کی طرف توجہ دلائی۔ اس طرح یہ واقعہ "عسى ان تكرهوا شيئاً وهو خير لكم" (شاید تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور تمہارے لئے بہتر ثابت ہو) کا مصداق بن گیا، دارالعلوم کی شہرت وعزت میں اور اضافہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے غیب سے مدد فرمائی۔

"ردّ قادیانیت" پر ایک عالمی تاریخی اجلاس

ادھر کچھ عرصہ سے قادیانیت کا فتنہ مختلف ملکوں میں سر اٹھا رہا تھا، ذرائع ابلاغ کی بعض رپورٹوں میں اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جانے لگا تھا، بعض پسماندہ علاقوں میں قادیانی رضاکار عیسائی مشنریوں کی طرح سرگرم عمل ہوگئے تھے، اس کے نتیجہ میں یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ بعض سادہ لوح مسلمان جو دین کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں رکھتے، اس خطرہ کا شکار ہوجائیں۔ حضرت کو جب اخبارات اور خطوط کے ذریعہ سے اس کی اطلاعات ملیں تو طبیعت بے چین ہوگئی۔ حضرتؒ عرصہ پہلے

(۱) کاروان زندگی ششم۔ ص ۷-۴۰۶-۴۰۸

ردّ قادیانیت پر ایک مبسوط اور مدلل کتاب تحریر فرما چکے تھے، لیکن حضرتؒ نے یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ اس سلسلہ میں عالمی سطح پر ایک اجلاس منعقد ہو جس میں ان خطرات کو پیش کیا جائے۔ ہندوستان ہی کی سرزمین سے یہ فتنہ اٹھا تھا، اس لئے مناسب تھا کہ اس کی سرکوبی بھی یہیں سے ہو۔ کہ "قصہ زمین برسر زمین"، عالم اسلام کے نمائندے یہاں آکر اس کی حقیقت سے خود بھی واقف ہوں اور پھر اپنے ملکوں میں جاکر جہاں اس طرح کے خطرات سامنے آئیں ان کا پوری طرح مقابلہ کر سکیں، خاص طور سے ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں سے اہم لوگ شریک ہوں اور بالاتفاق کوئی ایسی حکمت عملی طے ہو جائے کہ اس کے مطابق لوگ پوری بیداری اور فکر کے ساتھ اپنے اپنے مقامات پر اس کا سد باب کر سکیں اور اصولی طور پر لوگوں کے اندر دینی تعلیم کے عام کرنے اور بنیادی عقائد کی تعلیم دینے کا جذبہ پیدا ہو۔ حضرتؒ پر یہ خیال ایسا غالب ہوا اور ایک ایسی اضطراری کیفیت پیدا ہوئی کہ حضرتؒ نے جلد ہی دارالعلوم (جو ایک بین الاقوامی تعلیم و دعوت کا مرکز ہے اور اس کے بانی حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اس فتنہ کے بارے میں سب سے زیادہ حساس اور فکر مند لوگوں میں تھے) اجلاس کرنے کا ارادہ فرمالیا اور بڑے پیمانہ پر لوگوں کو اس کی دعوت دی گئی۔

۱۲-۱۳ر نومبر ۱۹۹۷ء کو یہ عظیم اجلاس دارالعلوم کے وسیع میدان میں منعقد ہوا، جو اپنی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے شاید پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں سب سے بڑا سیمنار تھا جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اہتمام میں کیا گیا، چونکہ دعوت نامے خود حضرتؒ ہی کی طرف جاری ہوئے تھے اس لئے تمام اہم لوگ اپنی سعادت سمجھ کر شریک اجلاس ہوئے۔ حکومت سعودیہ کے ایک خصوصی طیارے سے اہم علماء و ذمہ داران تشریف لائے جن میں شئون حرمین کے صدر امام حرم علامہ محمد بن عبداللہ السبیل، مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر صالح عبداللہ العبود، رابطہ عالم اسلامی کے معاون جنرل سکریٹری شیخ ناصر العبودی،

بارہواں باب

۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک اہم حوادث وواقعات،

اسفار وتقاریر

ملک میں ایمرجنسی اور ظلم وزیادتی

۱۹۷۱ء کے جنرل الیکشن میں رائے بریلی کی سیٹ سے مسز اندرا گاندھی کے مقابلہ میں مسٹر راج نرائن کھڑے ہوئے، کانگریس کی سابقہ پالیسیوں اور غلط طریقہ کار کی وجہ سے مسز گاندھی کو اپنی جیت خطرہ میں نظر آرہی تھی، اسلئے انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو حکمراں جماعت کرتی ہے، اس کے نتیجہ میں وہ جیت گئیں، لیکن مسٹر راج نرائن نے الہ آباد کی عدالت عالیہ میں مسز گاندھی کے الیکشن کو چیلنج کردیا، چار سال تک اس کا مقدمہ چلتا رہا۔ فاضل جج جسٹس جگ موہن لال سنہا نے ۱۲؍جون ۱۹۷۵ء کو اچانک عدالت میں آکر یہ فیصلہ کردیا کہ مسز گاندھی اپنی سیٹ سے محروم کی جاتی ہیں اور چھ سال تک ان کو انتخاب میں حصہ لینے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اندرا گاندھی نے سپریم کورٹ میں اپیل کردی لیکن اس دوران مخالف جماعتوں کے مظاہروں اور احتجاج کا زور اتنا بڑھا کہ انھوں نے اپنی کرسی محفوظ رکھنے کی خاطر ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی، لوگ گرفتار کیے جانے لگے۔

اندرا گاندھی کے چھوٹے بیٹے سنجے گاندھی نے زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لی، وہ اپنی جوانی کے نشہ میں سرشار تھے، ان کے یہاں کسی کی کوئی داد یا فریاد نہیں تھی۔ ان کی

دلچسپی کے دو میدان تھے، ایک خاندانی منصوبہ بندی، دوسرے شہروں کی صفائی، آراستگی۔ پوری طرح وہ اس میں منہمک ہوگئے، ہزاروں مکانات منہدم کر دیے گئے، سینکڑوں افراد مارے گئے، جبریہ نس بندی کا کام زور شور سے شروع کر دیا گیا، اور خاص طور سے مسلمان ہی اس کا نشانہ بنے۔

حضرتؒ کی طبیعت قدرتی طور پر اس سے بڑی متاثر تھی۔ ۲۷؍ دسمبر ۱۹۷۵ء کو حضرتؒ، مولانا عبد الغفار صاحب ندوی (قیم جماعت اسلامی لکھنؤ) سے ملنے گئے جو ڈسٹرکٹ جیل میں تھے، وہاں لوگوں نے حضرتؒ سے درخواست کی کہ وہ وزیر اعظم سے ملکر ان کو متوجہ کریں۔ حضرت کو خود بھی اسکی فکر تھی کہ ملک جس تیزی سے تباہی کی طرف جارہا ہے اگر اس کا سد باب نہ کیا گیا تو نتائج بڑے خطرناک ہو سکتے ہیں۔

وزیر اعظم سے حضرت کی ملاقات اور آگاہی، اور صدر جمہوریہ سے ملاقات

حضرت نے ملاقات کا ارادہ فرمایا اور کئی مرتبہ خطوط بھیج کر وقت چاہا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ۲۳؍ اگست ۱۹۷۶ء کو اچانک رائے بریلی میں کلکٹر صاحب کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ وزیر اعظم صاحب نے کل آپ کو راشٹرپتی بھون میں لنچ پر مدعو کیا ہے۔ حضرت نے اس کو غنیمت جانا، سخت بارشیں ہو رہی تھیں۔ حضرت نے اپنے دو رفقاء مولانا محمد رابع صاحب اور حاجی عبد الرزاق صاحب کو ہمراہ لیا، وزیر اعظم کے نام ایک مفصل تحریر حضرت نے پہلے سے تیار کر رکھی تھی، وہ ترجمہ کرا کے ساتھ لے لی۔ حالات ایسے تھے کہ حضرتؒ اور رفقاء کو یہ بھی شبہ تھا کہ شاید وطن واپسی کے بجائے حراست میں لے لیا جائے۔

فرسٹ کلاس کا اس کا کمپارٹمنٹ ریزرو تھا لیکن حضرتؒ کا اس زمانہ میں تھرڈ کلاس میں سفر کرنے کا معمول تھا، حضرت نے فرمایا کہ فرسٹ کلاس سے سفر کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ سرکاری عملہ نے تھرڈ کلاس کا انتظام کیا اور حضرتؒ دہلی

تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ صدر موریتانیا مختار ولد داداصاحب کے اعزاز میں وزیر اعظم کی طرف سے لنچ ہے اسی میں شرکت کی دعوت ہے۔ حضرت نے فراش خانہ میں قیام فرمایا اور ٹھیک لنچ کے وقت مولانا محمد رابع صاحب کو ساتھ لیکر راشٹرپتی بھون تشریف لے گئے۔ اندراگاندھی جب آئیں تو حضرت نے ان سے فرمایا کہ "میں نے کئی مرتبہ آپ سے وقت لینا چاہا، لیکن آپ کا کوئی جواب نہیں آیا۔" اس پر انھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ حضرت نے فرمایا "اب سہی، آپ مجھے وقت دیدیں، چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔" انھوں نے دوسرے دن تین بجے کا وقت دے دیا۔

لنچ میں حضرتؒ کو صدر موریتانیا کے ساتھ ہی بٹھایا گیا۔ وہ صرف عربی یا فرنچ سے واقف تھے۔ حضرت سے عربی میں گفتگو کرتے رہے، اور بہت مانوس ہوئے۔ اپنے ملک میں آنے کی دعوت بھی دی۔

دوسرے دن حضرتؒ ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ پہلے خط دیا اور فرمایا کہ "آپ اسی وقت اس کو پڑھ لیں۔" اس کے بعد زبانی گفتگو کا آغاز فرمایا۔ اس میں یہ تاریخی جملہ بھی فرمایا کہ "آزادی کی کسی تحریک، جدوجہد اور اس کے قائدین کی ناکامی کے لئے اس سے بڑی بات نہیں کہ لوگ غلامی کے زمانہ کو یاد کرنے لگیں، ہم سب کے لئے بڑے شرم کی بات ہے کہ لوگ برملا انگریزوں کے زمانہ کو یاد کرنے لگے ہیں۔" ایمرجنسی کے نتیجہ میں جو ملک پر خوف وہراس کی فضا طاری تھی، حضرتؒ نے اس کا ذکر کیا۔ اور فرمایا کہ "پہلے حالات نارمل کئے جائیں، اس کے بعد آبادی کے مسئلہ پر غور وخوض ہو۔"

اس ملاقات کے بعد حضرتؒ نظام الدین تشریف لے گئے۔ دوسرے دن سہارنپور گئے اور حضرت شیخ الحدیث سے اس کا تذکرہ کیا تو شیخ بہت مسرور ہوئے۔ اگلے دن لکھنؤ واپسی ہوئی۔ یہاں آکر خبر ملی کہ دارالعلوم کے شیخ التفسیر اور حضرتؒ کے رفیق تدریس مولانا اویس صاحبؒ کی وفات ہوگئی، حضرتؒ ہی نے نماز جنازہ

پڑھائی اور دوسرے روز رائے بریلی واپسی ہوئی۔

۱۸ر جنوری ۱۹۷۷ء کو ایمرجنسی کا خاتمہ ہوا، جنرل الیکشن کا اعلان ہوا، اور امید کے مطابق کانگریس کو شکست ہوئی اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی دونوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی اور لوگوں نے اطمینان کی سانس لی۔

حضرتؒ کی قیام گاہ رائے بریلی میں اندرا گاندھی کی آمد

اس شکست کے کچھ عرصہ کے بعد اندرا گاندھی نے اپنے حلقہ انتخاب کا دورہ کیا اور حضرتؒ کی زیارت و ملاقات کے لئے تکیہ بھی حاضری دی۔ اتفاق سے اس وقت مولانا ابواللیث صاحب ندویؒ (امیر جماعت اسلامی ہند) اور مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندویؒ اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبؒ بھی تشریف فرما تھے، حضرت نے اندرا جی سے ان حضرات کا تعارف کرایا۔ محسنہ قدوائی کے ساتھ مسز گاندھی گھر کی مستورات سے ملنے کے لئے گھر گئیں۔ حضرت کی ہمشیرہ صاحبہ نے ملنا گوارہ نہ کیا، اور بالاخانہ پر چلی گئیں۔ حضرتؒ کی اہلیہ صاحبہ کی انھوں نے زیارت کی اور واپس ہوئیں۔

جنتا حکومت صرف دو ہی سال چل سکی، پھر آپسی انتشار کی وجہ سے وسط مدتی انتخابات کی نوبت آئی اور کانگریس برسر اقتدار آگئی۔

چندر شیکھر اور اٹل بہاری باجپئی کی دارالعلوم آمد اور حضرتؒ سے ملاقات

اسی زمانہ میں حضرت دارالعلوم ہی میں مقیم تھے کہ اچانک چارٹر پلین سے جنتا پارٹی کے اہم ترین ذمہ داران حضرتؒ سے ملنے کے لئے دارالعلوم آئے، ان میں سابق وزیر اعظم مسٹر چندر شیکھر، موجودہ وزیر اعظم مسٹر اٹل بہاری باجپئی بھی تھے جو اس وقت جنتا پارٹی کے لیڈروں میں تھے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ "آپ نے ایک زریں موقع کھو دیا اور اس ملک کی خدمت اور اس کو ان خرابیوں اور کمزوریوں سے

محفوظ کرنے کی فرصت ضائع کردی جن کی آپ کو اور ملک کے دانشوروں کو سابقہ حکومت سے شکایت تھی۔" دوسری مرتبہ یہ لوگ پھر حضرتؒ سے ملے، اور حضرتؒ نے بے تکلف اور صاف صاف اپنی بات ان کے سامنے رکھی۔

"السیرۃ النبویۃ" کی تالیف

کسی بھی انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ سیرت نبویؐ کے چشمۂ صافی سے سیراب نہ ہو، اور اس کی روشنی میں اپنی زندگی کی تشکیل نہ کرے۔ حضرتؒ پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ عہد طفولیت ہی سے حضرتؒ کو اس کی روشنی ملی۔ تحریر فرماتے ہیں:

"وہ پہلا مکتب اور مدرسہ جہاں سب سے پہلے مصنف کا داخلہ ہوا، وہ سیرت نبویؐ کا مدرسہ ہے، اس مبارک مدرسہ میں اس کا داخلہ اس ابتدائی عمر میں ہوا جس میں بچے عام طور پر مکتب اور مدرسہ میں داخل نہیں کئے جاتے، یہ اس خاندانی ماحول کا نتیجہ تھا جو وہاں قائم تھا، اور اس میں اس بچے کی چھوٹی موٹی لائبریری کو بڑا دخل تھا جو نظم و نثر دونوں طرح کی کتابوں پر مشتمل تھی، اس کے بعد سب سے بڑا حصہ برادر اکبر ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحب کی حکیمانہ تربیت اور رہنمائی کا ہے، اس کا فائدہ یہ تھا کہ اس نے بہت کمسنی اور نوعمری میں اردو میں سیرت کی وہ بہترین کتابیں پڑھ لیں جس میں عربی زبان کے بعد سیرت کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔"(۱)

عربی زبان سے واقفیت و قدرت کے بعد حضرتؒ نے خصوصیت کے ساتھ سیرت کی دو کتابوں سے اشتغال رکھا: ان میں ایک ابن ہشام کی "السیرۃ النبویۃ" اور دوسری امام ابن قیم کی "زاد المعاد" ہے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:

"انہیں کتابوں میں اپنی زندگی کے شب و روز بسر کئے، یہی وقت تھا

---

(۱) مقدمہ نبی رحمت ص ۹

جب اسکا دل ایمان و یقین کی حلاوت سے آشنا ہو اور جذبۂ شوق و محبت کو نئی غذا ملی۔"(۱)

ان میں بھی "زاد المعاد" سے حضرت کو بڑا شغف تھا، حضرت نے یہاں تک تحریر فرمایا ہے کہ "اگر مجھے صرف دو کتابوں کے مطالعہ کا اختیار دیا جائے تو میں کتاب اللہ کے بعد "زاد المعاد" کا نام لونگا کہ وہ سفر و حضر میں ایک مرشد و رہنما کا کام کرتی ہے"۔

سیرت نبویؐ سے حضرت کا جو تعلق بچپن سے رہا اور پھر جس طرح حضرت نے اپنی عملی زندگی اور دعوتی و فکری سرگرمیوں میں اس سے استفادہ کیا اس کا تذکرہ اسی کتاب کے ابتدائی ابواب میں گذر چکا ہے۔

حضرتؒ نے اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز کے بعد مختلف دعوتی و فکری، تاریخی اور علمی موضوعات پر کتابیں تصنیف فرمائیں لیکن سیرت نبویؐ جیسے اہم اور مبارک موضوع پر باقاعدہ کسی تصنیف کی نوبت ابھی تک نہیں آئی تھی جسکا بڑا سبب یہ تھا کہ موضوع کی دقت و نزاکت اور اہمیت (جسکو حضرتؒ نے تفصیل سے مقدمہ نبی رحمت میں بیان فرمایا ہے) کی بنا پر یہ کام نہیں ہو سکا۔ بقول حضرت کہ "شاید یہی وہ اسباب و وجوہ تھے جن کی وجہ سے سیرت نبوی کے موضوع پر کسی نئی تالیف کی مجھے اب تک ہمت نہ ہو سکی اور اس عظیم الشان کام کو اپنی حیثیت سے بہت بلند سمجھتا رہا۔"(۲)

ہر زمانہ کا ایک خاص اسلوب بیان اور زبان ہوتی ہے جسکا لحاظ ضروری ہوتا ہے۔ حضرتؒ کو اس کی بڑی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ عربی زبان میں سیرت پر ایسی کتاب تیار ہونی چاہئے جس میں نئی نسل کے ذہن اور ذوق اور انکی فہم و نفسیات کی موجودہ سطح کا خیال رکھا گیا ہو نیز ان نئے تقاضوں اور ضرورتوں اور اس طرز تحقیق اور طرز کلام کی اس میں پوری رعایت ہو جو موجودہ دور میں رائج

---

(۱) مقدمہ نبی رحمت ص ۹ (۲) مقدمہ نبی رحمت ص ۳۰

ہے۔ بعض مخصوص فاضل اہل تعلق بھی بار بار حضرتؒ کو اس کام پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ بالآخر حضرتؒ نے ۱۹۷۵ء مطابق ۱۳۹۵ھ کو تالیف کا آغاز فرمایا، اور ۱۹۷۶ء کے آغاز میں یہ کتاب "السیرۃ النبویۃ" کے نام سے شائع ہو کر مقبول عام ہوئی۔

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ "جاہلیت عالیہ" پر جو کلام اس میں کیا گیا ہے وہ یکجا کسی سیرت کی کتاب میں ملنا مشکل ہے۔

کتاب کا اردو ترجمہ مولانا محمد الحسنی صاحبؒ نے بڑے اہتمام سے کیا جو "نبی رحمت" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ہی ان کی وفات ہوئی اور علامہ شبلی کا یہ شعر ان پر صادق آیا کہ ؎

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

چند اہم وفیات

پچاسی سالہ جشن سے فراغت کے بعد حضرتؒ رائے بریلی تشریف لائے تو آگے بڑھ کر ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ نے مبارکباد دی اور خوشی کا اظہار کیا، اسکے کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ لکھنؤ گئیں، چند ہی روز کے بعد وہ اچانک علیل ہوئیں اور ۲۸؍ جنوری ۱۹۷۶ء کو ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا۔ یہ حضرتؒ کی وہ بہن تھیں جن کے ساتھ حضرتؒ کی سب سے زیادہ یکجائی رہی تھی، سفر حج میں بھی وہ ساتھ تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو شعر و شاعری کا اچھا ذوق عطا فرمایا تھا، ان کی مناجاتیں اور نعتیں اس پر شاہد ہیں، "ریاض الصالحین" کا انھوں شستہ اردو زبان میں ترجمہ کیا تھا جو "زاد سفر" کے نام سے شائع ہوا اور اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی وفات کا حضرتؒ پر بڑا اثر پڑا۔ دائرہ شاہ علم اللہ میں حضرتؒ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی اور حظیرۂ شاہ علم اللہ میں اپنی والدہ صاحبہؒ کے پہلو میں سپرد خاک کی گئیں۔

ہمشیرہ صاحبہؒ کی وفات کے تیسرے ہی روز قدیم فضلائے دارالعلوم کی آخری یادگار مولانا عبد الباری صاحب ندویؒ نے رحلت فرمائی اور حضرتؒ نے وصیت کے مطابق ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ مولانا کے ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ سے بڑے گہرے روابط و تعلقات تھے، حضرتؒ پر بھی وہ بڑی شفقت فرماتے تھے اور حضرتؒ کی تصنیفات کا ذوق و شوق کے ساتھ مطالعہ فرماتے تھے۔

۷؍ جنوری ۱۹۷۷ء کو مولانا عبد الماجد صاحب دریابادیؒ کی وفات ہوئی، حضرتؒ کو رائے بریلی میں اسکی خبر ملی، لکھنؤ تشریف لے گئے اور حسب وصیت نماز جنازہ پڑھائی۔ مولاناؒ سے حضرتؒ کا بڑا گہرا تعلق تھا، دارالعلوم میں درس تفسیر کے دوران مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں اور جدید تاریخی یا جغرافیائی مسائل میں حضرتؒ نے مولانا سے استفادہ کیا تھا۔ مولانا کی نظر سے کوئی نئی کتاب یا ایسا مضمون گذرتا جو وہ حضرتؒ کے لئے مناسب و مفید سمجھتے تو حضرتؒ کو وہ کتاب یا مضمون ارسال فرمادیتے۔ حضرتؒ کی متعدد تصانیف پر انھوں نے تبصرہ فرمایا اور داد دی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے اخبار میں مسلسل حضرتؒ کے خلاف قسطیں لکھنی شروع کی تھیں، اتفاق سے ان کا نسبی تعلق فرنگی محل سے تھا، مولانا عبد الماجد صاحبؒ نے اپنے مخصوص اسلوب میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "علماء فرنگی محل کتابوں کے نام رکھنے میں سجع کا لحاظ رکھتے ہیں، ان صاحب کو میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنی کتاب کا نام "القول الجلی فی مثالب ابی الحسن علی" رکھ لیں"۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

"معاصرین" میں وہ حضرتؒ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"سن میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں لیکن علم و فضل میں، سنجیدگی فکر میں، اخلاص میں، اخلاق و تقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں، خشیت و طاعت میں میرے بڑوں میں شامل ہونے کے قابل۔ رائے بریلی کے سید زادے خاندان کے اور بھی لوگوں سے میں واقف ہوں، باپ اور بھائی کا کیا

کہنا؟! دونوں نورٌ علیٰ نور، پاک صاف، طاہر و مطہر مٹی (جو تیمم کے قابل ہو) اس سے بنے ہوئے، دوسرے اعزہ بھی اپنی جگہ قابل قدر و قابل فخر۔ یہ اس تاروں کے جھرمٹ کے درمیان آفتاب!"

مولانا دریابادی کی وفات کے بعد حضرت ہی کو دارالمصنفین کا صدر منتخب کیا گیا، ایک وہ دن تھا کہ جب حضرت نے دارالمصنفین سے منسلک ہو کر خدمت کرنے کا ارادہ فرمایا تھا تو ذمہ داروں نے معذرت کی تھی، آج باصرار اس کے سب سے باوقار منصب کو حضرت کے لئے پیش کر کے اس منصب کی زینت و رونق بڑھائی جارہی تھی۔

مغرب اقصیٰ مراکش میں

طویل طویل بیرونی اسفار کے باوجود حضرتؒ نے مغرب اقصیٰ کا کوئی سفر ابھی تک نہیں کیا تھا۔ ایک مرتبہ ملک حسن ثانی شاہِ مراکش نے بڑے اصرار کے ساتھ دعوت دی تھی لیکن رمضان مبارک کی مشغولیات کی وجہ سے یہ سفر نہ ہوسکا۔

۱۱ر ۱۲ر ۱۳ر مئی ۱۹۷۶ء کی تاریخوں میں "رابطة الجامعات الاسلامية" کا جلسہ رباط میں ہونا طے پایا۔ حضرتؒ شروع ہی سے اس کے رکن تھے، اس کی طرف سے دعوت نامہ آیا۔ دوسری طرف شیخ صالح قزاز سکریٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی نے جو اپنی کسی مشغولیت کی وجہ سے اس کے جلسہ میں شریک ہونے سے معذور تھے، حضرتؒ سے رابطہ کی نمائندگی کی بھی گذارش کی۔ حضرتؒ نے سفر کا ارادہ فرمالیا، اور حجاز مقدس سے جہاں اس زمانہ میں حضرتؒ کا قیام تھا، ۶ر مئی کو "الدار البیضاء" روانگی ہوئی۔ "الدار البیضاء" میں ایک رات دن قیام رہا، اور وہیں اچانک شیخ تقی الدین ہلالی سے ملاقات ہوئی۔ وہیں سے "مکناس" اور فاس" بھی جانا ہوا۔ فاس میں حضرت نے "جامعة القرويين" اور اس کا قیمتی کتب خانہ بھی دیکھا۔ ۱۰ر مئی کو رباط تشریف آوری ہوگئی۔ ۱۱ر مئی کے پہلے اجلاس میں جن پانچ منتخب

علماء و فضلاء کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی ان میں حضرتؒ بھی تھے۔ ۱۴ر مئی کو "وزارة الثقافة" کی طرف سے خصوصی خطاب کا انتظام کیا گیا۔ خود وزیر الثقافة بھی اس میں شریک ہوئے۔ حضرتؒ نے "أزمة هذا العصر الحقيقية" (عالم اسلامی کا حقیقی بحران) کے عنوان سے تقریر فرمائی۔

۱۵ر مئی کو مراکش روانگی ہوئی۔ ۱۶ر مئی کو شاہ مراکش نے قصر ملکی میں مدعو کیا، حضرتؒ کو وہاں خطاب کا موقع دیا گیا۔ حضرتؒ نے ان کے ولی صفت والد سلطان محمد الخامس کا تذکرہ فرمایا اور شاہ کو ان کی صفات اختیار کرنے اور صحیح دینی قیادت کرنے کی صاف صاف دعوت دی۔

مراکش سے "الدار البیضاء" ایک روز ٹھہر کر ہندوستان واپسی ہوئی۔ وہیں حضرتؒ نے "إسمعيات" کے اسلوب میں "نحن الان في المغرب" کے عنوان سے ایک اہم مضمون تیار فرمایا۔

امریکہ کا پہلا سفر

حضرتؒ امریکہ کے سفر کی ضرورت وافادیت محسوس فرمارہے تھے کہ وہ مغربی تہذیب کا سب سے بڑا نمائندہ ملک بن چکا تھا، علمی اور صنعتی ترقی وہاں نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی، کئی مرتبہ سفر کی تحریک ہوئی اور ایک مرتبہ شکاگو سے دعوت نامہ بھی آیا لیکن بعض موانع کی وجہ سے سفر نہ ہو سکا۔

اپریل ۱۹۷۷ء میں وہاں کی مشہور مسلم تنظیم ایم۔ ایس۔ اے کی طرف سے اس کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ آیا، اور مختلف لوگوں کی طرف سے سفر کا شدید تقاضا اور اصرار ہوا۔ حضرتؒ نے اس خیال سے سفر کا ارادہ فرمالیا کہ وہاں مسلم نوجوانوں کو خطاب کرنے اور مغربی تہذیب کے اس مرکز میں اسکی خرابیوں کی نشان دہی کرنے کا موقع ملے گا۔ دوسرا ایک بڑا محرک یہ ہوا کہ داہنی آنکھ کٹریکٹ کے آپریشن کے لئے بالکل تیار تھی اور ڈاکٹروں کا مشورہ یہ تھا کہ

مزید تاخیر سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ بھی آپریشن کے لئے اصرار فرمارہے تھے۔ امریکہ جو سرجری میں دوسرے ملکوں کی بہ نسبت بہت ترقی یافتہ ملک ہے، اس کام کیلئے بہت موزوں تھا۔

۲۸ر مئی ۱۹۷۷ء کو نیویارک روانگی ہوئی۔ مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ ہمراہ تھے۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ "ایرپورٹ پر محمد خورشید صاحب موجود تھے، جب معلوم ہوا کہ وہ بالاکوٹ کے ہیں تو سفر کا آدھا تکان جاتا رہا"۔ چند گھنٹہ نیویارک ٹھہر کر بلیو منگٹن تشریف لے گئے اور تنظیم کے اجلاس میں "اسلامی دعوت کا کام کرنے والوں کے تعلقات کی نوعیت" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

اس جلسہ سے فارغ ہو کر تنظیم کے ذمہ داروں نے شمالی امریکہ اور کناڈا کے دورہ کا پروگرام بنایا، اس پروگرام میں یہاں کے تقریباً تمام اہم شہروں میں حضرتؒ کی بڑی اہم طاقتور اور موثر تقریریں ہوئیں۔ ان تقریروں میں خاص طور سے دو چیزوں پر زور دیا گیا، ایک مغربی تہذیب پر تنقید، اسکی ناکامی اور اسکے پیدا کئے ہوئے مسائل و مشکلات کی وضاحت۔ دوسرے امریکہ میں مقیم مسلمانوں کو اپنے مقام و پیغام اور شخصیت کی حفاظت کی تاکید اور اس راہ کی رکاوٹوں اور خطرات کی وضاحت۔

اس دورہ میں عربی اردو میں بیس (۲۰) سے زائد تقریریں ہوئیں۔ پروگرام ہائن نیویارک سٹی سے شروع ہو کر شکاگو میں ختم ہوا۔ امریکہ کی پانچ اہم یونیورسٹیوں کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک)، ہارورڈ یونیورسٹی (کیمبرج)، ڈٹرائٹ یونیورسٹی (ان آربر) جنوبی کیلی فورنیا یونیورسٹی (لاس اینجلس) اور اوتا یونیورسٹی (سالٹ لیک سٹی) میں بھی خطابات ہوئے۔

تقریروں کا یہ مجموعہ "نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں" جب چھپا تو حضرت شیخ الحدیثؒ نے بڑے اہتمام سے اس کو سنا اور حضرتؒ کو بڑے تاثر کا خط تحریر فرمایا، اس میں یہ بھی لکھا "میری تو رائے یہ ہے کہ جتنی زیادہ سے زیادہ اس کی انگریزی، عربی میں طباعت کی صورت ہو سکے بہتر ہے۔ اس کی اشاعت کی بہت

ضرورت ہے، اہل خیر کو متوجہ کر کے ایک لاکھ نسخہ انگریزی، عربی اردو کے خوب تقسیم کیے جائیں۔'' مزید یہ بھی تحریر فرمایا کہ ''دو ہزار کی رقم میرے ذمہ ہے''۔

آنکھ کا آپریشن

تقریباً تیرہ سال سے حضرتؒ کی بصارت بہت کمزور چل رہی تھی، بائیں آنکھ تو ضائع ہو چکی تھی اور دائیں آنکھ کی بصارت بھی بہت معمولی رہ گئی تھی۔ اس معذوری میں حضرتؒ نے بڑی اہم کتابیں بھی لکھوائیں، جن میں خاص طور پر ارکان اربعہ قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ دعوتی اسفار کا سلسلہ بھی جاری رہا، بعض بعض مواقع پر بڑی دشواری بھی ہوئی مگر یہ پوری مدت حضرتؒ نے بڑی صبر و عزیمت کے ساتھ گذاری۔ دائیں آنکھ آپریشن کے لئے بالکل تیار تھی اور امریکہ کے سفر کا ایک بڑا محرک یہ بھی تھا مگر وہاں پہنچ کر حضرتؒ کو بڑا تردد پیدا ہوا کہ خدانخواستہ اگر آپریشن ناکام ہوا تو کس طرح واپسی ہوگی اور رفیق سفر مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کو کیسی دشواری ہوگی، بار بار استخارہ فرماتے لیکن شرح صدر پوری طرح نہیں ہوتا تھا، جناب انیس احمد صاحب اور بعض دوسرے مخلص محبین و معتقدین مستقل اصرار کر رہے تھے۔ حضرتؒ نے حضرت شیخ کو فون کے ذریعہ اپنے تردد کی اطلاع دینی چاہی لیکن لائن نہیں مل سکی، بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ نے خود یہ خیال کر کے کہ آپریشن کے معاً بعد ہندوستان کا سفر ہوگا اور احتیاط دشوار ہوگی، یہ تحریر فرما دیا کہ اب میری رائے آپریشن کرانے کی نہیں ہے، لیکن آپریشن کا ہونا عند اللہ مقدر تھا اور مبارک بھی اس لئے وہ خط بجائے امریکہ کے پتہ پر بھیجنے کے لکھنؤ کے پتہ پر بھیج دیا گیا۔ فلاڈلفیا میں یکم جولائی کو ڈاکٹر ''شے'' سے آپریشن کی تاریخ مقرر تھی، تین روز قبل حضرتؒ کو پورا انشراح ہو گیا اور آپریشن کا فیصلہ کر لیا گیا۔

اس وقت دو چوٹی کے سرجن تھے، ایک یہودی دوسرا عیسائی۔ اکثر اہل تعلق نے تاکید کی تھی کہ یہودی ڈاکٹر سے آپریشن نہ کرایا جائے، خاص طور پر مولانا محمد

عمر صاحب پالنپوریؒ نے چلتے وقت حضرتؒ سے اس کا تذکرہ کیا تھا، اس لئے عیسائی ڈاکٹر سے آپریشن کرانا طے ہوا۔ ۲۹؍جون کو آئی انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ ہو گیا، اور یکم جولائی کو اسی عیسائی ڈاکٹر شے نے بڑے اہتمام سے آپریشن کیا، حسن اتفاق کہ حضرتؒ کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا جارہا تھا اسی وقت حضرت شیخ کو اطلاع ہوئی وہ پوری طرح خود بھی دعا میں مشغول ہو گئے اور دوسروں کو بھی تاکید کردی، لکھنؤ، رائے بریلی میں گھر کی خواتین نے اور دار العلوم اور نظام الدین میں اہل تعلق نے خصوصی دعاؤں کا اہتمام کیا۔ الحمد للہ بڑی کامیابی کے ساتھ آپریشن ہوا، ڈاکٹر نے بڑی توجہ رکھی، فیس بھی نہیں لی اور کہا کہ ”میں مذہبی رہنماؤں سے فیس نہیں لیتا“۔ ۱۳؍جولائی کو اسپتال سے چھٹی ملی۔

ایک ہفتہ سید صفوت علی صاحب خیر آبادی (حال پاکستانی) کے فلیٹ میں قیام رہا، پھر ٹانکے نکلوا کر حضرتؒ آرام کے لئے شکاگو تشریف لے آئے اور سید عظمت اللہ صاحب قادری کے مکان پر ۲؍اگست تک مقیم رہے۔ ڈاکٹر عباد الرحمٰن نشاط صاحب جو حضرت کے قدیم عقیدت مندوں میں سے ہیں (اور بعد میں حضرتؒ نے ان کو اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی)، خدمت وراحت رسانی کے لئے حاضر رہتے، محترمی سید طارق حسن عسکری صاحب حضرتؒ کو راحت پہنچانے ہی کے لئے سفر کر کے تشریف لائے، ان کی آمد سے حضرتؒ کو بڑی مسرت ہوئی۔

۲؍اگست کو حضرت فلاڈلفیا تشریف لے گئے، بقیہ دو ٹانکے ڈاکٹر نے نکالے اور آپریشن کی پوری طرح کامیابی پر مبارک باد دی اور ہندوستان واپسی کی بھی اجازت دے دی۔ دو روز نیویارک ٹھہر کر حضرت ۹؍اگست ۱۹۷۷ء کو دہلی ہوتے ہوئے لکھنؤ تشریف لے آئے اور اس طرح یہ دعوتی وطبی سفر ہر طرح سے کامیابی اور بہترین نتائج کے ساتھ مکمل ہوا۔ سب سے زیادہ اس سفر میں جناب پروفیسر انیس احمد صاحب (برادر خورد جناب خورشید احمد صاحب) نے خدمت کی اور پورے سفر میں ساتھ رہے۔

رفیق سفر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے اس طویل سفر کی روداد تفصیل سے قلمبند فرمائی اور "دو مہینے امریکہ میں" کے نام سے یہ سفرنامہ شائع ہو کر مقبول ہوا۔

پاکستان کا سفر

حضرت رائپوریؒ کی وفات کے بعد پاکستان جانے کا کوئی بڑا محرک نہیں تھا اسلئے ایک طویل عرصہ تک پاکستان کا سفر نہیں ہوا۔ جون ۱۹۷۸ء میں جبکہ حضرتؒ "جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ" کی مجلس تاسیسی میں شرکت کے لئے حجاز میں مقیم تھے، "رابطہ عالم اسلامی" کی طرف سے کراچی میں منعقدہ ایشیائی کانفرنس کا دعوت نامہ پہنچا۔ حضرتؒ نے ایک پڑوسی ملک کے رشتہ سے جس میں خاندان کی ایک بڑی تعداد مقیم تھی، سفر منظور فرمالیا، اس کا ایک بڑا محرک یہ بھی ہوا کہ طویل عرصہ سے وہاں کا سفر نہیں ہو سکا تھا، اور اس کی ضرورت تھی کہ وہاں کے باشندوں کو اور ذمہ داران حکومت کو صحیح اسلامی معاشرہ اختیار کرنے اور صحیح اسلامی مملکت کا نمونہ پیش کرنے کی دعوت دی جائے۔

حضرت کے برادر زادہ مولانا سید محمد الحسنیؒ اور مولانا اسحاق جلیس صاحبؒ کے نام بھی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ آیا تھا، مولانا اسحاق صاحبؒ نے جو اصلاً "ہزارہ" کے رہنے والے تھے اور پاکستان میں ان کے خاندان کا بڑا حصہ مقیم تھا، کئی روز پہلے سے کراچی پہنچ گئے تھے تاکہ حضرتؒ کے قیام کو زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جا سکے۔

حضرتؒ جدہ سے براہ راست کراچی تشریف لے گئے۔ ادھر سے مولانا منظور نعمانی صاحبؒ اور مولانا محمد الحسنیؒ کراچی پہنچ گئے۔

صدر مملکت جنرل ضیاء الحق مرحوم نے کانفرنس کا افتتاح کیا اور حضرتؒ کی اختتامی تقریر ہوئی۔ حضرت نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تاریخی جملہ

"أينقص الدين و أنا حيٌّ" (کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی قطع و برید ہو سکتی ہے؟!) کو سامنے رکھ کر بڑا موثر اور مدلل خطاب فرمایا۔

اجلاس سے فارغ ہو کر پہلے سے مرتب شدہ پروگرام کے مطابق تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا، بڑے دینی مدارس، عصری جامعات اور خصوصی استقبالیوں میں اہم تقاریر ہوئیں۔ یہ تقریریں کراچی میں "حدیث پاکستان" کے نام سے یکجا شائع کی گئی تھیں، پھر ہندوستان میں "دعوت فکر و عمل" کے نام سے مجلس تحقیقات سے دوبارہ شائع کی گئیں۔ یہ تقریریں بڑی پر مغز، موثر اور "از دل خیزد بر دل ریزد" کا مصداق ہیں۔

قیام کے دوران وہاں کے اہم علماء، قائدین اور مشائخ حضرتؒ سے ملاقات کے لئے آتے رہے، ایک دن حضرت تھانویؒ کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفیؒ بھی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔

حضرتؒ لاہور بھی تشریف لے گئے اور کچھ وقت اپنی پرانی درسگاہ اور مرکز عقیدت شیر انوالہ دروازہ کی لائن والی مسجد میں گذارا۔ حضرت لاہوریؒ کے صاحبزادہ مولانا عبید اللہ انور صاحب نے بڑی محبت فرمائی۔

جن اہم لوگوں سے حضرتؒ نے خود جاکر ملاقات کی ان میں علامہ عبد العزیز میمنؒ اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دو روز کے لئے حضرتؒ اپنے شیخ و مرشد حضرت رائپوریؒ کے وطن و مدفن "ڈھڈیاں" بھی تشریف لے گئے۔ حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں "وہ اس سفر کے سب سے خوشگوار اور بابرکت دن تھے۔"

حضرتؒ کو سب سے زیادہ خوشی سید احمد الحسنی صاحب اور ان کے بھائیوں سے مل کر ہوئی کہ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی خاندانی یادگار تھے اور انکے ساتھ لکھنؤ اور رائے بریلی میں برسوں رہنا ہوا تھا۔

رمضان کے قرب کی وجہ سے سفر مختصر کیا گیا اور لکھنؤ واپسی ہو گئی۔

بعض اہم حادثات

سفر پاکستان سے واپسی کو ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ حضرتؒ کے محبوب بھتیجے مولانا سید محمد الحسنیؒ نے ۱۴ رجون ۱۹۷۹ء کو مختصر علالت کے بعد رحلت فرمائی۔ حضرتؒ اس وقت بمبئی میں تھے، حضرتؒ کو علالت کی خبر دی گئی اور فوراً ہی لکھنؤ واپسی کے لئے کوششیں شروع کردی گئیں۔ ۱۵ رجون کو جب حضرتؒ واپس تشریف لائے تو یہاں سب کچھ ہو چکا تھا۔ یہ حادثہ حضرت کے لئے بڑا سخت اور صبر آزما تھا۔ حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں:

"اس عظیم حادثہ نے دل و دماغ، اعصاب اور چھوٹے سے گھرانے کی محدود زندگی ہی کو نہیں میری تمام فکری، عملی اور دعوتی زندگی، کام کے منصوبوں اور مستقبل کے خوابوں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا........ میرے ان کے درمیان فکر و ذوق، مزاج و طبیعت، خیالات و افکار، شان تحریر و خط، اسلوب تحریر میں اتنی مماثلت و مشابہت تھی جس کا دو ہستیوں میں کم سے کم میں نے مشاہدہ کیا .... ان کے انتقال سے نہ صرف میری عربی تحریروں اور تصنیفات کا بہترین مترجم، قومیت عربیہ اور عربوں کی بے راہ روی پر تنقید کرنے والا پرزور قلم، عربی زبان میں دین کا ایک داعی اور رجز خواں مجاہد، اردو کا ایک اچھا انشاء پرداز اور سوانح نگار نہیں رہا، یہ بھی ایک خسارہ تھا کہ تحریک پیام انسانیت میں میرا اقلمی ترجمان اور اس سے سو فیصدی اتفاق و توارد رکھنے والا رفیق جدا ہو گیا، جس سے ہمیشہ بیش قیمت مدد ملی۔"(۱)

اس کے چند ہی روز کے بعد مولانا اسحاق جلیس ندوی صاحبؒ کی وفات کا حادثہ پیش آگیا جو حضرت کے خاص طور پر "تحریک پیام انسانیت" کے سلسلہ میں معاون اور ترجمان تھے۔

ان دو حادثوں کے بعد تیسرا حادثہ قدیم رفیق مولانا عبد السلام صاحب

(۱) کاروان زندگی دوم ۲۷۱-۲۷۳

قدوائی کی وفات کا پیش آیا جو حضرت کے رفیق درس بھی رہ چکے تھے۔ عید کی شب میں ان کی وفات ہوئی اور حضرتؒ عید کی نماز کے بعد ان کے وطن تھلینڈی تشریف لے گئے اور نماز جنازہ پڑھائی۔

حکومت سعودی عرب کے ذمہ داروں کے نام ایک اہم تحریری یادداشت

عالم عربی خاص طور سے حجاز مقدس سے تعلق و محبت ایمان کا ایک اہم تقاضا ہے، حضرتؒ کا دل اس کی محبت سے سرشار تھا اور شروع سے حضرتؒ کو اس کی فکر تھی کہ کس طرح عالم عربی کو اس کے اصل مقام پر لایا جائے اور وہ اپنی ذمہ داری ادا کرے۔ حضرتؒ نے اس کے لئے وہاں کے عوامی حلقوں سے بھی خطاب کیا، خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کیا اور حکمراں طبقہ کو توجہ دلاتے رہے، اس سلسلہ میں حضرتؒ نے سب سے پہلے امیر سعود کو مفصل مکتوب تحریر فرمایا تھا اس کے بعد شاہ فیصل سے متعدد ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعہ سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا، شاہ خالد امیر فہد جو بعد میں شاہ خالد کے جانشین ہوئے اور دوسرے وزراء و امراء کو بھی توجہ دلاتے رہے لیکن اپنے مسلسل سفروں اور وہاں طویل طویل قیام سے حضرتؒ نے محسوس فرمالیا کہ گاڑی اسی رفتار سے چل رہی ہے، لوگ اسلامی طرز معاشرت کی جگہ پر مغربی طرز معاشرت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ ۱۹۷۹ء کے آغاز میں حضرتؒ کو وہاں طویل قیام کا موقع ملا اور حضرتؒ نے بنظر غائر اس کا جائزہ لیا اور معلومات جمع کیں اور یادداشت تحریر فرماکر (جس میں اشارات کے بجائے صراحت کے ساتھ اعداد و شمار ذکر کر کے حقائق سامنے رکھے گئے ہیں) ذمہ داران حکومت کو بھیج دی شاہ خالد کو دینے کے لئے، حضرت نے وہ یادداشت اپنے قدیم دوست شیخ عبد العزیز بن بازؒ اور شیخ عبد اللہ بن حمیدؒ (رئیس القضاۃ) کے حوالہ فرمائی دونوں نے وہ تحریر شاہ خالد کے حوالہ کی۔ حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ بادشاہ نیز ان کے ولی عہد اور ان

کے وزیر اعظم امیر فہد، وزیر داخلہ وغیرہ کے پاس یہ یادداشت پہنچی اور ان کو اس کے مندرجات سے آگاہی ہوئی (ولعل الله یحدث بعد ذالک امرا)۔"(۱)

حرم میں ایک ناشدنی واقعہ

۱۹۷۹ء کے اواخر میں ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ کی آخری تاریخ کو حضرتؒ رابطہ کے اجلاس میں شرکت کیلئے جدہ تشریف لے گئے، اس سفر میں برادر زادہ مولانا سید محمد الحسنیؒ کے فرزند مولانا عبداللہ حسنی ندوی کو حضرت نے ساتھ لیا تھا، یکم محرم الحرام ۱۴۰۰ھ کو رابطہ کی طرف سے مقرر کردہ وزرائے اوقاف کی کمیٹی میں حضرتؒ کو شرکت کرنی تھی، چار ملکوں کے وزراء اس میں شریک تھے، رابطہ کی طرف سے اسکے سکریٹری شیخ علی الحرکان کے علاوہ حضرتؒ کو اس کا نمائندہ منتخب کیا گیا تھا۔

حضرتؒ اور مولانا عبداللہ صاحب عمرہ کے احرام میں تھے۔ نصف شب میں جدہ پہنچنا ہوا، دوسری صبح اچانک یہ خبر ملی کہ حرم شریف پر کچھ ایرانیوں نے قبضہ کرلیا ہے اور محمد عبداللہ قحطانی نامی ایک شخص نے مہدویت کا دعویٰ کیا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس کا شکار ہو رہے ہیں، اس سے پورے عالم اسلام میں اضطراب و ہیجان پیدا ہو گیا، پانچ دن تک حرم شریف پر اس کا تسلط رہا بالآخر اس سے نجات ملی اور سب نے راحت کی سانس لی۔

حضرتؒ نے عمرہ کا احرام کھول دیا، کفارہ میں قربانی دی اور دوسرے سال عمرہ فرمایا، کمیٹی میں حضرتؒ نے شرکت فرمائی اور ۳؍ محرم کو قطر کی سیرت کانفرنس میں شرکت کے لئے بحرین کے راستہ "دوحہ" روانہ ہو گئے۔

عالمی سیرت کانفرنس اور حضرت کی الہامی تقریر

۵-۸؍ محرم کو چار روزہ تیسری عالمی سیرت کانفرنس بڑے اعلیٰ پیمانہ اور

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۲۸۳

انتظامات کے ساتھ منعقد ہو رہی تھی، حضرتؒ اس کی مجلس انتظامی و انتخابی کمیٹی کے رکن تھے اور خصوصی طور پر مدعو تھے، اور پورے عالم اسلام کے چیدہ افراد کو اس میں مدعو کیا گیا تھا۔ حضرتؒ سے اس میں پورے عالم اسلام کی نمائندگی کے طور پر خطاب کرنے کی درخواست کی گئی اور یہ کہا گیا کہ اس کے لئے مقالہ تیار فرمالیں تاکہ اس کو چھاپ کر اس موقع پر تقسیم بھی کردیا جائے۔ اگلے روز جمعہ تھا، مقالہ نہیں لکھا جاسکا اور حضرتؒ نے معذرت فرمائی کہ کسی دوسری موقر شخصیت کو یہ ذمہ داری تفویض کردی جائے مگر جب اجلاس شروع ہوا تو مطبوعہ پروگرام میں کلمۃ الوفود حضرت ہی کے نام تھا۔

والی قطر کے نہ ہونے کی وجہ سے ولی عہد نے کانفرنس کا افتتاح کیا اس کے بعد رئیس القضاۃ شیخ عبداللہ بن زید المحمود نے تقریر کی۔ اس کے بعد خطاب کے لئے حضرتؒ کو مدعو کیا گیا پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، پورے عالم اسلام کے نمائندہ اور منتخب افراد وہاں موجود تھے۔ حضرتؒ نے تقریر شروع فرمائی تو خود حضرتؒ ہی فرماتے ہیں:

"مجھے محسوس ہوا کہ دل و دماغ اس دلآویز موضوع کی حلاوت اور جس ذات گرامی سے اس کو نسبت ہے اس کی عظمت و محبت سے معمور ہی نہیں مخمور ہیں، مضامین ہی نہیں الفاظ اور جملوں کا ورود ہو رہا ہے اس وقت اس کی حکمت معلوم ہوئی کہ پہلے یہ تقریر کیوں تیار نہیں ہو سکی۔"(۱)

یہ خالص الہامی تقریر تھی جس میں دل کا سوز بھی تھا اور زبان کا ساز بھی، جذبات کی طغیانی بھی تھی اور الفاظ کی روانی بھی، طوفان کا زور بھی تھا اور آبشار کا شور بھی، پوری تقریر زبان دل سے کی گئی اور دلوں میں اترتی چلی گئی، سامعین کی آنکھیں پر آب ہو گئیں اور دلوں پر اس کی چوٹ محسوس کی گئی بعد میں یہ تقریر "في ظلال البعثة المحمدية" کے عنوان سے بار بار شائع ہوئی۔

---

(۱) کاروان زندگی دوم ص ۲۹۰

اجلاس کے ذمہ داروں نے (جن کے سرخیل شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری تھے جو حضرتؒ سے بڑی محبت و عقیدت رکھتے تھے) حضرتؒ کی سیرت پر تازہ ترین کتاب "السیرۃ النبویۃ" کا ایک خوبصورت ایڈیشن بھی شائع کیا اور اس کو تمام مندوبین اور شرکاء اجلاس کو بطور تحفہ پیش کیا۔

فیصل ایوارڈ اور حضرتؒ کا زہد و استغناء

شاہ فیصل مرحوم کی یاد میں انہیں کے نام سے ۱۳۹۹ھ سے سعودی حکومت کی طرف سے قیمتی ایوارڈ کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا جس کے لئے عالم اسلام کی کسی ایسی نمایاں اور اہم شخصیت کا انتخاب ہوتا جس نے کوئی بڑی دینی خدمت انجام دی ہو۔ ۲۴ر صفر ۱۴۰۰ھ کے جلسہ میں حضرت کا بالاتفاق اس کے لئے انتخاب ہوا۔ حضرتؒ رائے بریلی میں مقیم تھے کہ اچانک اس کی اطلاع ملی، ساتھ ہی حضرت شیخ کی مبارکباد کا تار بھی ملا۔ ان کو جب ریڈیو سے اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا "علی میاں کو فوراً مبارک باد کا تار دیدو کہ ان سے اندیشہ ہے کہ وہ قبول کرنے سے معذرت نہ کردیں، وہ میرے اس تار سے میرا ایماء سمجھ لیں گے"۔

اس تار کے بعد اور خاص طور پر شاہ فیصل مرحوم کی اسلامی خدمات کے اعتراف واحترام میں حضرت نے اس کو قبول فرمالیا۔

ایوارڈ پیش کرنے کے لئے بڑے اہتمام سے جلسہ کیا جاتا ہے جس میں بادشاہ اور دوسرے وزراء اور علماء شریک ہوتے ہیں، وزیر تعلیم شیخ حسن عبداللہ آل الشیخ نے حضرتؒ سے اس میں شرکت پر اصرار کیا لیکن حضرتؒ نے خود شرکت سے معذرت فرمادی اور اپنے جوابی مکتوب میں تحریر فرمایا کہ "بہتر تو یہ تھا کہ دین کی خدمت کرنے والوں کو ان کا انعام دنیا سے جانے کے بعد ملے" پھر لکھا کہ "اس کے دو پہلو ہیں ایک اسکی معنوی قیمت یعنی اعزاز واعتراف، اس کو میں شرمندگی کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔ دوسرا اس کا مالی پہلو یعنی وہ رقم جو اس کے ساتھ ملے

گی، اس کے لئے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ میں اس کو اپنی صوابدید کے مطابق اسلام کے مفاد اور دینی خدمات کے میدان میں صرف کروں جس کا اعلان مولوی عبداللہ عباس ندوی کریں گے۔"(۱)

یہ حضرت کی شان استغناء تھی کہ خود اپنے ہاتھ سے لینا بھی پسند نہیں فرمایا، اپنی طرف سے مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب کو نمائندہ بنادیا، انھوں نے حضرتؒ کی طرف سے اس کو قبول کیا اور اس کی نصف رقم افغان پناہ گزینوں کے لئے ایک ربع جماعت تحفیظ القرآن کے لئے اور دوسری ربع مدرسہ صولتیہ کے لئے حضرت کے حکم کے مطابق دیدی۔ دارالعلوم کو یا اپنی سرپرستی میں چلنے والے کسی ادارہ کو دینا بھی حضرتؒ نے پسند نہیں فرمایا، اس کا طلائی تمغہ بھی حضرتؒ نے اپنے ایک خاص تعلق رکھنے والے میزبان کو عنایت فرمادیا اور ایک حبہ بھی اس کا استعمال نہیں فرمایا۔

فیصل ایوارڈ کے کچھ ہی دنوں کے بعد دارالمصنفین کی انتظامیہ کا جلسہ ہوا جس میں حضرتؒ تشریف لے گئے، ناظم دارالمصنفین جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبؒ نے اسی موقع پر ایک روز تہنیتی جلسہ کیا اور اس میں خود دارالمصنفین کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا اس کے دو اقتباسات یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ حضرتؒ کے بارے میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"وہ اس وقت نہ صرف علم کی آبرو ہیں بلکہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے عطر مجموعہ ہیں، نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، پاک دل اور پاکباز

ع ان کی ادا دلفریب، ان کی نگہ دلنواز"

"ان کے قلم کی گل فشانیاں بہت سی کتابوں میں ظاہر ہو چکی ہیں، ان میں نغمۂ عشرت بھی ہے اور نالۂ ماتم بھی، سرمایۂ گداز بھی ہے اور نوائے درد بھی، وہ جب کوئی چیز اردو میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے پر یہ اثر طاری ہوتا ہے

---

(۱) کاروان زندگی دوم ۲۹۵

کہ وہ اس کے ضمیر لالہ میں چراغ آرزو روشن کر رہے ہیں، عربی میں لکھتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث سوز و ساز زندگی بیان کر رہے ہیں۔"

حضرتؒ نے اس کے جواب میں جو تقریر فرمائی وہ حضرتؒ کی فطری تواضع اور انکار ذات کا مظہر ہے، حضرت نے تقریر کا آغاز محمود و ایاز کے اس قصہ سے کیا جس کا ایک فقرہ "ایاز قدر خود را بشناس" ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ "میں نے اپنی پرانی گدڑی (ابتداء کی بے نوائی اور بے حقیقتی) محفوظ کر رکھی ہے اور میں بھی اس کو سامنے رکھ کر "ایاز قدر خود را بشناس" "ایاز اپنی حقیقت نہ بھول جانا کہہ لیا کرتا ہوں۔ وہ گدڑی یہ ہے کہ میں جب ۱۹۳۱ء میں اپنے استاد علامہ تقی الدین ہلالیؒ کے ساتھ یہاں خادمانہ حاضر ہوا تھا تو میں نے ان کے ذریعہ اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ مجھے یہاں کم سے کم مشاہرہ پر رکھ لیا جائے، لیکن میں اس وقت اس کا بھی اہل نہیں سمجھا گیا، آج اس عظیم ادارے کی طرف سے میری یہ پذیرائی اور عزت افزائی ہو رہی ہے لیکن الحمد للہ میں اپنی حقیقت سے واقف ہوں اور مجھے اپنا ماضی یاد ہے اور میں اپنے بارے میں کسی فریب میں مبتلا نہیں، اس لئے اپنے نفس کو مخاطب کر کے اب بھی کہہ رہا ہوں "ایاز قدر خود را بشناس" اور اسی میں اپنی حفاظت اور سلامتی سمجھتا ہوں۔"(۱)

دار العلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس اور حضرتؒ کی تاریخی تقریر

۳ر ۴ر ۵ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ مطابق ۲۱ر ۲۲ر ۲۳ر مارچ ۱۹۸۰ء میں دار العلوم دیوبند کا عظیم الشان صد سالہ اجلاس منعقد ہوا۔ حضرتؒ کو ڈاکٹر عبد العلی صاحب کی جگہ پر ان کی وفات کے بعد شوریٰ کا رکن بنا لیا گیا تھا، اجلاس کے بارے میں مجلس شوریٰ کے جلسوں میں حضرتؒ شریک رہتے۔ حضرتؒ ہی نے ذمہ داروں

---

(۱) کاروان زندگی دوم ۲۹۹

کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ ابتدائی دو دن کا اجلاس فضلائے دار العلوم اور اہل علم کے طبقہ تک محدود رکھا جائے اور آخری دن عمومی نشست ہو، لیکن اس پر عمل نہیں ہو سکا۔ شاہ خالد کے خصوصی نمائندہ کو مدعو کرنے کی ذمہ داری بھی حضرتؒ کے سپرد کی گئی تھی، حضرتؒ نے اس کو پورا فرمایا اور اپنے سفر حجاز میں جو اجلاس کے قریب ہی ہوا تھا ڈاکٹر عبد اللہ عبد المحسن ترکی (وائس چانسلر جامعۃ الامام محمد بن سعود) سے ملاقات کی جو شاہ کی طرف سے اجلاس میں شرکت کے لئے نمائندہ منتخب ہوئے تھے، حضرت ہی کی رائے سے انکو پہلے دن کا صدر بنایا گیا۔

اجلاس سے ایک روز قبل حضرتؒ دہلی تشریف لے آئے لیکن جب معلوم ہوا کہ افتتاحی اجلاس میں مسز گاندھی بھی شرکت کریں گی تو یہ بات حضرتؒ کو ناگوار ہوئی کہ اس کا اس ادارے، اس کے مقام اور روایات سے کوئی جوڑ نہیں تھا۔ اس لئے قصداً حضرتؒ نے افتتاحی اجلاس میں شرکت نہیں فرمائی۔

دوسرے دن اجلاس کی صدارت شیخ عبد اللہ زائد کر رہے تھے اور متعدد عرب فضلاء اسٹیج پر رونق افروز تھے، اس لئے ذمہ داروں کی خواہش ہوئی کہ حضرتؒ عربی میں خطاب فرمائیں۔ لیکن حضرتؒ نے اس عظیم مجمع کو سامنے رکھتے ہوئے جو میدان عرفات کی یاد تازہ کر رہا تھا اردو میں خطاب کرنے کو ترجیح دی تاکہ یہ مجمع جو دور دور سے اللہ و رسول کی بات سننے اور علماء کرام کی زیارت کرنے کے لئے آیا ہے ایک نیا دینی اعتماد اور ہندوستان میں ایک صاحب دعوت اور حامل شریعت ملت کی حیثیت سے رہنے اور اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کرنے کی ذمہ داری کا احساس لیکر جائے۔ اس کے بعد حضرتؒ نے اردو میں وہ تاریخی تقریر فرمائی جو اکثر اہل بصیرت کے نزدیک اجلاس کا ماحصل تھی اور اگر وہ تقریر نہ ہوتی تو ایک بڑا نقص رہ جاتا۔ تقریر کے بعد مفتی محمود صاحب (سابق وزیر اعلی صوبہ سرحد) کھڑے ہوئے اور انھوں نے حضرت کی تائید کی اور کہا کہ دیوبندیت کی تعریف میں جو کہا گیا وہ سو فیصد صحیح ہے۔

اس اجلاس کے بعد دار العلوم دیوبند میں اختلاف و انتشار کا دور شروع ہوا، اور دار العلوم کی تقسیم ہوئی جو مدارس کی تاریخ میں ایک بد نما داغ ہے، حضرتؒ نے اس اختلاف کو رفع کرنے کی امکانی کوشش کی، اجتماعی و انفرادی ملاقاتیں فرمائیں لیکن تصفیہ نہ ہو سکا اور اس سلسلہ میں اس گروہ نے تعاون نہیں کیا جسکو قاری صاحبؒ کا وقار، ان کا سکون خاطر اور دار العلوم سے ان کا ارتباط سب سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے تھا۔

حضرت قاری صاحبؒ کو حضرتؒ سے اخیر دور میں تعلق بہت بڑھ گیا تھا، لکھنؤ میں آخری ملاقات میں انھوں نے یہ بھی فرمایا "جی چاہتا ہے کہ رائے بریلی آکر کچھ روز آپ کے پاس رہوں۔"

بارہ دری کا اجلاس "پیام انسانیت"

۱۳ر اگست ۱۹۸۰ء کو عید کے دن مراد آباد میں وہ المیہ پیش آیا جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں؛ عید گاہ میں پولیس اور پی اے سی نے بے دردی کے ساتھ فائرنگ کی اور اسی لمحہ سیکڑوں مسلمان شہید ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔ حضرتؒ نے مجلس مشاورت کے ذمہ داروں کے ساتھ مراد آباد کا دورہ فرمایا اور صاف دماغ رکھنے والے غیر مسلم دانشور طبقہ کے بعض لوگوں سے ملاقات کی اور واقعہ کی سنگینی کا ذکر فرمایا، گفتگو سے حضرتؒ نے اندازہ فرمالیا کہ ابھی تک دلوں میں تلخی، ناگواری اور بد گمانی پائی جاتی ہے اور اس کو دور کرنے کے لئے بڑی حکمت، سلیقہ اور وقت کی ضرورت ہے اور اس موقع پر ان کاموں کے علاوہ جو حکومت، انتظامیہ اور سیاسی رہنماؤں کو انجام دینے چاہئیں، "پیام انسانیت" کے طرز کی تحریک و مہم کی ضرورت ہے کہ وہی اس کا مستقل علاج ہے، اسی فکر کے نتیجہ میں ۲۷، ۲۸ر اکتوبر کو کل ہند سطح پر لکھنؤ کی بارہ دری میں یہ "پیام انسانیت" کنونشن منعقد ہوا۔

عرصہ کے بعد یہ ایک نمائندہ اجلاس تھا جس میں ملک کے چیدہ دانشور، یونیورسٹیوں کے پروفیسر، متعدد سابق و حال وزراء، متعدد سیاسی پارٹیوں کے ذمہ دار، تاجر، وکیل، ڈاکٹر اور ہندوستان کے مختلف مذاہب کے لوگ شریک ہوئے، حضرتؒ نے خطبۂ صدارت "ملک کا حقیقی مسئلہ اور اس کے لئے حقیقی خطرہ" کے عنوان سے پیش فرمایا۔ کنونشن کے اختتام پر حضرتؒ نے ایک اثر انگیز اور پرجوش تقریری فرمائی جو حضرت کی یادگار تقریروں میں سے ہے، اس میں صاف صاف بلند آہنگی اور پوری قوت و جرأت کے ساتھ حضرتؒ نے معاشرہ کا تجزیہ فرمایا اور ہندوستان میں اخلاقی انارکی اور ان انسانیت سوز، اخلاق سوز، برائیوں کا تذکرہ فرمایا جو عام ہوتی جارہی ہیں۔ اس اجلاس اور خاص طور سے حضرتؒ کی اس موثر تقریر نے بڑا اثر ڈالا اور فضا کچھ سازگار ہوئی۔

حجاز کے دو سفر اور یاسر عرفات کے سامنے ایک اہم تقریر

۵ر فروری ۱۹۸۱ء میں مکہ مکرمہ میں منعقدہ اصلاح المساجد کے جلسہ میں شرکت کے لئے حضرتؒ نے مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی رفاقت میں حجاز کا سفر کیا، وہاں کے قیام میں متعدد پروگرام ہوئے، اس سفر کی روداد بھی مولانا محمد ثانی حسنی صاحبؒ نے قلمبند فرمائی تھی، مدینہ منورہ کے ایک پروگرام کے بارے میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"شیخ محمد المجذوب کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی، وہ تشریف لائے اور ماموں جی کا تعارف بڑے بلند الفاظ میں کیا، تعریف کرتے کرتے وہ جذبات میں ڈوب گئے اور جو کہہ سکتے تھے وہ تعریف و توصیف میں کہہ گئے، پھر ماموں جی کا محاضرہ شروع ہوا، ماموں جی نے اپنے ایک گھنٹہ کے محاضرہ میں مغربی تہذیب و تمدن پر سخت تنقید کی، تقریر کے آغاز میں ماموں جی نے صحابہ کی سادگی اور روم و ایران کی تہذیب سے انکے استغناء کا تذکرہ کیا پھر

موجودہ مرعوبیت اور مغربی تہذیب سے متاثر ہونے پر تنقید کی، ماموں جی کی تقریر میں اتنا زور تھا کہ اکثر حضرات رو رہے تھے اور پورا ہال جھوم رہا تھا۔" (۱)

اس کے پانچ ہی مہینے کے بعد ۳۱ر اگست ۱۹۸۱ء کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور رابطہ عالم اسلامی کے جلسوں میں شرکت کے کے لئے حضرتؒ دوبارہ حجاز تشریف لے گئے۔ مولانا سید سلمان الحسینی صاحب اس سفر میں حضرت کے رفیق تھے۔ چند سال سے رابطہ نے موسم حج میں آئے ہوئے اہم علماء و اہل فکر کے محاضرات کا سلسلہ شروع کیا تھا، اس سال شیخ علی الحرکان نے حضرتؒ کو دعوت دی کہ اس سلسلۂ محاضرات کا افتتاح فرمائیں اور حدیث پر محاضرہ دیں۔ حضرتؒ نے "اسلامی مزاج اور ماحول کی تشکیل میں حدیث کا بنیادی کردار" کے عنوان سے ۱۶ر ذی قعدہ کی شب میں علماء و اعیان مکہ اور اہل ذوق حجاج کرام کے ایک بڑے مجمع میں یہ مقالہ پیش فرمایا، بعد میں یہ عربی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے شائع کیا گیا۔

اسی دوران فلسطینی تحریک آزادی کے سربراہ یاسر عرفات کی حجاز آمد ہوئی اور رابطہ کی طرف سے ان کے لئے ایک حفلۂ تکریم ترتیب دیا گیا، حضرتؒ نے شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ رسمی تقریروں سے ہٹ کر کوئی ایسا خطاب بھی ہونا چاہئے جس میں ان کے سامنے مسئلہ فلسطین سے متعلق ضروری باتیں رکھی جائیں اور حقائق واضح کئے جائیں۔ اس کے لئے حضرت نے مشہور اخوانی مجاہد و رہنما شیخ محمد محمود صواف سے گفتگو فرمائی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں رابطہ کے ذمہ داروں سے گفتگو کی اور سب نے اس کام کے لئے حضرتؒ ہی کا نام تجویز کیا، جلسہ میں دیر رات کو یاسر عرفات آئے، رسمی کاروائیوں کے بعد حضرتؒ نے ان کے سامنے وہ پر جوش، پر تاثیر اور مبنی بر حقائق تقریر فرمائی جو حضرتؒ کی شاہکار تقریروں میں سے ہے، اس میں حضرتؒ نے صاف صاف بیت المقدس کے

(۱) ماخوذ از سفر نامہ حجاز از مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ (غیر مطبوعہ)

عرصہ کے بعد یہ ایک نمائندہ اجلاس تھا جس میں ملک کے چیدہ دانشور، یونیورسٹیوں کے پروفیسر، متعدد سابق وحال وزراء، متعدد سیاسی پارٹیوں کے ذمہ دار، تاجر، وکیل، ڈاکٹر اور ہندوستان کے مختلف مذاہب کے لوگ شریک ہوئے، حضرتؒ نے خطبۂ صدارت "ملک کا حقیقی مسئلہ اور اس کے لئے حقیقی خطرہ" کے عنوان سے پیش فرمایا۔ کونشن کے اختتام پر حضرتؒ نے ایک اثر انگیز اور پرجوش تقریر فرمائی جو حضرت کی یادگار تقریروں میں سے ہے، اس میں صاف صاف بلند آہنگی اور پوری قوت وجرأت کے ساتھ حضرتؒ نے معاشرہ کا تجزیہ فرمایا اور ہندوستان میں اخلاقی انارکی اور ان انسانیت سوز، اخلاق سوز، برائیوں کا تذکرہ فرمایا جو عام ہوتی جارہی ہیں۔ اس اجلاس اور خاص طور سے حضرتؒ کی اس موثر تقریر نے بڑا اثر ڈالا اور فضا کچھ سازگار ہوئی۔

حجاز کے دو سفر اور یاسر عرفات کے سامنے ایک اہم تقریر

۵/ فروری ۱۹۸۱ء میں مکہ مکرمہ میں منعقدہ اصلاح المساجد کے جلسہ میں شرکت کے لئے حضرتؒ نے مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی رفاقت میں حجاز کا سفر کیا، وہاں کے قیام میں متعدد پروگرام ہوئے، اس سفر کی روداد بھی مولانا محمد ثانی حسنی صاحبؒ نے قلمبند فرمائی تھی، مدینہ منورہ کے ایک پروگرام کے بارے میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"شیخ محمد المجذوب کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی، وہ تشریف لائے اور ماموں جی کا تعارف بڑے بلند الفاظ میں کیا، تعریف کرتے کرتے وہ جذبات میں ڈوب گئے اور جو کہہ سکتے تھے وہ تعریف وتوصیف میں کہہ گئے، پھر ماموں جی کا محاضرہ شروع ہوا، ماموں جی نے اپنے ایک گھنٹہ کے محاضرہ میں مغربی تہذیب وتمدن پر سخت تنقید کی، تقریر کے آغاز میں ماموں جی نے صحابہ کی سادگی اور روم وایران کی تہذیب سے انکے استغناء کا تذکرہ کیا پھر

موجودہ مرعوبیت اور مغربی تہذیب سے متاثر ہونے پر تنقید کی، ماموں جی کی تقریر میں اتنا زور تھا کہ اکثر حضرات رو رہے تھے اور پورا ہال جھوم رہا تھا۔" (۱)

اس کے پانچ ہی مہینے کے بعد ۳۱؍ اگست ۱۹۸۱ء کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور رابطہ عالم اسلامی کے جلسوں میں شرکت کے کے لئے حضرتؒ دوبارہ حجاز تشریف لے گئے۔ مولانا سید سلمان الحسینی صاحب اس سفر میں حضرت کے رفیق تھے۔ چند سال سے رابطہ نے موسم حج میں آئے ہوئے اہم علماء و اہل فکر کے محاضرات کا سلسلہ شروع کیا تھا، اس سال شیخ علی الحرکان نے حضرتؒ کو دعوت دی کہ اس سلسلۂ محاضرات کا افتتاح فرمائیں اور حدیث پر محاضرہ دیں۔ حضرتؒ نے "اسلامی مزاج اور ماحول کی تشکیل میں حدیث کا بنیادی کردار" کے عنوان سے ۱۶؍ ذی قعدہ کی شب میں علماء و اعیان مکہ اور اہل ذوق حجاج کرام کے ایک بڑے مجمع میں یہ مقالہ پیش فرمایا، بعد میں یہ عربی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے شائع کیا گیا۔

اسی دوران فلسطینی تحریک آزادی کے سربراہ یاسر عرفات کی حجاز آمد ہوئی اور رابطہ کی طرف سے ان کے لئے ایک حفلۂ تکریم ترتیب دیا گیا، حضرتؒ نے شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ رسمی تقریروں سے ہٹ کر کوئی ایسا خطاب بھی ہونا چاہیے جس میں ان کے سامنے مسئلہ فلسطین سے متعلق ضروری باتیں رکھی جائیں اور حقائق واضح کیے جائیں۔ اس کے لئے حضرت نے مشہور اخوانی مجاہد و رہنما شیخ محمد محمود صواف سے گفتگو فرمائی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں رابطہ کے ذمہ داروں سے گفتگو کی اور سب نے اس کام کے لئے حضرتؒ ہی کا نام تجویز کیا، جلسہ میں دیر رات کو یاسر عرفات آئے، رسمی کارروائیوں کے بعد حضرتؒ نے ان کے سامنے وہ پر جوش، پر تاثیر اور مبنی بر حقائق تقریر فرمائی جو حضرتؒ کی شاہکار تقریروں میں سے ہے، اس میں حضرتؒ نے صاف صاف بیت المقدس کے

---

(۱) ماخوذ از سفر نامہ حجاز، از مولانا سید محمد علی حسنیؒ (غیر مطبوعہ)

ساتھ مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا ذکر فرمایا اور فلسطینی قائد کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی صفات اختیار کرنے اور صحیح اسلامی جذبات کے ساتھ اس کام کو انجام دینے کی کھل کر دعوت دی۔

کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے ایک علمی اعزاز

کشمیر یونیورسٹی نے ۲۹؍اکتوبر ۱۹۸۱ء کو اعزازی طور پر حضرتؒ کو ڈاکٹر کی سند دینے کا فیصلہ کیا، اس سلسلہ میں وائس چانسلر وحید الدین ملک صاحب گورنر جموں و کشمیر بی کے نہرو صاحب اور پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے حضرتؒ سے رابطہ قائم کیا اور قبول کر لینے کی درخواست کی۔ حضرتؒ نے اس شرط کے ساتھ کہ اس کی حیثیت خالص علمی و ادبی ہوگی اس کو منظور فرمالیا، اس کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ حضرتؒ کے سامنے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی نظیریں تھیں جن کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے یہ اعزاز دیا گیا تھا اور انھوں نے اس کو قبول کیا تھا۔ دوسرا بڑا محرک یہ بھی تھا کہ اس موقع پر یونیورسٹی کے اساتذہ و فضلاء، جدید تعلیم کے ماہرین اور ملک کے بعض ذمہ داروں کے سامنے اپنے خیالات اور مشوروں کے پیش کرنے کا موقع ملے گا۔ حضرتؒ خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس تقریب میں مجھے صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ مجھے اپنا مقالہ پڑھنے کا موقع ملے جو میں نے "علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے تیار کیا تھا اور کوشش کی تھی کہ اس میں اپنا دل و دماغ نکال کر رکھ دوں —

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

کانفرنس کی روایات و رسمیات میں جتنی دیر لگ رہی تھی میرے دل میں اضطراب پیدا ہو رہا تھا کہ میرے لئے اپنے خیالات پیش کرنے کا وقت نہ رہے؟ جو

اس پورے سفر اور اس کی تقریب میں شرکت کا مقصود اصلی اور قیمت ہے"۔(۱)
گورنر بی کے نہرو نے کہا "میں نے بہت سے جلسہائے تقسیم اسناد میں شرکت کی لیکن ایسا فکر انگیز خطبہ نہیں سنا"۔
وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر شیخ عبد اللہ نے خطبہ کے بارے میں اپنے ایک مکتوب میں لکھا۔

"مذکورہ جلسہ میں آپ کی آمد اور فکر انگیز انداز میں ہم عصر مسائل پر حقیقت پسندانہ نظر سب باتوں کی بازگشت ابھی تک یہاں سنائی دے رہی ہے، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہم عصر زندگی کی انفرادی و اجتماعی الجھنوں کی عکاسی جس انداز میں آپ کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے، اس طرح نہ صرف یہ کہ معاشرہ کی اصلاح کے لئے نیا راستہ نکل آتا ہے بلکہ اس سے لوگوں کی بھی جو مختلف سطحوں پر معاشی اقتصادی اور سماجی حالات سے نبرد آزما ہیں بہت بڑی راہ نمائی ہو جاتی ہے، امید ہے کہ آپ اپنی دعاؤں میں بدستور یاد رکھیں گے۔

خیر اندیش
شیخ محمد عبد اللہ (۲)

حضرتؒ کا یہ سفر کشمیر طویل عرصہ کے بعد ہوا تھا اس لئے وہاں کی اہم شخصیتوں، تنظیموں، اور اداروں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی اور حضرتؒ کے نو دن کے قیام میں اہم اور مرکزی مقامات پر حضرتؒ کی دسیوں تقریریں ہوئیں، کسی کسی دن تین تین پروگرام ہوتے۔ میر واعظ مولانا فاروق نے خاص طور پر مختلف مجالس کا انتظام کیا۔
اہم تقریروں میں جامع مسجد میں جمعہ کے بعد کی تقریر ہے جس میں ہزاروں

---

(۱) کاروان زندگی دوم ۳۴۴
(۲) کاروان زندگی دوم ص ۳۴۰

لوگ شریک ہوئے اور حضرتؒ نے "وادیٔ کشمیر میں توحید خالص کا پیغام" کے عنوان سے خطاب فرمایا۔ میر واعظ منزل میں خواص کے ایک بڑے مجمع میں ان کو ان کا مقام اور ذمہ داریاں یاد دلائیں، سب سے اہم تقریر نصرۃ الاسلام ہال میں کی گئی جس میں سری نگر اور اطراف کے علماء و اہل فکر بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

یہ سب تقریریں بعد میں "تحفۂ کشمیر" کے نام سے کتابی شکل میں "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" سے شائع کر دی گئیں۔

اہم خاندانی حادثہ

جنوری ۱۹۸۲ء میں حضرتؒ نے حجاز کا سفر فرمایا، ۱۵؍ فروری کو جب واپسی ہوئی تو اچانک وہ حادثہ پیش آیا جس نے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا؛ حضرتؒ کے سب سے بڑے بھانجے مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ نے ایک مختصر علالت کے بعد وفات پائی۔ مولانا مرحوم حضرت کے شروع سے سفر و حضر کے رفیق اور قوت بازو تھے، حضرتؒ کو اپنی سوانحی تصنیفات میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی اور یہ قرین قیاس تھا کہ وہ حضرتؒ کی وفات کے بعد حضرتؒ کی نہایت جامع سوانح مرتب کریں گے، اور خاندانی سلسلہ و روایات کے امین و وارث ہوں گے، لیکن برادر زادہ مولانا محمد الحسنیؒ صاحب کے بعد یہ دوسرا حادثہ پیش آیا جس نے سارے منصوبوں کو زیر و زبر کر دیا۔ ۱۶؍ فروری کو یہ حادثہ پیش آیا اور اسی دن شام کو حظیرہ شاہ علم اللہ میں اپنے محبوب بھائی مولانا سید محمد الحسنیؒ کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے۔ پہلی نماز جنازہ دار العلوم میں ایک بڑے مجمع کو مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ نے پڑھائی اور دوسری نماز نماز جنازہ رائے بریلی میں حضرتؒ کی امامت میں ادا کی گئی اور اتنا بڑا مجمع دیکھنے میں آیا جو اس چھوٹی سی بستی میں کم ہی اس سے پہلے ہوا ہوگا۔

مولانا مرحوم حضرت شیخؒ کے مجاز بھی تھے، شیخ پر بھی اس حادثہ کا گہرا اثر پڑا اور انھوں نے حضرتؒ کو اپنی اس بیماری کے حال میں تعزیتی مکتوب تحریر فرمایا

اوراس کے تین مہینے کے بعد خود حضرت شیخ کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔

دارالمصنفین کا "اسلام و مستشرقین" پر سیمینار

۲۶ر ۲۷ر ۲۸ر فروری کو دارالمصنفین میں اسلام و مستشرقین کے عنوان سے ایک بین الاقوامی سیمینار کا پہلے سے اعلان ہو چکا تھا، اور حضرتؒ اس کے مشوروں میں شریک تھے، تین دن تو تعزیت میں آنے والوں سے ملنے میں گذرے لیکن حضرتؒ نے جن کی پوری زندگی صبر و عزیمت میں گذری اس میں شرکت کا فیصلہ کرلیا، مقالہ بھی تیار فرمایا اور خواہر زادہ مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب مدظلہ کے ساتھ دارالمصنفین تشریف لے گئے، مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کے لئے یہ سخت اور صبر آزما مرحلہ تھا کہ تین چار روز قبل اس حقیقی بھائی کی وفات ہوئی تھی جو جان چھڑکنے والا تھا، مگر وہ بھی حضرت کے مزاج کا پرتو اور اسی راہ کے رہ رو تھے۔

حضرتؒ کے مقالہ کے منتخب اقتباسات مولانا سید سلمان حسینی صاحب نے پیش کیے اور حضرتؒ نے اردو میں اسی موضوع پر تقریر فرمائی جو بعد میں "اسلام اور مستشرقین" کے نام سے طبع ہوئی۔

حضرت شیخ الحدیثؒ کا سانحۂ وفات

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ سے حضرتؒ کا تعلق شروع سے تھا اور مشائخ میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ حضرت رائپوریؒ اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے بعد حضرت، شیخ کو ہی اپنا شیخ و مربی سمجھتے رہے۔ حضرت شیخ کو بھی حضرتؒ سے بڑی محبت و شفقت تھی۔ حضرت کے نام حضرت شیخ کے تقریباً تین سو خطوط (جن میں بعض بعض کئی کئی صفحات پر مشتمل ہیں) اس تعلق کا واضح ثبوت ہیں، متعدد خطوط میں انہوں نے حضرتؒ کو

تحریر فرمایا ہے کہ ''مولوی محمد یوسف مرحوم کے بعد اب آپ سے ہی سب سے زیادہ مناسبت ہے'' ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ ''اب تو نظام الدین اور آپ کے دار العلوم ہی سے امیدیں ہیں اور ان کے لئے دعا کرتا رہتا ہوں''۔ ایک مرتبہ حجاز مقدس میں غالباً مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ جاتے ہوئے فرمانے لگے کہ ''مولوی یوسف مرحوم کے بعد مایوسی ہونے لگی تھی مگر آپ کو دیکھ کر ڈھارس ہوتی ہے۔''
ایک جگہ تحریر فرمایا کہ ''مولوی ابوالحسن علی صاحب مجموعۂ حسنات ہیں۔''

حضرتؒ تشریف لے جاتے تو بڑا اہتمام فرماتے، ایک مرتبہ گوشت کا پرہیز تھا۔ حضرتؒ نے خط میں حضرت شیخ کو اس کی اطلاع کردی تو شیخ نے حضرتؒ کے اعزاز میں آٹھ دس قسم کی ترکاریاں تیار کرائیں، جتنے روز حضرتؒ مقیم رہے دستر خوان پر گوشت نہیں آیا حالانکہ شیخ کو گوشت بہت مرغوب تھا۔

حجاز کے قیام میں بھی حضرتؒ کا بڑا خیال رہتا، یہ بھی اہتمام تھا کہ حضرتؒ شام کو ساتھ ہی کھانا تناول فرمائیں، اگر کہیں شام کی دعوت ہوتی تو شیخ کو ناگوار ہوتا۔

یہ بھی شیخ کے اعتماد و محبت کی دلیل ہے کہ انھوں نے اپنی حدیث کی تصنیفات پر حضرتؒ سے باصرار مقدمات لکھوائے۔ یکم شعبان ۱۴۰۲ھ کو مدینہ طیبہ میں وفات ہوئی۔ حضرتؒ اس وقت لکھنؤ میں تھے، اسی شام کو دار العلوم میں تعزیتی جلسہ ہوا جس میں حضرتؒ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے گلوگیر آواز میں خطاب فرمایا۔ حضرتؒ نے کاروان زندگی میں تحریر فرمایا کہ ''ان کی وفات سے ہم سب اہل تعلق نے یتیمی کی کیفیت محسوس کی رحمہ اللہ الابرار الصالحین والعلماء الربانیین المخلصین۔(۱)

الجزائر کا سفر

الجزائر میں کئی سالوں سے کسی ایک اسلامی موضوع پر حکومت کے شعبۂ امور مذہبی کی طرف سے ایک عالمی سیمینار منعقد کیا جاتا تھا، حضرت کو اس میں مدعو

(۱) کاروان زندگی دوم ۳۴۸

کیا جاتا تھا لیکن کوئی نہ کوئی مانع پیش آجاتا۔ شوال ۱۴۰۲ھ کے سیمینار میں جو حدیث کے موضوع پر ہو رہا تھا بڑے اصرار سے دعوت آئی، سیمینار کے ناظم کے علاوہ وہاں کے وزیر امور مذہبی نے خصوصی طور پر کئی خطوط بھیجے، حضرتؒ کے رفیق سفر مولانا سید محمد رابع حسنی کو الگ سے دعوت نامہ بھیجا گیا، اس لئے حضرتؒ نے سفر منظور فرمالیا اور عید کے فوراً بعد ۲۸ر جولائی کو مولانا محمد رابع حسنی صاحب کے ساتھ الجزائر تشریف لے گئے، یہ عالمی سیمینار اس سال تلمسان میں ہو رہا تھا اس لئے دوسرے دن بذریعہ طیارہ تلمسان پہونچے۔

سیمینار میں پورے عالم اسلام کی نمائندگی تھی اور ممتاز ترین علماء اساتذہ اور اہل فکر وہاں موجود تھے حضرتؒ نے " طبیعة هذا الدین و سماته البارزة " (دین کا مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات) کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ ایک اجلاس کی صدارت بھی فرمائی۔ مندوبین وشرکاء اجلاس میں حضرتؒ کا رسالہ " دور الحدیث فی تکوین المناخ الاسلامی " چھاپ کر تقسیم کیا گیا۔ مولانا محمد رابع صاحب حسنی نے الگ سے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ وزارت امور مذہبی اور سیمینار کے ذمہ داروں نے حضرتؒ کے ساتھ ہر جگہ خصوصیت برتی۔ ہفتہ عشرہ قیام کے بعد ۸ر اگست کو ہندوستان واپسی ہوئی۔

سری لنکا کا سفر

فروری کی کسی تاریخ میں سیلون میں واقع " الجامعة النظیمیة " کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد شکری نے نائب مدیر جامعہ مولانا شہید اللہ صاحب کو دعوت نامہ دے کر لکھنؤ بھیجا، الگ سے حضرت کے نام شیخ علی الحرکان کا سفارشی خط بھی آیا کہ حضرت اس دعوت نامہ کو قبول فرمالیں۔

مولانا سید سلمان حسینی کو ہمراہ لے کر ۲ر مئی کو حضرتؒ لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ اس جامعہ کا قیام آٹھ سال پہلے ہوا تھا، اس کے فارغین کی پہلی جماعت کو

اس عظیم الشان جلسۂ تقسیم اسناد میں جس میں متعدد وزراء، سفراء اور مسلمان رہنما شریک تھے حضرتؒ کے دست مبارک سے اسانید تقسیم کی گئیں اور حضرتؒ نے خطاب فرمایا۔ یہ یونیورسٹی حضرت کے رسالہ " ردة ولا ابا بكر لها " کی فکر کو سامنے رکھ کر قائم کی گئی تھی۔

اس پروگرام کے علاوہ حضرتؒ کی آٹھ تقریریں ہوئیں جن میں تبلیغی جماعت کے مرکز میں کولمبو کی جمیۃ العلماء کے ارکان کے سامنے اور کلیۃ الزاہرہ کی تقریریں بڑی اہم ہیں۔

بیروت کاالمیہ

۱۹۸۲ء کے اواخر میں بیروت کا وہ المیہ پیش آیا جس میں مسلمان بھیڑ بکری کی طرح مارے گئے جس کی مثال قریبی زمانہ میں نہیں ملتی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں "اسی کے ساتھ عرب ملکوں کی بے حسی و بے بسی اور بڑی طاقتوں کی تماشابینی کو دیکھ کر میرا دل پارہ پارہ ہو گیا۔(۱)

حضرتؒ نے اپنے سفر بیروت میں جو اس واقعہ سے کئی سال پہلے ہوا تھا یہ خدشات ظاہر فرمائے تھے اور اس وقت یہ الفاظ تک فرمادیئے تھے کہ "عمارتوں کی دیواروں میں گولیوں اور خون کے نشان اور لوگوں کے دلوں میں اس کے ناسور دیکھے" یہ بات حقیقت بن کر سامنے آگئی۔ حضرت نے اس سے متاثر ہو کر ایک بیان جاری فرمایا جس میں اس واقعہ پر گہرا تاثر اظاہر کیا، اور صاف صاف تحریر فرمایا کہ "اس وقت بھی متمدن تعلیم یافتہ اور تہذیب کے مدعی انسانوں میں وہ خونخواری پائی جاتی ہے جو دور جہالت کی خصوصیت اور آدم خور قوموں اور قبائل کی روایت سمجھی جاتی تھی، اور آج بھی اس متمدن دنیا میں جنگل کا قانون چل رہا ہے۔ پھر اس صورت حال کے ازالہ کے سلسلہ میں ان تدابیر کا ذکر فرمایا جن کی قرآن اور شریعت اسلامی تعلیم دیتی ہے۔

اس بیان کی وسیع پیمانہ پر اشاعت ہوئی، امریکی صدر ریگن کو بھی اس کی ایک

کاپی بھیجی گئی جس کی وصولیابی کی رسید بھی بھیجنے والے کو پہونچی جو انھوں نے حضرتؒ کو بھیج دی۔

اسی طرح دسمبر ۱۹۸۲ء میں افغان مجاہدین کی حمایت و تائید میں ایک بیان جاری فرمایا جس نے دنیا کی دوسری عظیم طاقت کا مقابلہ کر کے اپنی دینی حمیت کا ثبوت دیا تھا، اس بیان کی بھی وسیع پیمانہ پر اشاعت ہوئی۔

وسط اکتوبر میں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجیز (Central Institute of English and Foreign Languages) کی دعوت پر حیدر آباد کا سفر ہوا، اس آل انڈیا عربک سیمینار کا حضرت نے افتتاح فرمایا۔ چار روز کے قیام میں مرکزی مقامات پر متعدد تقریریں ہوئیں۔ حیدر آباد سے واپسی پر دو روز اورنگ آباد میں بھی قیام رہا۔ ۱۶/ اکتوبر کو اورنگ آباد آزاد کالج میں "قصہ سات جواں مردوں کا" کے عنوان پر خطاب ہوا۔ اگلے دن جامع مسجد اورنگ آباد میں ایک بڑے مجمع کے سامنے دینی دعوتی خطاب ہوا۔

حضرتؒ کی صدارت میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے "اسلامک سنٹر" کا قیام

مئی ۱۹۸۳ء کے اوائل میں مشہور مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ کا حضرت کے نام ایک خط آیا کہ مشہور تاریخی یونیورسٹی آکسفورڈ میں ایک اسلامک سنٹر کے قیام کی تجویز زیر غور ہے اور ڈاکٹر براؤننگ جو اس کے کسی کالج کے وائس پرنسپل اور استاذ ہیں اس میں خاصی دلچسپی لے رہے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس کی تاسیس میں شرکت فرمائیں اور "اسلام اور مغرب" کے عنوان سے مقالہ بھی پڑھیں۔ حضرت کی زمانہ سے خواہش تھی کہ مغربی تہذیب کے قلب میں اور اس کے علمبرداروں کے سامنے اسلام کی صداقت و حقانیت اور ابدیت پیش کریں، اس لئے حضرتؒ نے دعوت قبول فرمائی اور مولانا محمد رابع حسنی صاحب مدظلہ کے

ہمراہ ۲۱ر جولائی کو لندن پہنچ گئے۔ مرکز کی دستور ساز مجلس میں شرکت کے لئے پاکستان کے مشہور ماہر قانون اے کے بروہی صاحب بھی تشریف لائے تھے، دوسرے دن اکزامینشن ہال میں عمومی مجلس تھی، حضرتؒ نے اس میں مختصراً عربی میں خطاب کیا، پھر انگریزی میں چند کلمات فرما کر ڈاکٹر فرحان صاحب کو اپنا وہ مضمون سنانے کی دعوت دی جو حضرتؒ نے "اسلام اور مغرب" کے عنوان سے تیار فرمایا تھا، ڈاکٹر فرحان صاحب نے سید محی الدین صاحب کا کیا ہوا اس کا ترجمہ سنایا۔

پورے قیام میں ذمہ داروں نے حضرتؒ کے مزاج و مذاق کی رعایت رکھی اور میزبانوں نے جو سب مغربی میں تھی اس کا خیال رکھا کہ کوئی چیز اسلامی تعلیمات اور اس طبقہ کے ذوق و مسلک کے خلاف نہ ہو جس سے حضرت کا تعلق ہے۔

۲۳ ر ۲۴ ر جولائی کو اس مرکز کی تاسیس عمل میں آئی اور باصرار حضرتؒ کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔

اس تقریب کے علاوہ مختلف مقامات پر حضرتؒ نے خطابات فرمائے جن کا مشترک موضوع برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریاں، صحیح طریق عمل اور خطرات کی نشان دہی تھا۔ ۳۱ ر جولائی کو یہ سفر تمام ہوا اور لکھنؤ واپسی ہو گئی۔

امارات و کویت کا دورہ

شیخ عبد اللہ العلی المحمودؒ امارات کی ایک محبوب و محترم شخصیت تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے سعادت مند فرزندوں خاص طور پر شیخ سالم عبد اللہ نے یہ طے کیا کہ ان کی یادگار کے طور پر ان کے ذاتی کتب خانہ کو عوامی کتب خانہ بنا دیا جائے اور اس میں مزید ضروری اہم کتابیں داخل کر دی جائیں کہ وہ امارات کا بڑا اسلامی کتب خانہ بن جائے۔

شیخ عبد اللہ العلی المحمود کے حضرتؒ سے خصوصی تعلق کی بنا پر ان کے صاحبزادگان نے حضرتؒ کو اس کے افتتاح کے لئے دعوت دی۔ مسلسل سفروں اور مصروفیت کی وجہ سے حضرتؒ نے معذرت فرمائی لیکن وہ مصر ہوئے کہ حضرتؒ

کے افتتاح کے بغیر وہ کام نہیں ہوگا، شیخ عبداللہ کے تعلق سے حضرتؒ نے دعوت قبول فرمائی اور مولانا محمد رابع صاحب کی معیت میں شارقہ تشریف لے گئے، تقریب بڑے پیانہ پر کی گئی اور اس میں حاکم شارقہ، حاکم عجمان اور وزراء و اعیان نے شرکت کی۔ حضرتؒ کا اس میں مدلل اور موثر خطاب ہوا۔

اس سفر میں اس تقریب کے علاوہ متعدد جلسوں میں حضرتؒ کے خطابات ہوئے جن میں جامعۃ العین میں " ازمة هذا العصر الحقيقية "(عہد حاضر کا اصل حقیقی خلا اور ضرورت) کے عنوان سے خطاب ہوا۔ كلية البنات میں ایک تقریر "خواتین کا مسلم معاشرہ میں خصوصی کردار" کے عنوان سے ہوئی، ابوظہبی کی ایک مسجد میں " الى الاسلام من جديد " کے عنوان سے خطاب ہوا۔

کویت کی وزارت اعلام کی طرف سے کئی ہفتوں سے دعوت آرہی تھی، حضرتؒ نے چاہا کہ اسی سفر میں یہ سب کام ہو جائیں، اس لئے ۲ر نومبر کو کویت تشریف لے گئے اور اسی دن بعد مغرب کویت یونیورسٹی کے کلیۃ العلوم کے میدان میں ایک بڑے اجلاس میں "الاسلام و الحضارة الانسانية" (اسلام اور انسانی قدریں) کے عنوان سے مقالہ پیش فرمایا۔ ۲۶ر نومبر کو جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی کے میدان میں عالم اسلامی کی موجودہ صورت حال کے عنوان سے ایک اہم تقریر ہوئی۔

یہ سفر حرمین شریفین پر ختم ہوا۔ وہاں سے عمرہ اور مدینہ طیبہ حاضری کے بعد ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو ہندوستان واپسی ہوئی۔

"آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ" کی صدارت کیلئے انتخاب

"آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ" کی تشکیل کا جو ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں ہوئی تھی تذکرہ گذر چکا ہے، حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ بالاتفاق اس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۷۷ء کے رانچی کے اجلاس میں بعض حلقوں کی طرف سے صدارت کے لئے حضرتؒ کا نام لیا گیا لیکن حضرت نے ایسا تاریخی جملہ فرمایا کہ

لوگوں کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں مل سکا، حضرت نے فرمایا کہ "طوفان میں کشتی نہیں بدلی جاتی" اس میں حضرتؒ کی تواضع کے علاوہ حضرت قاری صاحبؒ کا احترام اور ادارہ کا اتحاد و سالمیت بھی مقصود تھی۔

قاری صاحبؒ کی وفات کے بعد اس کے پہلے اجلاس میں جو ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۸۳ء میں مدراس میں ہو رہا تھا، حضرتؒ نقرس کی شدید تکلیف کی وجہ سے شرکت نہیں فرما سکے، اسی اجلاس میں بالاتفاق صدارت کے لئے حضرتؒ کا نام پیش کیا گیا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ

"مجھے جب اس کی اطلاع ہوئی تو "سنگ آمد و سخت آمد" کا مضمون تھا، یہ فیصلہ میری افتاد طبع، صحت جسمانی، عمر اور دوسری ذمہ داریوں اور مشغولیتوں سے میل نہیں کھاتا تھا، اگر یہ کسی بھی سیاسی، ملی تنظیم اور باعث افتخار واعزاز منصب کے قبول کرنے کا ہوتا تو میں بغیر کسی ادنیٰ تردد کے انکار کر دیتا لیکن ایک تو مسئلہ کی نوعیت واہمیت کی وجہ سے جس کو میں اپنے عقیدہ کا جزء اور مسلمانوں کی ملی زندگی کے لئے شہ رگ کا درجہ دیتا ہوں، دوسرے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے احترام کی بناء پر جن کا بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے فرزند ہونے کی وجہ سے میں ہمیشہ لحاظ کرتا رہا ہوں چاروناچار قبول کرنا پڑا۔ دوستوں کی اس بات کو بھی اس میں دخل تھا کہ اس وقت بورڈ کو اختلاف وانتشار سے بچانے کے لئے بھی ایسا کرنا ضروری ہے، چنانچہ فارسی کے اس پرانے شعر پر عمل کرنا ہی پڑا ۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن (۱)

(۱) کاروان زندگی سوم ص ۱۱۳

تیرہواں باب

۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۹ء تک اہم واقعات، اسفار، تحفظ ملت کی اہم کوششیں اور بعض اہم وفیات

بنگلادیش کا پہلا سفر

عجیب اتفاق ہے کہ حضرتؒ نے دنیا کے دور دراز ملکوں کے طویل طویل اسفار فرمائے لیکن بنگلادیش اس سعادت سے محروم رہا، حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے عالی مرتبت خلفاء سے قدیم تعلق کے باوجود بھی حضرتؒ وہاں تشریف نہ لے جا سکے۔ کئی سالوں سے اہل تعلق اصرار کر رہے تھے مگر "کل شئ مرهون بوقته" (ہر چیز کا وقت متعین ہے) بالآخر اس سفر کی تقریب نکل آئی اور بنگلادیش کے بعض اہم مدارس اور تنظیموں کی خواہش و طلب اور اسلامک فاؤنڈیشن ڈھاکہ کی دعوت پر ۹ مارچ ۱۹۸۴ء کو حضرتؒ اپنے رفقاء کے ساتھ ڈھاکہ تشریف لے گئے، دس روز بنگلادیش میں قیام رہا جس میں ڈھاکہ، چاٹگام، کوکس بازار، ستار گاؤں، مومن شاہی اور سلہٹ کے مرکزی مقامات پر جانا ہوا، بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں ہوئیں، برما کی سرحد تک تشریف لے گئے، تشریف آوری کی خبر سن کر بہت سے برما کے اہل علم و اہل فکر ملنے آئے، وہ حضرتؒ کے برما کے سفر اور حقائق پر مبنی تقریروں کو یاد کر کر کے روتے تھے کہ آج سے بیس سال پہلے حضرتؒ نے اپنی نگاہ بصیرت سے دیکھ کر جو خدشات ظاہر فرمائے تھے اور ان کا علاج تجویز فرمایا تھا اس پر

عمل نہ کرنے کے نتیجہ میں وہ خدشات واقعات کی شکل میں سامنے آرہے تھے۔
۱۶ر مارچ کو جمعہ کے روز حضرتؒ نے جامع مسجد بیت المکرّم میں خطاب فرمایا اور حضرتؒ ہی کی اقتداء میں مجمع نے نماز ادا کی، صدر بنگلادیش جنرل محمد ارشاد بھی اس میں موجود تھے۔ اپنی تقریروں میں حضرتؒ نے ایک طرف قومی ولسانی جاہلیت و عصبیت پر سخت نکیر فرمائی اور دوسری طرف علماء واہل دین کو بنگلا زبان میں مہارت پیدا کرنے کی تلقین کی تاکہ وہ اس میدان میں دوسروں کے دست نگر نہ ہوں اور دین کی صحیح زبان میں ترجمانی کر سکیں، حضرتؒ نے اس خلیج کے پر ہونے پر بھی زور دیا جو علماء اور یونیورسٹیوں کے گریجویٹس کے درمیان حائل ہے تاکہ دونوں طبقہ دین وملت کی خدمت کے میدان میں دوش بدوش کام کر سکیں۔
رفقاء سفر میں سے مولانا ابوالعرفان خاں صاحبؒ، مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب اور مولانا سلمان حسینی صاحب ندوی کی بھی تقریریں ہوئیں اور ان کے بھی اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

شرق اردن کا سفر

حضرتؒ شرق اردن کے علمی و تحقیقی ادارے "موسسة آل البیت" کے عرصہ سے رکن تھے اور ہر مرتبہ بڑے اہتمام سے دعوت نامہ بھی آتا تھا لیکن ابھی تک شرکت کی نوبت نہیں آسکی تھی، مارچ یا اوائل اپریل میں پھر اس کا دعوت نامہ موصول ہوا، ولی عہد سلطنت امیر حسن نے بھی شرکت کی خواہش بار بار ظاہر کی اس لئے حضرتؒ نے سفر منظور فرمالیا۔
مولانا سید محمد واضح رشید ندوی کو ہمراہ لیکر ۲۳ر اپریل ۱۹۸۴ء کو دہلی سے روانہ ہوئے، ایک روز کویت ٹھہر کر ۲۴ر اپریل کو عمان تشریف لے گئے، ۲۵ر اپریل کو کانفرنس شروع ہوئی، حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے ممتاز علماء و مفکرین کے علاوہ مختلف ممالک کے سفراء اور شاہی خاندان کے افراد اور ممتاز لوگ

موجود تھے۔امیر حسن نے استقبال کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ حضرتؒ کا تذکرہ کیااور ممنونیت کااظہار کیا۔حضرتؒ اپنامقالہ سکرٹریٹ میں پیش فرماچکے تھے مگرامیر محترم کی خواہش پر زبانی خطاب فرمایااور اس میں خاص طور سے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کاخاکہ پیش کیا۔

امیر حسن نے اپنی تقریر میں مسئلہ فلسطین کومدلل انداز میں پیش کیااس کے بعد حضرتؒ نے بڑی اثر انگیز تقریر فرمائی، اس میں یہ جملہ بھی فرمایاکہ "اصل انقلاب انگیز طاقت اور ناممکن کو ممکن بنادینے والی چیز اس ہستی کا وجود ہے جو عزم وایمان کی خارق عادت طاقت سے سرشار صورت حال کو یکسر بدل دینے کے لئے تیاراور اس کی راہ میں ہر طرح کی قربانی وجاں نثاری، خطرپسندی و مہم جوئی کے لئے مضطرو بے قرار ہو۔"اس تقریر نے دلوں کو گرمادیااور سامعین اشکبار ہوگئے۔

عمان میں آٹھ روز قیام رہااور متعدد مقامات پر تقریریں ہوئیں اور اس مرتبہ بھی ڈاکٹر رفیق وفاد جانی کی معیت میں حضرتؒ نے اس غار کی زیارت فرمائی جس کے بارے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہی "اصحاب کہف" کاغار ہے۔

ولی عہد کی ایک دعوت میں یہ خاص بات پیش آئی کہ مفتی عمان شیخ حمد الخلیلی نے امیر کے سامنے "روائع اقبال" کے صفحات زبانی سنانے شروع کئے معلوم ہوتا تھاکہ پوری کتاب ان کوازبر ہے۔

۲ر مئی کو عمان سے جدہ واپسی ہوئی، رخصت کرنے کے لئے موسسہ کے صدر ڈاکٹر ناصر الدین اسد خود موجود تھے۔

حضرتؒ کی صدارت میں "رابطۂ ادب اسلامی" کا قیام

حضرتؒ جدہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، چندروزوہاں قیام فرماکر وہیں سے عمرہ کااحرام باندھ کر مکہ مکرمہ تشریف لائے اور عمرہ فرمایا۔

مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران وہاں کے ممتاز ادباء کا ایک وفد حضرتؒ کی

خدمت میں حاضر ہوا اور انھوں نے "رابطہ ادب اسلامی" کے نام سے ایک عالمی تنظیم کا مسودہ خدمت میں پیش کیا، اس کی صدارت قبول فرمالینے اور منظوری دینے کی درخواست کی، حضرتؒ نے اس کے عمومی فائدہ کے پیش نظر اس کو قبول فرمالیا۔

اس عالمی تنظیم کا قیام اتنا مبارک اور مفید ثابت ہوا کہ عالمی سطح پر ادباء کے ذہنوں میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی اور مختلف ملکوں کے ممتاز اہل قلم اور ادباء اس قافلہ میں شامل ہوئے اور اس کے نتیجہ میں ان کی ایک تعداد الحاد و دہریت سے محفوظ ہو گئی، ادب کے معنی میں وسعت پیدا ہوئی اور اب تک جس طرح ادب کو لادینیت کے ساتھ مربوط سمجھا جاتا تھا اس نظریہ میں عمومی طور پر تبدیلی پیدا ہوئی۔ اب تک مختلف ملکوں میں اس کے دسیوں کامیاب سیمینار منعقد ہو چکے ہیں جن کا تذکرہ اپنی اپنی جگہ پر کیا جائے گا۔

حجاز ہی کے قیام میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثانی کے سانحہ وفات کی خبر ملی جو حضرتؒ کے ساتھ ہندوستان میں ملی کاموں میں شریک اور بڑے معاون تھے، حضرتؒ سے ان کو بڑا تعلق تھا اور وہ ندوہ کی فکر کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے زمانۂ قیام میں انھوں نے بھری مجلس میں جس میں حضرت قاری طیب صاحبؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور دوسرے اہم لوگ موجود تھے یہ بات فرمائی تھی کہ "ہر تحریک اور فکر کا ایک دور ہوتا ہے اب یہ دور مولانا علی میاں اور ندوہ کا ہے"۔

یمن میں

یمن سے ہر صاحب ایمان کو تعلق اور وہاں جانے کا اشتیاق ہوتا ہے کہ زبان نبوت سے اس کے بارے میں تعریفی کلمات نکلے ہیں، لیکن حضرتؒ کے لئے اس تعلق کے علاوہ سفر کا ایک اور محرک یہ بھی تھا کہ حضرتؒ کے استاد شیخ خلیل عربؒ کا وہ وطن تھا اور ان کو یمن کی خصوصیات کا بڑا حصہ وراثت میں ملا تھا۔ یمن سے پہلے

بھی دعوت نامہ موصول ہوا تھا لیکن مصروفیات کی وجہ سے سفر نہ ہو سکا، شیخ احمد عبدہ ناشر نے جو وہاں ایک اہم دینی عہدہ پر حکومت کی طرف سے فائز تھے خصوصیت کے ساتھ دعوت دی تھی۔

جدہ ہی سے ۱۴؍ مئی کو حضرت صنعاء روانہ ہوئے یہ یمن کا پہلا سفر تھا وہاں کے لوگوں نے اس کو بہت اہمیت دی اور سرکاری سطح پر حضرت کا استقبال کیا گیا، سابق صدر جمہوریہ نے (جو اس وقت نائب صدر تھے) اس سفر و قیام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور مختلف پروگرام ترتیب دیے۔

پہونچنے کے دوسرے ہی دن پہلی تقریر صنعاء یونیورسٹی میں ہوئی، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، کرسیوں پر جن کو جگہ نہیں مل سکی تھی وہ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرتؒ نے تقریر شروع فرمائی تو طبیعت بڑی منشرح تھی اور مضامین کا ورود تھا، تقریر ڈیڑھ دو گھنٹہ جاری رہی، سامعین ہمہ تن گوش تھے۔

اس کے علاوہ بھی صنعاء میں متعدد تقریریں ہوئیں جن میں ایک تقریر ایر فورس ٹریننگ کالج میں ہوئی اور دوسری اہم تقریر ٹینک پر کام کرنے والے فوجیوں کے ہیڈ کواٹر میں ہوئی، فوجی جوانوں کے سامنے یہ خطاب کا دوسرا موقع تھا۔ حضرت نے سورہ نساء کی آیت ولا تهنوا فی ابتغاء القوم ان تكونوا تالمون فانهم يالمون كما تالمون وترجون من الله مالا يرجون۔ (اور دشمنوں کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرنا اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو جس طرح تم بے آرام ہوتے اسی طرح وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں اور خدا سے تم ایسی ایسی امیدیں رکھتے ہو جو وہ نہیں رکھ سکتے۔) کی آیت تلاوت فرما کر اس کی روشنی میں موثر اور طاقتور خطاب فرمایا، اس میں صحابہ کرام کے واقعات سنائے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھیوں کے بعض ایمان افروز واقعات کا بھی تذکرہ فرمایا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ تاریخی جملہ بھی سنایا کہ "اگر ہم اپنی حقانیت اور فضیلت کی بناء پر نصرت الٰہی کے مستحق نہیں ہوئے تو محض اپنی طاقت سے ان پر

غلبہ نہیں پاسکتے۔"تیسری تقریر جامع مسجد میں ایک بڑے مجمع کے سامنے ہوئی۔

صدر جمہوریہ یمن نے ایک روز دعوت کی اور حضرتؒ نے ان سے کھل کر گفتگو فرمائی، ان کے علاوہ وزیر اعظم، وزیر اوقاف، وزیر خارجہ اور بعض ارکان پارلیمنٹ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور حضرتؒ نے آزادی کے ساتھ ان سے گفتگو فرمائی اور ان لوگوں نے دلچسپی اور توجہ کا اظہار کیا، ان کے علاوہ علماء و قائدین سے بھی ملاقاتیں رہیں۔

تعز کی جامع مسجد جامع المظفر میں بھی خطاب ہوا وہاں سے زبید اور زبید سے خدیدہ تشریف لے گئے، حدیدہ حضرت کے محبوب استاد شیخ خلیل عرب اور شیوخ حدیث کا وطن ہے، حضرتؒ کو وہاں پہنچ کر بوئے انس آئی، وہاں تبلیغی مرکز میں خطاب ہوا، اس کے علاوہ معہد علمی میں مفصل خطاب ہوا، وہاں بچوں نے استقبال کرتے ہوئے دلکش اور پر اثر لہجہ میں اشعار پڑھے جن میں بار بار یہ مصرعہ آتا تھا

ع یا مرحبا بابی الحسن نمشی علی العیون والمقل

(ہم شیخ ابوالحسن کا استقبال کرتے ہیں اور دیدہ و دل ان کیلئے فرش راہ کرتے ہیں۔)

۲۱ر مئی کو یہ سفر پورا ہوا اور حضرتؒ جدہ ہوتے ہوئے ۲۳ر مئی کو کراچی تشریف لائے، چار روز وہاں قیام رہا، اس قیام میں اہم اجتماعات اور منتخب مجمعوں کے سامنے چھ تقریریں ہوئیں۔ان تقریروں کا قدر مشترک حسب ذیل تھا:

(۱) امت اسلامیہ کے تاریخی دشمنوں کے کردار کا ذکر۔

(۲) پاکستان کے اسلامی تشخص کی نہ صرف حفاظت بلکہ اس کو مزید اجاگر کرنے کی ضرورت۔

(۳) عمومی طور پر پاکستانی رہن سہن، اسراف، تقریبات و مظاہر میں صرف بیجا پر نقد و احتساب اور اظہار تشویش۔

اردن میں حضرتؒ کو مسئلہ فلسطین کی مناسبت سے مسجد اقصیٰ کا جو خوبصورت مرمریں ڈھانچہ (Model) پیش کیا گیا تھا وہ حضرت نے صدر پاکستان جنرل محمد

ضیاء الحق کو پیش فرمادیا، اس میں زبان حال سے یہ اشارہ بھی تھا کہ "مسجد اقصیٰ کی بازیافت بھی ایک صاحب ایمان مسلم حکمراں کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔"

۲۹ر مئی کو یہ سفر اختتام کو پہونچا اور رمضان المبارک کے قرب کی وجہ سے رائے بریلی تشریف لے آئے۔

ہندو احیائیت کا طوفان،

اندرا گاندھی کے نام حضرتؒ کا تاریخی مکتوب اور ان کا قتل

۱۹۸۰ء میں کانگریس پھر برسر اقتدار آگئی اور اس مرتبہ اس نے اپنے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کھل کر مسلم مخالفت، پروپیگنڈہ، ہندو احیائیت کی تحریکوں کی پشت پناہی کی اور "وشو ہندو پریشد"، "شیو سینا" اور "آر ایس ایس" کو کام کرنے کی پوری آزادی دیدی، اسی کے نتیجہ میں ۷/۸ر اپریل ۱۹۸۴ء کو وشو ہندو پریشد کا ایک خفیہ اجلاس ہوا، اس میں ملک بھر کے انتہا پسند ہندو شریک ہوئے، اس میں مسلمانوں کے خلاف نہایت خطرناک تجاویز پیش کی گئیں اور اسی کے ساتھ بنارس کی گیان واپی مسجد، متھرا کی عیدگاہ اور اجودھیا کی بابری مسجد کو منہدم کرکے اول الذکر کو وشوناتھ کا مندر ثانی الذکر کو کرشن جنم بھومی اور ثالث الذکر کو رام جنم بھومی میں تبدیل کرنے کا مطالبہ تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ صورت حال بڑی تشویشناک اور قابل فکر تھی، حضرتؒ نے یہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر اس سے صرفِ نظر کیا گیا تو اس ملک کے دوسرے "اسپین" بن جانے کا اندیشہ ہے، سب سے پہلے آواز بلند کی اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کو ۲۴ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ایک صاف اور مدلل خط تحریر فرمایا لیکن قبل اس کے یہ خط ان تک پہونچتا وہ حفاظتی دستہ کے ایک سکھ سپاہی کے ہاتھوں ۳۱ر اکتوبر کو قتل کردی گئیں، اس کے رد عمل میں سکھوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات بھڑک اٹھے اور وہ ظلم وسفاکی میں حدود سے تجاوز کر گئے،

لوٹ مار میں کچھ مسلمان بھی شریک ہو گئے اور ان کے گھروں تک بھی غصب شدہ مال پہونچا، حضرتؒ نے اپنی مجلسوں میں بار بار یہ بات فرمائی کہ "جن گھروں میں یہ مال آئے گا ان میں بیماریاں اور آفتیں آئیں گی۔ اس جملہ کا اثر یہ ہوا کہ رائے بریلی شہر میں متعدد مسلمانوں نے یہ لوٹا ہوا مال واپس کر دیا اور بہت دنوں تک سکھ اپنی عقیدت مندی اور شکر گذاری کے لئے آتے رہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ "یہ میرا ایک اخلاقی و دینی فرض تھا جو میں نے ادا کیا واقعہ بھی یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلام اور قرآن نے اسی کی تعلیم دی ہے اور صاف کہا ہے۔ "ولا يجرمنكم شنآن قوم على ان لا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوى" (المائدہ۔ ۸) اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر نہ آمادہ کر دے کہ تم (اس کے ساتھ) انصاف ہی نہ کرو، انصاف کرتے رہو کہ وہ تقوی سے بہت قریب ہے"۔

حجاز مقدس کا ایک سفر اور حضرتؒ کے اعزاز میں استقبالیہ

اوائل ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ، اواخر دسمبر ۱۹۸۴ء میں حضرتؒ رابطہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے حجاز مقدس تشریف لے گئے، اس سفر میں مولانا واضح رشید صاحب مدظلہ کے فرزند مولوی جعفر مسعود ندوی صاحب ہمراہ تھے، محترمی سید طارق حسن عسکری صاحب بھی حضرتؒ کی راحت کے خیال سے ساتھ ہو گئے۔ رابطہ کے جلسہ کے علاوہ مکہ مکرمہ میں "نادی مكة الثقافی" میں تقریر ہوئی، مدینہ منورہ کے قیام میں "نادی المدينة المنورة الأدبی" کے ذمہ داروں کے شدید اصرار و خواہش پر "مكتبة الملك عبدالعزيز" میں "دور محمد اقبال فی توجيه الأدب والشعر" کے عنوان سے خطاب ہوا، عنوان نادی کے ذمہ داروں نے ہی منتخب کیا تھا، ذات گرامی ﷺ سے علامہ اقبال کے والہانہ تعلق و عشق کا حضرت نے تذکرہ فرمایا، اس کے بعد ادب و شاعری کو نیا رخ دینے میں اقبال کے

قائدانہ کردار اور اس کے اثرات پر روشنی ڈالی۔ تقریر میں مدینہ منورہ کے تمام اہم لوگ موجود تھے جن میں خاص طور پر شیخ عطیہ سالم قابل ذکر ہیں۔

اس سفر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جدہ میں وہاں کی ایک ممتاز و معروف شخصیت شیخ عبد المقصود خوجہ نے حضرتؒ کے اعزاز میں ایک جلسہ ترتیب دیا اس میں مکہ و جدہ کے ممتاز لوگ شریک ہوئے اور انھوں نے حضرتؒ کی عالمی سطح پر دعوتی و فکری اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور اپنے تاثرات ظاہر کئے۔ حضرتؒ کی دو کتابیں "السیرۃ النبویہ" اور "مختارات" بھی جلسہ میں تقسیم کی گئیں، حضرتؒ نے صرف شکریہ کی جوابی تقریر کے بجائے اس منتخب مجمع کو اس کے منصب اور کام کی طرف توجہ دلائی اور "إن لا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر" (اگر یہ نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائیگا) کی روشنی میں بہت مؤثر تقریر فرمائی۔

حرمین شریفین سے فارغ ہو کر حضرتؒ شیخ عبد اللہ ترکی کی دعوت پر ریاض تشریف لے گئے اور وہاں بعض اہم تقریبات میں شرکت فرما کر ہندوستان واپس تشریف لے آئے۔

ہندوستان کے حالات اور مستقبل کے خطرات حضرتؒ کے سامنے تھے "پیام انسانیت" کی تحریک کو مؤثر اور وسیع بنانے کا حضرتؒ کو اسی لئے ہمیشہ خیال رہتا تھا، مارچ ۱۹۸۵ء کے وسط میں اس سلسلہ کا "بندیل کھنڈ" کا ایک مختصر دورہ فرمایا، اس پورے سفر میں حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ نے نہ صرف رفاقت فرمائی بلکہ جلسوں کا انتظام بھی انھوں نے فرمایا اور خاص طور سے حضرتؒ کی راحت کا بے حد خیال رکھا۔

یورپ کا سفر

آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سنٹر کی بنیاد تو ڈال دی گئی تھی مگر اس کا

باقاعدہ افتتاح باقی تھا، دوسری طرف لکسم برگ (بلجیم) میں چند عرب فضلاء نے علوم اسلامیہ پر ایک تحقیقی مجلس قائم کی تھی اور حضرتؒ ہی کو اس کا صدر منتخب کیا تھا۔ ان دونوں جگہوں سے سفر کا اصرار تھا، حضرتؒ نے سفر منظور فرمالیا اور ۸/اکتوبر ۱۹۸۵ء کو مولانا محمد رابع صاحب حسنی مد ظلہ کے ہمراہ پہلے انگلستان تشریف لے گئے، ۹/اکتوبر کو اس کا باقاعدہ افتتاح کر دیا گیا، حضرتؒ کی طرف سے بحیثیت صدر ایک دعوت کا بھی انتظام کیا گیا جس میں یونیورسٹی کے پروفیسران، اعلی عہدیداران اور برطانیہ کے منتخب دانشور طبقہ کے لوگ شریک ہوئے۔ حضرتؒ نے ان کو خطاب فرمایا اور عالم انسانیت پر محسن انسانیت ﷺ کے احسانات کا تذکرہ فرمایا۔

۱۱/اکتوبر کو لکسم برگ تشریف لے گئے اور ۱۲/اکتوبر کو حضرتؒ کی صدارت میں "ادارہ تحقیقات اسلامیہ" کا جلسہ اس کے مستقر پر ہوا، اس سے فارغ ہو کر لندن واپس تشریف لائے اور ایک روز ٹھہر کر ۱۵/اکتوبر کو دہلی واپسی ہوئی۔

کلکتہ کا اجلاس پرسنل لا بورڈ

حضرتؒ کی صدارت کے بعد ۶، ۷، ۸، اپریل ۱۹۸۵ء میں پرسنل لا بورڈ کا پہلا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا، حضرتؒ نے عاملہ کے جلسہ میں تقریر فرمائی جو "مسلم پرسنل لا بورڈ کی صحیح نوعیت واہمیت" کے عنوان سے شائع ہوئی، ۷/اپریل کی شام کو جلسہ عام ہوا جس میں حاضرین کی تعداد پانچ لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی، اس میں حضرتؒ نے بڑی مؤثر اور پرجوش تقریر کی، کھل کر مسلمانوں کا احتساب کیا، شریعت پر عمل کرنے میں ان سے جو کوتاہیاں ہو رہی ہیں ان کی نشاندہی فرمائی اور ان کو خود شرعی قوانین پر عمل کرنے کی دعوت دی۔

حضرتؒ کی قیادت میں "مسلم پرسنل لا بورڈ" کی تاریخ ساز کامیابی

کلکتہ کے اجلاس سے فراغت ہوئی ہی تھی کہ ۲۳/اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم

کورٹ نے "نفقہ مطلقہ" کے سلسلہ میں اپنا وہ فیصلہ دیا جس میں دین میں کھلی مداخلت، قرآن مجید کے الفاظ کی من مانی تفسیر، شریعت اسلامی کی توہین اور اس پر کھلا حملہ تھا۔

اس فیصلہ کے خلاف اضطراب و پریشانی کے اظہار کی یہی شکل تھی کہ جگہ جگہ مسلمانوں کے ایسے عظیم الشان احتجاجی جلسے کئے جائیں جن کا اثر ملک کی انتظامیہ پر پڑے اور اعلیٰ عہدہ داران کچھ سوچنے پر مجبور ہوں، پرسنل لا بورڈ کی اپیل پر حضرتؒ کی صدارت میں پورے ملک میں ان جلسوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا اور لوگوں میں ایسا جوش و خروش پیدا ہو گیا کہ تحریک خلافت کی یاد دوبارہ تازہ ہو گئی، خود حضرتؒ کے وطن رائے بریلی میں اس سلسلہ کا تاریخی جلسہ منعقد ہوا جس میں اطراف سے مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد جمع ہوئی جو اس سے پہلے رائے بریلی کی سرزمین پر شاید ہی ہوئی ہو، انسانوں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، گھروں میں پردہ نشین خواتین کے ہجوم تھے جو کمروں میں اور چھتوں پر ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔

وزیر اعظم کے نام ہزاروں احتجاجی تار بھیجے گئے، دستخطی مہم بھی چلائی گئی جس میں لاکھوں مسلمانوں نے دستخط کئے۔ حضرت نے اس سلسلہ میں جب خاص طور پر جنوبی ہند کا دورہ فرمایا تو لوگوں کے جذبات امنڈ پڑے، آدھی آدھی رات کو گاڑی کسی اسٹیشن پر پہونچتی تو سیکڑوں ہزاروں لوگ استقبال کے لئے موجود ہوتے اور زیارت سے مشرف ہوتے، مسلمانوں میں دینی بیداری اور اسلام سے وفاداری کی ایک لہر دوڑ گئی لوگ زیارت کرتے اور کہتے کہ "شریعت کی حفاظت کے لئے جان و مال حاضر ہے"۔

اسی کے ساتھ دوسری طرف صدر بورڈ حضرتؒ اور جنرل سکریٹری حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے براہ راست وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سے ملاقات بھی ضروری سمجھی تاکہ افہام و تفہیم کے ذریعہ سے یہ مسئلہ حل کیا جاسکے، اس کے لئے حضرتؒ کی قیادت میں ایک وفد ۳۰؍ جولائی کو وزیر اعظم سے ملا، انھوں نے

ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا۔

۲ر فروری ۱۹۸۶ء میں حضرتؒ بورڈ کی میٹنگ کے سلسلہ میں دہلی میں مقیم تھے کہ خود وزیر اعظم نے تنہائی میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی، حضرتؒ نے چاہا بھی کہ بورڈ کے بعض دوسرے اہم ذمہ داروں کو ساتھ لے لیں لیکن وزیر اعظم نے خواہش کی کہ اس مرتبہ تنہا ہی تشریف لے آئیں، حضرتؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو شان استغناء عطا فرمائی تھی اس کا اثر پڑنا طبعی تھا، اس ملاقات میں حضرتؒ نے وزیر اعظم سے صاف صاف کہا کہ

"جس طرح رسم الخط کا ایک شارٹ ہینڈ (Short Hand) ہوتا ہے اسی طرح سیاست کا بھی ایک شارٹ ہینڈ (Short Hand) یا شارٹ کٹ (Short Cut) ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن کا مسئلہ ہے اس کو ان کے مخلص لوگوں سے سمجھ لیا جائے۔"(۱)

یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی، اسی مجلس میں پھر جب پارلیمنٹ میں ایسے بل کا ذکر آیا جس سے سپریم کورٹ کا فیصلہ کالعدم ہو سکتا ہے تو راجیو جی نے اس پر معذرت کی اور کہا کہ اب بل پارلیمنٹ میں پیش ہو جائے گا، حضرتؒ کی اس ملاقات سے وہ پوری طرح مطمئن ہو گئے۔ ۷ار فروری کو حضرتؒ کی قیادت میں جب وفد نے ملاقات کی تو انھوں نے صاف صاف اس مسئلہ سے دلچسپی ظاہر کی، اسی دوران بعض لوگوں نے ان سے یہ کہا کہ بل پاس ہونے سے پہلے مسلم ملکوں کا طرز عمل بھی معلوم کر لیا جائے کہ انھوں نے اپنے یہاں کے پرسنل لا میں کوئی ترمیم کی ہے یا نہیں؟ اگر انھوں نے کی ہے تو ایک سیکولر اسٹیٹ (Secular State) کو اس میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے۔ حضرتؒ کو جب اس کا علم ہوا تو یہ خدشہ محسوس ہوا کہ اگر یہ مشورہ انھوں نے قبول کر لیا تو بل کھٹائی میں پڑ جائے گا، اچانک ایک دن وزیر اعظم صاحب نے بورڈ کے اہم ذمہ داروں کو گفتگو کے لئے پارلیمنٹ کے ایک ہال

---

(۱) کاروان زندگی سوم ص ۱۳۲

میں بدعو کیا، حضرتؒ کے سامنے وزیراعظم بیٹھے ہوئے تھے، حضرتؒ نے بڑی حکمت اور صفائی کے ساتھ فرمایا کہ "اگر آپ سے کوئی کہے کہ دوسرے مسلم ممالک بھی تو ہیں وہاں سے معلوم کرنا چاہئے کہ انھوں نے کوئی ترمیم کی ہے یا نہیں، پھر آپ ان کی تقلید کرسکتے ہیں تو آپ کو یہ پوزیشن ہرگز نہیں قبول کرنی چاہئے۔ ہم ایک مرتبہ انکار کریں تو آپ کو چار مرتبہ انکار کرنا چاہئے اس لئے کہ ہندوستان علمی ومذہبی حیثیت سے خود اپنا مقام رکھتا ہے وہ کسی مسلم یا عرب ملک سے پیچھے نہیں۔ (۱)

یہ بات جو نفسیاتی اثر رکھتی تھی اپنا اثر کرگئی۔

یہ بل پاس ہونے کے قریب تھا کہ اس میں ایک قانونی پیچیدگی یہ پیدا ہوگئی کہ چونکہ یہ بل دفعہ ۱۴ اور ۱۵ کے خلاف ہے اور دستور میں دی گئی آزادی سے ٹکراتا ہے اس لئے سپریم کورٹ اس کو بہرحال مسترد کردیگا اس لئے بل میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا گیا کہ کوئی بدنصیب مطلقہ اسلامی قانون پر نہ چلنا چاہتی ہو اور دفعہ ۱۲۵ کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے تو اس کو اس کی آزادی ہے، اس ترمیم کو ارکان بورڈ نے قبول کیا کہ اس سے کوئی مداخلت نہیں تھی۔

پارلیمنٹ میں بل کے پاس ہونے کا وقت جتنا قریب آرہا تھا ہندی انگریزی پریس اور فرقہ پرست ہندو جماعتوں کی طرف سے مخالفت کا طوفان شدت اختیار کرتا جارہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان میں زلزلہ آیا ہوا ہے لیکن یہ مسلمانوں کے ملی اتحاد اور حمیت اور حضرتؒ کی حکمت وبصیرت تھی کہ اللہ تعالی نے راجیو جی کو اس کے لئے مسخر کردیا اور انھوں نے طے کرلیا کہ بل پاس ہوتا ہے۔ ۵/ مئی ۱۹۸۶ء کی تاریخ اس کے لئے طے کردی گئی اور انھوں نے وہپ (Whip) جاری کردیا کہ پارٹی کے ہر ممبر کو اس کی تائید کرنی ہے ورنہ وہ پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔

۵/ ۶/ مئی کی درمیانی شب میں گرما گرم بحث ومباحثہ کے بعد رات پونے

---

(۱) ایضاً ص ۱۳۶

تین بجے ووٹنگ ہوئی اور بل کی حمایت میں ۳۷۲ ووٹوں کے مقابلہ میں مخالفت میں صرف ۵۴ ووٹ ڈالے گئے اس طرح یہ بل پاس ہوا اور "یومئذ یفرح المؤمنون بنصر اللہ" کا ایک ظہور ہوا۔

حضرتؒ نے اس کے بعد راجیو جی کو شکریہ کا ایک خط تحریر فرمایا جس میں ان کو اہم اور ضروری مشورے بھی دیئے۔ ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۶ء کو بمبئی میں "مسلم پرسنل لا بورڈ" کا آٹھواں اجلاس منعقد ہوا جس کے خطبۂ صدارت میں حضرتؒ نے بل کے پاس ہونے کے بعد حالات کا جائزہ لیا، یونیفارم سول کوڈ کے خطرہ سے آگاہ فرمایا اور ملت کو ایک نئی اور طویل جد و جہد کی دعوت دی۔

۲۲ر ۲۳ر دسمبر کو بنارس میں "دینی تعلیمی کونسل" کی چھٹی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے اور حضرتؒ نے اپنا خطبۂ صدارت پیش فرمایا۔

ترکی میں "رابطۂ ادب اسلامی" کا اجلاس

رابطہ ادب اسلامی کے پہلے جلسہ (منعقدہ دار العلوم ندوۃ العلماء) میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ اس کا آئندہ اجلاس ترکی میں ہو، حضرتؒ اس میں شرکت کرنے کے لئے مولانا محمد رابع صاحب ندوی کو ہمراہ لے کر ۲۰ر جون ۱۹۸۷ء کو استنبول تشریف لے گئے۔ ۲۱ر جون کو سیمینار کی افتتاحی نشست میں حضرتؒ کا خطاب ہوا، اسی دن شام کو مسجد فاتح کے خطیب شیخ امین سراج (جو حضرتؒ کے سفر مصر کے وقت ازہر میں طالب علم تھے حضرتؒ سے محبانہ و عقید تمندانہ تعلق رکھتے ہیں) کے گھر میں ایک ادبی نشست ہوئی۔ ۲۲ر جون کو صبح ایک وسیع نشست ہوئی جس میں کئی سو ادباء و اہل قلم شریک ہوئے، حضرتؒ نے اس نشست میں "روائع اقبال" کا وہ حصہ پڑھ کر سنایا جس میں ان کی معرکۃ الآراء نظم "طلوع اسلام" کا ترجمہ عربی میں پیش کیا گیا ہے۔ اسٹیج پر حضرتؒ کے ایک طرف ایک ممتاز ترک ادیب و فاضل بیٹھے تھے اور دوسری جانب عرب فاضل و ادیب محمد قطب تھے، حضرت

نے جب یہ شعر پڑھا۔

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والی ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

تو شکوہ ترکمانی کہتے ہوئے ترک ادیب کی طرف اشارہ فرمایا اور نطق اعرابی کہتے ہوئے استاذ محمد قطب کی طرف اشارہ کیا اور ذہن ہندی کہتے ہوئے یہ فرمایا کہ میں خود نہیں، اس قوم کا نمائندہ ہوں جسکو خدا نے خاص ذہن سے نوازا اور اس سے اس نے اسلام کی خدمت کا کام لیا۔

ملک کے ذرائع ابلاغ نے اس جلسہ کی تشہیر کی اور پہلی مرتبہ حکومت نے ایک ایسے خالص اسلامی پروگرام اور جلسہ کو ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ذریعہ نشر کرنے کی اجازت دی۔ اس طرح یہ جلسہ ملک اور اسلامی بیداری کیلئے نیک فال سمجھا گیا۔

اس جلسہ کے علاوہ بعض تاریخی مقامات کی زیارت کا پروگرام بھی رہا اور حضرت نے بعض مقامات پر مختصر اور مؤثر خطابات فرمائے۔

سنیچر کے روز ۲۸؍ جون کو صبح چار بجے کراچی ہوتے ہوئے ۳۰؍ جون کو بخیر وعافیت دہلی واپسی ہوئی۔ کراچی کے دو روزہ قیام میں بھی بعض اہم خطابات ہوئے۔

لندن اور الجزائر کا ایک سفر

اسلامک سینٹر آکسفورڈ کے جلسہ میں شرکت کے لئے ۲۶؍ اگست ۱۹۸۶ء کو لندن تشریف لے گئے۔ تین روز وہاں قیام فرما کر "ملتقی الفکر الاسلامی" کے سیمنار میں شرکت کیلئے الجزائر تشریف لے گئے، افتتاحی اجلاس میں حضرتؒ نے اپنا مقالہ پیش فرمایا جس کا عنوان تھا "انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی اور بنیادی کردار" یہ رسالہ کی شکل میں بعد میں طبع ہوا، تین روزہ قیام میں ایک دن مصر کے کثیر الاشاعت روزنامہ "الاھرام" نے تفصیل سے حضرتؒ کا انٹرویو لیا جس میں وقت کے اہم مسائل پر استفسار کیا گیا تھا۔ ۶؍ دسمبر کو وہاں سے جدہ روانگی

ہوئی، براہ راست فلائٹ نہ ہونے کی وجہ سے قاہرہ میں چند گھنٹے انتظار کے بعد دوسری فلائٹ سے جدہ روانگی ہوئی۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ ہم اپنے وطن آگئے"۔ تقریباً دو ہفتہ حرمین شریفین میں گذار کر ۲۰؍ ستمبر کو دہلی تشریف آوری ہوئی۔

مولانا محمد عمران خاں صاحبؒ کی وفات اور بھوپال کا تعزیتی سفر

۱۸؍ اکتوبر کو دوپہر کے وقت جب کہ حضرتؒ دستر خوان پر تھے اچانک حافظ کرامت اللہ صاحب کا فون آیا کہ مولانا عمران خاں صاحبؒ کی وفات ہوگئی۔ طویل رفاقت کی وجہ سے جس کی مدت نصف صدی سے کم نہیں تھی قدرتی طور پر حضرت پر اثر پڑا۔ دوسرے ہی روز حضرتؒ کی صدارت میں "دینی تعلیمی کونسل" کی ایک کانفرنس سیتاپور میں تھی اس سے فارغ ہو کر ۲۰؍ اکتوبر کو حضرتؒ تعزیت کے لئے بھوپال تشریف لے گئے اور تاج المساجد میں تعزیتی تقریر فرمائی۔

دہلی، ناگپور اور پونہ کے ڈائیلاگ

"نفقۂ مطلقہ" کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کے بعد انگریزی، ہندی پریس غیر مسلم دانشوروں، اہل قلم اور مختلف پارٹیوں کے رہنماؤں نے جو جذباتی، جارحانہ اور غیر دانشمندانہ رخ اختیار کیا تھا اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ عمومی طور پر ذہنوں میں فرقہ وارانہ منافرت اور مسلم دشمنی کا بیج موجود ہے اور اکثریتی طبقہ اقلیتوں کے مسائل اور جذبات سے پوری طرح ناواقف ہے، "پیام انسانیت" کی تحریک کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ذہنوں کو صاف کیا جائے۔ ایسی صورت حال میں حضرتؒ نے شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس کی کہ مرکزی مقامات پر ایسے ڈائیلاگ منعقد کئے جائیں جن میں ایسے لوگوں کو خاص طور پر ذاتی ملاقات کر کے دعوت دی جائے جن کے ذہن صاف نہیں ہیں، اس سلسلہ کا پہلا پروگرام دہلی میں ۴؍ مئی کو ہوا، اس کے دو ہی دن کے بعد "نفقۂ مطلقہ" کے خلاف بل پارلیمنٹ

میں پیش ہونے والا تھا اس لئے فضا گرم تھی، دہلی کے پروگرام کے لئے سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کو ذمہ دار بنایا گیا، انھوں نے قاضی عبدالحمید صاحب اندوری کے ساتھ مل کر جدوجہد کی لیکن غیر متوازن فضا کی وجہ سے غیر مسلم صحافیوں، دانشوروں، قانون دانوں اور پارٹیوں کی شرکت کم رہی، حضرتؒ نے اس میں "مسلمانوں کے جذبات و مسائل سمجھنے کی کوشش کیجئے!" کے عنوان سے مقالہ تیار فرمالیا تھا جو وہاں پڑھا گیا اور اس کا انگریزی، ہندی ترجمہ تقسیم کیا گیا۔

دہلی کے بعد آر ایس ایس (.R.S.S) کے مرکز ناگپور میں یہ پروگرام ۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب مدظلہ کی دعوت و انتظام میں ہوا، مولانا کے اپنے ذاتی تعلقات، اثرات اور جدوجہد کی وجہ سے یہ پروگرام بہت کامیاب ہوا اور غیر مسلم طبقہ کے اہم لوگ شریک ہوئے، حضرتؒ نے اس میں "ملک و معاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر ہے اور اس کی جلد خبر لینے اور فکر کرنے کی ضرورت ہے" کے عنوان سے مضمون پیش فرمایا اور ہندی، انگریزی میں اس کو تقسیم بھی کیا گیا۔

ناگپور کے قیام میں وہاں مقیم عرب طلباء سے بھی خطاب ہوا اور "کامٹی" کے ایک جلسہ عام میں تقریر ہوئی۔ وہاں سے برہان پور تشریف آوری ہوئی اور ایک بڑے جلسہ میں خطاب ہوا۔ برہان پور سے حضرتؒ "دھرنی" تشریف لے گئے اور وہاں "پیام انسانیت" کے ایک جلسہ کو خطاب فرمایا۔

ناگپور کے پروگرام کے بعد اس سلسلہ کا بڑا کامیاب جلسہ ۲۱ر فروری ۱۹۸۷ء کو پونہ میں جناب انیس چشتی صاحب کی دعوت و انتظام میں ہوا، انھوں نے پہلے سے اس کی تیاری کی تھی اور بڑی محنت سے فضا بنائی تھی اس لئے بھی پروگرام بہت کامیاب ہوا اور ذرائع ابلاغ نے اس کو اہمیت کے ساتھ پیش کیا، اس پروگرام میں حضرتؒ نے اپنا کلیدی مضمون "ملک کے بہی خواہوں کے سوچنے اور کرنے کی

باتیں" کے عنوان سے پیش فرمایا۔
پونہ میں تین روز قیام رہا، اس عرصہ میں پونہ کالج، طبیہ کالج، مولد نیاہائی اسکول، الشبان المسلمین، مسجد مومن پورہ اور مسجد تنبولیان میں حضرت کی تقریریں ہوئیں، آر ایس ایس کے ادارہ "گیان پر بودھنی" کے طلباء اور ذمہ داروں سے بھی خطاب ہوا۔ پونہ کالج میں وکلاء کی مخصوص نشست ہوئی جس میں بڑی تعداد میں وکلاء شریک ہوئے۔

"رابطۂ ادب اسلامی" سیمینار

"رابطہ ادب اسلامی" کے ترکی سیمینار میں رابطہ کی ہندوستانی شاخ نے ۱۹۸۷ء میں سیمینار کا فیصلہ کیا تھا۔ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب جے پوری مجددی کی دعوت پر یہ سیمینار ۱۷ ر ۱۸ ر فروری ۱۹۸۷ء کو جامعہ ہدایت جے پور میں منعقد ہوا، اس جامعہ کے افتتاحی اجلاس کی صدارت شاہ صاحب کی خواہش و دعوت پر حضرتؒ نے دسمبر ۱۹۸۵ء میں فرمائی تھی، تقریباً دو سال کے بعد اسی سرزمین پر حضرتؒ ہی کی صدارت میں ادب اسلامی کا سیمینار "اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات" کے موضوع پر منعقد ہو رہا تھا۔
افتتاحی اجلاس کے صدارتی خطاب میں حضرتؒ نے مغربی فکر و ادب کی بے راہ روی، خامی و نارسائی کا تذکرہ فرمایا اور اس کے اسباب بیان فرمائے اور سیمینار کی آخری نشست کی اختتامی تقریر میں اس اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ دنیا کی علمی و فکری قیادت امت اسلامیہ ہی کا منصب اور حق ہے، اس سے اپنے آپ کو سبک دوش سمجھ لینے سے دنیا کو اور خود اس کو کیا نقصان پہونچے گا؟

ملیشیا کا پہلا سفر

ملیشیا کے متعدد نوجوان فضلاء ندوہ میں تعلیم حاصل کر چکے تھے، اپنی صلاحیت اور صلاح کی وجہ سے ان کا وہاں کی دعوتی تنظیموں پر اچھا اثر تھا، اور ان کی

بڑی خواہش تھی کہ حضرتؒ وہاں کا سفر فرمالیں تاکہ وہاں کے لوگوں کو بھی استفادہ کا موقع مل سکے، حضرتؒ نے وہاں مسلمانوں کی اکثریت کو دیکھتے ہوئے اور ان نوجوانوں کی خواہش وجذبہ کی قدر کرتے ہوئے اپنے ضعف وعلالت اور شدید مصروفیات کے باوجود سفر منظور فرمالیا۔

۲راپریل ۱۹۸۷ء کو مولانا محمد رابع صاحب حسنی مدظلہ کی رفاقت میں یہ سفر ہوا حضرتؒ کے ایک محبّ اور تبلیغی کارکن جناب غلام محمد صاحب حیدرآبادی اپنی خواہش پر شریک سفر ہو گئے جن سے بڑی راحت ملی۔ ایک ہفتہ کے قیام میں مختلف یونیورسٹیوں، دینی اداروں، تبلیغی مراکز اور بڑے شہروں کے بعض مرکزی مقامات پر خطابات ہوئے، قیام کے آخری دن بھی کئی پروگرام ہوئے جن میں "انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی" کی اہم تقریر بھی ہے۔

۹راپریل کو ملیشین ائرلائنز کے جہاز سے مدراس اور وہاں سے دہلی واپسی ہوئی۔

"دو متضاد تصویریں"

ایرانی انقلاب اپنے جلو میں وہ سارے عقائد باطلہ لایا تھا جو شیعیت کا طرہ امتیاز ہیں لیکن چونکہ اس فساد عقیدہ ضلالت وکجروی کے ساتھ اس میں مبہم جوئی اور حوصلہ مندی بھی تھی اس لئے بہت سے سنجیدہ اور اسلامی الفکر اہل قلم اور داعیوں نے عقیدہ ومسلک اور ضلالت وہدایت کے فرق وامتیاز سے آنکھیں بند کر کے خمینی صاحب کی تائید وحمایت شروع کردی، یہ چیز ایک بڑے فتنہ کا پیش خیمہ بن سکتی تھی اس لئے اس کے سدباب کی شدید ضرورت تھی۔

اس صورتحال سے متاثر ہو کر حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" کے نام سے ایک مدلل ومفصل کتاب تصنیف فرمائی اور حضرتؒ سے اس پر مقدمہ لکھوایا، اس کتاب کے مطالعہ کے دوران حضرتؒ نے

ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس فرمائی جو خالی الذہن، سلیم الفطرت اور عقل عام رکھنے والوں کے لئے رہنما اور فیصلہ کن ہو، اور معروضی و مثبت طریقہ پر اس میں بعثت عظمیٰ کے مقاصد و نتائج، صحابہ کرام کی فطری صلاحیت اور اثر پذیری کو غیر جانب دار تاریخ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہو، ان ہی مقاصد کے پیش نظر حضرتؒ نے مستقل ایک کتاب تصنیف فرمائی اور یہ ”دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں“ کے عنوان سے شائع اور مقبول ہوئی، اردو کے علاوہ عربی میں اس کے بار بار اور بڑی تعداد میں ایڈیشن نکلے، انگریزی اور دوسری اہم زبانوں میں اس کے تراجم شائع کئے گئے، اور ایک ایسے علمی حلقہ کو اس کتاب نے متاثر و مطمئن کیا جو بحث و تردید کے متعارف اور قدیم طرز سے نہ مانوس بلکہ کسی حد تک متوحش تھا۔

شدید علالت اور فضل الٰہی

مئی ۱۹۸۷ء کے رمضان میں حضرتؒ کی علالت کا آغاز ہوا اور جلد ہی اس میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ روزے بھی چھوڑنے پڑے اور قرب کے باوجود عید کی نماز کے لئے مسجد تشریف نہیں لے جا سکے، ڈاکٹروں کی تشخیص ”السر“ (آنتوں میں زخم) کی تھی، نقاہت اتنی بڑھ گئی کہ دو قدم چلنا دشوار ہو گیا، خون میں بہت کمی تھی اور ڈاکٹروں کا اصرار تھا کہ خون چڑھایا جائے مگر حضرتؒ نے سختی سے انکار فرمادیا۔ اسی دوران حکیم افہام اللہ صاحب انہونویؒ تشریف لائے اور انھوں نے جو علاج تجویز کیا اس سے افاقہ ہونا شروع ہوا، البتہ ضعف بہت تھا اس لئے عید کے بعد ہی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کی دعوت و خواہش پر حضرتؒ علاج و آرام کے لئے ان کی قیام گاہ اکبری گیٹ (لکھنؤ) تشریف لے آئے، ڈاکٹر صاحب نے بڑی توجہ اور دلسوزی سے علاج و آرام کی فکر رکھی، حضرتؒ دس بارہ روز ان کے یہاں قیام فرما کر دار العلوم کے مہمان خانہ تشریف لے آئے۔

چند ہی روز کے بعد حکیم عبد الحمید صاحب کی خواہش و اصرار پر دہلی تشریف

لے گئے اور دوسرے ہی دن حکیم صاحب کی رائے کے مطابق مجیدیہ ہاسپٹل منتقل ہوگئے، حکیم صاحب نے اپنی نگرانی میں ہر طرح طبی انتظامات فرمائے اور اسپتال کے عملہ نے زیادہ سے زیادہ طبی سہولتیں پہونچائیں۔

سخت گرمی کی وجہ سے اہل بمبئی کا اصرار تھا کہ حضرتؒ آرام کے لئے کچھ روز کے لئے بمبئی تشریف لے آئیں کہ وہاں موسم بھی معتدل ہوتا ہے اور محمد بھائی پوری راحت کا خیال کرتے ہیں، حضرتؒ نے منظور فرمالیا اور مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ مولانا نثار الحق صاحب ندوی اور حاجی عبدالرزاق صاحب کی معیت میں بمبئی تشریف لے گئے، اپنی تمامتر ناطاقتی اور ضعف کے باوجود تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا، ۳۰؍جولائی ۱۹۸۷ء کو عید الاضحیٰ کے قرب کی وجہ سے واپسی ہوئی۔

لندن اور کویت کا سفر

اگست کے دوسرے ہفتہ میں ڈاکٹر فرحان نظامی صاحب لکھنؤ آئے، اور انھوں نے ۲۷؍اگست کو منعقد ہونے والے اسلامک سنٹر کے جلسہ میں شرکت کی خواہش ظاہر کی، اہل تعلق نے اور خود انھوں نے بھی سفر کی افادیت پر اس حیثیت سے بھی زور دیا کہ وہاں ماہرین فن اور اہل اختصاص سے مرض کی تشخیص بھی کرائی جاسکتی ہے اور طبی مشورہ بھی لیا جاسکتا ہے، اہل تعلق کے اصرار پر حضرتؒ نے سفر کا ارادہ فرمالیا، اور ۲۶؍اگست کو مستقل رفیق سفر مولانا محمد رابع صاحب ندوی مدظلہ کے ہمراہ براہ دبئی وکویت لندن تشریف لے گئے۔

۲۷؍اگست کو سنٹر کے جلسہ میں شرکت ہوئی، جامعۃ الامام محمد بن سعود کے وائس چانسلر شیخ عبداللہ عبدالمحسن ترکی اور رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف خاص طور سے حضرتؒ کی تشریف آوری کی خبر سن کر اپنی ساری مصروفیتوں کے باوجود تشریف لائے تھے۔

حضرتؒ نے اپنے ضعف وعلالت اور مصروفیات کی وجہ سے ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کو نائب صدر منتخب فرمایااور کمیٹی نے اس کو بالاتفاق منظور کیا۔

۲۹ر اگست کو "سینٹ کراس کالج" آکسفورڈ میں حضرتؒ کے مقالہ سے "شیخ عبدالعزیز المطوع لکچرز سیریز" کا افتتاح ہوا۔

لندن کے مشہور اسپتال میں اسپشلسٹ نے طبی معائنہ کر کے اطمینان ظاہر کیا۔ علالت وضعف کی وجہ سے کسی اور پروگرام میں شرکت نہیں ہوئی اور ۶ر ستمبر کو دو روز کویت ٹھہرتے ہوئے ہندوستان واپسی ہوئی۔

سفر حجاز اور رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنس میں شرکت

۱۱ر تا ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو "رابطۂ عالم اسلامی" نے اپنی تیسری عالمی کانفرنس منعقد کی، رابطہ کے ذمہ داروں کے اصرار پر اس امید میں حضرتؒ نے شرکت کا ارادہ فرمالیا کہ عالم اسلام کے نمائندہ اجتماع میں جس میں خود سعودی عرب کی اہم علمی وفکری شخصیتیں اور حکومت سعودیہ کے اہم ذمہ داران شریک ہوں گے، سعودی عرب کو حقیقت پسندانہ وجرأت مندانہ مشورہ دینے اور صفائی کے ساتھ حقائق وخطرات سے آگاہ کرنے کا موقع ملے گا۔

۹ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ سے روانگی ہوئی ۱۱ر اکتوبر کو احرام کی حالت میں افتتاحی اجلاس میں شرکت فرمائی، اسی دن شام کو عمرہ سے فراغت ہوئی دوسرے دن کی نشست میں حضرتؒ نے حرمین شریفین کی عظمت وحرمت پر بڑی اثرانگیز اور مدلل تقریر فرمائی، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "تقریر میں صاف محسوس ہوا کہ اس میں مقام کی برکت، حرم کے جاں نواز، روح پرور اور خیال افروز جھونکوں کی کارفرمائی بھی شامل تھی۔" اختتامی نشست میں شیخ بن باز کی تقریر اور ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف صاحب کے شکریہ کے بعد حضرتؒ کی آخری تقریر ہوئی، جس میں حضرتؒ نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے اس تاریخی جملہ کی روشنی میں شرکاء جلسہ کو ان

کی ذمہ داریاں یاد دلائیں جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فتنۂ ارتداد کے موقع پر فرمایا تھا کہ أینقص الدین وأنا حی (کیا میرے جیتے جی دین میں ترمیم و تنسیخ ہو سکتی ہے؟!)

۱۷/ اکتوبر کو شیخ بن باز کی مسجد میں تقریر ہوئی جس میں اس بلد امین کی خصوصیات، اس کی دعوت اور پیغام پیش کیا گیا۔

۱۸/ اکتوبر کو مدینہ منورہ حاضری ہوئی، چند روزہ قیام میں صرف "رابطہ ادب اسلامی" کی نشست ہوئی، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس مرتبہ اس میں شرکت کے لئے حضرت کے قدیم رفیق مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ بھی تشریف لائے تھے۔ ۲۳/ اکتوبر کو جدہ تشریف آوری ہوئی ۲۴/ اکتوبر کو وہاں ایک تقریر شیخ علی بصفر صاحب کی مسجد منصور شعیبی میں ہوئی جس میں بڑا مجمع تھا، اسی دن دہلی واپسی ہو گئی، محترمی جناب عثمان صاحب حیدر آبادی کے تعاون سے آمد و رفت میں ایرپورٹ پر بڑی سہولت ہوئی۔

جامعہ سلفیہ بنارس کے سیمینار میں شرکت

۲۲/ نومبر ۱۹۸۷ء کو "جامعہ سلفیہ" کے ذمہ داروں کی دعوت و اصرار پر حضرتؒ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سیمینار کا افتتاح فرمایا، حضرتؒ نے عربی میں اپنا مقالہ تیار فرمایا تھا جس کا اصل موضوع یہ تھا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا عظیم ترین کارنامہ اس حقیقت کا اثبات اور اس پر زور ہے کہ نبوت ہی صحیح معرفت اور کامل ہدایت کا واحد اور قابل اعتماد ذریعہ ہے۔

حضرتؒ نے اردو کی مختصر تمہید کے بعد مقالہ کسی قدر اختصار کے ساتھ عربی میں پیش فرمایا، شام کی نشست میں مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی نے اس کا اردو ترجمہ پیش کیا، اہل شہر کے شوق و تقاضے اور داعیان جلسہ کی خواہش پر حضرتؒ نے شام کو ایک جلسہ عام سے بھی خطاب فرمایا۔

۱۹۸۸ء کے اہم واقعات

۱۹۸۸ء کے اہم حوادث میں مسلم صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی شہادت کا وہ دلدوز واقعہ بھی ہے جس کی خبر حضرتؒ کے دل ودماغ پر بجلی بن کر گری۔ حضرتؒ نے بارہا فرمایا کہ دو مسلم قائدین مملکت ایسے تھے کہ جن سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، دینی غیرت، صحیح فکر، اور شعور کی پختگی میں ان کو امتیاز تھا، ایک سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل مرحوم دوسرے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم، جنرل صاحب مرحوم حضرتؒ سے عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے تھے، سفر پاکستان کے موقع پر خود ہی ملاقات کے لئے تشریف لے آتے، ایک مرتبہ انھوں نے حضرت سے کچھ پڑھنے کے لئے دریافت کیا حضرتؒ نے فرمایا کہ آپ درود شریف کی کثرت رکھئے، انھوں نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا اور حرمین شریفین کی حاضری کا بھی التزام رکھا، ایک مرتبہ انھوں نے حضرتؒ سے فرمایا کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں حضرت نے فرمایا کہ "سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ آپ ہندوستان سے اچھے تعلقات رکھیں تاکہ ہم اطمینان سے معتدل اور پر سکون ماحول میں اپنے تعمیری وتعلیمی ورفاہی کام انجام دے سکیں"۔(۱) پاکستان میں سیرۃ النبی جلد ہفتم جب حضرتؒ کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی تو جنرل صاحب نے اس سے متاثر ہو کر حضرتؒ کی خدمت میں ایک لاکھ روپے پیش کئے تھے حضرتؒ نے خود لینے کے بجائے اس کی نصف رقم حضرت سید صاحبؒ کی اہلیہ صاحبہ اور نصف رقم دارالمصنفین کو عنایت فرمادی۔

۲۵ / ۲۶ / ۲۷ / ۲۸ صفر ۱۴۰۹ھ مطابق ۷ / ۸ / ۹ / ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی تاریخوں میں نعتیہ شاعری کے موضوع پر مدرسہ کاشف العلوم اورنگ آباد میں "رابطہ ادب اسلامی" کا اجلاس منعقد ہوا۔

حضرتؒ نے اس میں "فارسی واردو زبان کی نعتیہ شاعری میں سیرت نبوی کی

---

(۱) پرانے چراغ سوم ص ۱۳۱

کچھ روشن جھلکیاں" کے موضوع پر مقالہ پیش فرمایا، حضرت فرماتے ہیں "شہر اورنگ آباد (جسے اللہ تعالیٰ نے قدرتی حسن وجمال اور خوشنما تعمیری و تاریخی یادگاروں سے مالامال کیا ہے) کے باشندوں نے پورے تین دن رسول اکرم ﷺ کے ذکر و تذکرہ میں گزارے، ذکر حبیب کی مشکبار ہوا نے شہر کے گوشہ گوشہ کو معطر کیا۔"(۱)

۱۹۸۸ء ہی میں حضرت نے "المرتضیٰ" تالیف فرمائی، اس کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خلفاء راشدین کی ترتیب زمانی میں اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ فیصلے اور ان عظیم دینی ملی مصالح پر روشنی ڈالی گئی جو اس میں مضمر تھے اسکے بعد وہ قطعی و بدیہی دلائل پیش کئے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا کہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کس درجہ خلفاء ثلاثہ کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے مصالح و مفاد کی خاطر بے نظیر اخلاص و تعاون پیش کیا اور ان حضراتؓ نے کس طرح اسکی قدر فرمائی۔

اس کتاب سے برادر اکبر مولانا حکیم سید عبدالعلی صاحب حسنیؒ کی خواہش کی بھی تکمیل ہوئی کہ ایک مرتبہ انھوں نے حضرتؒ سے فرمایا تھا کہ "علی تم سیدنا حضرت علیؓ کی سوانح لکھو! تم لکھ سکتے ہو"۔

خلاف معمول اس کتاب کی رسم اجراء کا بھی اہتمام ہوا اور ۶/ نومبر ۱۹۸۸ء کو مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ کی صدارت میں یہ تقریب انجام پذیر ہوئی، اور اس میں اس کتاب اور مصنف کتاب پر قیمتی مقالات پڑھے گئے۔

حجاز مقدس اور خلیج کا سفر

۳/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۲/ نومبر ۱۹۸۸ء سے "رابطہ عالم اسلامی" کا اجلاس شروع ہو رہا تھا حضرتؒ، مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کی معیت میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے لیکن سفر کی بعض دشواریوں کی وجہ سے تیسرے دن کے اجلاس میں شرکت ہو سکی، چوتھے دن حضرتؒ کا خطاب ہوا اور اجلاس ختم ہوا۔

(۱) کاروان زندگی چہارم ص ۲۳

اسی سفر میں استاذ احمد محمد جمال نے حضرتؒ کے اعزاز و تکریم میں عشائیہ کا اہتمام کیا اور اس میں بعض اہم عرب علماء و ادباء شریک ہوئے، اسی سفر میں اچانک مولانا ابوالعرفان خاں صاحب مرحوم کے حادثۂ وفات کی خبر ملی جس کا حضرتؒ پر بڑا اثر ہوا کہ وہ دارالعلوم کے قدیم اساتذہ میں سے تھے اور ندوی ثقافت کے بہترین ترجمان تھے۔ ۱۰ر ربیع الثانی کو مدینہ منورہ حاضری ہوئی، ایک ہفتہ قیام میں "رابطہ ادب اسلامی" کے جلسوں میں شرکت فرمائی۔ ۱۷ر ربیع الثانی کو جدہ تشریف لائے، اسی دن مسجد شعیبی میں مختصر تقریر ہوئی، دوسرے دن عزیزیہ کی مسجد الجوہرہ میں بڑی مؤثر تقریر ہوئی جس میں حضرتؒ نے "ومن الناس من یشتری لھو الحدیث" کی آیت تلاوت فرمائی، اور فرمایا کہ خصوصاً یہ آیت ریڈیو، ٹیلیویژن پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے اس لئے کہ یہ بیک وقت لہو بھی ہے اور حدیث بھی۔

۱۹ر ربیع الثانی مطابق ۲۸ر نومبر کو صدر مملکت شیخ زائد کے معتمد خصوصی شیخ احمد خلیفہ السویدی کی دعوت و اصرار پر حضرتؒ نے ابوظبی کا سفر فرمایا، اگلے ہی دن "ترشید الصحوۃ الاسلامیۃ" (اسلامی بیداری پر ایک نظر) کے موضوع پر حضرتؒ نے بڑی مدلل، پر مغز اور مؤثر تقریر کی جو اپنے موضوع کی افادیت کے اعتبار سے حضرتؒ کی اہم تقریروں میں سے ہے۔

خلیج کے اس سفر میں دبئی اور شارقہ میں بھی تقریریں ہوئیں۔ یکم دسمبر کو رات ۱۱ بجے ہندوستانی فلائٹ سے واپسی ہوئی۔ حاکم شارقہ شیخ سلطان ایرپورٹ تک رخصت کرنے آئے۔ بھائی محمد عثمان صاحب حیدرآبادی پورے سفر میں ساتھ رہے اور ان سے بڑی مدد ملی۔

جلسۂ "پیام انسانیت" حیدرآباد، واجلاس "مسلم پرسنل لا بورڈ" کانپور

۲۹ر دسمبر کو حیدرآباد میں "پیام انسانیت" کی بڑے پیمانہ پر کانفرنس منعقد ہوئی جس کا انتظام سید جمیل الدین ــ ب حیدرآبادی نے کیا اور اس میں اکثریتی

فرقے کے اہم دانشور لوگ شریک ہوئے، حضرتؒ نے اس میں مفصل خطاب فرمایا اور خاص طور پر دانشوروں کو متوجہ کیا کہ ملک کو تباہی سے بچائیں۔ جلسہ کے بعد متعدد غیر مسلم تعلیم یافتہ لوگوں نے حضرتؒ سے اپنے تاثر کا اظہار کیا۔

اس کانفرنس کے علاوہ عابد میدان میں اسی موضوع پر ایک جلسۂ عام بھی منعقد ہوا جس میں حضرتؒ نے خطاب فرمایا۔

۴/۵/مارچ کو کانپور کے حلیم مسلم کالج کے وسیع میدان میں "مسلم پرسنل لابورڈ" کا اجلاس منعقد ہوا، حضرتؒ کی صدارت میں یہ تیسرا اجلاس تھا جو بعض دشواریوں کے باوجود پوری طرح کامیاب ہوا۔

ترکی اور انگلستان کا سفر

۱۱/اگست سے شروع ہونے والے "رابطہ ادب اسلامی" سیمینار میں شرکت کے لئے حضرتؒ اپنے رفقاء کے ہمراہ ترکی تشریف لے گئے، افتتاحی اجلاس مکہ ہوٹل ہی کے ہال میں منعقد ہوا جہاں حضرتؒ کا قیام تھا، مختلف عرب ملکوں کے اہم نمائندے شریک ہوئے اور کامیابی کے ساتھ اجلاس اختتام کو پہونچا دوران قیام ایک روز وہاں کی اسلام پسند جماعت کے ایک مشہور رہنما نجم الدین اربکان بھی ملنے آئے اور اپنے تعلق و محبت کا اظہار کرتے رہے۔

حسب معمول ایک روز سیدنا ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر بھی حاضر ہوئی۔

اگست کو استنبول کے ایک نواحی محلہ سلطان بغلی کی وسیع مسجد سلام میں حضرتؒ کی بڑی ولولہ انگیز اور اثر خیز تقریر ہوئی، پوری مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، حضرتؒ نے اردو میں خطاب فرمایا جسکا ترجمہ ایک ترک عالم نے بڑی روانی کے ساتھ پیش کیا جن کو اردو پر بھی قدرت حاصل تھی، تقریر میں حضرتؒ نے اولوالعزم ترکی قوم کی دینی وملی خدمات اور فاتحانہ و مجاہدانہ کارناموں کا بڑے جوش واثر کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد انکی موجودہ ذمہ داریوں کو یاد دلایا، یورپ کی

شاطرانہ چالوں کا تذکرہ فرمایا اور انکو ناکام بنانے کے عزم و تدبیر کا بھی ذکر فرمایا، یہ تقریر رسالہ کی شکل میں "ترکی کی مجاہد ملت اسلامی" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

ترکی سے اسلامک سنٹر آکسفورڈ میں شرکت کیلئے حضرتؒ، مولانا محمد رابع صاحب مد ظلہ اور بھائی عثمان صاحب حیدر آبادی کے ہمراہ انگلستان تشریف لے گئے، سنٹر کی قانونی اور ضروری نشستوں کے علاوہ حضرتؒ نے سنٹر کے ہال میں "انسانیت کے محسن اعظم اور شریف و متمدن دنیا کا اخلاقی فرض" کے موضوع پر مقالہ پیش فرمایا، اس موضوع پر خاص طور سے مقالہ پیش کرنے کا محرک یہ تھا کہ ملعون سلمان رشدی انگلستان ہی میں پناہ گزیں تھا، حضرتؒ فرماتے ہیں :

> "خاص بات یہ تھی کہ پورے مقالہ میں کہیں سلمان رشدی کا نام نہیں لیا گیا اور وہ اس قابل ہی نہیں تھا، لیکن سننے والے سب سمجھ رہے تھے کہ اس مقالہ کا محرک کیا ہے اور اس میں اشارہ کس بے ادب اور گستاخ انسان کی طرف ہے؟!"(۱)

۶/۷/۸/ ربیع الاول مطابق ۷/۸/۹/ اکتوبر ۱۹۸۹ء کی تاریخوں میں حیدر آباد میں "رابطہ ادب اسلامی" کا جلسہ بڑے اہتمام سے ہوا، حضرتؒ نے افتتاحی اجلاس میں "تحریک آزادی واصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ" کے موضوع پر صدارتی خطاب فرمایا، اختتامی نشست میں "امت مسلمہ کی دوہری ذمہ داری" کے موضوع پر تقریر فرمائی، بعد میں دونوں تقریریں رسالہ کی شکل میں شائع ہوئیں۔

تحفظ ملت کی فکر اور اسکی کوششیں

ان تمام ادبی، دعوتی اور تصنیفی سرگرمیوں کے ساتھ حضرتؒ ملک وملت کے مسائل سے پوری طرح باخبر اور فکر مند رہتے اور اس کو دین کا ضروری اور اہم تقاضہ خیال فرماتے، اپنے اپنے وقت میں مختلف وزرائے اعظم کو بھی متوجہ فرماتے

(۱) کاروان زندگی چہارم ص ۱۱۳

رہے، پھر جب بابری مسجد کے قضیہ میں شدت پیدا ہوئی اور حکومت نے اس میں یکطرفہ پالیسی اختیار کی، اور اس کے نتیجہ میں ہندو دہشت گرد تنظیمیں آزادی کے ساتھ سرگرم عمل ہو گئیں تو پورے ملک پر اس کا اثر پڑا، فریقین نے اس میں بڑی گرمجوشی اور جذباتیت کا مظاہرہ کیا اور پورے ملک کی فضا مسموم ہو گئی، حضرتؒ نے اس مسئلہ کے حل کے لئے وزیر اعظم راجیو گاندھی سے گفتگو کی تھی مگر بعض رکاوٹوں کی وجہ سے بات آگے نہ بڑھ سکی اور اس کے مضر اثرات پورے ملک پر مرتب ہونے لگے تو حضرتؒ نے ایک بڑا بصیرت افروز بیان دیا اس میں وہ تاریخی جملہ بھی تھا جو حضرتؒ نے اپنے اپنے وقت میں اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے نام مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ "تاریخ کو الٹا سفر کرانے میں ملک بڑے خطرات اور مصائب میں مبتلا ہو جائیگا اور تعمیر و ترقی کا کام رک جائیگا، یہ ایک سویا ہوا شیر ہے اس کو جگانا دانشمندی کے خلاف ہے"۔

اسی صورت حال میں ۴؍نومبر ۱۹۸۹ء کو رائے بریلی میں "پیام انسانیت" کے موضوع پر بڑا کامیاب اور تاریخ ساز کنونشن ہوا جس میں حضرتؒ نے بڑے مؤثر انداز میں اپنے ہم وطنوں سے خطاب فرمایا، مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے بھی بڑی صاف اور مؤثر تقریر کی، اس جلسہ کا شہر کی فضا پر بڑا اچھا اثر پڑا اور حالات میں اعتدال اور سکون پیدا ہو گیا۔ اواخر اکتوبر اور اوائل نومبر میں بھاگلپور میں وہ لرزہ خیز فساد پھوٹ پڑا جس میں وحشت و بربریت کا ننگا ناچ ناچا گیا، اور حکومت نے بجائے اس کا مداوا کرنے کے زخم پر مرچ چھڑکنے کا کام کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نومبر کے عمومی انتخابات میں کانگریس کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور جنتا دل وشوناتھ پرتاب سنگھ کی قیادت میں حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی، حضرتؒ نے اس موقع پر ایک اخباری بیان جاری فرمایا جس کا عنوان تھا "حکومت کی تبدیلی سے سبق اور آئندہ کے لئے صحیح طریقۂ کار" اس بیان کا خاطر خواہ اثر پڑا۔

اہلیہ صاحبہؒ کی وفات

۱۵/دسمبر ۱۹۸۹ء کو عشاء کے وقت اچانک حضرتؒ کی اہلیہ محترمہ سیدہ طیب النساء صاحبہؒ نے رحلت فرمائی، ان کی زندگی میں خاندانی خصوصیات پوری طرح جلوہ گر تھیں، خاص طور پر دو چیزوں میں ان کو نمایاں امتیاز حاصل تھا: ایک نمازوں کا غایت درجہ اہتمام، وہ شاید ان کو اپنے عالی مرتبت دادا حضرت شاہ ضیاء النبیؒ سے ورثہ میں ملا تھا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا ان کو انتظار و اشتیاق رہتا، عبادت و تلاوت اور دعاء مناجات کا بھی خاص ذوق تھا۔ دوسری ان کی نمایاں صفت زہد و استغناء ہے، حضرتؒ کے پاس تحائف آتے تھے تو حضرتؒ ان کو اہلیہ صاحبہؒ کے پاس گھر بھجوا دیتے وہ فوراً ہی ان کو تقسیم فرما دیتیں، قیمتی سے قیمتی سامان انھوں نے لمحوں میں تقسیم کر دیا جو آتا وہ خالی ہاتھ واپس نہ جاتا، دو تین جوڑے سے زیادہ کپڑے ان کے پاس کبھی جمع نہیں ہوئے، بارہا ایسا ہوا کہ نیا جوڑا زیب تن فرمایا کسی غریب خاتون نے تعریف کی اسی وقت دوسرا پہن کر وہ قیمتی لباس اس غریب خاتون کو دے دیا، اخیر میں دنیا سے بڑا توحش پیدا ہو گیا تھا، اور لقائے رب کا شوق بہت بڑھ گیا تھا۔

ان کی علالت کا سلسلہ بڑا طویل تھا اور مختلف قسم کی شکایتیں تھیں، ان امراض و تکالیف کو انھوں نے بڑے صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیا۔

ان کو حضرتؒ کی خدمت و راحت کا بڑا خیال رہتا اور حضرتؒ کی ہر بات ان کے لئے حرف آخر تھی، اخیر دس سالوں میں جب ان کا ضعف بہت بڑھ گیا تو انھوں نے حضرتؒ کی راحت کی خاطر درخواست کی کہ حضرتؒ باہر بنگلہ ہی میں آرام فرمایا کریں تاکہ خدام پوری راحت کا خیال کر سکیں، چونکہ حضرتؒ کی چھوٹی ہمشیرہ صاحبہؒ (جو حضرت سے بڑی تھیں) کی وفات کے بعد سے وہ گھر میں تنہا تھیں اس لئے حضرت کے باہر قیام فرمانے کے بعد سے وہ حضرتؒ کی بڑی ہمشیرہ صاحبہؒ (والدہ مولانا محمد ثانی حسنیؒ و مولانا محمد رابع حسنی، و مولانا واضح رشید ندوی

مد ظلھما) کے مکان میں جو متصل تھا ان ہی کے ساتھ رہنے لگیں۔

وفات سے چند روز قبل پیر کی ہڈی میں ضرب کی وجہ سے وہ معذور ہو گئی تھیں، حضرتؒ سفر پر تھے ان کو حضرتؒ کی آمد کا شدت سے انتظار و اشتیاق تھا جس روز حضرتؒ تشریف لائے مل کر بہت مسرور ہوئیں لیکن شام کو طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور عشاء کے وقت حضرتؒ کی موجودگی میں جبکہ دوسرے اعزہ واقربا بھی قریب ہی تھے بڑی اچھی علامتوں کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کردی اور یہ مصرعہ ان پر صادق آیا کہ

ع عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

دوسرے دن ایک بہت بڑے مجمع نے حضرتؒ کی اقتداء میں نماز جنازہ ادا کی، اور ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں ”تعزیتی خطوط اور تار بھی اندرون ملک اور بیرون ملک سے اتنی بڑی تعداد میں آئے جو اس سے پہلے یاد نہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے لئے دعاء مغفرت وایصال ثواب کا بھی ایسا اہتمام کیا گیا اور اس میں اس خلوص وعقیدت کا حصہ رہا جو بڑے خوش نصیبوں اور مقبول بندوں کے حصہ میں آیا کرتا ہے۔ وذلك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم“(۱)

اس حادثہ کے دوسرے ہی دن سید احمد الحسنیؒ صاحب کا لاہور میں انتقال ہوا اور اس خبر نے غم بالائے غم کا کام کیا۔

(۱) کاروان زندگی چہارم ص ۱۶۴

چودھواں باب

۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء تک اہم واقعات، حوادث، اسفار اور علمی ودینی خدمات واعزازات

حجاز مقدس کا سفر

۲۷؍جنوری ۱۹۹۰ء کو "رابطہ عالم اسلامی" کی مجلس تاسیسی کا اجلاس شروع ہو رہا تھا، حضرتؒ اپنے مستقل رفیق حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب مدظلہ کے ہمراہ ۲۶؍جنوری کو جدہ تشریف لے گئے۔ رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے علاوہ اس سفر میں حضرت کے اعزاز میں تین استقبالیے بھی دیئے گئے جن میں خاص طور پر شیخ ابراہیم امین فودہ نے بڑا اہتمام کیا، حضرتؒ کی خدمات کے اعتراف میں تقریریں بھی ہوئیں اور قصائد بھی پڑھے گئے۔ حضرتؒ نے اخیر میں تقریر فرمائی۔

اس سفر میں ایک خصوصی جہاز سے ریاض بھی تشریف لے گئے، وہاں حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک روز "جامعة الامام محمد بن سعود" میں شیخ عبداللہ عبدالمحسن ترکی کی خواہش میں وہاں سے فارغ ہونے والے طلبہ کے سامنے خطاب بھی ہوا۔

جدہ کے قیام میں شیخ عبداللہ علی بصفر نے ایک خصوصی نشست کا انتظام کیا تھا، جس میں ممتاز اہل علم اور دینی دعوتی کام کرنے والوں کو جمع کیا، حضرتؒ کی اس

میں بڑی اہم تقریر ہوئی، اس کا عنوان تھا "اس وقت دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ایک مثالی اسلامی معاشرہ و ماحول ہے" تقریر عربی میں ہوئی، اور بعد میں "حاجة العالم إلى مجتمع إسلامي مثالي أفضل" کے عنوان سے مجلس تحقیقات نے اس کو ایک رسالہ کی شکل میں شائع کیا۔

اندرون ملک بعض اہم جلسوں میں شرکت اور مدراس کا ایک سفر

مولانا آزاد میموریل اکیڈمی لکھنؤ کی جانب سے ۴؍مارچ کو لکھنؤ ہی میں مولانا آزاد کی یاد میں صد سالہ جشن منایا گیا، حضرت کی صدارت میں اجلاس منعقد ہوا، حضرتؒ نے اپنی تقریر میں ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی اور ان کی تحریر کا ایک اقتباس بھی پیش کیا۔

۷؍مارچ کو دہلی میں "پیام انسانیت" کا تاریخی کنونشن ہوا، اور اس میں ہندوستان کے چیدہ افراد شریک ہوئے، شمبھر ناتھ پانڈے نے جلسہ کی صدارت کی، چونکہ یہ اجلاس حضرت کی خصوصی دعوت پر ہوا تھا اور حضرتؒ نے اجلاس سے پہلے ایک مفصل مکتوب اہم دانشوروں کو بھیجا تھا، اس لئے یہ اجتماع بہت کامیاب مثالی اور ممتاز ہوا۔

دہلی سے فارغ ہو کر حضرتؒ مدراس تشریف لے گئے، اس سفر کا مقصد شنکر اچاریہ جی سے ملاقات اور گفتگو تھی جس کی دعوت تین ماہ قبل جناب یونس سلیم صاحب (سابق گورنر بہار) اور شری کرشن کانت جی (سابق گورنر آندھرا پردیش اور حال نائب صدر جمہوریہ ہند) نے خود لکھنؤ آکر حضرت کو دی تھی، اور یہ معروضہ پیش کیا تھا کہ شنکر اچاریہ جی بابری مسجد کے قضیہ میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں نے ملاقات کی افادیت و ضرورت پر بہت زور دیا تھا۔ حضرت کو اس میں برابر تردد تھا لیکن ان دونوں کے اصرار پر اس امید میں حضرتؒ نے اس کو منظور فرمالیا تھا کہ شاید مسئلہ کا کچھ حل نکل آئے۔

۱۸؍مارچ کو حضرتؒ، مولانا پاریکھ صاحب اور حاجی عبد الرزاق صاحب کو ساتھ لیکر مدراس تشریف لے گئے۔ اپنے قدیم میزبان عماد الدین خطیب صاحب کے یہاں قیام فرمایا۔ ۱۹؍مارچ کو ملاقات کے لئے کانچی پورم تشریف لے گئے۔ حضرت کے رفقاء کے علاوہ دونوں گورنر صاحبان بھی ہمراہ تھے۔ پہلے دن نمبر دو کے شنکر اچاریہ سے ملاقات ہوئی، اور اچھے ماحول میں ان سے گفتگو ہوئی، عصر کا وقت ہو گیا، حضرتؒ نے وہیں بلند آواز سے اقامت کہی اور جماعت کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ دوسرے روز نمبر ایک کے شنکر اچاریہ سے ملاقات کا وقت طے ہوا لیکن چونکہ پہلے دن بات مکمل ہو چکی تھی اس لئے حضرتؒ نے مولانا پاریکھ صاحب کو گفتگو پر مامور فرمایا۔ حضرتؒ کو تعب بہت ہو گیا تھا اس لئے خود معذرت فرمائی۔

اس گفتگو کے بعد اچھی امیدیں قائم ہو گئی تھیں لیکن مسلم قائدین کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت واشتعال کے نتیجہ میں اس پر عمل نہیں ہو سکا۔

۲۰؍مارچ کو یہ حضرات دہلی واپس ہوئے اور حضرتؒ دہلی سے فوراً ہی لکھنؤ واپس تشریف لے آئے کہ ماہ مبارک قریب تھا۔ رمضان میں پروفیسر مشیر الحق ندویؒ کو کشمیر میں شہید کیا گیا اور حضرتؒ کو ان سے قدیم تعلق کی بنا پر صدمہ ہوا۔ اس کے دو ہی مہینے کے بعد میر واعظ مولوی محمد فاروق کو بھی شہید کر دیا گیا، حضرتؒ کو بمبئی میں اس حادثہ کا علم ہوا، واپسی پر حضرتؒ کا بیان اخبارات میں شائع ہوا جس میں حضرتؒ نے اپنے تاثر کا اظہار فرمایا۔

وزیر اعظم سے ملاقات

حکومت میں فرقہ پرست جماعت بی جے پی کی شمولیت کی وجہ سے ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے ذمہ داروں کو ''یونیفارم سول کوڈ'' کے بارے میں خدشہ محسوس ہو رہا تھا، بعض اراکین پارلیمنٹ کی طرف سے اس طرح کی آوازیں بھی اٹھنے لگی تھیں، حضرت نے وزیر اعظم کے نام ایک خط میں اس کی وضاحت فرمائی

اور تحریر فرمایا کہ "انھوں نے جنتا حکومت کی تشکیل کے بعد رائے عامہ کے احترام اور اقلیتوں کے تحفظ کے جو اشارے دیئے اور اس سے خود ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں میں حکومت کے ساتھ ہمدردی اور تائید کی ایک فضا قائم ہوئی ہے، وہ اس کو کسی حال میں کمزور یا مجروح نہ کریں۔"

اراکین بورڈ کو ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ براہ راست وزیراعظم سے ملاقات کر کے اس کا اطمینان حاصل کر لیا جائے، اس کے لئے یکم مئی کو حضرتؒ کی قیادت میں وفد نے وزیراعظم وی پی سنگھ جی سے ملاقات کی انھوں نے حضرتؒ کے خط کا تذکرہ کیا، اور کہا کہ میں اس کا جواب دینے والا تھا لیکن وفد کی ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا۔ پھر انھوں نے تمام مطالبات تسلیم کئے اور وفد کو پوری طرح اطمینان دلایا، حضرت سے خصوصی طور پر انھوں نے اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور کہا کہ "جب میں کوئی پبلک اسپیچ دینے جاتا ہوں تو آپکا کوئی پمفلٹ یا تقریر پڑھ لیتا ہوں"۔

یہ ملاقات بڑی اچھی فضا میں ہوئی اور دوسرے دن پریس میں اس کی رپورٹ بھی اچھی آئی۔

بمبئی و بنگلور کا سفر

کئی سالوں سے محمد بھائی کے اصرار پر حضرت کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ موسم کی شدت کے زمانہ میں بمبئی تشریف لے جاتے اور حسب تقاضہ ہفتہ دو ہفتے قیام فرماتے۔ اس سال ۲۰ر مئی کو اپنے رفقاء و خدام کے ساتھ بمبئی تشریف لے گئے۔ دو ہفتے کے قیام میں وہاں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا، دوران قیام ایک تقریر جامع مسجد میں، دوسری حجاج کے سامنے صابو صدیق مسافر خانے میں ہوئی۔ وہیں سے ۷ر جون کو مولانا مجاہد الاسلام صاحب کے اصرار پر فقہ اکیڈمی کے سیمینار میں شرکت کے لئے بنگلور تشریف لے گئے، سیمینار میں شرکت اور صدارت فرمائی،

اور "بحث و تحقیق اور اجتہاد کی ضرورت اور اس کے آداب" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

دوران قیام اور بھی پروگرام ہوئے جن میں سبیل الرشاد میں جلسہ دستار بندی اور گرونانک ہال میں جلسہ "پیام انسانیت" خاص طور پر قابل ذکر ہیں، دونوں جگہ حضرتؒ نے اپنے اپنے موضوع پر موثر خطاب فرمایا۔

جلسہ "پیام انسانیت" لکھنؤ

۲؍جولائی کو لکھنؤ میں گنا سنستھان کے آڈیٹوریم میں بڑے پیمانے پر "پیام انسانیت" کا جلسہ منعقد ہوا، بشمبھر ناتھ پانڈے نے صدارت کی اور یوپی کے وزیر اعلیٰ مسٹر ملائم سنگھ یادو کے علاوہ متعدد مرکزی وزراء اور اہم شخصیتیں شریک ہوئیں، حضرتؒ نے اجلاس میں اختتامی تقریر فرمائی اور اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی اس تقریر کا ایک اقتباس بھی پیش کیا جو انھوں نے ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ کی تاریخی سلور جبلی میں کی تھی، جس میں ملک کے (یاد رہے کہ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے) تمام منتخب قائدین، دانشور اور علماء شریک ہوئے تھے۔

۵؍اگست ۱۹۹۰ء کو غالب اکیڈمی دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی پر ایک سیمینار منعقد ہوا، ذمہ داران سیمینار کے اصرار و خواہش پر حضرتؒ نے بھی اس میں مقالہ پیش فرمایا اور ان کی خوبیوں، قائدانہ صلاحیتوں اور خدمات کا تذکرہ کیا، بعد میں یہ مضمون "پرانے چراغ" کے حصہ سوم میں شامل کر لیا گیا۔

عراق کا کویت پر حملہ اور حضرتؒ کا موقف

۲؍اگست ۱۹۹۰ء میں وہ سنگین اور شرمناک واقعہ پیش آیا کہ پوری ملت اسلامیہ کے سر شرم سے جھک گئے، عراق جیسے بڑے اور طاقتور ملک نے کویت جیسی چھوٹی ریاست پر حملہ کر کے ایسی خراب نظیر قائم کی جو نہ صرف یہ کہ اسلام

کی اخلاقی تعلیم و روایات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی بلکہ انسانی ضمیر اور اصول اخلاق کے لحاظ سے بھی ایک مذموم اقدام اور قزاقی کے مرادف تھا، پھر اس حملہ میں وہ ساری قباحتیں اور شرمناک واقعات پیش آئے جن کا ایسے حملہ اور فتوحات میں حملہ آور فوجوں کے ہاتھوں تجربہ کیا گیا ہے۔

اس کا سب سے خطرناک پہلو یہ تھا کہ صدر صدام حسین کی قوت ارادی، کامیاب فوجی تنظیم اور قیادت سے بعض حلقوں میں یہ امید ہونے لگی تھی کہ شاید وہ عالم اسلامی کی قیادت کے خلا کو پر کر سکیں، اس طرح سحر ناصری کی طرح ان کا جادو بھی ان حلقوں میں سر چڑھ کر بولنے لگا تھا اور عوامی حلقوں کو ایک لفظ ان کے خلاف سننا گوارہ نہ تھا۔

حضرتؒ نے اپنی خداداد ایمانی بصیرت سے پہلے ہی دن اس کی سنگینی کو محسوس فرمالیا اور اس حادثہ کا حضرتؒ پر ایسا اثر پڑا کہ کم حادثوں کا پڑا ہوگا، صاف صاف اور دو ٹوک انداز میں حضرتؒ نے اس کی قباحتیں بیان فرمانی شروع کیں، عوامی اور عمومی رجحان کے خلاف حضرتؒ نے کھل کر اس پر تنقید کی اور اپنے مضامین اور تقریروں میں اسکی مخالفت کی، بعض بعض مرتبہ خلاف معمول بڑے جوش میں فرمایا "میں اللہ کی طرف سے اسکی مخالفت پر مامور ہوں" بعد میں پیش آنے والے واقعات و حقائق نے ثابت کردیا کہ حضرتؒ کی رائے کتنی دوراندیشی اور بصیرت پر مبنی تھی۔ دوسری طرف اس واقعہ کے دو تین ماہ بعد حضرتؒ نے سعودی سربراہ شاہ فہد کو ایک مکتوب روانہ فرمایا جس میں عالم اسلام کو پیش آنے والے خطرات اور چیلنجوں کی نشاندہی فرمائی، صالح اور مثالی اسلامی معاشرہ اختیار کرنے اور صحیح دینی طاقت و قیادت کے خلا کو پر کرنے کی پرزور اور مؤثر انداز میں دعوت پیش کی، اس مکتوب کا شاہ نے شریفانہ اور مثبت جواب اہتمام کے ساتھ بھیجا اور ان ہدایات پر عمل کرنے کی یقین دہانی کرائی جو حضرتؒ نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمائیں تھیں۔

اسی فکر و غم کی فضا میں حضرتؒ نے چار اہم جلسوں میں شرکت فرمائی؛ جس

میں پہلا جلسہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کا تھا، دوسرا مسلم پرسنل لا بورڈ کی عاملہ کا تیسرا دینی تعلیمی کونسل کی عاملہ کا اور چوتھا مجلس مشاورت کا۔

ان ہی ایام میں جناب یونس سلیم صاحب اور جناب کرشن کانت صاحب لکھنؤ آئے اور بابری مسجد کے مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں وہ فارمولا پیش کیا جو شنکر اچاریہ جی سے گفتگو کے بعد طے ہوا تھا، حضرت نے اس میں چند نقاط کا اضافہ فرمایا جو انھوں نے منظور کیا لیکن مسئلہ جوں کا توں رہا اور بعض رکاوٹوں کے باعث کام آگے نہ بڑھ سکا۔

حجاز مقدس کا سفر

خلیج کے ان تکلیف دہ حالات کے پیش نظر اسی موضوع پر "رابطہ عالم اسلامی" نے کانفرنس منعقد کی اور اس میں حضرتؒ کو خصوصی طور پر مدعو کیا۔ ۷؍ستمبر کو حضرتؒ دہلی سے ریاض ہوتے ہوئے جدہ تشریف لے گئے۔ حضرتؒ کے رفیق و معاون کی حیثیت سے مولانا محمد رابع صاحب ساتھ تھے، ان کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے ممتاز علماء، دانشور اور قائدین بھی کانفرنس میں شرکت کے لئے اسی جہاز سے روانہ ہوئے۔

۹؍ستمبر کو مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، اسی روز عمرہ کی ادائیگی فرمائی اور مولانا عبد اللہ عباس ندوی صاحب کے مکان پر آرام فرمایا۔ اگلے روز ۱۰؍ستمبر کو کانفرنس کا آغاز ہوا، اجلاس میں پورے عالم اسلام کی بھرپور نمائندگی تھی، اسٹیج پر عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیات جلوہ افروز تھیں: حضرتؒ، شیخ بن باز، شیخ الازہر، افغانستان کے وزیر اعظم استاد عبد رب الرسول صیاف کو اسٹیج پر جگہ دی گئی تھی۔ ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف جلسہ کو کنڈکٹ کر رہے تھے۔ دوسرے اہم مندوبین میں شام کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر معروف دوالیبی اور ترکی کے سابق نائب وزیر اعظم نجم الدین اربکان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افتتاحی نشست کا اختتام حضرتؒ کے اس مقالہ سے ہوا جو حضرتؒ نے پہلے ہی "عالم عربی کا تازہ المیہ، اس کا دینی، اخلاقی،

اصولی اور دعوتی نقطۂ نظر سے مطالعہ اور جائزہ" کے عنوان سے اردو میں تحریر فرمایا تھا، اور حضرتؒ ہی کے حکم پر حضرت کے چھوٹے بھانجے مولانا واضح رشید ندوی صاحب نے شستہ عربی زبان میں اسکا ترجمہ کردیا تھا۔

تین روزہ اجلاس میں اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخری اجلاس میں شیخ الازہر شیخ بن باز کے علاوہ حضرتؒ کو خطاب کا موقع دیا گیا، اور حضرتؒ نے اس تقریر میں موضوع کے سلبی پہلو سے ہٹ کر امید کی کرن روشن کی، تاریخ اسلام کی روشنی میں اس کے ایجابی پہلو کو نمایاں کیا اور ان صفات کو اختیار کرنے پر زور دیا جو حقیقی غلبہ اور فتحمندی کی ضامن ہوا کرتی ہیں۔

مؤتمر سے فراغت کے بعد مزید دو روز مکہ مکرمہ میں قیام رہا۔ بھائی عبداللطیف صاحب ساعاتی حرم لانے لے جانے کے لئے اپنی گاڑی کے ساتھ مستعد رہتے۔

۱۶ر ستمبر ۷ ۲ر صفر کو مدینہ منورہ روانگی ہوئی، بھائی عثمان صاحب حیدر آبادی نے ایک بڑی آرامدہ امریکن کار سفر کے لئے حاصل کرلی تھی، اسلئے بہت کم وقت میں سفر پورا ہوا۔ مدینہ منورہ میں چھ روز قیام رہا، اہل تعلق ملنے آتے رہے۔ مسجد نبوی میں تعمیر کا سلسلہ جاری تھا، اسلئے گاڑیاں خاصی دور روک دی جاتی تھیں لیکن بھائی عبدالرشید صاحب حیدر آبادی کی کوشش سے شیخ عبدالعزیز الفالح (جو اس پورے کام کے نگراں تھے) نے اپنی گاڑی دے دی، وہ بالکل "باب السلام" سے جاکر لگ جاتی تھی، اس طرح مسجد نبوی حاضری کیلئے اللہ تعالیٰ نے سہولت فرمادی۔

۲۶ر ستمبر کو جدہ سے دہلی اور ۲۷ر ستمبر کو دہلی سے لکھنؤ واپسی ہوئی۔

حجاز مقدس سے واپسی پر ۶ر اکتوبر کو سہکار تا بھون لکھنؤ میں تحفظ حرم کے موضوع پر ڈاکٹر یونس نگرامی صاحب نے ایک کانفرنس منعقد کی، حضرتؒ نے اس کی صدارت فرمائی اور صدارتی خطاب فرمایا۔

رائے بریلی میں "حمد و مناجات" کے موضوع پر سیمینار، کڑہ کا سفر

۱۶ر ۱۷ر ۱۸ر ربیع الاول ۱۴۱۱ھ مطابق ۷ر ۸ر ۹ر اکتوبر کو رائے بریلی میں

"مولانا محمد ثانی حسنی میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی" کی دعوت پر اس کے زیر اہتمام "رابطہ ادب اسلامی" کا چھٹا سیمینار منعقد ہوا، اور اس میں ہندوستان کے مختلف تعلیمی اداروں کے نمائندے شریک ہوئے، عالمِ عربی سے بھی متعدد فضلاء نے جلسہ کو رونق بخشی۔ حضرتؒ نے اس میں صدارتی خطاب بھی فرمایا اور اختتامی کلمات بھی ارشاد فرمائے، اور حضرتؒ ہی کی دعا پر جلسہ کا اختتام ہوا۔ موضوع کی مناسبت سے پورے شہر پر ایک سکینت کی فضا طاری رہی، خاص طور پر حضرتؒ نے جب صدارتی خطاب میں گلوگیر آواز میں طائف اور عرفات کی دعا پڑھی تو پورے مجمع کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

حضرتؒ نے ایک روز دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں میں تمام مندوبین کو مدعو کیا اور دوپہر کے کھانے کا اہتمام فرمایا۔

سیمینار سے فارغ ہو کر حضرتؒ مولوی نفیس صاحب ندوی کی دعوت پر ایک جلسۂ سیرت میں شرکت کے لئے "کڑہ" تشریف لے گئے۔ سفر کا بڑا محرک یہ تھا کہ کڑہ حضرتؒ کے خاندان کا ایک صدی تک مسکن و مدفن رہ چکا تھا، خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت سید قطب الدین محمد المدنیؒ وہیں مدفون ہیں، ان کے بیک واسطہ خلیفہ اور ہنسوہ کے خاندان حسینی وواسطی کے مورثِ اعلیٰ مولانا شمس الدین خواجگی عریضی کا بھی وہ مدفن ہے۔

حضرتؒ نے جلسۂ سیرت میں تقریر کی اور فارغ ہو کر ان حضراتؒ کے مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ حضرت خواجگیؒ کے بارے میں حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "ان پر نسبت تواضع کا بڑا غلبہ تھا، ان کی جب وفات ہوئی تو انھوں نے وصیت کی کہ یہ اشعار ان کی لوحِ منبر پر کندہ کر دیئے جائیں۔

برائے خدائے عزیزان من	نویسید برگور من ایں سخن
کہ چوں خواجگی در تہ خاک شد	نکو شد کہ خس کم جہاں پاک شد

حضرت جب ان کے مزار پر حاضر ہوئے تو اس میں تصرف فرمایا، ان کے شعر

کا دوسرا مصرع تھا "نگو شد کہ خس کم جہاں پاک شد" اس کو حضرتؒ نے اس تصرف کے ساتھ پڑھا "نگو شد کہ منزل بافلاک شد"۔

بابری مسجد کا مسئلہ اور ماہ دسمبر کے متفرق واقعات

اسی دوران حضرتؒ اس امید میں اپنے مزاج کے خلاف بابری مسجد کے مسئلہ کے حل کی کوشش فرماتے رہے، دونوں گورنر صاحبان بھی دلچسپی لیتے رہے، اور امید تھی کہ شاید کوئی حل نکل آئے لیکن دونوں فرقوں کی جذباتیت کی وجہ سے بات آگے نہ بڑھ سکی، ایڈوانی کی رتھ یاترا نے فضا کو اور مشتعل کر دیا جسکے نتیجہ میں جگہ جگہ فسادات ہوئے، اس مسئلہ میں حکام میں سے ملائم سنگھ یادو جی نے سب سے زیادہ اصول پسندی کا ثبوت دیا۔

فضا کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ۲/دسمبر ۱۹۹۰ء میں اردو اکیڈمی نے جلسہ "پیام انسانیت" کا انعقاد کیا؛ حضرتؒ نے اس میں افتتاحی تقریر فرمائی، یہ تقریر "ملک و معاشرہ کے لئے سب سے بڑا خطرہ" کے عنوان سے الگ رسالہ کی شکل میں بھی شائع کی گئی، مگر فضا اتنی مشتعل ہو چکی تھی کہ یہ کوششیں اس وقت نقش بر آب ثابت ہو رہی تھیں، عارضی طور پر ضرور اس کا اثر ہوتا لیکن اس کے لئے خاص طور پر اکثریتی فرقہ کے لوگوں کو متوجہ ہونے کی ضرورت تھی جس کا فقدان تھا، چند لوگوں کے سوا کسی کو ملک کی فکر نہیں تھی۔

انہیں دنوں حضرتؒ نے مدرسہ سید احمد شہید کے احاطہ میں منعقد ایک کیمپ میں بھی خطاب فرمایا جو "شباب اسلام" کی طرف سے حضرتؒ کی برادر زادی کے فرزند مولانا سلمان حسینی صاحب کے انتظام و سرپرستی میں لگایا گیا تھا اور اس میں بعض عرب طلباء اور مہمان بھی شریک تھے، ان عرب مہمانوں کے اعزاز میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں بھی ایک دو نشستیں کی گئیں۔

ان ہی دنوں میں مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحیؒ کی وفات ہوئی اور ان کی

تعزیت میں دارالعلوم کی مسجد میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اور لوگوں کے علاوہ حضرتؒ نے بھی خطاب فرمایا اور ان سے اپنے قدیم تعلق کا ذکر کیا۔

اوائل دسمبر ہی میں ایک روز حضرتؒ مدرسہ تعلیم القرآن جگدیش پور میں منعقد "پیام انسانیت" کے نام سے آنکھ کے آپریشن کے ایک مشترک کیمپ میں تشریف لے گئے اور وہاں خطاب فرمایا۔

دسمبر ہی کی ۱۳؍ تاریخ کو روس کی ایک تبلیغی جماعت حضرتؒ سے ملاقات کے لئے دارالعلوم آئی، اس میں بعض راسخ العلم اور عربی پر قدرت رکھنے والے علماء بھی تھے، انھوں نے حضرتؒ کی کتابیں پڑھی تھیں، بعضوں کو "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کے صفحہ کے صفحہ زبانی یاد تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ وہاں حضرتؒ کی کتابیں پڑھی گئی ہیں، خاص طور پر "قصص النبیین" اکثر مدارس میں داخل نصاب ہے۔ ان کے اعزاز میں "عباسیہ ہال" میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں حضرتؒ نے مفصل خطاب فرمایا اور وہاں کے حالات کو سامنے رکھ کر ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔

۱۹۹۱ء کے اہم حوادث وواقعات

۲۰؍ مارچ ۱۹۹۱ء مطابق ۴؍ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ کی شب کو تہجد کے وقت اچانک مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ کے حادثۂ وفات کی خبر آئی، خاندانی تعلق، رفاقت اور خاص طور پر "مسلم پرسنل لا بورڈ" کے سلسلہ میں ان کی معاونت کی وجہ سے حضرتؒ پر اس کا اثر پڑا، حضرتؒ نے ایک تعزیتی بیان اسی وقت جاری فرمایا جو دوسرے دن اخبارات میں شائع ہوا، اس کے علاوہ مستقل ایک تاثراتی مضمون بھی تیار فرمایا جو "تعمیر حیات" کے شمارے میں شائع ہوا، اور بعد میں "پرانے چراغ" میں اس کو شامل کر دیا گیا۔

مولانا مرحوم کو بھی حضرتؒ سے بڑی مناسبت و تعلق اور محبت تھی؛ ایک

مرتبہ ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ راجیو گاندھی سے ملاقات کے لئے یہ دونوں حضرات تشریف لے جارہے تھے، کاغذات مولانا منت اللہ صاحبؒ کے پاس تھے۔ حضرتؒ نے ان کے احترام میں فرمایا کہ یہ سامان ہم کو دے دیجئے اسکے اٹھانے کا حق ہم کو ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا کیوں؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ اگر مولانا محمد علی مونگیریؒ اور مولانا عبدالحی حسنیؒ صاحب ہوتے تو سامان کون لیتا؟ اس پر مولانا منت اللہ صاحبؒ نے برجستہ فرمایا "وہ لیتا جس کو مولانا مونگیریؒ فرماتے۔" اس سے دونوں حضرات کے آپس میں تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

۲۱ر مئی کو اچانک راجیو گاندھی کا قتل ہوا، اور نرسمہا راؤ وزیر اعظم بنائے گئے۔ حضرتؒ نے ملک کے بگڑتے حالات اور پیش آنے والے خطرات کو دیکھتے ہوئے ان کو بھی مکتوب تحریر فرمایا جیسے ان کے پیش رووں (اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، وی پی سنگھ اور چندر شیکھر) کو تحریر فرمایا تھا، اس میں خطرات کی نشاندہی فرمائی، ضروری اور مفید مشورے دیئے۔

اگست کے اخیر میں مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کی معیت میں حضرتؒ نے انگلستان کا سفر فرمایا۔ آکسفورڈ اسلامک سنٹر کے جلسہ میں شرکت کے علاوہ لیسٹر کے اسلامک فاؤنڈیشن میں تشریف لے گئے اور وہاں ایک وقیع مجمع کو خطاب کیا، بعد میں یہ تقریر "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" سے "دین حق اور دعوت اسلام، ایک فلک بوس وصد ابہار درخت" کے عنوان سے شائع ہوئی۔

۱۳ر ۱۴ر ۱۵ر اکتوبر کو بھوپال میں دارالعلوم تاج المساجد کی دعوت و انتظام میں "رابطہ ادب اسلامی" کا سہ روزہ سیمینار ہوا، حضرتؒ نے اس کے افتتاحی جلسہ میں صدارتی خطاب فرمایا، جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں "رابطہ عالم اسلامی" کے نائب جنرل سکریٹری شیخ محمد ناصر العبودی اور جلیل القدر محدث مولانا عبدالرشید نعمانی صاحبؒ بھی شریک تھے۔

سیمینار سے فراغت کے بعد مولانا معین اللہ صاحبؒ کے وطن "اندور" اور

وہاں سے چند گھنٹوں کے لئے تاریخی قلعہ "مانڈو" بھی جانا ہوا، وہاں پہونچ کر حضرتؒ نے بڑے درد و سوز کے ساتھ یہ اشعار پڑھے ۔

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلیں تھیں باغ میں ایک شور تھا غل تھا
کھلی جب آنکھ نرگس کی نہ تھا جزء خار کچھ باقی
بتاتا باغباں رو رو، یہاں غنچہ یہاں گل تھا

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ کا حادثۂ وفات

۱۲/ اکتوبر مطابق ۳/ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ کو حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوریؒ کی وفات کا حادثہ پیش آیا، اور حضرتؒ کو بھوپال ہی میں اسکی خبر ہوئی، جو حضرتؒ کے لئے بڑی متاثر کن تھی، دونوں بزرگوں کا آپس میں عقیدت و محبت کا وہ تعلق تھا جو اہل اللہ کا خاصہ ہے، حضرتؒ گاہے گاہے الہ آباد یا پرتا بگڈھ مولانا کے پاس تشریف لے جاتے۔ مولاناؒ بھی متعدد مرتبہ رائے بریلی، لکھنؤ حضرتؒ سے ملنے تشریف لائے۔ حضرت نے مجلس میں بارہا یہ بات فرمائی کہ اب (حضرت شیخ کے بعد) مولاناؒ ہی رہ گئے ہیں جن سے سب سے زیادہ مناسبت و تعلق محسوس ہوتا ہے۔ حضرتؒ بھی جب مولاناؒ کے پاس الہ آباد تشریف لے جاتے تو مولانا کا خوشی میں عجب حال ہو جاتا، کبھی فرماتے "نعمت غیر مترقبہ حاصل ہوئی۔" حضرتؒ کے نام مولاناؒ کے مکاتیب اس تعلق خاص کے آئینہ دار ہیں۔ بھوپال جانے سے پہلے بھی حضرتؒ الہ آباد تشریف لے گئے تھے، مولانا کا مرضِ وفات تھا، جسم کو حرکت دینی مشکل تھی، لیکن حضرتؒ کو دیکھ کر مولاناؒ کے اندر عجیب قوت پیدا ہوئی، اصرار کر کے خود بستر سے اتر کر نیچے بیٹھ گئے اور کسی طرح لیٹنا گوارہ نہ کیا۔ جب حضرتؒ واپس ہوئے تو بھی اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک حضرتؒ کی گاڑی روانہ نہیں ہو گئی۔

بعض اہم اسفار وواقعات

۲۳ر ۲۴ر نومبر کو دہلی میں "مسلم پرسنل لا بورڈ" کا دسواں سالانہ جلسہ جامعہ نگر اوکھلا میں منعقد ہوا اور حضرتؒ نے اس میں تاریخی حقائق سے بھرپور خطبہ صدارت پیش فرمایا۔

۲۷ر اکتوبر کو جامعہ سلفیہ بنارس کے زیر اہتمام منعقد ایک سیمینار میں شرکت فرمائی، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ پر مقالہ پیش فرمایا، اس میں ان کی سیرت کے بعض اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا اور ان کی خصوصی علمی انقلابی کوششوں کا تذکرہ فرمایا۔

نومبر کے اواخر میں بھٹکل کا سفر ہوا، وہاں انجمن شباب اسلام کا ایک بڑا جلسہ جامعہ اسلامیہ کی دعوت وانتظام میں منعقد ہوا، اس میں شرکت وصدارت کے علاوہ "پیام انسانیت" کے دو بڑے جلسے ہوئے: ایک بھٹکل ہی میں، دوسرا منگلور میں۔ دونوں میں حضرتؒ نے خطاب فرمایا۔

۱۲ر جنوری ۱۹۹۲ء کو انجمن تعلیمات دین ضلع مراد آباد کے زیر اہتمام حضرتؒ کی صدارت میں دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی اور حضرتؒ نے خطبۂ صدارت پڑھا۔

۱۷ر فروری کو مسجد اقصیٰ کے جلاوطن امام شیخ محمد صیام دار العلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے، ان کے اعزاز میں بعد نماز عصر "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کی جانب سے ایک نشست کا انتظام کیا گیا: اس میں تقریر کرتے ہوئے شیخ نے خاص طور پر حضرتؒ کی تصنیفات کے عالم اسلام پر اثرات کا ذکر کیا اور اپنے تعلق و استفادہ کا بھی تذکرہ کیا۔ مغرب کی نماز انھوں نے دار العلوم کی مسجد میں پڑھائی، جس میں اساتذہ وطلبہ کے علاوہ شہریوں کی بھی بڑی تعداد شریک ہوئی۔

یکم مارچ کو پٹنہ میں "اصلاح معاشرہ" کے ایک بڑے جلسہ کو حضرتؒ نے خطاب فرمایا۔ اس کے بعد آسنسول تشریف لے گئے اور وہاں بھی مفید اور اہم

خطابات اور مجالس ہوئیں۔

۳/ مئی کو جامعہ رحمانیہ مونگیر میں ایک عمارت کا سنگ بنیاد نصب فرمایا۔ وہاں سے بھاگلپور ہوتے ہوئے نیپال تشریف لے گئے، اور وہاں دار العلوم نور اسلام جلپاپور میں ایک شب گذار کر واپسی ہوئی۔ بھاگلپور میں "اصلاح معاشرہ" کے موضوع پر ایک بڑے جلسہ کو خطاب فرمایا اور نیپال میں مدرسہ ہی کے زیر انتظام ایک جلسہ میں تقریر ہوئی، جو بعد میں رسالہ کی شکل میں مجلس سے شائع ہوئی۔

"پدم بھوشن" کا اعزاز اور حضرتؒ کا استغناء

چندر شیکھر جی نے اپنے وزارت عظمیٰ کے زمانے میں حضرتؒ کو "پدم بھوشن" کا اعزازی خطاب دینا چاہا تھا لیکن حضرتؒ نے معذرت فرمائی تھی۔ نرسمہاراؤ نے بھی اپنے زمانے میں اس کی کوشش کی اور فون پر براہ راست اس سلسلہ میں گفتگو کی لیکن حضرتؒ نے حسب معمول ان سے بھی معذرت کی، اور فرمایا کہ "یہ میرے اصول و روایت کے خلاف ہے، مجھے آزادانہ طور پر ملک کی خدمت کرنے دیجئے!"

انگلستان کا سفر

ستمبر ۱۹۹۲ء کے پہلے ہفتہ میں مولانا سید محمد رابع حسنی مدظلہ کی رفاقت میں آکسفورڈ اسلامک سنٹر کے جلسہ میں شرکت کے لئے حضرتؒ نے انگلستان کا سفر فرمایا، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں حکومت ازبکستان سے ایک معاہدہ کے تحت امام بخاریؒ کی آخری آرامگاہ سے متصل ان کے مدرسہ و مسجد کی از سر نو تعمیر کا منصوبہ طے ہوا۔ آکسفورڈ سے فارغ ہو کر لیسٹر کے اسلامی مرکز اور اسلامک سنٹر لندن میں اہم خطابات ہوئے۔ لیسٹر میں "امت مسلمہ کا فرض منصبی اور اس کے انقلابی اثرات" کے موضوع پر اور لندن میں "غیر اسلامی تہذیب و اقتدار کے مرکزوں میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے تقریر ہوئی۔

ہندوستان کی تاریخ کا عظیم حادثہ

بابری مسجد کے سلسلہ میں حضرتؒ کوششیں فرماتے رہے، اسی سلسلہ میں "مسلم پرسنل لابورڈ" کے وفد کے ساتھ بار بار وزیر اعظم سے گفتگو بھی ہوئی، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس کی بڑی وجہ فریقین کی بڑھی ہوئی جذباتیت، عدم اعتماد اور ذاتی مفاد پرستی تھی، ورنہ شنکر اچاریہ کے ساتھ جو فارمولا طے ہو رہا تھا اگر اس کو تسلیم کر لیا جاتا تو شاید یہ حادثہ پیش نہ آتا جو ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو پیش آیا۔ وکان أمر اللہ قدراً مقدوراً۔

۶ر دسمبر کو وہ سب کچھ ہوا جو مقدر تھا، مسجد مسمار کر دی گئی، اس کی جگہ پر مورتیاں رکھ دی گئیں، صوبائی اور مرکزی حکومتیں صرف خاموش تماشائی ہی نہیں بنی رہیں سب کام ان کی سرپرستی میں ہوا، اس کے بعد ملک گیر فسادات کا سلسلہ شروع ہوا جس میں سیکڑوں جانیں گئیں۔ حضرتؒ کے قلب و دماغ پر اس کا جو اثر پڑا وہ ظاہر ہے، سب سے پہلے تو اس آتش فشانی فضا کو ٹھنڈا کرنے کی ضرورت تھی، حضرت نے اس کے لئے "پیام انسانیت" کے مختلف جلسوں میں خطابات فرمائے جن میں پوری صفائی اور جرأت کے ساتھ ملک کو درپیش خطرات کی نشاندہی فرمائی، اور ایسے اسلوب میں خطاب فرمایا کہ جس سے قلب و ضمیر پر چوٹ لگے اور احساس پیدا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وزیر اعظم کو بار بار متوجہ فرمایا، اور براہ راست ملاقات کر کے ان سے گفتگو کی اور صورت حال کو واضح فرمایا۔

کم و بیش یہی صورت حال چل رہی تھی کہ ۱۲ر مارچ ۱۹۹۳ء مطابق ۱۷ر رمضان ۱۴۱۳ھ کو بمبئی میں عین جمعہ کی نماز کے وقت مختلف مقامات پر طاقتور بم پھٹے۔ کلکتہ میں بھی بعض مقامات پر یہی ہوا، اس واقعہ نے آگ پر پانی کا کام کیا اور اچانک صورت حال بدل گئی۔

"مسلم پرسنل لابورڈ" حضرتؒ کی قیادت میں اپنی کوشش کرتا رہا، اور اس

مسئلہ کے حل کے لئے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔

۱۷ اپریل ۱۹۹۳ء کو حضرتؒ کے برادر زادے مولانا سید محمد الحسنیؒ کی اہلیہ محترمہؒ اور اس ناکارہ کی والدہ کا اچانک انتقال ہوا، حضرتؒ نے نماز جنازہ پڑھائی، اور خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

عالمی سطح پر حضرتؒ کی فکر و تشویش

حضرتؒ کو ایک طرف ہندوستان میں ملت کے تحفظ و بقا کی فکر تھی اور اس کے لئے قانونی طور پر "مسلم پرسنل لا بورڈ" کے پلیٹ فارم سے اور اخلاقی و تعلیمی اعتبار سے "دینی تعلیمی کونسل" اور "اصلاح معاشرہ" کے اسٹیج سے کوششوں کا سلسلہ جاری رہا، اسی طرح دوسری طرف حضرتؒ کو پورے عالم اسلام کی فکر تھی، نئے نئے خطروں کو محسوس فرماتے اور ان کے تدارک کی فکر کرتے، اس زمانے میں حضرت نے اپنی متعدد تقریروں میں یہ بات فرمائی کہ:

"صدیوں کے بعد یہ بات پیش آئی ہے کہ یہودی دماغ اور عیسائی طاقت دونوں متحد ہوگئے ہیں اور دونوں نے اپنا اصل حریف مسلمانوں کو سمجھا ہے، اور ان کا سارا زور اسی پر ہے کہ مسلمانوں کو ایمانی و اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ کردیا جائے تاکہ پوری طرح ان کو بالادستی حاصل ہوسکے، اس کیلئے انھوں نے ایسی ایسی سازشیں اختیار کی ہیں کہ ممالک عربیہ بھی ان کا شکار ہوتے جارہے ہیں، اسلئے بڑی فکر و فہم اور توجہ کی ضرورت ہے: ان میں ایک سازش یہ ہے کہ امریکہ نے عالمی سطح پر بنیاد پرستی (Fundamentalism) کے خلاف مہم چلا رکھی ہے کہ کوئی اصول ہی باقی نہ رہے، حدود ہی باقی نہ رہیں، آدمی جو چاہے کرے، یہ چیز اسلامی عقائد و تعلیمات کے سراسر منافی ہے، اس لئے اس تحریک کو سمجھنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔"(۱)

---

(۱) اس موضوع پر حضرت کی تحریروں کی تلخیص

پٹنہ کا سفر

جون ۱۹۹۳ء کی آخری تاریخوں میں پٹنہ کا سفر ہوا وہاں شباب اسلام کے زیر اہتمام ایک کیمپ میں طلباء اور نوجوانوں سے خطاب ہوا جس میں حضرتؒ نے اصحاب کہف کی ایمانی عزیمت کا واقعہ سنا کر اس سے سبق لینے اور زندگی کی راہ متعین کرنے کی دعوت دی۔

دوسرے دن "پیام انسانیت" کا عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا، جس میں موجودہ وزیر اعلیٰ، سابق وزیر اعلیٰ اور مختلف مذاہب کے اہم دانشور شریک ہوئے، اس میں حضرت کا افتتاحی خطاب ہوا۔

ایک طویل بیرونی سفر

۱۹۹۳ء کے اگست و ستمبر کے مہینوں میں حضرتؒ نے اپنے ضعف اور شدید مصروفیتوں کے باوجود ایک طویل سفر کیا، حسب سابق مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ رفیق سفر تھے، مولانا کے علاوہ مولانا واضح صاحب اور مولانا سعید الرحمن صاحب بھی ہمراہ تھے، ۱۹ر اگست کو دہلی سے دبئی ہوتے ہوئے استنبول روانگی ہوئی۔ ایک ہفتہ کے قیام میں "رابطہ ادب اسلامی" کی نشست کے علاوہ استنبول میں ایک عمومی جلسہ بھی ہوا جس میں حضرتؒ نے عربی میں بڑی اثر انگیز تقریر فرمائی، ترکی میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔

۲۸ر اگست کو انگلستان تشریف لے گئے اور سنٹر کے جلسوں میں شرکت فرمائی۔ ۳ر ستمبر کو امریکہ روانگی ہوئی، شکاگو اور نیویارک میں مختلف مقامات پر تقریریں ہوئیں، ۸ر ستمبر جنیوا ہوتے ہوئے جدہ روانگی ہوئی، اور وہاں سے عمرہ و زیارت سے فارغ ہونے کے بعد ۱۸ر ستمبر کو دہلی واپسی ہوگئی۔

جے پور اور ٹونک کا سفر

۹ر۱۰ر اکتوبر کو جامعہ ہدایت جے پور میں "مسلم پرسنل لا بورڈ" کا سالانہ جلسہ

منعقد ہوا حسب دستور حضرتؒ نے اس میں اپنا قیمتی اور پر مغز خطبہ صدارت پیش فرمایا۔ ۱۰ اکتوبر کی شب میں جے پور کے میدان رام لیلا گراؤنڈ میں جلسہ عام ہوا جس میں حضرتؒ نے "اصلاح معاشرہ" کے موضوع پر موثر خطاب فرمایا۔

ٹونک سے حضرتؒ کو حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت سے بڑی الفت و تعلق تھا، پھر حضرتؒ کے استاذ حدیث حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کا بھی وہ مسکن و مدفن تھا اس لیے حضرتؒ جے پور کے جلسوں سے فارغ ہو کر اپنی خواہش پر ٹونک تشریف لے گئے اور وہاں دو روز قیام فرمایا، اہل ٹونک نے بڑا والہانہ استقبال کیا، اور بڑی محبت و عقیدت سے پیش آئے، وہاں بھی بعض مقامات پر تقریریں ہوئیں، خاص طور محلہ "قافلہ" کی تقریر بڑی اثر انگیز اور جذبہ و قوت سے بھر پور تھی۔

بخارا اور سمرقند کا سفر

اسلامک سنٹر آکسفورڈ کے زیر انتظام امام بخاریؒ کی یادگار قائم کرنے کا جو منصوبہ بنایا گیا تھا، اس کے لئے ۲۳، ۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء کی تاریخیں طے کر دی گئی تھیں، ستمبر اور اوائل اکتوبر میں مسلسل ملک و بیرون ملک کے اسفار کی وجہ سے تعب بہت ہو گیا اور ضعف بڑھ گیا لیکن موضوع کی اہمیت اور جگہ کی خصوصیت و امتیاز کی وجہ سے حضرتؒ نے اس طویل اور پر مشقت سفر کی دشواریاں گوارہ فرمائیں اور ۲۲ر اکتوبر کو دہلی سے مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ اور بھائی عثمان صاحب کی رفاقت میں تاشقند ہوتے ہوئے سمرقند تشریف لے گئے۔

۲۳ر اکتوبر کو افتتاحی اجلاس میں بعض اعلیٰ سرکاری عہدیداران و اہم علماء کی تقریریں ہوئیں۔ اخیر میں حضرتؒ نے بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث پڑھ کر اس کی روشنی میں خطاب فرمایا۔

مقالات کی چار نشستیں ہوئیں، حضرتؒ نے ان میں سے ایک میں اپنا مقالہ بھی پیش فرمایا، جو امام بخاریؒ اور ان کی صحیح کی خصوصیات و امتیازات کے تذکرہ پر مشتمل

تھا، ایک نشست کی صدارت مولانا محمد رابع صاحب حسنی مدظلہ نے فرمائی، اہم شرکاء میں شیخ عبد الفتاح ابو غدہ، ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف اور ہندوستان کے ممتاز علماء شامل تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء سے وہاں کے شیخ الحدیث مولانا ناصر علی صاحب ندوی مدظلہ اور استاد حدیث مولانا سید سلمان حسینی صاحب ندوی بھی تشریف لے گئے تھے۔

سیمینار کی مشغولیات کے علاوہ حضرتؒ نے دوسرے علماء کے ساتھ وہاں کے آثار و باقیات کی زیارت بھی فرمائی اور اہم علماء و مشائخ میں سے امام بخاریؒ، حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ اور حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے مزارات پر حاضری دی اور فاتحہ خوانی فرمائی، امام بخاری کی مسجد میں کچھ دیر خطاب بھی فرمایا۔

۲۹ر نومبر ۱۹۹۳ء کو اچانک دار العلوم کے مہتمم مولانا محب اللہ صاحب ندوی کا حادثۂ وفات پیش آیا۔ حضرتؒ کو اپنی قیام گاہ دائرہ شاہ علم اللہ میں اس کی خبر ہوئی، اسی وقت حضرت لکھنؤ تشریف لے گئے اور بعد مغرب نماز جنازہ پڑھائی اور ڈالی گنج کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی، رفیق درس ہونے کے علاوہ طویل رفاقت و معاونت کی وجہ سے حضرتؒ پر اس حادثہ کا اثر پڑا۔

بنگلہ دیش کا سفر اور "رابطہ ادب اسلامی" کے جلسہ میں شرکت

رابطہ ادب اسلامی کے ایشیائی دفتر کی طرف سے اب تک ہندوستان ہی کے مختلف شہروں اور علمی مراکز میں سالانہ جلسے ہوتے تھے، لیکن ۱۹۹۴ء کے آغاز میں یہ سیمینار بنگلہ دیش میں کیا گیا، اس کی میزبانی کے فرائض مولانا سلطان ذوق صاحب نے بڑے ذوق و اہتمام کے ساتھ انجام دیے، انہی کی شدید خواہش و اصرار پر یہ سیمینار بنگلہ دیش میں منعقد ہو رہا تھا، ۲۱ر جنوری کو اس کا افتتاحی اجلاس حضرت کی صدارت میں "دار المعارف الاسلامیۃ" میں منعقد ہوا، یہ سہ روزہ اجلاس ۲۳ر جنوری کو اختتام کو پہونچا، اس ادبی سیمینار کا موضوع تھا "مشرقی اقوام

کے زبان وادب میں اسلامی رجحانات"۔

حضرت کا یہ سفر علالت وضعف کے باوجود اہل بنگلہ دیش کے شدید اصرار و خواہش پر ہوا تھا، بنگلہ دیش پہونچ کر ضعف کا سخت حملہ ہوا اور رفقاء و خدام کو اس سے بڑی تشویش ہوئی مگر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور الحمد للہ بعافیت سفر سے واپسی ہوگئی۔

۱۹۹۴ء کے بعض اہم واقعات واسفار

۲۷؍مارچ کو حضرت "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" کے ذمہ داروں کی خواہش و اصرار پر علی گڑھ تشریف لے گئے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کے نام پر تعمیر شدہ ہاسٹل کا افتتاح کیا اور سرسید ہال میں اساتذہ و طلبہ کے سامنے خطاب فرمایا۔

۲۲، ۲۳؍اپریل کو جامعہ سلفیہ بنارس میں "رابطہ ادب اسلامی" کے جلسہ کی صدارت فرمائی، وہیں سے غازی پور تشریف لے گئے اور ۲۴؍اپریل کو مدرسہ دینیہ کے جلسہ میں شرکت فرمائی۔ مولانا عزیز الحسن صاحب نے حضرت کی تشریف آوری کی مناسبت سے ایک جلسہ "پیام انسانیت" کا رکھا تھا۔ اس میں بھی شرکت فرمائی۔

۱۱؍جون کو حضرت کی سب سے بڑی بھتیجی سیدہ حمیرا صاحبہ (اہلیہ سید محمد مسلم حسنی) کا پندرہ روز کی شدید علالت کے بعد انتقال ہوا، حضرت کو طبعی طور پر اس کا صدمہ ہوا، حضرت ہی نے نماز جنازہ پڑھائی اور خاندانی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

بیرونی ممالک کا ایک سفر

۲۷؍اگست کو حضرت، مولانا محمد رابع صاحب کی معیت میں لندن تشریف لے گئے، وہاں اسلامک سنٹر کے جلسہ کے علاوہ "رابطہ ادب اسلامی" کے ایک جلسہ میں بھی شرکت ہوئی۔ لندن سے جدہ جانے کا پہلے سے پروگرام تھا مگر اچانک رابطہ عالم اسلامی کے ایک اہم اجلاس میں شرکت کی دعوت آئی، جو مصر میں منعقد

اس کانفرنس کے متعلق ہو رہا تھا جس میں آبادی اور انسانی ترقی کے عنوان پر ایسی تجاویز پاس کی گئی تھیں جو اسلامی روح اور تعلیمات کے منافی تھیں اور مسلمانوں کے ملی تشخص کے لئے خطرہ بن سکتی تھیں، یہ سب کچھ امریکہ کے اشارہ پر ہو اتھا۔ موضوع کی اہمیت اور پھر رابطہ کے ذمہ داروں کے پیہم اصرار پر حضرتؒ نے سفر منظور فرمالیا۔ ۲؍ ستمبر کو احرام باندھ کر جدہ تشریف لے گئے، عمرہ ادا فرمایا اور ۳؍ ستمبر کو اجلاس میں شرکت فرمائی، اور خطاب فرمایا، خطاب میں خاص طور پر حضرتؒ نے یہودی سازشوں اور عیسائیوں کے ساتھ ان کے اسلام دشمن اتحاد کا ذکر کیا۔ اجلاس اتفاق عام اور خیر وخوبی کے ساتھ ختم ہوا۔

۶؍ ستمبر کو جدہ سے "وجدہ" اس نیت سے روانگی ہوئی کہ وہاں سے مدینہ منورہ حاضری ہوگی۔ ۷/۸/۹ ستمبر کو "رابطہ ادب اسلامی" کے جلسے ہوئے۔ اس کے علاوہ بعض اہم مقامات اور مساجد میں بھی تقریریں ہوئیں۔ ۱۰؍ ستمبر کو وجدہ سے "کاسابلانکا" ہوتے ہوئے ریاض تشریف آوری ہوئی، ایک رات وہاں ٹھہر کر دوسرے دن مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، ایک ہفتہ وہاں قیام رہا۔ اسی میں ایک "النادی الادبی" کے جلسہ میں خطاب ہوا۔ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ حاضری ہوئی اور وہاں سے چار روز ٹھہر کر ۲؍ ستمبر کو بمبئی واپسی ہوئی۔

بعض جلسوں میں شرکت اور جنوبی ہند کے تین سفر

۹؍ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو سہ کارتا بھون لکھنؤ میں "پیام انسانیت" کے ایک جلسہ کو حضرتؒ نے خطاب فرمایا۔ ۱۳؍ نومبر کو میرٹھ میں حضرتؒ ہی کی صدارت میں "اصلاح معاشرہ" کے عنوان سے ایک عظیم جلسہ ہوا جس کا اہتمام مولانا عبداللہ مغیثی صاحب نے کیا تھا۔

جنوری ۱۹۹۵ء میں جنوبی ہند کے دو سفر ہوئے، پہلا سفر بمبئی سے بھٹکل کا ہوا، وہاں دو روز قیام رہا۔ ۱۸؍ جنوری کو بعد مغرب وہاں ایک جلسہ عام بھی ہوا

جس میں بھٹکل اور اطراف بھٹکل کے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے، اس میں حضرتؒ نے خطاب فرمایا۔ دوسرا سفر بمبئی سے کوچین کا ہوا، وہاں سید قطبؒ کی تفسیر "فی ظلال القرآن" کے ملیالم ترجمہ کی رسم اجراء کی تقریب تھی، جو حضرت ہی کے دست مبارک سے انجام پائی۔ جلسہ میں حضرتؒ نے سید قطبؒ اور ان کی تفسیر کے بارے میں اپنے تاثرات پیش فرمائے۔ دو دن وہاں ٹھہر کر بمبئی واپسی ہوئی اور وہاں چند روز قیام کر کے لکھنؤ تشریف آوری ہوگئی۔

۳۱؍مارچ ۱۹۹۵ء کو بستی میں "اصلاح معاشرہ" کانفرنس منعقد ہوئی، حضرتؒ نے اس کی صدارت فرمائی، اور خطاب فرمایا، حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ نے بھی جلسہ عام میں خطاب فرمایا، جلسہ کا اہتمام مولانا باقر حسین صاحب نے فرمایا تھا۔

۷؍۸؍۹؍اپریل کو اورنگ آباد میں مدرسہ کاشف العلوم کے زیر انتظام "رابطہ ادب اسلامی" کا گیارہواں مذاکرہ علمی "ادب میں سفرناموں کی اہمیت" کے موضوع پر منعقد ہوا، افتتاحی جلسہ میں حضرتؒ کی صدارتی تقریر ہوئی، اس کے بعد مقالات کی متعدد نشستیں ہوئیں۔ ان جلسوں کے علاوہ ایک بڑا جلسہ "پیام انسانیت" کا ہوا اور دوسرا "اصلاح معاشرہ" کا جلسہ جامع مسجد میں ہوا، جس میں حاضرین کا وہ ہجوم تھا جو بقول منتظمین کے اس سے پہلے شاید ہی ہوا ہو۔ حضرتؒ نے اس میں "لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوة حسنة" کی روشنی میں خطاب فرمایا۔

اسی دوران خلد آباد بھی تشریف لے گئے اور وہاں کے مدفونین کو ایصال ثواب بھی کیا، جن میں سادس الخلفاء الراشدین اورنگ زیب عالمگیرؒ بھی ہیں۔

قطر کا سفر

۱۲؍اپریل ۱۹۹۵ء کو حضرتؒ قطر کی وزارت اوقاف کی دعوت اور شدید اصرار پر دوحہ تشریف لے گئے، ایئرپورٹ پر حکومتی سطح پر استقبال ہوا، استقبال کرنے والوں میں علامہ یوسف القرضاوی بھی موجود تھے جو حضرت سے خوردانہ و

عزیزانہ تعلق رکھتے ہیں۔

دوسرے دن جمعہ کی نماز حضرتؒ نے جامع مسجد میں ادا کی اور مختصر خطاب کیا، اسی دن شام کو جامع مسجد کے صحن میں ایک عظیم اجتماع ہوا، حضرتؒ نے اس میں پڑھنے کے لئے "قیمۃ الامۃ الاسلامیۃ بین الامم و دورھا فی العالم" (امت اسلامیہ کی اصل قدر و قیمت اور دنیا میں اس کا کردار) کے موضوع پر مقالہ تحریر فرمایا تھا لیکن اس عظیم مجمع کو دیکھ حضرتؒ نے برجستہ خطاب فرمایا، جس میں بڑی روانی اور زور تھا، حضرتؒ کی عمر اسی سے اوپر ہو رہی تھی، ضعف و ناطاقتی بڑھتی جارہی تھی، لیکن یہ ایمان کی طاقت، دین کی حمیت اور جذبہ غیرت کا اثر تھا؛ پوری تقریر "از دل خیزد بر دل ریزد" کی مصداق تھی۔ تقریر کے فوراً بعد علامہ یوسف القرضاوی کھڑے ہوئے اور انھوں نے حضرتؒ سے اپنے والہانہ تعلق و محبت، عقیدت و احترام کا پورے جوش و طاقت کے ساتھ تذکرہ کیا، حضرتؒ کی وسیع تر دینی و فکری خدمات اور امامت و علو شان کا اعتراف کیا، اور خراج تحسین پیش کیا۔

وزارت اوقاف نے وہاں مقیم اردو دانوں کے لئے بھی ایک بڑے جلسہ کا انتظام کیا تھا اس میں بھی حضرتؒ نے اردو میں موثر خطاب فرمایا، اس کے علاوہ خواتین کو خطاب کرنے کے لئے الگ سے انتظام کیا گیا تھا۔ آخری پروگرام یونیورسٹی میں اساتذہ اور تحقیقی کام کرنے والوں کا تھا، اس میں حضرتؒ نے "واقع العالم الاسلامی" کے عنوان سے تیار کردہ مقالہ کے اقتباسات پیش فرمائے۔

قطر سے واپسی کے دوسرے ہی روز حضرتؒ ناگپور تشریف لے گئے، اور وہاں ۲۸ر مئی کو مولانا عبد الکریم صاحب پاریکھ کے درس تفسیر کے ختم میں شرکت فرمائی اور سورہ فاتحہ کا درس دے کر نئے دور کا آغاز فرمایا۔

ناگپور سے کچھ دن آرام کے لئے بمبئی تشریف لے گئے، چار روز بمبئی قیام فرما کر حاجی عبد الکریم صاحب کی دعوت پر "لوناوالہ" تشریف لے گئے، وہاں بھی چار روز رہ کر بمبئی واپسی ہوئی، وہیں قیام کے دوران اچانک حضرت مولانا انعام

الحسن صاحبؒ کے حادثۂ وفات کی خبر ملی جسکا حضرت پر گہرا اثر پڑا، اسی دن حضرتؒ نے مولانا زبیر الحسن صاحب کو تعزیتی خط تحریر فرمایا اور ایک تعزیتی بیان اخبار میں بھی دیا گیا۔

یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا مطالبہ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کا احتجاجی جلسہ

ملک کے حالات اگرچہ پوری طرح معتدل (Normal) نہیں تھے لیکن فوری طور پر کوئی قانونی و آئینی خطرہ بھی نہیں تھا کہ اچانک سپریم کورٹ نے حکومت سے "یکساں عائلی قانون" (Uniform Civil Code) کے نفاذ کا مطالبہ کیا، حکومت کا ذہن بھی اس سلسلہ میں صاف نہیں تھا اسلئے خطرات کے بادل منڈلانے لگے۔ حضرتؒ نے بحیثیت صدر بورڈ کے احتجاجی بیان دیا اور اس میں صاف کہا کہ ملک کو بھی سوائے نقصان اور تضییع اوقات کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ حضرتؒ کے علاوہ بھی بورڈ کے دوسرے ذمہ داروں نے اس کے خلاف بیانات دیئے اس کا اثر یہ ہوا کہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے محتاط اشارہ یہ دیا کہ حکومت فوری طور پر اس کو عمل میں لانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، مگر یہ اطمینان کے لئے کافی نہ تھا اس لئے ۱۸ر جون کو دہلی میں حضرتؒ کی صدارت میں اس سلسلہ کا ایک اہم مشاورتی اجلاس ہوا اور اس میں حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ کھل کر یہ اعلان کرے کہ اسکے نفاذ کا وہ کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ دوسری طرف اجلاس میں یہ قرارداد بھی پاس ہوئی کہ غیروں کے سامنے اسلامی قوانین اور تعلیمات کی افادیت واضح کی جائے، اس کے لئے جگہ جگہ سمپوزیم اور اجتماعات منعقد کئے جائیں اور لٹریچر پہونچایا جائے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جلسہ احمد آباد

۷/۸ اکتوبر کی تاریخوں میں احمد آباد میں "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کا

بارہواں سالانہ اجلاس عظیم الشان پیمانہ پر کیا گیا، گجرات کے علماء و قائدین اور اہل خیر نے اجلاس کی کامیابی اور اس کو مفید تر بنانے کے لئے دل کھول کر حصہ لیا۔ ۷؍اکتوبر کو مشاورتی نشستیں ہوئیں۔ ۸؍اکتوبر کو صبح باقاعدہ افتتاحی اجلاس ہوا جس میں حضرتؒ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ اسی دن شام کو ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں ڈھائی لاکھ کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے، اس میں حضرت نے بڑی اثر انگیز دینی و اصلاحی صدارتی تقریر فرمائی۔

اس سفر میں خصوصیت کے ساتھ گجرات کے علماء و مشائخ اور طبقہ متعلقہ اور عوام نے حضرتؒ سے اپنی وابستگی اور گہرے تعلق و محبت اور عقیدت کا ثبوت دیا۔ بورڈ کے جلسوں سے فراغت کے بعد اہم دینی مدارس اور مراکز میں وہاں کے ذمہ داروں کی خواہش و اصرار پر حضرتؒ تشریف لے گئے اور بعض مقامات پر خطاب بھی فرمایا۔ راندیر میں مولانا مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاجپوری سراپا شوق و انتظار تھے، حضرتؒ ان سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ ۱۳؍اکتوبر کو بمبئی تشریف لائے۔ دوسرے دن "اصلاح معاشرہ" کے ایک جلسہ کو خطاب فرمایا اور ۱۷؍اکتوبر کو لکھنؤ واپسی ہوگئی۔

اس جلسہ احمد آباد کے لئے خصوصیت کے ساتھ مولانا سید مرتضیٰ صاحبؒ (سابق ناظم کتب خانہ ندوۃ العلماء) نے دورے کئے تھے، اور اجلاس کو کامیاب بنانے کی کوشش کی تھی۔ جلسہ کو ایک مہینہ بھی نہیں گذرا تھا کہ اچانک ۴؍نومبر کو ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا حضرتؒ اور ان کے خاندان سے ان کا تعلق ایک فرد خاندان کی طرح تھا اسلئے حضرتؒ نے اس کو ایک خاندانی حادثہ کی طرح محسوس کیا۔

۸؍نومبر کو غازیپور میں "تحفظ مدارس" کے عنوان سے مولانا عزیز الحسن صاحب نے ایک جلسہ کیا، حضرتؒ نے اس کی صدارت کی اور خطاب فرمایا۔ غازیپور ہی سے حضرتؒ اعظم گڑھ تشریف لے گئے جہاں ۱۰، ۱۱، ۱۲؍نومبر

کو دارالمصنفین میں "رابطہ ادب اسلامی" کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا، حضرتؒ نے اس کی صدارت فرمائی۔ مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب کی دعوت و خواہش پر اس کی آخری نشست جامعہ اسلامیہ مظفر پور میں ہوئی، اس میں بھی حضرتؒ اپنے رفقاء و خدام کے ساتھ تشریف لے گئے اور خطاب فرمایا۔

پندرہواں باب

۱۹۹۶ء سے علالت تک اہم حالات و واقعات اور اسفار

سفر حجاز

۵ر شعبان المعظم ۲۸ر دسمبر ۱۹۹۵ء کو "رابطہ عالم اسلامی" کے اجلاس میں شرکت کے لئے حضرتؒ اپنے رفقاء مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ العالی، بھائی عثمان صاحب حیدر آبادی اور حاجی عبدالرزاق صاحب نصیر آبادی کے ہمراہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے، جدہ میں حسب معمول محمد نور نور ولی صاحب کے مکان پر قیام ہوا، مکہ مکرمہ میں مولانا عبداللہ عباس صاحب کا مکان حضرتؒ کی مستقل قیامگاہ تھا۔ آٹھ سے بارہ شعبان تک رابطہ کے مختلف جلسوں میں شرکت ہوئی، حضرتؒ محسوس فرمانے لگے تھے کہ اب اس ادارہ میں رسمیت آتی جارہی ہے اور جلسوں میں زیادہ تر ضابطہ کی تقریریں ہوتی ہیں اور ضابطہ ہی کی تجاویز بھی پاس کی جاتی ہیں۔ اس احساس کے پیش نظر حضرتؒ نے اسکے اختتامی اجلاس میں پروگرام کے مطابق جو تقریر فرمائی اس میں خاص طور سے درپیش خطرات اور مغربی سازشوں کا ذکر فرمایا اور صاف صاف کہا ہے کہ اس وقت یہودی دماغ اور عیسائی وسائل اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی پر کمر بستہ ہیں، اس کے لئے بڑی فکر و توجہ اور اقدام کی ضرورت ہے۔

رابطہ کے جلسہ سے فارغ ہو کر مزید کچھ دن مکہ معظمہ میں قیام رہا، پھر مدینہ

طیبہ حاضری ہوئی اور وہاں ایک ہفتہ قیام فرماکر ظہران کے راستے سے ہندوستان واپسی ہوئی۔ سفر حجاز سے واپسی کے کچھ ہی روز کے بعد لکھنؤ میں ۱۶/ر جنوری ۱۹۹۶ء کو "پرسنل لا بورڈ" کی عاملہ کا جلسہ ہوا، اس میں "اصلاح معاشرہ کمیٹی" کے کاموں کا جائزہ لیا گیا اور اس کام کو مزید فکر و توجہ کے ساتھ کرنے کی ہدایت دی گئی۔

ماہِ مبارک اور دو اہم خاندانی حادثے

عرصہ سے حضرتؒ کا معمول تھا کہ رمضان المبارک میں اپنے آبائی وطن دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں تشریف فرما ہوتے، تلقین وارشاد کا سلسلہ جاری رہتا، ملک و بیرون ملک سے آئے ہوئے مہمان استفادہ کرتے، اِدھر کئی سالوں سے درسِ قرآن کا سلسلہ بھی جاری تھا، مہمانوں کے لئے حدیث کا بھی درس ہوتا اور بعض اہم اور مفید کتابیں بھی سنائی جاتیں۔

۱۹۹۶ء کے اس ماہِ مبارک کا آغاز بھی ان ہی معمولات کے ساتھ ہوا، لیکن حضرتؒ کی بھتیجی (اہلیہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ) کی شدید علالت کی وجہ سے حضرتؒ کی طبیعت متاثر تھی، دوسرے عشرہ کا اختتام ہو رہا تھا کہ ۱۸/ر رمضان المبارک کو ان کی وفات ہوئی، اس حادثہ کے چار ہی پانچ دن کے بعد حضرتؒ کی بڑی ہمشیرہؒ (والدہ مولانا محمد رابع صاحب و مولانا محمد واضح صاحب مدظلہما) کا بھی اچانک حادثۂ وفات پیش آیا، یہ رمضان المبارک کی تیئیسویں شب تھی، حضرتؒ کے لئے وہ شفیق ماں کے قائم مقام تھیں، حضرتؒ سفر سے واپس آتے تو ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، سفر پر جانا ہوتا تو وہ بڑے دُعاؤں کے ساتھ رخصت فرماتیں اور جب تک واپسی نہ ہو جاتی سراپا شوق وانتظار رہتیں۔ انکی عمر ترانوے سال کی ہو چکی تھی، لقائے رب کا شوق غالب تھا، اللہ تعالیٰ نے مبارک مہینہ کی مبارک شب میں ملاقات مقدر فرمائی۔ دوسرے دن حضرتؒ نے ایک بڑے مجمع میں نماز جنازہ پڑھائی اور حظیرہ شاہ علم اللہ میں مدفون ہوئیں۔ ایک ہی ہفتہ کے اندر ان دونوں

حادثوں کا حضرتؒ پر طبعی اثر پڑا کہ ان میں سے ایک کو ماں کا درجہ حاصل تھا تو دوسری بیٹی کے قائم مقام تھیں، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت کو صبر و عزیمت کا جو مادہ عطا فرمایا تھا اس کا نتیجہ تھا کہ معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا اور وعظ و درس، افادہ وارشاد کا سلسلہ اسی طرح سے جاری رہا۔

جنوبی ہند کا سفر اور وزیر اعظم کی دارالعلوم آمد

ادھر چند سالوں کے معمول کے مطابق ۲۸ر مئی کو حضرتؒ بمبئی تشریف لے گئے کہ شمالی ہند میں یہ زمانہ سخت گرمی کا ہوتا ہے، دو ہفتہ وہاں قیام رہا، اس عرصہ میں "السیرۃ النبویۃ" میں بعض اہم اضافے فرمائے اور گیارہویں ایڈیشن کے لئے اس کو تیار فرمایا۔ بمبئی سے بنگلور تشریف لے گئے بمبیل الرشاد میں طلبہ واساتذہ کے سامنے ایک اہم خطاب ہوا، دوسرے روز ہاسن کا سفر ہوا، وہاں ایک "دارالایتام" (بچوں کا گھر) کا افتتاح فرمایا، رات ہاسن میں رہ کر ۷ر جون کو ٹمکور اور وہاں سے لکور تشریف لے گئے، ایک مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا اور ایک بڑے جلسہ میں تقریر فرمائی، اس سے فراغت کے بعد بنگلور واپسی ہوئی اور ۲۰ر جون کو دہلی ہوتے ہوئے لکھنؤ تشریف آوری ہوئی۔

تشریف آوری کے چند ہی روز کے بعد بغیر کسی سابقہ اطلاع کے اچانک اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر دیویگوڑا حضرتؒ سے ملنے کے لئے دارالعلوم میں وارد ہوئے، ان کے ساتھ کئی مرکزی وزراء اور یوپی کے گورنر بھی تھے، وزیر اعظم نے احتراماً مہمان خانہ کے دروازہ سے کچھ دور جوتے اُتار دیئے اور ننگے پاؤں حاضر ہوئے اور زیارت وملاقات سے فارغ ہو کر واپس ہوئے، حضرتؒ نے حسب معمول ان کو بھی نصیحت کی اور ملک کو بچانے کی ان کو توجہ دلائی۔ بعد میں ایک گرامی نامہ بھی ان کے نام تحریر فرما کر بھیجا جس میں تفصیل سے یہ بات واضح فرمائی۔

۱۵ر جولائی کو دہلی میں "پرسنل لا بورڈ" کی عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں حضرتؒ

نے خطبۂ صدارت پیش فرمایا اور ۱۷ جولائی کو دارالعلوم کی "مجلس انتظامیہ" کا جلسہ دارالعلوم ہی میں منعقد ہوا، اس میں بھی حضرتؒ نے بڑی مؤثر اور فکر انگیز تقریر فرمائی۔

ایک طویل بیرونی سفر اور ترکی میں حضرتؒ کے اعزاز میں ایک عالمی سیمینار

۸/۹/۱۰ اگست ۱۹۹۶ء کو ترکی میں "رابطہ ادب اسلامی" کے اجلاس کی تاریخیں طے ہوئیں، اور اس مرتبہ عرب اور ترک ادباء و فضلاء کی خواہش و اصرار پر حضرتؒ کی شخصیت اور دینی و ادبی خدمات کو سیمینار کا موضع بنایا گیا۔

۵ اگست کو لکھنؤ سے حضرتؒ اپنے رفقاء مولانا محمد رابع صاحب اور حاجی عبدالرزاق صاحب کے ہمراہ روانہ ہوئے، دہلی، دبئ ہوتے ہوئے ۷ اگست کو استنبول تشریف لے گئے، بھائی عثمان صاحب حیدر آبادی بھی حضرتؒ کی راحت وخدمت کے خیال سے نیویارک سے استنبول تشریف لے آئے۔ دوسرے دن اجلاس کی افتتاحی نشست ہوئی، اسٹیج پر حضرتؒ کے ایک طرف علامہ یوسف القرضاوی اور دوسری طرف ادیب وفاضل محمد قطب جلوہ افروز تھے۔ افتتاحی تقریر محمد قطب نے کی پھر علامہ یوسف القرضاوی نے خطاب کیا، آخری تقریر صدر جلسہ حضرت والاؒ کی ہوئی۔ اسی دن شام کی نشست میں رپورٹیں پیش کی گئیں، اور ضابطہ کی گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن سے حفلہ تکریم (اعزازی جلسہ) کا آغاز ہوا، دو دنوں میں اس کی تین نشستیں ہوئیں جس میں ۱۶ مقالات پڑھے گئے، ان مقالات میں حضرتؒ کی دینی ودعوتی، ادبی وفکری وسیع خدمات کا جائزہ لیا گیا، خاص طور پر عرب فضلاء نے حضرتؒ سے اپنے گہرے تعلق وعقیدت اور حضرتؒ کی تصنیفات سے اپنی گرویدگی کا اظہار کیا۔ علامہ یوسف القرضاوی کا مقالہ بڑا فاضلانہ اور ممتاز تھا اس میں انھوں نے حضرتؒ کی دعوت وفکر کے بنیادی گوشوں کو نمایاں

کیااوراس میں حضرتؒ کی جامعیت اور فضل وکمال کااعتراف کیا۔

۱۰ راگست کی شام کو شعری نشست ہوئی جس میں شعراء نے خراج تحسین پیش کیا، پندرہ ملکوں کے شعراءاس میں شریک ہوئے۔

رابطہ کے ان جلسوں کے علاوہ بعض مرکزی مقامات پر حضرتؒ کے خطابات ہوئے، اور وہاں کی اہم دینی شخصیات اور حلقۂ تصوف کے مشائخ کے یہاں خصوصی دعوتوں میں شرکت ہوئی، حسب معمول سیدنا حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے مزار پر بھی حاضری ہوئی۔

نجم الدین ارکبان (جو جلدی ہی ترکی کے وزیراعظم منتخب ہوئے تھے) حضرتؒ سے محبانہ وعقیدت مندانہ تعلق رکھتے تھے اور پہلے کئی مرتبہ ملاقات کر چکے تھے، مگر اتفاق سے وہ اس وقت سفر پر تھے، اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی اور حضرتؒ نے ان کے نام ایک ناصحانہ خط تحریر فرمایا جس میں ترکی میں ملت کے تحفظ وبقاء کا طریقۂ کار اور بحیثیت ایک قائد کے ان کی اہم ذمہ داریوں کا تذکرہ فرمایا۔ مکتوب تحریر فرماکر بعض خصوصی تعلق والوں کے حوالہ فرمایا کہ وہ اس کا ترکی ترجمہ کر کے وزیراعظم کے حوالہ کر دیں جس پر عمل کیا گیا۔ ۱۳ راگست کو استنبول سے لندن روانگی ہوئی، وہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب ونظام کے مطابق نو منجھم میں ایک بڑے مدرسہ "جامعۃ الہدیٰ" کا افتتاح فرمایا، اور ایک اہم مجمع کو خطاب کیا۔ اکسفورڈ کے اسلامک سنٹر میں بھی تشریف لے گئے، یہ بات خصوصیت کے ساتھ حضرتؒ کے لئے موجب مسرت تھی کہ وہاں حضرت کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کی مایۂ ناز تصنیف "نزھۃ الخواطر" کو کمپیوٹرائز کر دیا گیا تھا اور اس کے ابتدائی بعض حصوں کا انگریزی ترجمہ بھی مکمل ہو گیا تھا۔ لیسٹر کے اسلامک سینٹر میں بھی جانا ہوا اور وہاں بھی خطاب کی نوبت آئی۔

۱۸ راگست کو لندن سے جدہ روانگی ہوئی، تین روز مدینہ طیبہ میں اور پانچ روز مکہ معظمہ میں قیام فرماکر ۲۷ راگست کو بمبئی واپسی ہوئی، وہاں سے دہلی تشریف لے

گئے اور ''نظام الدین'' جاکر مولانا اظہار الحسن صاحبؒ کی وفات پر فریضۂ تعزیت ادا فرمایا اور ذمہ داروں کو اہم اور ضروری ہدایت بھی دیں۔

اندرون ملک بعض اسفار

۳۰؍ستمبر کو مولانا معین اللہ صاحبؒ کی دعوت پر اندور کا سفر ہوا، اور ۵؍اکتوبر کو واپسی ہوئی۔

۱؍۲؍۳؍نومبر کو حیدر آباد میں ''سبیل السلام'' کے ذمہ داروں کی دعوت پر ''رابطہ ادب اسلامی'' کا اجلاس ملفوظات و مواعظ کے موضوع پر منعقد ہوا، حضرتؒ نے اس میں شرکت فرمائی اور خطبۂ صدارت پیش فرمایا۔ اختتامی نشست میں بھی حضرتؒ کی مؤثر اور فکر انگیز تقریر ہوئی۔ حیدر آباد میں حضرتؒ کی تشریف آوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک جلسہ ''پیام انسانیت'' اور دوسرا ''اصلاح معاشرہ'' کا کیا گیا، دونوں میں حضرتؒ نے خطاب فرمایا۔

۲۸؍نومبر تا یکم دسمبر کی تاریخوں میں جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کے ناظم مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کی دعوت و انتظام میں جامعہ ہی میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت وخدمات کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا، حضرت اسمیں شرکت کے لئے اعظم گڑھ تشریف لے گئے اور افتتاحی خطاب فرمایا۔

سفر حجاز اور ایک عظیم شرف واعزاز

۱۶؍۱۷؍۱۸؍دسمبر ۱۹۹۶ء کو ''رابطہ عالم اسلامی'' کی ایک ذیلی کمیٹی ''المجلس الاعلیٰ العالمی للمساجد'' کا اجلاس طے ہوا، حضرتؒ اس میں شرکت کے لئے ۱۲؍دسمبر کو اپنے رفقاء بھائی عثمانی صاحب حیدر آبادی اور حاجی عبد الرزاق صاحب نصیر آبادی کے ہمراہ بمبئی سے جدہ روانہ ہوئے۔ یہ راقم بھی اس سفر میں گرد کارواں تھا جو اس کے لئے باعث صد عزت و شرف تھا۔ ۱۲؍دسمبر کی شام کو حضرتؒ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور عمرہ ادا فرمایا۔ ۱۶؍دسمبر کو کمیٹی کا افتتاحی اجلاس تھا،

جس میں حضرتؒ کی بڑی مؤثر اور پر مغز تقریر ہوئی۔ اس کے دوسرے دن کے اجلاس میں بھی حضرتؒ نے شرکت فرمائی۔ ۱۸ر دسمبر کو جو اجلاس کا آخری دن تھا، اراکین کو بیت اللہ شریف میں داخلہ کی دعوت دی گئی اور اس کے لئے فجر بعد ساڑھے چھ بجے کا وقت طے ہوا، یہ وقت حضرت کے انتہائی ضعف و ناطاقتی کا ہوتا تھا اور عرصہ سے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ قیامگاہ پر ہی ادا فرماتے تھے، اس لئے ابتداء میں حضرتؒ کو کچھ تأمل ہوا کہ اس شدید ضعف کے ساتھ آداب کا خیال کرتے ہوئے اتنے مجمع میں زینے چڑھ کر اوپر جانا سخت دشوار تھا، اور حضرتؒ یہ شرف بار بار حاصل فرما چکے تھے، لیکن اچانک حضرتؒ نے ارادہ فرمالیا کہ یہ شرف اب اس کے بعد حاصل ہو نہ ہو "وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء"۔

۱۸ر دسمبر کو فجر اوّل وقت ادا فرمائی۔ مختصر ناشتہ کر کے دوائیں استعمال فرمالیں اور فارغ ہو کر وقت پر حرم شریف حاضر ہو گئے، وہاں خاصا مجمع تھا، اس لئے بجائے مطاف میں داخل ہونے کے حضرتؒ مسجد شریف کے دالان میں ٹھہر گئے، کچھ ہی دیر کے بعد کوئی صاحب آئے اور انھوں نے حضرت سے چلنے کی درخواست کی، شدید ضعف اور پیروں کی تکلیف کی وجہ سے حضرت "وہیل چیر" پر بیت اللہ کے بالکل قریب پہنچ گئے، حکومتی سطح پر وہاں باقاعدہ انتظام تھا، باب بیت اللہ پر زینہ لگادیا گیا تھا، شاہ سعود کے پوتے امیر مشعل بن محمد بن سعود نے حضرت کو سہارا دے کر اوپر چڑھایا، دروازہ اس وقت بند تھا، حضرت بیت اللہ کے دروازے کا کڑا پکڑ کر اس کے سہارے کھڑے ہو گئے، نیچے طواف کرنے والوں کا ایک سمندر تھا، ربّ البیت کے در پر اس کے کڑے کا سہارا لئے ہوئے اپنے وقت کا امام کھڑا تھا، وہ عجیب رقت انگیز منظر تھا، حضرتؒ پر بھی ایک کیفیت طاری تھی، چند ہی لمحوں میں کلید بردار کعبہ جناب شیبی صاحب تشریف لائے اور انھوں نے کلید دروازے کے اندر لگادی اور حضرتؒ سے درخواست کی کہ وہ اپنے دست مبارک سے دروازہ کھولیں اور اندر داخل ہوں۔ حضرت نے چابی گھمائی، اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا، اندر تشریف

لے جا کر سیدھے رکن یمانی کے کونے پر کھڑے ہو کر دوگانہ ادا فرمایا، فراغت کے بعد امیر مشعل نے دعا کی درخواست کی، حضرت نے پوری ملت اسلامیہ کے لئے اور خاص طور پر حرمین شریفین کے تحفظ کے لئے دعا فرمائی اور وہاں موجود مختلف ملکوں کے علماء و عمائدین نے "آمین" کہی۔

یہ ایک ایسا نادر المثال واقعہ تھا کہ شاید ہی زمانہ قریب میں اس کی کوئی نظیر ہو۔ اللہ تعالیٰ کا حضرت پر یہ انعام حضرت کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ کی شکل میں سامنے آیا۔ بیت اللہ سے نکل کر کچھ دیر کیلئے مطاف میں تشریف فرما ہوئے۔ مختلف علماء و اہل تعلق نے مبارک باد دی، حضرت سراپا تواضع و انکسار تھے اور اس مقام پر تھے جہاں پہنچ کر مدح و ذم یکساں ہو جاتے ہیں۔

یہ خبر عالم اسلام میں پھیل گئی، ہندوستانی اخبارات میں بھی نمایاں طور پر یہ خبر شائع ہوئی اور ہندوستانی مسلمانوں نے خاص طور پر ایک فخر محسوس کیا اور اس پر اللہ کا شکر ادا کیا، شعراء نے منقبتیں لکھیں، واپسی پر بعض اعزازی جلسے بھی لوگوں نے کرنے چاہے مگر حضرتؒ کو اس کی شہرت ناگوار ہوئی اور حضرتؒ نے اس کا اظہار بھی فرمایا اور یہ شعر پوری طرح حضرتؒ پر صادق آیا کہ۔

میں تو خود آپ کو مٹا بیٹھا

میرا شہرہ اڑا دیا کس نے

۱۹ دسمبر کو مدینہ طیبہ حاضری ہوئی۔ حرم شریف سے متصل قصر الشریف میں قیام رہا۔ محترمی جناب سید طارق حسن عسکری صاحب اور بھائی عبدالرشید صاحب حیدر آبادی پورے اہتمام کے ساتھ میزبانی فرماتے رہے، اہل تعلق قیامگاہ پر ملنے آتے رہے۔ ایک روز امیر مشعل بھی اپنے رفقاء کے ساتھ نیاز مندانہ حاضر ہوئے۔ مولانا سعید احمد خاں صاحب نے ایک روز بڑے اہتمام سے دعوت کی، ان کے علاوہ بھی بعض خصوصی تعلق والوں کی دعوت پر حضرتؒ تشریف لے گئے، ایک شب استاذ محمد الحافظ نے حفلۂ تکریم کا اہتمام کیا، حضرتؒ نے اس میں شرکت فرمائی اور

کھانا بھی تناول فرمایا۔

۲۲ر دسمبر کو مدینہ طیبہ سے جدہ تشریف لائے، وہاں دو روز قیام فرمایا اور "رابطہ ادب اسلامی" سے متعلق بعض نشستوں میں شرکت فرمائی، جو وہاں کے ایک تاجر عبد المقصود خوجہ صاحب کی کوٹھی پر رکھی گئی تھیں ایک نشست میں شیخ یوسف القرضاوی نے بھی شرکت کی۔

۲۶ر دسمبر کو جدہ سے بمبئی روانگی ہوئی، ایک روز وہاں قیام فرما کر ۲۸ر دسمبر کو لکھنؤ تشریف آوری ہوگئی۔

اتحادِ ملت کی فکر

ادھر چند سالوں سے سلفیوں کی طرف سے "مذاہب اربعہ" کے خلاف ایک مہم شروع کی گئی تھی، اس میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ تقلید کرنے والوں کو بدعتی، ضال یہاں تک مشرک تک کہا جانے لگا اور ان کے خلاف ایسا محاذ قائم کیا گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ یہی ہے جس کی سرکوبی ضروری ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ملکوں میں (جن میں ہندوستان سر فہرست ہے) ایک انتشار کی فضا پیدا ہونے لگی اور خاص طور سے ایک ایسے ملک میں جس میں اکثریت دوسری قوم کی ہے بڑی بدنمائی ہوئی اور اسلام کی غلط تصویر سامنے آئی۔ حضرتؒ نے اس کی ضرورت محسوس فرمائی کہ اس اشتعال پر جوابی کارروائی یا مناظرہ کے بجائے سلجھے ہوئے اہل حدیث علماء و قائدین کو اس کی طرف توجہ دلائی جائے اور اس کے نتائج و خطرات سے آگاہ کیا جائے؛ حضرتؒ نے اس کے لئے ایک مفصل مکتوب تحریر فرما کر روانہ فرمایا۔ سعودی عرب کے مفتی اعظم علامہ عبد العزیز بن عبد اللہ بن بازؒ نے خصوصیت کے ساتھ اس کا جواب دیا اور اپنے معتدل نظریہ کی وضاحت کی، اس سلسلہ میں "رابطہ عالم اسلامی" کی مناسب تجاویز بھی ارسال فرمائیں جس میں "ائمہ اربعہ" کی عظمت کے پورے اعتراف کے ساتھ عوام کے

لئے تقلید کے جواز بلکہ ضرورت کا اظہار کیا گیا ہے۔

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ صاحب کی

شخصیت پر لکھنؤ میں ایک سیمینار

حضرتؒ کے والد مولانا حکیم عبدالحی حسنی صاحبؒ کے علمی و تصنیفی کارناموں کا تقاضا تھا کہ ان پر ان کے شایانِ شان کوئی سیمینار ہو اور ان کی خدمات کو اُجاگر کیا جائے تا کہ عمومی طور پر لوگ ان سے واقف ہوں اور فائدہ اٹھا سکیں ۱۶ / ۱۷ / مارچ ۱۹۹۷ء کو اُردو اکاڈمی کے زیر اہتمام یہ سیمینار حضرتؒ ہی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں علماء و فضلاء شریک ہوئے اور مقالات پڑھے گئے۔ حضرتؒ نے اپنے خطبہ صدارت میں خاص طور پر انکی تصنیفات کی خصوصیات و امتیازات کا تذکرہ فرمایا۔

چند اہم وفیات

۱۹۹۷ء کے ابتدائی آٹھ دس مہینوں کے اندر متعدد ایسے اہم لوگوں کی وفات ہوئی جن سے حضرتؒ کا گہرا تعلق تھا: ان میں پہلا حادثہ محدث کبیر شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ کی وفات کا ہے، جنھوں نے ۱۶/ فروری ۱۹۹۷ء کو رحلت فرمائی۔ ان کو حضرتؒ سے بڑا محبانہ و عقیدت مندانہ تعلق تھا، فن حدیث میں علو مرتبت کے باوجود انھوں نے حضرتؒ سے حدیث کی اجازت لی تھی۔ حضرت کے نام ان کے مکتوبات سے ان کی گہری محبت اور عقیدت کا جا بجا اظہار ہوتا ہے۔

دوسرا حادثہ حضرت مولانا منظور نعمانیؒ کی وفات کا ہے، جنھوں نے طویل علالت کے بعد ۴/ مئی ۱۹۹۷ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ حضرتؒ کے ساتھ ان کی طویل اور مخلصانہ رفاقت نصف صدی کو محیط ہے، حضرتؒ ہی کے مشورہ سے انھوں نے لکھنؤ کا قیام اختیار فرمایا تھا۔ حضرتؒ کی مولاناؒ کے ساتھ جو یکجائی اور شرکت عمل رہی وہ شاید ہی کسی دوسرے کے ساتھ رہی ہو۔ حضرتؒ کو رائے بریلی

میں اس حادثہ کی خبر ملی اسی وقت لکھنؤ تشریف لے گئے، جنازہ میں شرکت فرمائی اور شام تعزیتی جلسہ میں تفصیلی خطاب فرمایا۔

۲۲ر مئی کو تیسرا حادثہ مولانا محمد عمر پالنپوری کی وفات کا پیش آیا جنکی حیثیت "لسان التبلیغ" کی تھی۔

چوتھا حادثہ ۲۸ر اگست کو حضرت قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی کی وفات کا پیش آیا۔ حضرت سے ان کا زمانہ طالب علمی سے محبت و عقیدت کا تعلق تھا جو بڑھتا ہی رہا۔ حضرت کے نام ان کے آخری خط کا ایک اقتباس یہاں پر نقل کیا جاتا ہے:

"مخدومی حضرت اقدس دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ احقر کو اپنے تمام اکابر سے الحمد للہ ہمیشہ سے عقیدت رہی ہے اور ہے، اس وقت حضرت والا کی عقیدت اور عظمت جو اس ناکارہ کے دل میں ہے اس کو سب پر فوقیت اور اولیت حاصل ہے، اور یہی زندگی کا سرمایہ ہے۔ اللہ پاک اخیر وقت تک اس کو باقی رکھے۔"

حضرتؒ کو بھی قاری صاحبؒ سے بڑا تعلق تھا، حضرت مولانا محمد احمد پھولپوریؒ کی وفات کے بعد بارہا فرمایا کہ "اب سب سے زیادہ مناسبت مولانا صدیق صاحب سے محسوس ہوتی ہے"۔

"رابطہ ادب اسلامی" کے دو اہم اجلاس

۴، ۵، ۶ر اکتوبر ۱۹۹۷ء کو پٹنہ میں خدا بخش خاں لائبریری اور مدرسہ شمس الہدیٰ کے زیر انتظام "رابطہ ادب اسلامی" کا جلسہ "اسلامی نشاۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ" کے موضوع پر ہوا، حضرتؒ نے اس کی صدارت فرمائی اور اپنے خطبۂ صدارت میں ادب کے تعمیری پہلو کو اُجاگر کرنے پر زور دیا۔

اسی مہینہ کے اواخر میں ۲۴-۲۵ر اکتوبر کو لاہور میں رابطہ کا جلسہ ہوا جس

کے افتتاحی اجلاس کی صدارت صدر پاکستان سردار فاروق احمد خاں لغاری نے کی۔ حضرتؒ نے افتتاحی تقریر فرمائی، افتتاحی اجلاس کے بعد مقالات کی متعدد نشستیں ہوئیں جن میں حرمین شریفین کے سفر ناموں کو موضوع بنا کر مقالات پیش کیے گئے۔ ایک نشست کی صدارت مولانا محمد رابع صاحب ندوی مدظلہ العالی نے بھی فرمائی۔ حضرتؒ ضعف ونقاہت کی وجہ سے لاہور کے باہر کہیں تشریف نہ لے جاسکے، صرف رائے ونڈ تبلیغی مرکز تشریف لے گئے اور خطاب فرمایا۔ ایک دن لاہور کی شاہی مسجد تشریف لے گئے جہاں حضرتؒ نے سلوک وریاضت کے ایام گزارے تھے۔

اہل تعلق خصوصیت سے ملاقات وزیارت کے لئے آتے رہے، ان میں حضرت شاہ نفیس الحسنی صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک دن شیر انوالہ تشریف لے گئے جہاں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی خدمت میں رہ کر حضرتؒ نے مہینوں گزارے تھے اور استفادہ کیا تھا۔ یہ حضرتؒ کا آخری سفر پاکستان تھا، اس میں خلقت کا ایسا ہجوم ہوا کہ صبح سے شام تک مختلف شہروں سے لوگ انبوہ درانبوہ آتے تھے اور زیارت سے مشرف ہوتے تھے۔ اکثر لوگوں کو ہجوم کی وجہ سے صرف زیارت پر ہی اکتفا کرنی پڑی۔

سفر حجاز

۶؍ دسمبر کو حضرتؒ اپنے رفقاء خواہرزادہ مولانا واضح رشید صاحب ندوی مدظلہ بھائی عثمان صاحب حیدر آبادی اور حاجی عبد الرزاق صاحب نصیر آبادی کے ہمراہ جدہ تشریف لے گئے، وہاں سے دوسرے دن مکہ مکرمہ حاضری ہوئی، چونکہ اسی دن صبح ۹ بجے رابطہ کا افتتاحی اجلاس تھا، اسلئے احرام ہی کی حالت میں حضرتؒ جلسہ میں شریک ہوئے، ادھر عرصہ سے امیر مکہ ماجد بن عبد العزیز ہی شاہ کی نیابت میں جلسہ کا افتتاح کرتے ہیں، انکے ایک طرف شیخ بن باز دوسری طرف

حضرتؒ کی نشست ہوتی تھی، حضرتؒ اپنی نشست پر جلوہ افروز ہوئے اور حسب معمول اختتامی خطاب بھی فرمایا۔

چند روز مکہ مکرمہ میں قیام کے بعد مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، یہاں قیام کے دوران مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر صالح عبداللہ العبود ملاقات کے لئے تشریف لائے اور اپنی قیامگاہ پر دوپہر کے کھانے کے لئے مدعو کیا، حضرتؒ اپنے رفقاء کے ساتھ تشریف لے گئے اس میں انھوں نے حضرتؒ کا ایک اہم عربی رسالہ خود پڑھ کر سنایا اور حاضرین اس سے مستفید ہوئے۔ مدینہ منورہ سے حضرتؒ جدہ ہوتے ہوئے ہندوستان واپس تشریف لے آئے، جدہ میں صرف شیخ علی طنطاویؒ کی ملاقات وعیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ اسی سفر میں حضرتؒ کو پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ کے حادثہ وفات کی خبر ملی۔

۲۴ر فروری ۱۹۹۸ء کو مولانا عبدالغفار صاحب ندوی نگرامیؒ نے رحلت فرمائی جو حضرت کے رفیق درس رہ چکے تھے، شاہ بدر علی صاحبؒ سے ان کو اجازت بیعت حاصل تھی، حضرتؒ ہی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، لکھدرہ میں تدفین عمل میں آئی۔

۵/ مارچ کو حاجی عبدالغفور صاحب نقشبندیؒ کے پوتے محمد حسن غوری کی دعوت پر حضرتؒ نے جودھپور کا سفر کیا، ان کے مدرسہ کا سنگ بنیاد نصب فرمایا اور اسی مناسبت سے ایک جلسہ عام کو خطاب کیا، اسکے علاوہ "پیام انسانیت" کے ایک بڑے جلسہ میں بھی شرکت فرمائی اور مختصر خطاب فرمایا۔

جودھپور سے دہلی تشریف لائے اور غالب اکیڈمی میں ماہنامہ ارمغان پھلت کے "دعوت اسلام نمبر" کا رسم اجراء فرمایا۔

۲۵ر اپریل کو شدت ضعف کے باوجود حضرتؒ "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کے عاملہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے دہلی تشریف لے گئے، وہاں سے دوسرے ہی دن بذریعہ کار علی گڑھ تشریف لے گئے اور اسی دن وہاں دینی تعلیمی کونسل کے جلسہ

کی صدارت فرمائی اور خطاب کیا۔ اسی دن بعد مغرب یونیورسٹی کے اساتذہ اور اونچے درجہ کے طلباء میں خصوصی خطاب ہوا اور بعد عشاء ایک جلسہ عام میں خطاب فرمایا۔ اس سفر میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمود الرحمن صاحب نے خصوصی تعلق کا اظہار کیا اور خود ملنے آتے رہے۔ دوسرے دن صبح کانپور ہوتے ہوئے شام تک لکھنؤ واپسی ہوئی۔

جنوبی ہند کا ایک طویل سفر

بنگلور میں بعض دیندار اہل فکر نے جو حضرتؒ سے عقیدت و محبت رکھتے تھے اور حضرتؒ کی تصانیف سے متاثر تھے ایک میڈیا سنٹر قائم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے ذرائع ابلاغ (میڈیا) کے تخریبی و منفی اثرات کو کم کیا جاسکے، اس کے لئے انھوں نے کنڑ زبان میں ایک روزنامہ جاری کرنے کا بھی ارادہ کیا اور حضرتؒ کو اس کے افتتاح کے لئے بنگلور آنے کی دعوت دی، حضرتؒ نے کام کی افادیت و ضرورت کے پیش نظر دعوت منظور فرمائی۔ ۱۸ر مئی کو اس کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ حضرتؒ نے اس کی صدارت فرمائی اور خطاب کیا، اور آیت شریفہ ھٰذا بلاغ للناس الخ کی روشنی کی اہمیت اور اعلام کی اہمیت و تاثیر اور اس کے مفید و مضر اثرات پر روشنی ڈالی۔

منگلور میں سید بیری صاحب کے مکان میں قیام رہا، وہاں کے مسلمانوں نے بڑی عقیدت و اپنائیت کا مظاہرہ کیا اور حضرتؒ کی تشریف آوری سے فائدہ اٹھایا۔

بھٹکل سے حضرتؒ کا تعلق قدیم اور عمیق تھا، منگلور پہنچ کر بھٹکل نہ جانا نا ممکن تھا، اس لئے حضرتؒ وہاں تشریف لے گئے، اور جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں پانچ روز قیام فرمایا، مختلف مقامات پر تقریریں بھی ہوئیں، اور بھٹکل اور اطراف بھٹکل کے لوگ محبت و عقیدت سے ملتے رہے۔

بھٹکل سے پونہ تشریف لائے، یہاں ۶ر جون سے "رابطہ ادب اسلامی" کا

سیمینار شروع ہو رہا تھا جس کا موضوع تھا "تاریخ نویسی کا جائزہ ادب کے تناظر میں" حضرتؒ نے اس کی صدارت فرمائی، اس کے علاوہ کوثر باغ کی مسجد میں جمعہ کے دن خطاب ہوا، اور ۸/ جون کو حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ کے اسمبلی ہال میں عرب طلباء کے سامنے خطاب ہوا جو پونہ کے مختلف تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس سفر کی آخری تقریر "پیام انسانیت" کے جلسہ عام میں ہوئی جس میں فوج کے اعلیٰ افسران، سابق وزراء، غیر مسلم سماجی کارکن، یونیورسٹی کے پروفیسر، ایڈمنسٹریشن کے اعلیٰ افسران، مختلف مذاہب کے رہنما، آر ایس ایس کے کارکنان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات شریک ہوئے۔

پونہ سے حضرتؒ اندور تشریف لے گئے اور مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ جو عرصہ سے علیل اور صاحب فراش تھے انکی عیادت فرمائی اور چند روز قیام فرما کر دہلی ہوتے ہوئے لکھنؤ تشریف لائے۔ دہلی میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی کی عیادت فرمائی، تسکین کے کلمات فرمائے اور یہ بھی فرمایا کہ "ابھی اللہ تعالیٰ آپ سے کام لے گا"۔

عمان اور حرمین شریفین کا سفر

۲۰-۲۵/ اگست ۱۹۹۸ء کو عمان میں "رابطہ ادب اسلامی" کے اجلاس کی تاریخیں مقرر ہوئیں اور یہ طے ہوا کہ بعض قانونی دشواریوں کی وجہ سے رابطہ کا صدر دفتر بجائے ریاض کے عمان منتقل کر دیا جائے، بحیثیت صدر رابطہ کے حضرتؒ کی شرکت میں اس میں ضروری تھی اس لئے حضرتؒ اپنے رفقاء مولانا محمد رابع صاحب ندوی، مولانا محمد واضح رشید صاحب ندوی، مولانا سعید الرحمن صاحب ندوی، ڈاکٹر اجتباء صاحب ندوی، بھائی عثمان صاحب حیدر آبادی اور حاجی عبد الرزاق صاحب کے ہمراہ ۲۰/ اگست کو دہلی سے عمان روانہ ہوئے، رابطہ کے جلسوں میں شرکت فرمائی، اس کے صدر دفتر کا افتتاح کیا۔

۲۳؍اگست کو امیر حسن نے اپنے شاہی محل میں خصوصی دعوت کی، حضرتؒ سے ان کو شروع سے عقیدت ومناسبت تھی، وہ اسی نیاز مندی کے ساتھ ملے، اسی مجلس میں حضرت نے اپنا رسالہ "اسمعوها منى صريحة ايها العرب" (اے عربو امیری بات صاف صاف سنو!) بڑے جوش کے ساتھ پڑھا جس کا بڑا اثر پڑا۔

ایک بڑا جلسہ وزارۃ الاوقاف کی طرف سے ہوا، جس میں اہم لوگ شریک ہوئے، اور حضرتؒ کا بڑا موثر خطاب ہوا، جامعہ الزرقاء اور جامعۃ اہل البیت میں بھی حضرتؒ کے اعزاز میں پروگرام ہوئے۔

قیام عمان میں حضرتؒ نے جمعہ مسجد "حذيفه اليمان" پڑھا، اسی مسجد میں امیر حسن نے بھی جمعہ پڑھا، خطیب صاحب نے خطبہ میں مہمانوں کا استقبال کیا اور ان میں خاص طور پر حضرتؒ کا نام لے کر تشریف آوری پر خوشی ومسرت کا اظہار کیا۔

۲۶؍اگست کو جدہ روانگی ہوئی، وہاں سے دوسرے روز مکہ مکرمہ تشریف لے گئے وہاں کے چار روزہ قیام میں طواف وعمرہ اور زیارت کے علاوہ بعض خصوصی دعوتوں میں بھی شرکت فرمائی اور ایک روز مولانا سعید خاں صاحب کی عیادت کے لئے بھی تشریف لے گئے جو مستشفیٰ ام القریٰ میں زیر علاج تھے۔

یکم ستمبر ۱۹۹۸ء کو مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، پانچ روز یہاں قیام کے بعد جدہ ہوتے ہوئے بمبئی واپسی ہوئی، یہاں مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ العالی کی آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں چند روز قیام فرمایا، اس کے بعد لکھنؤ اور وہاں سے رائے بریلی تشریف آوری ہوئی، رائے بریلی تک پورے سفر میں بھائی عثمان صاحب نے رفاقت واعانت فرمائی، رائے بریلی ایک روز قیام کر کے وہ واپس تشریف لے گئے۔

بعض اسفار اور اہم تقاریب اور جلسوں میں شرکت

۳۰؍ستمبر کو قاری محمد قاسم صاحب (مجاز طریقت حضرت والاؒ) کا درس

قرآن کا ختم تھا، ان کی خواہش واصرار پر حضرتؒ مدراس تشریف لے گئے اور اس تقریب میں (جس میں تقریباً پچیس ہزار کا مجمع تھا) شرکت فرمائی اور خطاب کیا۔ دوسرے دن تبلیغی مرکز میں خطاب ہوا۔ ۲۰ر اکتوبر کو یہ سفر بخیر وخوبی تمام ہوا۔

۱۱ر اکتوبر کو کانپور میں جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام تحفظ ختم نبوت کانفرنس کے افتتاح کے لئے تشریف لے گئے اور "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" (آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا) کی روشنی میں مفصل اور مؤثر خطاب فرمایا۔

۱۴ر نومبر کو جلسہ "پیام انسانیت" میں شرکت کے لئے گیا تشریف لے گئے مولانا سید نظام الدین صاحب (جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کے فرزند مولوی عبدالواحد ندوی کے انتظام میں یہ جلسہ بڑے پیمانہ پر منعقد ہوا، حضرتؒ نے اس کی صدارت فرمائی اور خطاب کیا۔

اس جلسہ میں روانگی سے ایک ہی روز قبل حضرتؒ کی برادر زادی سیدہ فاطمہ صاحبہؒ کی وفات ہوئی، حضرتؒ کو طبعی طور پر اس کا صدمہ ہوا، دارالعلوم میں اساتذہ وطلبہ کے ایک بڑے مجمع نے حضرتؒ کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی، دوسری نماز جنازہ دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ہوئی جو انکے نامور فرزند مولانا سید سلمان حسینی صاحب ندوی صاحب نے پڑھائی اور خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

سرکاری اسکولوں میں "وندے ماترم" کا نفاذ اور حضرتؒ کی فکر وتشویش

اتر پردیش میں بی۔جے۔پی حکومت مسلمانوں کے لئے ایک ننگی تلوار کی طرح تھی، اس کی وجہ سے اہل فکر ونظر اور صاحب بصیرت علماء ہر وقت فکر وتشویش میں تھے، ایک طرف مساجد ومدارس کے تحفظ وبقاء کا مسئلہ تھا، دوسری

طرف سرکاری نصاب میں ایسی خطرناک تبدیلیوں کا ایک ایسا سلسلہ تھا جن کے نتائج بڑے سخت اور ملت سوز ہو سکتے تھے۔ اسی صورت حال میں اچانک سرکاری اسکولوں میں یہ سرکلر جاری کیا گیا کہ "وندے ماترم" کا گیت پڑھنا ہر ایک پر لازم اور ضروری ہے، یہ ایک خالص مشرکانہ اور عقیدہ توحید کے منافی گیت تھا، جس کو کوئی بھی صاحب ایمان اور توحید کا عقیدہ رکھنے والا برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لئے یہ صورتحال مسلمانوں کے لئے بڑی تشویشناک تھی، کئی مہینوں تک مثبت اور قانونی انداز میں کوششیں ہوتی رہیں۔ "دینی تعلیمی کونسل" کے متعدد جلسوں میں جو حضرتؒ کی صدارت میں ہوئے اس پر تشویش ظاہر کی گئی اور قانونی احتجاج کیا گیا۔

ایک الہامی بیان اور فتنہ کا سد باب

صورتحال اسی طرح سے چل رہی تھی کہ اچانک ۱۹ر نومبر کو اخبارات ریڈیو ٹیلیویژن کے نمائندے دار العلوم میں حضرتؒ سے اس سلسلہ میں بیان لینے کے لئے اُمنڈ پڑے۔ حضرتؒ نے بیان میں صاف صاف اس کے نقصانات اور ملک پر پڑنے والے اس کے مضر اثرات کا ذکر فرمایا، پھر بڑے جوش کے ساتھ یہ بات بھی فرمائی کہ "مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ اہمیت ان کے عقیدہ توحید کی ہے اور وہ اس کی حفاظت کو ایمان کی شرط سمجھتے ہیں، ہماری مخالفت صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہے، یہ خالص دینی اور شرعی مسئلہ ہے اور حکومت اس کو جس طرح اسکولوں میں نافذ کرنا چاہتی ہے وہ میرے نزدیک مخالفت فی الدین ہے"۔ مزید حضرتؒ نے فرمایا کہ "اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میرا مشورہ ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں سے ہٹا لیں"۔

یہ محض عند اللہ حضرتؒ کی مقبولیت و محبوبیت کا اثر تھا کہ اس بیان سے اچانک فضا بدل گئی، حکومت کا رویہ تبدیل ہو گیا اور وہ کام جو تحریکوں اور جماعتوں کے لئے مشکل ہو رہا تھا وہ فرد واحد کی آواز پر ہو گیا کہ وہ فرد اپنی ذات میں ایک انجمن،

ایک ادارہ، ایک تحریک بلکہ ایک اُمت تھا، حکومت نے معذرت کی اور جس وزیر نے یہ کام کیا تھا اس کو برطرف کیا اور اس کے سکریٹری کا ٹرانسفر کیا گیا۔

حضرتؒ کے مکان پر چھاپہ اور ملک و بیرون ملک اسکا سخت ردِ عمل

"وندے ماترم" کا مسئلہ پورے زور کے ساتھ چل رہا اور حضرتؒ نے اس کے خلاف سخت بیان دیا تھا کہ اس کے تین ہی چار روز کے بعد اچانک حضرتؒ کے وطن میں قیام گاہ پر ۲۲-۲۳ر نومبر کی درمیان شب میں چھاپہ ڈالا گیا، حضرتؒ اس وقت لکھنؤ میں قیام فرما تھے، حضرتؒ کو دوسرے دن اس کی خبر ہوئی، آہستہ آہستہ جنگل کی آگ کی طرح خبر پھیل گئی اور لوگوں نے اسکے خلاف سخت ردِ عمل ظاہر کیا، احتجاجی مظاہرے کئے، بیانات دیئے، بیرون ملک بھی اعلیٰ پیمانے پر اسکے خلاف آواز اٹھائی گئی، اس سے حکومت کو اندازہ ہو گیا کہ ایسی قد آور شخصیت کے خلاف یا اس کی موجودگی میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی بڑا اقدام نہیں کیا جا سکتا۔ اس واقعہ کے دس ہی روز کے بعد حکومت یوپی نے "وندے ماترم" اور سرسوتی وندنا کے سلسلہ میں اپنے آڈرس کو منسوخ کرنے کا حکم جاری کیا اور معذرت کی۔

حضرتؒ کی زندگی کا آخری بیرونی سفر اور ایک عالمی اعزاز

دبئی کے "بین الاقوامی جائزہ قرآن" کے سرکاری ادارہ نے جس کی صدارت ولی عہد دبئی وزیر دفاع امارات محمد بن راشد آل مکتوم کرتے ہیں ۱۹۹۸ء کی ممتاز علمی واسلامی شخصیت کی حیثیت سے حضرتؒ کو یہ ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا، یہ عالمی سطح کا ایک بڑا دینی وعلمی اعزاز تھا، لیکن حضرتؒ کی شخصیت بلندی کے اس معیار پر پہنچ چکی تھی کہ خود حضرتؒ کے لئے اس میں کوئی بڑے اعزاز کی بات نہیں تھی، لیکن خود اعزاز کے لئے حضرتؒ کا قبول کر لینا باعث فخر واعزاز تھا، حضرتؒ کو جب اس کی خبر ملی تو بقول حضرت کے "یہ خبر ایک صاعقہ (بجلی) بن کر دل ودماغ پر گری، اس کو نہ اس سے پہلے اس کا علم تھا نہ توقع واندازہ لیکن نہ اس سے انکار کا کوئی

موقع تھا نہ کوئی فائدہ کہ اس کا اعلان بین الاقوامی سطح پر ہو گیا تھا"(۱)۔

حضرتؒ کو جب یہ معلوم ہوا کہ رمضان المبارک میں یہ تقریب منعقد ہو گی تو حضرتؒ نے سفر سے معذرت فرمائی کہ رمضان میں مہمانوں کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ رائے بریلی میں قیام فرما ہوتے تھے، اور پھر شدید ضعف کے ساتھ ماہِ مبارک میں سفر سخت دشوار تھا اور پھر فیصل ایوارڈ کے موقع پر بھی حضرتؒ خود تشریف نہیں لے گئے تھے مگر ذمہ داروں کا اصرار بڑھتا گیا اور انھوں نے یہاں تک کہا کہ اگر حضرتؒ تشریف نہیں لائیں گے تو ہم سب خود حاضر ہو کر درخواست کریں گے، مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب نے بڑا اصرار فرمایا اور یہ یقین بھی دلایا کہ حضرتؒ کی تشریف آوری سے یہ اُمید ہے کہ وہاں عمومی فضا پر اثر پڑے گا اور ایک دینی ماحول پیدا ہو گا اور یہ بھی کہا کہ حضرتؒ کے نہ آنے سے حکومت کی سبکی ہو گی، حضرتؒ نے اس دینی نفع کی خاطر سفر کرنا منظور فرما لیا۔

حضرتؒ کے ضعف اور مشغولیت کا خیال رکھتے ہوئے ذمہ داروں نے مملکت دبئ کا ایک مخصوص جہاز لکھنؤ ایر پورٹ بھیجا جس پر دبئ کے دو معزز اور ذمہ دار حضرات بھی لینے کیلئے تھے، ایک دو صحافی اور ایک ڈاکٹر بھی ہمراہ تھے۔ حضرتؒ اپنے رفقاء مولانا محمد رابع صاحب ندوی، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مولانا عبداللہ حسنی ندوی، بھائی عثمان صاحب حیدر آبادی اور حاجی عبدالرزاق صاحب نصیر آبادی کے ہمراہ ۶؍ جنوری کو لکھنؤ سے دبئ تشریف لے گئے، دوسرے دن تقسیم جوائز کی تقریب تھی جس کا سلسلہ دیر رات تک جاری رہا اور مختلف ملکوں کے حفاظ کو انعامات دیئے گئے، اخیر میں حضرتؒ کو جلسہ میں مدعو گیا کچھ دیر ولی عہد کے ساتھ تشریف فرما رہے، پھر اسٹیج پر تشریف لے گئے اور ولی عہد نے ایوارڈ پیش کیا۔ وہ بھی عجیب منظر تھا کہ حضرتؒ نے ایک ہاتھ سے ایوارڈ قبول فرمایا اور دوسرے ہاتھ میں حضرتؒ کی بعض اہم تصنیفات کا جو پیکٹ تھا وہ ولی عہد کو عطا فرمایا۔ اس کے بعد

---

(۱) کاروانِ زندگی ہفتم۔ ص ۲۱۶

حضرت کا مختصر لیکن بہت موثر خطاب ہوا، اس میں حضرتؒ نے بڑے جوش و تاثیر کے ساتھ اقبال کا یہ شعر سنایا اور اس کا ترجمہ فرمایا ۔

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربیؐ سے ہے عالم عربی

اس تقریر میں حضرتؒ نے اپنے معمول کے مطابق یہ اعلان بھی فرمادیا کہ یہ خطیر رقم (جو تقریباً ہندوستانی سکہ کے اعتبار سے سوا کروڑ روپے ہوتی تھی) دینی و تعلیمی اداروں کے لئے بطور اعانت وعطیہ صرف کی جائے گی اور پھر تھوڑے ہی عرصہ میں جس طرح وہ تقسیم کی گئی وہ اکثر واقفین جانتے ہیں کہ اس میں سے ایک حبہ بھی حضرتؒ نے اپنی ذات پر صرف نہیں کیا اور جب تک وہ رقم ختم نہیں ہو گئی حضرتؒ کو چین نہیں آیا۔

اس تقریب کے دوسرے دن مسجد غریر میں اُردو دانوں کے سامنے حضرتؒ نے خطاب فرمایا، اور سرزمین عرب میں رہ کر ان کے اوپر جو حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ یاد دلائیں، انبیاء اور بعض ان اہل اللہ کے واقعات بھی سنائے کہ سرزمین عرب کو دیکھ کر جن کے اندر کرنٹ دوڑ جاتا تھا، اللہ کے رسول ﷺ کی اس وصیت کا بھی تذکرہ کیا جس میں آپؐ نے فرمایا تھا "اخرجوا الیھود والنصاری من جزیرۃ العرب" (یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے باہر رکھو) اس تقریر کا لوگوں پر بڑا اثر پڑا اور ایک دینی رجحان پیدا ہوا۔ دبئی کے اس مختصر قیام میں امیر شارقہ سلطان بن محمد قاسمی اور نائب وزیر اعظم شیخ سلطان بن زائد خود حضرتؒ کی ملاقات وزیارت کے لئے حاضر ہوئے اور اپنے قدیم تعلق کو تازہ کیا۔

۹ر جنوری ۱۹۹۹ء کو اسی خصوصی جہاز سے حضرتؒ اپنے رفقاء کے ساتھ لکھنؤ واپس تشریف لائے اور اسی دن رائے بریلی تشریف لے آئے۔ یہ رمضان المبارک کی بیس تاریخ تھی۔

زندگی کا آخری سفر

۱۹۹۹ء کے "رابطہ ادب اسلامی" کے اجلاس کے لئے سبیل الرشاد بنگلور نے میزبانی کی پیشکش کی تھی جو قبول کی گئی اور ۲۷-۲۸ر فروری کی تاریخیں اس کے لئے طے کردی گئیں، اس میں شرکت کے لئے حضرت اپنے رفقاء کیساتھ ۲۵ر فروری کو لکھنؤ سے بنگلور کے لئے بذریعہ طیارہ روانہ ہوئے، دوسرے دن افتتاحی اجلاس کی صدارت فرمائی اور صدارتی تقریر میں ادب کے صحیح استعمال پر زور دیا اور دین سے اس کے تعلق کا تذکرہ فرمایا۔

۲۷ر فروری کی شام کو ادباء شعراء اور صحافیوں کے اجتماع کو خطاب فرمایا اور اس میں زبان و قلم کی اہمیت اور نزاکت بیان فرمائی۔

۲۸ر فروری کو عربی مقالات کی نشست میں حضرتؒ نے اپنا عربی مقالہ بھی پیش فرمایا، جو حضرت یوسفؑ کے قصہ کے تقابلی مطالعہ سے متعلق تھا۔ اختتامی نشست میں حضرتؒ کی آخری تقریر ہوئی اور اس پر یہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

۲۸ر فروری ہی کو بعد عصر سبیل الرشاد کے جلسۂ تقسیم اسناد میں حضرتؒ نے فارغ ہونے والوں کو سندیں تقسیم فرمائیں اور توجیہی کلمات ارشاد فرمائے۔ یکم مارچ کا دن بڑی مشغولیت کا تھا، اس دن حضرت نے اطراف کے بعض مدرسوں میں بعض بڑے جلسوں سے خطاب فرمایا اور اسی دن "پیام انسانیت" کے ایک اہم جلسہ میں بھی تقریر ہوئی اور بعد عشاء خواص کے ایک مجمع میں بھی ان کی مناسبت سے حضرتؒ نے ضروری اور اہم باتیں ارشاد فرمائیں۔

سفر بنگلور کی مناسبت سے اہل بھٹکل نے بھی تشریف آوری کی درخواست کی تھی، تعب و ضعف کی وجہ سے حضرتؒ کو اس میں تردد تھا لیکن بھٹکل والوں کے اصرار اور پھر ان کی محبت و تعلق کی بنا پر حضرتؒ نے اس کو منظور فرمالیا۔ ۲ر مارچ کو منگلور کے لئے روانہ ہوئے، ایئرپورٹ پر استقبال کرنے والوں کا اتنا بڑا مجمع تھا جو

اس سے پہلے منگلور میں نہیں ہوا تھا، جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے اساتذہ طلبہ اور ذمہ داران موجود تھے۔ سید بیری صاحب کے مکان پر کچھ دیر آرام فرما کر حضرت پورے قافلہ کے ساتھ بھٹکل تشریف لے گئے، یہ سفر تین گھنٹوں میں طے ہوا، بھٹکل میں دو روز قیام رہا، زیارت واستفادہ کے لئے بھٹکل اور اطراف بھٹکل کے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ ۳؍مارچ کو بعد عصر جامعہ کے وسیع میدان میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوئے، استاذ جامعہ مولوی محمد الیاس صاحب ندوی نے سپاس نامہ پیش کیا، اس میں انھوں نے بڑے مؤثر انداز میں حضرتؒ سے اہل بھٹکل کے تعلق ومحبت اور ان کے جذبات واحساسات کا ذکر کیا، اخیر میں حضرتؒ نے خطاب فرمایا، اسمیں تعیش ونفس پرستی اور ملحدانہ نظریات کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کے آگے بندھ باندھنے کی شدید ضرورت پر زور دیا اور فرمایا کہ یہ جامعہ کی اصل ذمہ داری ہے۔ مزید فرمایا کہ "اس ادارہ کو جنوبی ہند کے لئے ایک منارۂ نور ہونا چاہئے، جہاں سے عقیدۂ صحیحہ، علم خالص اور فکر خالص کی تابناک کرنیں پھوٹ کر آس پاس کے علاقوں کو منور کریں"۔

اس جلسہ عام کے علاوہ "رابطہ ادب اسلامی" بھٹکل کی طرف سے اہل نوائط کی علمی، ادبی اور تعلیمی خدمات پر ایک سیمینار بھی منعقد ہوا، جس کی ایک نشست میں حضرتؒ بھی شریک ہوئے، اور کچھ خطاب فرمایا، اسی نشست ہی میں رابطہ کا اگلا اجلاس بھٹکل میں ہونا طے ہوا۔ (۱)

۴؍مارچ کو جامع مسجد بھٹکل میں مولانا عبدالباری ندوی بھٹکلی کے درس قرآن کے ختم میں شرکت ودُعا فرما کر حضرت منگلور واپس تشریف لائے۔ منگلور کے ایک روزہ قیام میں ڈاکٹر حبیب الرحمن صاحب نے بڑے اصرار کے ساتھ حضرتؒ کا پورا چیک اپ (ڈاکٹری معائنہ) کرلیا اور اطمینان ظاہر کیا۔ دوسرے دن

(۱) یہ اجلاس حضرتؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد رابع صاحب ندوی مدظلہ کی صدارت میں بڑی کامیابی کے ساتھ مورخہ ۸/۹/۱۰؍اکتوبر ۲۰۰۰ء بعنوان "مولانا علی میاں اور بچوں کا ادب" منعقد ہوا۔

منگلور سے بمبئی آئے اور وہاں پانچ روز آرام فرما کر لکھنؤ تشریف لے آئے۔

سفر سے واپسی کے چند ہی روز کے بعد علالت کا شدید حملہ ہوا جس کی تفصیلات اگلے باب کا موضوع ہیں۔

سولھواں باب

علالت سے وفات تک

علالت کا شدید حملہ اور حضرتؒ کی عزیمت

حضرتؒ کی صحت کی کمزوری کا سلسلہ اگرچہ خاصا طویل کوئی خطرناک
مرض حضرتؒ کو نہیں رہا، شباب کے آغاز میں پرانی پیچش ض کچھ عرصہ چلا
جس کے اثر سے عمومی کمزوری رہی اور جسم نحیف رہا، اسی ن کھانسی کی شکایت
پیدا ہو گئی تھی جو بڑی تدبیروں کے بعد بھی نہیں جا سکی ی، شام کے قیام میں
وہاں کی آب و ہوا حضرتؒ کو بہت موافق آئی اور کھانسی کی یہ شدت دور ہو گئی۔

۱۹۶۰ء میں پہلی مرتبہ نقرس کا درد ہوا، ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی دوا سے اس میں ایسا فائدہ ہوا کہ کئی سال تک اس کا احساس نہیں ہوا، جب دوبارہ اس کی تکلیف ہوئی تو ڈاکٹر صاحبؒ کی وفات ہو چکی تھی اور دوا بھی یاد نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۹۰ء تک اس کے شدید حملے ہوتے رہے، اس میں اتنی شدت کا درد ہوتا تھا کہ قدم زمین پر رکھنا مشکل ہوتا تھا۔ ۱۹۹۰ء کے بعد سے تکلیف کے سخت حملے تو نہیں ہوئے مگر ٹانگوں میں کمزوری بہت بڑھ گئی۔

ضعف بصارت کا سلسلہ بھی ۱۹۶۰ء سے شروع ہو گیا، اس میں حضرتؒ نے جو تکلیفیں اٹھائیں اس کی تفصیلات کتاب میں گذر چکی ہیں البتہ آخری سالوں میں ضعف بہت بڑھ گیا تھا، اسی میں اسفار کا سلسلہ بھی جاری تھا، ابھی پندرھویں باب

کے اخیر میں جنوبی ہند کے جس سفر کا ذکر گذر چکا ہے وہ بھی اسی ضعف کی شدت میں کیا گیا۔

سفر سے واپسی کو چند ہی روز گزرے تھے کہ ۱۷ مارچ مطابق یکم ذی الحجہ سہ شنبہ کو ناشتہ کے وقت جسم کے داہنے حصہ پر فالج کا حملہ ہوا، زبان پر بھی اس کا اثر تھا، حضرت ؒ کے معالج خاص جناب ڈاکٹر نظر احمد صاحب اسی وقت تشریف لے آئے، انھوں نے فوری تدابیر کیں، "گرین کراس نرسنگ ہوم" کے مالک جناب ڈاکٹر عبدالمعبود صاحب اپنی ایمبولینس اور ضروری امدادی سامان لیکر تشریف لائے، ڈاکٹر کرنل شمسی صاحب تو قدیم محب و معتقد تھے وہ بھی مشورہ میں شریک ہو گئے، سحر نرسنگ ہوم کے مالک ڈاکٹر عرفان صاحب اور ڈاکٹر غوث صاحب بھی آگئے، ماہر امراضِ قلب جناب ڈاکٹر منصور حسن صاحب کو بھی زحمت دی گئی، ان کے علاوہ بعض غیر مسلم ماہر ڈاکٹروں کو بھی بلایا گیا، شہر کے ایک نرسنگ ہوم میں جدید ترین آلات کے ذریعہ چیک اپ کرایا گیا، ڈاکٹروں نے خاصی تشویش ظاہر کی، خاص طور پر ڈاکٹر نظر احمد صاحب جو ادھر برسوں سے حضرت ؒ کے خاص معالج تھے بار بار آبدیدہ ہو جاتے تھے، افراد خاندان اور خدام کا جو حال ہوا وہ اللہ ہی جانتا ہے۔

دہلی سے ڈاکٹر خلیل اللہ صاحب بھی دیکھنے کے لئے خاص طور پر آئے، اور ڈاکٹروں سے مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ دہلی لے جا کر وہاں چک اپ کرایا جائے، گھر کے لوگوں خاص طور پر حضرت ؒ کے محبوب بھانجہ مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کو بادل ناخواستہ راضی ہونا پڑا، فوری طور پر جہاز ملنے کا مسئلہ بڑا اہم تھا، اتفاق سے ڈی ایم صاحب بھی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے، حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی ؒ کے صاحبزادہ قاری مشتاق احمد صاحب بھی اس وقت موجود تھے، ڈی ایم ان سے پہلے سے واقف بلکہ ایک طرح سے اچھا تعارف رکھتے تھے، غالباً دونوں کا مشورہ ہوا اور ڈی ایم نے وزیر اعلیٰ سے اجازت لے کر حکومت کی طرف سے خصوصی طیارہ کی پیش کش کی جس کو مجبوراً منظور کر لیا گیا کہ اس وقت

دور و قریب سے آنے والوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، علالت کی خبر سے جس طرح عموی طور پر وسیع پیمانہ پر لوگوں میں ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی یہ حضرت کی کھلی ہوئی مقبولیت و محبوبیت کا اثر تھا، لوگوں نے رو رو کر بارگاہ الٰہی میں صحت و شفایابی کی دعائیں کیں، علالت کے دوسرے تیسرے دن امام حرم شیخ سبیل نے عیادت نامہ ارسال فرمایا اور اس میں انھوں نے دعا کا جو اہتمام کیا تھا اس کا تذکرہ کیا۔

حج میں خاص طور پر حجاج کرام بڑے الحاح و تضرع کے ساتھ حضرت کی صحت یابی اور درازیٔ عمر کے لئے دعا کرتے رہے، حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم، شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب سہارنپوری مد ظلہ العالی، مولانا محمد طلحہ صاحب اور نظام الدین کے حضرات حج پر تشریف لے گئے تھے، ان حضرات نے وہیں خبر سنی اور مستقل دعا میں لگ گئے، حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب جونپوری نے اپنے مدرسہ میں ختم کرایا اور شدید ضعف کے باوجود بڑے اہتمام سے خود دعا کرائی، ہر ایک کی زبان پر تھا کہ حضرتؒ ملت کی آبرو ہیں، بہت سے فتنے حضرتؒ کے وجود سے تھمے ہوئے ہیں، اللہ حضرتؒ کے سایۂ عاطفت و رحمت کو تادیر باقی رکھے اور ملت کو ان کی ذات سے متمتع فرماتا رہے۔ دعا کا یہ ایک ایسا سلسلہ تھا، جو ہر خاص و عام کی زبان پر تھا، اللہ تعالیٰ نے دعائیں قبول فرمائیں اور مرض میں تخفیف ہونی شروع ہوئی، ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر خود اپنے ہاتھ سے وضوء فرمانے لگے، سہارے سے دو چار قدم چلنا بھی ممکن ہو گیا، زبان پر بھی اثر کم ہو گیا اور حضرتؒ نے لکھنے پڑھنے کا کچھ کام بھی شروع فرما دیا۔

رجوع عام

علالت کی خبر عام ہوتے ہی ملک و بیرون ملک سے عیادت کے لئے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا، مرض میں تخفیف کے بعد زیارت و ملاقات کے لئے ایسا رجوع عام ہوا جو مقبولین بارگاہ الٰہی کا امتیاز رہا ہے، دار العلوم کے مہمان خانہ میں

آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا، سب حضرتؒ کے مہمان ہوتے، حضرتؒ نے شدت سے تاکید فرمادی تھی کہ مہمانوں پر دارالعلوم کا ایک حبہ بھی خرچ نہ ہو، عیادت کے لئے آنے والوں میں مخصوص محبین ومعتقدین کے علاوہ علماء ومشائخ اور دینی قائدین میں سے حضرت مولانا ابرارالحق صاحب دامت برکاتہم، مولانا مرغوب الرحمان صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند)، شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب، مولانا محمد طلحہ صاحب، مولانا مفتی مظفرحسین صاحب، جناب حکیم مکرم حسین صاحب سنساری پوری، مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب رائے پوری، مولانا سلمان صاحب (ناظم مظاہر العلوم)، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری کے دونوں خویش قاری محمد مبین صاحب اور مولانا قمرالزماں صاحب، ان کے علاوہ مولانا اسعد مدنی صاحب (صدر جمعیت علمائے ہند) مولانا محمد سالم صاحب قاسمی، مولانا سید نظام الدین صاحب (امیر شریعت بہار واڑیسہ)، مولانا سراج الحسن صاحب (امیر جماعت اسلامی ہند) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ دیوبند، مظاہر علوم اور دوسرے اہم مدارس کے اساتذہ بھی عیادت کے لئے آتے رہے۔

ایک روز مشہور سلفی عالم وخطیب مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی جھنڈانگری بھی اپنی تمامتر معذوریوں اور علالت کے باوجود عیادت کے لئے تشریف لائے۔

حکومت کے عہدہ داروں میں سے خود وزیر اعظم مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے دارالعلوم آکر حضرتؒ کی عیادت کی، یوپی کے گورنر اور وزیر اعلیٰ بھی ساتھ تھے۔ شدید کمزوری اور بولنے میں دشواری کے باوجود حضرتؒ نے فرمایا "ملک کی خبر لیجئے، ملک خطرہ میں ہے۔" حضرتؒ کے جانشیں مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ نے حضرت کا یہ جملہ نقل کیا کہ "ہم سب ایک کشتی کے سوار ہیں، کشتی ڈوبے گی تو سب ڈوبیں گے اس لئے اسکی فکر سب کی ذمہ داری ہے۔" وزیر اعظم اور ان کے رفقاء کے علاوہ بعض مرکزی وزراء اور دوسرے اہم سیاسی قائدین نے بھی حاضری دی اور عیادت کی، انڈین نیشنل کانگریس کی صدر نے بھی آکر عیادت کی۔

شخصیت کی سرگذشت حیات ہے جس میں ذاتی زندگی کے مشاہدات و تجربات، احساسات و تاثرات اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے واقعات وحوادث اور تحریکات وشخصیات کے مطالعہ کا ماحصل اسطرح گھل مل گیا ہے کہ وہ ایک دلچسپ وسبق آموز آپ بیتی اور ایک مورخانہ وحقیقت پسندانہ جگ بیتی بن گئی ہے اور چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی کی تاریخ وسرگذشت کا ایک اہم باب محفوظ ہوگیا ہے۔(۱)

دوران علالت اہم وفیات

نو دس مہینہ کی علالت کے دوران حضرتؒ کے متعدد رفقاء، محبین ومعاونین، بعض خدام اور خاندان کے افراد نے رحلت کی جن میں سر فہرست حضرت کی بھتیجیؒ (اہلیہ مولانا محمد ثانی صاحب حسنیؒ جو حضرت کے گھر کی ذمہ دار تھیں اور بمنزلہ بیٹی کے تھیں) کی وفات کا حادثہ ہے جو ۳؍اگست کو پیش آیا، حضرتؒ کو لکھنؤ میں اس حادثہ کی اطلاع ہوئی: اسی وقت رائے بریلی تشریف لائے، علالت اور ضعف کی شدت کے باوجود خود ہی نماز جنازہ پڑھائی، خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

حضرتؒ کے لئے دوسرا سخت حادثہ مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ کی وفات کا ہے جو حضرتؒ کے اولین شاگردوں میں سے تھے اور ساری عمر انھوں نے حضرت کی رفاقت وخدمت میں گزار دی، حضرتؒ کو ان سے قلبی تعلق تھا، انکی محبت و تعلق اور وفاشعاری کا بار بار ذکر فرماتے تھے۔ آخری چند سال انکی معذوری کے گذرے ۲۳؍اگست کو انکی وفات ہوئی اور اپنے وطن ہی میں مدفون ہوئے۔

تیسرا حادثہ جسکا حضرتؒ پر بڑا اثر پڑا حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانیؒ کی وفات کا ہے جنھوں نے ۱۲؍اگست کو رحلت کی، وہ حضرتؒ کے ہم استاذ بھی تھے (حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ کے وہ شاگرد باختصاص اور ان کے علوم

(۱) کاروان زندگی کے سرورق سے یہ عبارت کچھ معمولی حذف واضافہ کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔

کے وارث وامین تھے) اور حضرت سے بھی انھوں نے چند روز ادب کی کوئی کتاب پڑھی تھی، اخیر میں حضرتؒ سے ان کا تعلق بہت بڑھ گیا تھا، حضرتؒ نے ان کو اجازت و خلافت بھی مرحمت فرمائی تھی اور ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ علم حدیث میں چند ہی لوگ ان کے پایہ کے ہوں گے، انھوں نے ایک مرتبہ پورا رمضان حضرت کے ساتھ دائرہ شاہ علم اللہ میں گزارا تھا، اور ۱۹۸۹ء میں حضرتؒ ہی کی خواہش وایماء پر دارالعلوم میں تین ماہ قیام فرمایا تھا۔

ہم عصر مشائخ میں سے حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوریؒ کی وفات بھی حضرتؒ کے زمانۂ علالت میں ہوئی، اخیر میں مولانا مرحوم کا تعلق حضرتؒ سے بہت بڑھ گیا تھا، اپنے چھوٹے فرزند کو انھوں نے دارالعلوم میں تعلیم کے لئے بھیجا تھا، ندوہ کے مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہونے کے بعد سے جب تک بالکل معذوری نہیں ہوئی وہ پابندی سے اس میں شرکت فرماتے رہے اور ایک مرتبہ حضرتؒ کے وطن رائے بریلی بھی زیارت وملاقات کے لئے تشریف لائے۔

رفقا و محبین میں سے جن اہم لوگوں نے زمانہ علالت میں وفات پائی ان میں شیخ علی طنطاویؒ، شیخ بن بازؒ شیخ محمد المجذوب، استاذ مصطفےٰ زرقاءؒ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان سب سے حضرتؒ کے دوستانہ و محبانہ تعلقات کی مدت نصف صدی سے کم نہیں، یہ سب حضرات حضرتؒ کے بڑے قدر داں اور حضرتؒ کی دینی دعوتی اور فکری خدمات کے معترف تھے۔

خدمت گذاروں اور راحت کا خیال رکھنے والوں میں مولانا محمد رضوان صاحبؒ کی شہادت کا بڑا دلدوز اور صبر آزما واقعہ پیش آیا، حضرتؒ اس زمانہ میں رائے بریلی میں تشریف فرما تھے کہ اچانک مولانا کے ایکسڈنٹ میں جاں بحق ہونے کی اطلاع ملی حضرتؒ اسی وقت لکھنؤ تشریف لے گئے، انکی نماز جنازہ کی خود ہی امامت بھی فرمائی۔

''ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے وطن ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، ہمارے اس فیصلہ کو ارادۂ الٰہی کے سوا کوئی طاقت نہیں بدل سکتی، ہمارا یہ فیصلہ کسی کم ہمتی، مجبوری، یا بے چارگی پر مبنی نہیں ہے، ہم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔

ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے (جو اپنے عزم اور قطعیت میں پہلے فیصلہ سے کسی طرح کم اور غیر اہم نہیں) کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، قانون شریعت اور اپنی پوری مذہبی و تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، ہم ان کے کسی ایک نقطہ سے دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں۔

اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت اور دستور و آئین کا بھی فیصلہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنی خصوصیات، قانون شریعت، احکام دین، اپنے عقائد و شعائر، اپنی تہذیب اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو عزیز ہیں اس ملک میں رہیں، اس طرح رہنے سے یہ وطن، وطن نہیں بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی عزتوں اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے، ہمارا خمیر ضرور اس ملک سے تیار ہوا ہے اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے، لیکن ہماری تہذیب ابراہیمی ہے اور مسلمان جس ملک میں رہے گا اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو، اس کی تہذیب ابراہیمی ہوگی، ہم یہاں زندہ اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، ہم اس ملک میں آزاد ہیں، اس کی تعمیر و ترقی اور دستور سازی میں شریک ہیں، اس لئے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری، انسانی، اخلاقی اور قانونی حق ہے اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے۔''

لقاءِ رب کا شوق

ادھر عرصہ سے حضرتؒ پر ایک فکر و استغراق کی کیفیت طاری رہتی، کلام کم سے کم فرماتے، بعض بعض مرتبہ عصر بعد کی مجلس میں شاید ہی دو ایک جملے فرماتے ہوں، لقائے الٰہی کا شوق غالب تھا، زبان مبارک سے بار بار، اللھم لقاءك کے الفاظ ادا ہوتے، ساری زندگی امت کی فکر و اصلاح میں گذری تھی، زبان مبارک سے یہ کلمات بھی ادا فرماتے کہ اللھم اشھد وانت شاھد (اے اللہ! تو گواہ رہ کہ اصل گواہ تو ہی ہے) حیا کوٹ کوٹ کے بھری تھی دوسروں سے خدمت لینا طبیعت پر بار تھا، پانی کی بھی طلب ہوتی تو ہر ایک سے نہ فرماتے صرف خادم خاص الحاج عبدالرزاق صاحب نصیر آبادی مدظلہ سے تکلف نہیں تھا کہ وہ چالیس سال سے حضرتؒ کے خادم تھے علالت کے زمانہ میں بھائی ذکاءاللہ صاحب اندوری اور بھائی عبدالمعید صاحب پرتاب گڈھی نے بھی بڑی خدمت کی، رائے بریلی کے قیام میں مولوی نیاز احمد صاحب ندوی اور لکھنؤ کے قیام میں مصباح الدین صدیقی نے بھی راحت و آرام کا خیال رکھا۔ ہر ایک خدمت کو اپنے لئے سعادت و عزت سمجھتا تھا مگر حضرتؒ خدمت کے بعد بڑے مشکور ہوتے اور خدام کے ساتھ بڑا سلوک فرماتے، عیادت کے لئے ہر طرح کے لوگ آتے، اپنے ضعف و علالت کے باوجود حضرتؒ سب کے ساتھ حسب مراتب معاملہ فرماتے اور خدام کو خیال رکھنے کی ہدایت فرماتے، اخیر میں یہ بھی معمول ہو گیا تھا کہ جو آتا وہ خالی ہاتھ واپس نہ جاتا، قدیم تعلق والوں کو خاص طور پر کچھ نہ کچھ ضرور عنایت فرماتے، نسبتوں کا بڑا خیال رہتا، کسی بھی بزرگ سے تعلق رکھنے والا یا نسبت رکھنے والا آجاتا اسکا بڑا اکرام فرماتے اور مسرور ہوتے۔

رمضان المبارک میں دارالعلوم کا قیام

رمضان المبارک قریب آرہا تھا، ہر تعلق والے خاص طور پر افراد خاندان کی

پہلے آجائیے گا۔ کسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر جس دن حضرت کو لکھنؤ سے رائے بریلی جانا چاہتے ہیں وہ سفر آخرت کا دن ہے۔ ۲۰ر رمضان المبارک کو حضرتؒ نے دار العلوم پر الوداعی نگاہ ڈالی اور پورے قافلہ کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے، تکیہ پر بہار آگئی معلوم ہوتا تھا کہ جشن کا سماں ہے، حضرتؒ کی صحت وعافیت کے ساتھ آمد پر ہر ایک مسرور تھا۔

"دائرۂ شاہ علم اللہ" کے دو دن

۲۰ر رمضان المبارک بروز چہار شنبہ حضرتؒ رائے بریلی تشریف لائے تھے یہاں مبارک زندگی کے صرف دو دن گذرے، صحت پوری طرح بحال تھی معمولات اسی طرح ادا ہورہے تھے البتہ شدید ضعف اور سخت ٹھنڈک کی وجہ سے نمازیں اور تراویح اپنی قیام گاہ پر (بنگلہ میں) باجماعت ادا فرمارہے تھے، فیاضی حضرتؒ کے مزاج میں داخل تھی، رمضان المبارک میں اس میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا، اس مرتبہ تو حضرتؒ نے آتے ہی خدام سے فرمادیا تھا کہ حاجت مندوں میں خوب تقسیم کرو اور تاک تاک کردو۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ حضرتؒ ایک ہی دو روز کے اندر سب تقسیم فرمادینا چاہتے ہیں۔ حسن سلوک اور صلہ رحمی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی۔

رمضان المبارک میں نبی اکرم ﷺ کے بارے میں صحابہ کرام بیان فرماتے ہیں کہ "كان أجود من الريح المرسلة" کہ تیز ہوا سے زیادہ آپکی فیاضی ہوتی۔ اس وقت حضرتؒ محبوب دوعالم ﷺ کی اقتداء میں اس صفت کا مصداق تھے۔

پنجشنبہ (جمعرات) کے روز گھر تشریف لے گئے، گھر کی خواتین نے زیارت کی، دیر تک تشریف فرمارہے، مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ بھی تشریف فرماتھے ان سے گفتگو فرماتے رہے، جمعرات کا دن بھی گذر گیا، تراویح کے بعد مجلس میں دریافت فرمایا کہ مسجد میں کتنے لوگ ہیں؟ عرض کیا گیا کہ مسجد بھر گئی۔ فرمایا" یہ

بانی (حضرت شاہ علم اللہ) کا اخلاص ہے۔" پھر فرمایا کہ "محمد میاں کی کتاب "تذکرہ شاہ علم اللہ" ہم کو دینا موقع ہوا تو دیکھیں گے"۔ اسی مجلس میں یہ عجیب بات دریافت فرمائی کہ "کیا کل "جمعۃ الوداع" ہے"۔ کسی نے عرض کیا کہ حضرتؒ ابھی ایک اور جمعہ بھی آئے گا۔ اس پر دوبارہ یہی فرمایا کہ "کل جمعۃ الوداع ہے؟" پھر عرض کیا گیا کہ ابھی ایک جمعہ اور ہوگا، اس پر خاموش ہوگئے۔ کون جانتا تھا کہ حضرتؒ کیلئے کل جمعۃ الوداع ہے۔

مجلس دین کی باتوں اور بزرگوں کے تذکروں پر ختم ہوئی، اسی دن مدینہ منورہ سے بھائی طارق حسن صاحب عسکری تشریف لائے حضرتؒ کو ان کی آمد سے بڑی مسرت ہوئی، مولانا نذر الحفیظ صاحب بھی اپنے سفر سے اسی دن واپس ہوئے اور حضرتؒ کو ان کے آنے سے بھی بڑی خوشی ہوئی۔

جوارِ رحمت میں

جمعہ کا دن سخت سردی کا تھا، کہر کی وجہ سے سردی میں اور بھی شدت پیدا ہوگئی تھی۔ حضرتؒ حسب معمول تہجد کیلئے بیدار ہوئے، اس سے فارغ ہو کر سحری تناول فرمائی، فجر کی اذان کے بعد سنتیں پڑھکر باجماعت فجر کی نماز ادا کی، اور آرام فرمانے کے لئے لیٹ گئے، ساڑھے آٹھ بجے کے قریب بیدار ہوئے وضوء فرمانے کے بعد اشراق کی نماز پڑھی پھر تلاوت میں مشغول ہوگئے، نصف گھنٹہ تلاوت فرمائی، سجدہ تلاوت بھی فرمایا اس کے بعد سورہ یٰسین کا ورد شروع فرمادیا، اور حسب معمول تیرہ یا چودہ مرتبہ اس کی تلاوت فرمائی اور نام لے لے کر ایصال ثواب فرماتے رہے۔ اس سے فارغ ہو کر حاجی صاحب سے فرمایا "جلد ہی غسل کرادو"۔ حاجی صاحب نے عرض کیا حضرتؒ سردی سخت ہے اور کہر بہت ہے کچھ دیر کے بعد غسل فرمالیں۔ فرمایا کہ "زیادہ دیر نہ کرو"۔ اسی اثناء میں جعفر بھائی خدمت میں حاضر ہوئے دوران کلام عرض کیا کہ تکیہ پر آپ کے نہ ہونے سے رمضان نہیں

کے فضل کا ایک حصہ تھا ورنہ شاید آنے والوں کیلئے زمین تنگ ہو جاتی اور نہ جانے کتنے حادثات ہوتے پھر بھی عشاء تک آنے والوں کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ڈیڑھ لاکھ (۱،۵۰،۰۰۰) پہونچ چکی تھی۔ وفات کے بعد ہی سے زیارت کا سلسلہ جاری تھا۔ بعد مغرب یہ سلسلہ روک کر غسل دیا گیا، یہ کام مخصوص خدام اور گھر کے افراد نے انجام دیا، حضرتؒ کے جانشین حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ نگرانی فرماتے رہے۔

تجہیز و تکفین کے بعد پھر زیارت کا سلسلہ شروع ہو گیا، تقریباً دس بجے رات کو نعش مبارک کو اس کی آخری آرامگاہ تک لے جانے کے لئے نکالا گیا، انسانوں کا ایسا ہجوم تھا کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جنازہ کس طرح حظیرہ تک پہونچے گا۔ گھر سے وہاں تک کا مختصر سفر جو شاید نصف فرلانگ بھی نہ ہو آدھے گھنٹے میں طے ہوا۔ افراد خاندان اور خدام نے بالاتفاق یہ بات طے کر دی تھی کہ حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ ہی نماز جنازہ کی امامت فرمائیں گے کہ حضرتؒ کو ان سے جیسی محبت تھی اور ان پر جتنا اعتماد تھا شاید کوئی دوسرا اس میں ان کا ہمسر نہیں تھا، انھوں نے ساری زندگی حضرتؒ کی خدمت میں ان کے اشاروں پر گذاری تھی اور حضرتؒ کے سامنے اپنی شخصیت کو بالکل فنا کر دیا تھا، تقریباً ساڑھے دس بجے رات کو ان کی اقتداء میں نماز جنازہ پڑھی گئی، خلق کے ہجوم سے دائرہ شاہ علم اللہ کی بستی بھر چکی تھی، قریب کی بستیوں میں لوگوں کا مجمع تھا، شہر کے چاہنے والوں نے روشنی کا اور لاؤڈ اسپیکر کا بڑا اچھا نظم کیا تھا، نماز جب شروع ہوئی تو جو جہاں کھڑا تھا وہیں صف بندی کر کے نماز میں شامل ہو گیا، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جہاں شہر کی آبادی شروع ہوتی ہے وہاں تک لوگ نماز میں شریک تھے۔

حضرت شاہ علم اللہ کے حظیرہ میں ان کے بڑے صاحبزادہ شاہ ہدایت اللہؒ کے پہلو میں لحد تیار کی گئی تھی، اسی حظیرہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے علاوہ حضرتؒ کے والد نامدار، برادر بزرگوار، والدہ محترمہ، دونوں بہنیں، بھتیجے اور بڑے بھانجے

مدفون ہیں، نماز کے بعد جنازہ حظیرہ میں لایا گیا اور جسد مبارک کو لحد میں اتارا گیا، یہ آخری خدمت حضرت مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ، مولانا عبد اللہ حسنی صاحب، خادم خاص حاجی عبد الرزاق صاحب اور کاتب خاص مولانا نثار الحق صاحب نے انجام دی۔ اس طرح یہ حظیرہ جس میں تدفین کی ابتداء حضرت شاہ علم اللہؒ سے ہوئی تھی حضرتؒ کی تدفین سے اس کا اختتام ہوا، اور اس کے ساتھ ہی رشد وہدایت کا وہ آفتاب غروب ہو گیا جس نے بیسویں صدی کے بڑے حصہ کو اپنی روشنی سے منور کیا تھا، اور دعوت وعزیمت اور اصلاح وتجدید کا وہ باب بند ہو گیا جس سے اللہ کی مخلوق نے راہ ہدایت پائی تھی۔

عالمی تاثر

پورے عالم اسلام پر یہ خبر بجلی بن کر گری اور جس طرح وسیع پیمانہ پر تاثر کی فضا قائم ہوئی اور ہر طبقہ کے لوگوں نے اپنی عقیدت ومحبت کا ثبوت دیا یہ بھی تاریخ کی نادر مثالوں میں سے ہے، اکثر مساجد میں جمعہ کی نماز کے بعد اعلان ہوا، خبر سنتے ہی لوگوں پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی، پھر غائبانہ نماز جنازہ کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ شاید عالم اسلام کا کوئی ملک بچا ہو جہاں غائبانہ نماز جنازہ ادا نہ کی گئی ہو، ملک فہد کے ایماء پر حرم مکی اور حرم مدنی دونوں جگہ ستائیسویں شب کو غائبانہ نماز ادا کی گئی۔

دونوں جگہ جب حضرتؒ کا نام لیکر نماز کا اعلان کیا گیا تو لوگوں پر کیفیت طاری ہو گئی، محتاط اندازے کے مطابق دونوں جگہ ملا کر تقریباً پینتیس لاکھ (۳۵،۰۰،۰۰۰) کا مجمع تھا، ایسے مواقع بھی تاریخ میں کم ہی پیش آئے ہوں گے کہ کسی عالم کی غائبانہ نماز جنازہ دونوں جگہ پڑھی جائے، اس کے بعد تعزیتی جلسوں، سیمیناروں، دنیا کے مختلف ملکوں سے شائع ہونے والے رسالوں کی خصوصی اشاعتوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو تادم تحریر جاری ہے۔ من تواضع لله رفعه الله (جو اللہ کے لئے جھکتا ہے اللہ اس کو بلندی عطا فرماتا ہے) کی تصویر سامنے تھی، جس

ستائیسویں شب) حضرت مرحوم کے لئے غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم جاری فرمایا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ علامہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے اور انھیں اپنے نیکو کار بندوں میں شامل فرمائے اور انھیں ابرار و اتقیاء، شہداء و صالحین کے ساتھ اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ إنا للہ و إنا إلیہ راجعون.

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
محمد بن عبد اللہ السبیل
صدر نشین امور حرمین شریفین
امام و خطیب مسجد حرام۔ مکہ مکرمہ

عادات و معمولات

حضرتؒ کی پوری زندگی ابتداء سے بڑی منظم اور مشغول گذری، اس کا ایک ایک لمحہ امت کے لئے ایک متاع گرانمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندہ کو چاہتا ہے اس کو منتخب فرما کر توفیق سے نواز دیتا ہے، مفتی محمد شفیع صاحبؒ حضرتؒ کے لئے "موفق من اللہ" کی تعبیر استعمال فرمایا کرتے تھے جس میں حقیقت حال کی پوری عکاسی ہے، حضرتؒ کی زندگی کے معمولات اسی توفیق الٰہی کا نتیجہ تھے، حضرتؒ نے ایک ایسے گھرانہ میں آنکھیں کھولیں جو خالص دینی و علمی گھرانہ تھا، غیر شعوری طور پر اس کے اثرات بچپن ہی سے حضرتؒ پر پڑنے لگے تھے، والد صاحب کی وفات کے بعد والدہ صاحبہؒ اور بھائی صاحبؒ کی تربیت و نگہداشت نے اس میں اور نکھار پیدا کیا، عمر کے اس مرحلے میں جس میں عام طور پر نمازوں کا اہتمام نہیں ہو پاتا ہے والدہ صاحبہؒ نے اس زمانے سے حضرتؒ کو سحر خیزی کا عادی بنایا، پھر یہ حضرتؒ کا ایسا معمول بن گیا کہ ساری زندگی اس کا اہتمام رہا، سخت سے سخت موسم میں اور شدید ضعف و علالت کے زمانہ بھی یہ معمول ترک نہیں ہوا۔

حضرتؒ کا ابتدائی دور سخت مجاہدات میں گذرا، اس دور میں مطالعہ کے استغراق وانہماک یہ حال تھا کہ اس میں حضرتؒ کو کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی، اسی زمانہ میں کھانسی کی شدید تکلیف ہوئی لیکن اس کے باوجود بھی مطالعہ کا انہماک جاری رہتا تھا، حضرتؒ نے اسی زمانہ کا ایک واقعہ سنایا کہ "بیماری میں بھائی صاحب مطالعہ سے منع فرماتے تھے (کہ وہ شفیق بھائی کے ساتھ حاذق طبیب بھی تھے) مگر ہم چھپ چھپ کر پڑھتے تھے، ایک مرتبہ بھائی صاحب نے دیکھ لیا تو فرمایا کہ کیا شہادت کا ارادہ ہے؟" مطالعہ میں انہماک کے علاوہ اسی زمانہ میں حضرتؒ نے قرآن مجید یاد کرنا شروع کیا تھا، رائے بریلی کے قیام میں مسجد کے پیچھے گھنٹوں ٹہل ٹہل کر بڑے ذوق وحلاوت کے ساتھ تلاوت فرماتے رہتے تھے۔

فجر بعد ٹہلنے کا معمول شروع سے تھا، دار العلوم میں تدریس کے دوران ٹہل کر اس وقت واپس تشریف لاتے جب سبق کا وقت شروع ہو چکا ہوتا۔ چہل قدمی کے دوران اکثر تلاوت یا اوراد و وظائف میں مشغول رہتے، اسباق کی تیاری کیلئے بھی بڑا مطالعہ فرماتے، اسی زمانہ میں دیر رات تک مطالعہ کا معمول رہا ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ سے تعلق کے بعد دعوتی و تبلیغی اسفار کا سلسلہ شروع ہوا، ہر ہفتہ جمعرات کو طلبہ کی جماعت کو لے کر لکھنؤ کے مضافات میں تشریف لے جاتے، اکثر دس دس میل پیدل سفر فرماتے، نہ لو اور گرمی کی پرواہ ہوتی، نہ پانی اور کیچڑ کی۔ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے کہ جماعت لے کر رائے بریلی ہی کے ایک قصبہ میں تشریف لے گئے، خاندان کے دوسرے افراد بھی ساتھ تھے، رمضان کا مہینہ تھا وہاں دوسرے خیال و عقیدے کے لوگ تھے، افطار سے پہلے جب کچھ کھانے کا نظم کیا جانے لگا تو ان لوگوں نے سخت کلامی کی، چولہے پر چڑھی ہانڈی پلٹ دی، اور قریب تھا کہ وہ زدوکوب پر اتر آئیں، اسی وقت یہ حضرات بھوکے پیاسے کئی میل دور پیدل دوسرے گاؤں میں تشریف لے گئے اور وہاں جا کر افطار کی نوبت آئی۔

چہل قدمی کے بعد تھوڑی دیر مجلس میں تشریف فرما ہوتے، اس وقت عمومی طور پر بڑے انشراح کے ساتھ گفتگو فرماتے، اس زمانہ میں کم خوابی کی بڑی شکایت تھی، کبھی کبھی پوری پوری رات کروٹوں میں گذار دی، اس کا بڑا سبب عالم اسلام کے حالات کی فکر اور اس پر اضطراب و بے چینی کی کیفیت تھی۔

۱۹۷۷ء کے بعد جب ضعف بڑھ گیا اور اکثر رات کو نیند پوری نہیں ہوتی تھی تو فجر کی نماز کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ آرام فرمانے کا معمول ہو گیا، اسکے بعد بیدار ہو کر ناشتہ اور ضرورت سے فارغ ہوتے اور کام پر بیٹھ جاتے تقریباً ظہر سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے سورہ یٰسین کا معمول پورا فرماتے، مغرب بعد اوابین کا معمول تو باقی رہا لیکن ضعف کی وجہ سے اس میں طویل قرأت کا معمول ترک فرما دیا تھا۔

آخری سالوں میں سورہ یٰسین کا اہتمام بہت بڑھ گیا تھا، تلاوت سے فارغ ہو کر پہلے اسی کو پورا فرماتے، عموماً اس میں دو گھنٹے صرف ہوتے، اس ناکارہ نے ایک مرتبہ دریافت کیا تو فرمایا کہ روزانہ تیرہ مرتبہ اور ہفتہ میں ایک دن چودہ مرتبہ پڑھنے کا معمول ہے، یہ حضرتؒ کی کرامت تھی کہ ایک ایک کا نام لے لے کر ایصال ثواب فرماتے اور دعاء مغفرت و ترقی درجات کرتے، سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر آخر تک جس شخصیت نے بھی اصلاح و تجدید کا کام کیا یا حضرتؒ سے اس کا نسبی تعلق ہے یا سلسلہ کی نسبت ہے اسکا نام لیتے، یہاں تک وہ چھوٹے جنھوں نے حضرتؒ کی خدمت کی اور حضرتؒ کی حیات میں ان کا انتقال ہوا ان کا بھی نام لیتے اور ایصال ثواب فرماتے، یہ بھی معمول تھا کہ سفر میں جس بستی یا شہر میں داخل ہوتے تو سورہ یٰسین پڑھتے ہوئے داخل ہوتے اور وہاں کے مدفونین کو ایصال ثواب فرما کر دعائے مغفرت کرتے، عرصہ سے یہ بھی معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد منزل پڑھ کر تعلق والوں کا نام لے لے کر دعاء فرماتے۔

آخری سالوں میں نقرس کی تکلیف اور ضعف کی وجہ سے فجر کی نماز دو چار مخصوص خدام کے ساتھ باجماعت قیام گاہ پر ہی ادا فرماتے کہ اس وقت دو قدم چلنا بھی سخت دشوار ہونے لگا تھا، آخر میں ذکر سری اور توجہ و مراقبہ کا معمول بڑھ گیا تھا، رائے بریلی کے قیام میں صرف جمعہ کے روز مجلس ذکر میں ذکر جہری فرماتے،

جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھنے کا بچپن سے معمول تھا،اس کے علاوہ جمعہ کی نماز سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے دیر تک دعا میں مشغول رہتے،اس میں طائف اور عرفات کی دعا بڑے درد و سوز کے ساتھ پڑھتے،اس دن عصر بعد مغرب تک درود شریف پڑھنے کا بھی اہتمام تھا، رمضان مبارک میں ابتدائی دور میں خود ہی تراویح کی امامت فرماتے،بیس پاروں کے بعد کوئی دوسرا حافظ تکمیل کر دیتا،یہ بھی اس زمانہ کا معمول تھا کہ تراویح سے فراغت کے اپنے طور پر چار رکعتوں میں ڈیڑھ دو پارے پڑھتے،کبھی کبھی مخصوص خدام یا اہل تعلق اس میں شریک ہو جاتے۔

رمضان مبارک میں تلاوت کے معمول میں بھی خاصا اضافہ ہو جاتا، آخر ضعف کے زمانہ میں بھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس میں صرف ہوتا تھا، آخری سالوں میں رمضان میں یہ بھی معمول رہا کہ قاری قاسم صاحب کی تلاوت کے کیسٹ سے روزانہ ایک پارہ سنتے، رمضان میں یہ معمول تھا کہ عصر سے مغرب تک مسجد میں تشریف فرماتے اور ذکر و دعا میں مشغول رہتے،جب تک صحت رہی مستقل آخری عشرہ کے اعتکاف کا بھی معمول رہا جو عموماً دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد ہی میں فرماتے۔

حضرت شیخؒ کی وفات کے بعد پورا رمضان رائے بریلی میں گذرتا، محبین اور اہل تعلق جمع ہو جاتے اور مستفید ہوتے، آخری سات آٹھ سالوں سے درس قرآن کا سلسلہ بھی جاری تھا، آخری رمضان میں جس میں وفات ہوئی شدید ضعف کی وجہ سے اس کو موقوف کرنا پڑا، رمضان مبارک میں خاص طور پر ضرورت مندوں کی حاجت کا بہت خیال رہتا تھا، مہمانوں پر بھی جو صرف ہوتا وہ اپنے پاس سے ہی کرتے، آخری سالوں میں مہمانوں کی تعداد آخری عشرہ میں تین چار سو تک ہو جاتی اور بعض بعض دنوں میں تو ہزار ہزار آدمی دستر خوان پر کھانا کھاتے۔

طہارت کا بڑا اہتمام رہتا تھا، ہمیشہ باوضو رہتے، اذان سنتے ہی مسجد تشریف لے جانے کا معمول تھا، شدید ضعف کے باوجود اس میں تخلف نہیں تھا، دوران سفر بھی اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو باجماعت نماز ادا فرماتے اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ذرا بھی تاخیر ہونے لگتی تھی تو اضطراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

ہوائی جہاز کے سفر میں مستقل درود شریف کا ورد رہتا تھا، یہ ناکارہ بھی ایک

طرف منتقل ہوتا ہے، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ موضوع تفسیر کی بنیاد قرآن فہمی پر ہے اور تفسیر کی کتابیں اس کے لئے معاون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حضرتؒ کو عموی طور پر ایک مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ فہم قرآن میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اس پایہ کے ہوں، اس کی دو بڑی وجہیں ہیں: ایک تو عربی زبان وادب، بلاغت اور اعجاز قرآنی پر حضرتؒ کی وسیع وعمیق نگاہ، دوسرے ان لوگوں کی صحبت جن کی زندگی قرآن مجید کی عملی تفسیر ہے۔ حضرتؒ نے مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں لیکن ان سب پر قرآن مجید کا رنگ غالب ہے، حضرتؒ نے خود ایک جگہ لکھا ہے:

''میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں اس کے بعد جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اس میں قرآن مجید کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم

جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصنیفات دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے۔''(۱)

اس ذوق سے حضرتؒ کی مناسبت کا آغاز تو اسی وقت ہو گیا تھا جب والدہ صاحبہؒ اپنے مخصوص لحن میں بڑے درد وسوز کے ساتھ تلاوت فرماتی تھیں۔ حضرتؒ اپنے بچپن کے اس دور ہی میں جس پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں اس کی حلاوت محسوس فرمانے لگے تھے اور اسی وقت دل کی نرم زمین میں اس کا بیج پڑ گیا تھا۔

پھر جب خلیل عرب صاحبؒ سے عربی تعلیم کا آغاز ہوا اور فہم کی صلاحیت پیدا ہوئی تو خود حضرتؒ ہی فرماتے تھے کہ تلاوت کا ذوق پیدا ہو گیا اور اس میں مزہ آنے لگا۔ خلیل عرب صاحبؒ عربی زبان کے رمز شناس اور اس کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھنے والے استاد تھے اس کا اثر تھا کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت بڑی حلاوت اور درد کے ساتھ کرتے تھے اور اس میں سرشار ہو جاتے تھے۔

---

(۱) قرآنی افادات، ص ۳۱-۳۲

حضرتؒ کو جب انہوں نے قرآن مجید کی بعض سورتوں کا درس دیا تو حضرتؒ کے اس ذوق میں مزید جلا پیدا ہوئی پھر تو حضرت کا یہ حال ہو گیا کہ مزے لے لے کر گھنٹوں تلاوت کرتے، اس کے معانی و مفاہیم پر غور فرماتے اور اعجاز قرآنی کے سمندر میں ڈوب جاتے۔

خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی سے بھی حضرتؒ نے قرآن مجید کی بعض سورتوں کا درس لیا، اس کے بعد حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے درس میں باقاعدہ شرکت فرمائی، حضرت ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحبؒ کے مجلس درس کا فیض اور برکت شامل ہے۔" (۱)

دارالعلوم دیوبند کے قیام میں قرآن مجید کی بعض آیات اور مشکل مقامات کے سلسلہ میں حضرت مدنیؒ سے بھی استفادہ فرمایا۔

اس پورے دور میں حضرتؒ نے کم سے کم تفسیروں کی مدد لی اور براہ راست قرآن مجید سے استفادہ فرمایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرتؒ کسی مخصوص طرز فکر یا نظریہ سے متاثر نہیں ہوئے اور بلاواسطہ فہم قرآن کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ جب کسی خاص تفسیر کی مدد ہی سے قرآن مجید کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو فہم قرآن میں اس مفسر کا عکس پڑ جاتا ہے۔ مزید فرماتے ہیں:

"قرآن مجید کے فہم کا اصلی دروازہ جب کھلتا ہے جب آدمی بغیر کسی انسانی حجاب کے اس کلام کے ذریعہ صاحب کلام سے ہم کلام ہو، اسکا راستہ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت ہے اور نوافل پابندگان خدا کی صحبت جو اس کتاب سے حقیقی لذت آشنا اور حقیقت شناس ہیں اور جنکے رگ و پے میں یہ کلام بس گیا ہے، ضرورت اسکی ہے کہ پڑھنے والا اس کتاب سے براہ راست تعارف و انس حاصل کرے اور اس کو ایسا محسوس ہو کہ وہ براہ راست مخاطب ہے۔" (۲)

---

(۱) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں۔ ص ۱۸۶ (۲) قرآنی افادات۔ ص ۵۷

اور نقد حدیث اصول حدیث ورجال کی بحثوں پر مبنی تھا۔ دوسری چیز یہ کہ انکا درس عملی تھا، جس میں طالب علم استاد کے ساتھ شریک عمل ہوتے تھے۔ مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول، مذاہب کے دلائل، رجال پر نقد و جرح کی بحثیں نکلواتے تھے اور کبھی کبھی مرتب کراتے تھے، بعض مرتبہ بعض کتابوں کی شرح کا کام شروع کراتے تھے۔ اسطرح تدریس و تالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے۔"(۱)

ان کے درس میں شرکت سے حضرتؒ کے اندر حدیث کا تحقیقی ذوق پیدا ہوا، اسی زمانہ میں حضرتؒ نے ترمذی شریف پر کچھ حواشی بھی تحریر فرمائے جس کا تذکرہ تعلیم حدیث کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

دارالعلوم میں تدریس کے دوران حضرتؒ نے متعدد کتابوں کا درس دیا اور ایک سال مکمل بخاری شریف پڑھانے کا بھی آغاز ہوا لیکن نظر کی کمزوری کے باعث یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ فن حدیث میں باقاعدہ تصنیف و تالیف یا تدریس کا سلسلہ تو نہیں رہا لیکن حدیث کی اہم کتابوں کا مطالعہ جاری رہا اور حدیث کا یہ ذوق باقی رہا، اس کا کچھ اندازہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی تصنیفات یا ان کے اہتمام میں شائع شدہ حدیث کی کتابوں پر حضرتؒ کے ان مقدمات سے ہوتا ہے جو حضرتؒ نے شیخ کے اصرار و حکم پر تحریر فرمائے تھے، یہ چھ مقدمات ہیں جن میں بعض خالص فنی اور محدثانہ نقد و اصول پر مبنی ہیں اور حضرتؒ کے ذوق حدیث پر ان سے واضح ثبوت ملتا ہے۔

اخیر سالوں میں حدیث سے حضرتؒ کا اشتغال بڑھ گیا تھا۔ "مطالعہ حدیث کے اصول و مبادی" کے موضوع پر ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی۔ اخیر میں یہ بھی معمول ہو گیا تھا کہ بخاری شریف کے روزآنہ دو صفحات اپنے کسی عزیز سے سنتے تھے، اکثر یہ سعادت و خدمت مولانا عبداللہ حسنی صاحب مدظلہ کے حصہ میں آتی

---

(۱) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں۔ ص ۱۶۹-۱۷۰

تھی جو حضرتؒ کے برادر زادہ مولانا محمد الحسنی صاحبؒ کے فرزند اور حضرتؒ کے مجاز ہیں۔

حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ نے حضرتؒ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر سند عنایت فرمائی تھی، اس سند میں وسائط کم ہیں، اس اعتبار سے یہ سند بہت عالی ہے۔ پھر خود حضرتؒ کی مقبولیت و محبوبیت کا اثر تھا کہ آخری دس سالوں میں حضرتؒ سے اجازت حدیث لینے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ دارالعلوم کے اساتذہ و طلبہ نے تو یہ شرف حاصل ہی کیا، ان کے علاوہ سفر و حضر میں مختلف علاقوں کے علماء و مشائخ آکر اجازت حدیث سے مشرف ہوتے تھے، سفر حجاز میں بھی یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ متعدد ایسے علماء نے جن کو صحیحین یا ان میں سے کوئی ایک حفظ تھی، اوائل سنا کر اجازت حاصل کی۔ اجازت لینے والوں میں سے محدث شام علامہ عبد الفتاح ابو غدہ اور مظاہر علوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب مدظلہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخری سفر حجاز میں مدینہ منورہ میں شام و حجاز اور مغرب کے علماء کی ایک بڑی تعداد نے جن میں بعض شیوخ حدیث بھی تھے اجازت لی۔

ادب

ادب و تاریخ سے حضرتؒ کی دلچسپی موروثی تھی۔ والد ماجد مورخ بھی تھے اور ادیب بھی۔ دادا صاحب فارسی کے قادر الکلام شاعر اور بلند پایہ ادیب تھے۔ اردو زبان سیکھنے کی جو عمر ہوتی ہے اس میں حضرتؒ نے اردو ادب کی متعدد کتابیں پڑھ لی تھیں اور اس کا ذوق پیدا ہونے لگا تھا۔ پھر خلیل عربؒ اور ہلالی صاحبؒ کی صحبت میں عربی ادب کا چسکا لگا اور پھر حضرتؒ نے اس میں وہ کمال پیدا کیا کہ اہل زبان بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ عرب ادباء نے حضرتؒ کے ادبی ذوق اور اسلوب پر دل کھول کر داد دی اور حضرتؒ کی تصنیفات کو اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل

ومداح ہی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے حضرتؒ پر شیفتہ اور ان کی گرویدہ رہی ہے، اور پھر خود حضرت کی تصنیفات بھی "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کی مصداق ہیں جن کو دیکھ کر ہر صاحب نظر فیصلہ کر سکتا ہے۔ "گل رعنا" پر حضرتؒ نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ حضرت کے اردو ادب، تاریخ و تنقید سے واقفیت اور ذوق پر بڑی دلیل ہے۔

تاریخ

تاریخ و تذکرہ نویسی گھر کا موضوع تھا، والد صاحبؒ اور دادا صاحب کی بیشتر تصانیف اس موضوع پر شاہکار ہیں۔ خاندانی کتب خانہ میں اس موضوع پر کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی توجہ سے حضرتؒ کو اس سے دلچسپی پیدا ہوئی، پھر اپنے ذوق مطالعہ سے حضرتؒ نے اس میں تفوق و امتیاز حاصل کیا، ایک عظیم داعی کی حیثیت سے حضرتؒ نے تاریخ کا مطالعہ کیا اور اس سے وہ نتائج اخذ فرمائے جن کی طرف ایک عام مورخ کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ علامہ یوسف القرضاوی نے اپنے مضمون میں خاص طور سے حضرتؒ کے اس تاریخی ذوق اور امتیاز کا تذکرہ فرمایا ہے۔ حضرتؒ خود تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے سب سے زیادہ قرآن مجید سے مدد لی ہے اور پھر تاریخ سے، اور میں تاریخ کو قرآن مجید ہی کی تفسیر سمجھتا ہوں۔" (۱)

حضرتؒ نے اپنے دعوتی و فکری مضامین میں اس سے بہت کام لیا، تقریروں میں بھی تاریخی واقعات و حقائق پیش فرما کر اس سے اخذ کردہ نتائج کا اس خوبی سے تذکرہ فرماتے کہ ان سے مستقبل میں پیش آنے والے خطرات کا ادراک آسان ہو جاتا، پھر تاریخ کی روشنی میں اس کا حل بھی پیش فرماتے، اس سلسلہ میں حضرتؒ کو بڑی ذکاوت حس حاصل تھی اور اس میں تاریخی ذوق کے ساتھ ایمانی بصیرت بھی شامل ہو گئی تھی۔

---

(۱) قرآنی افادات۔ ص ۳۲

حضرتؒ کا یہ تاریخی ذوق بیشتر اہم تصنیفات میں نمایاں ہے ان میں بھی خاص طور پر "ماذا خسر العالم" اور "تاریخ دعوت و عزیمت" امتیاز رکھتی ہے۔

فقہی بصیرت اور وسعت قلب و نظر

حضرتؒ نے علم فقہ کی تحصیل دار العلوم ندوۃ العلماء میں مولانا شبلی فقیہ ندوی سے فرمائی تھی لیکن اس علم سے زیادہ اشتغال نہیں رہا اور کسی فقہی کتاب کی تدریس کی نوبت بھی نہیں آئی اس لئے فقہی مسائل و جزئیات بتانے یا فتویٰ دینے سے ہمیشہ احتراز فرمایا۔ اس طرح کے جتنے بھی خطوط آتے وہ دار الافتاء کے حوالہ فرمادیتے لیکن اس کے باوجود نظر بڑی وسیع تھی اور فقہی بصیرت حاصل تھی۔

مسالک فقہیہ پر سے جب اعتماد ختم کرنے کی تحریک شروع ہوئی تو حضرتؒ نے اس کا پورا دفاع کیا اور ان فقہی مسالک اور ان کے بانیوں کی مخلصانہ جد و جہد کو پوری اہمیت و عظمت کے ساتھ اجاگر فرمایا۔

اجتہاد و تقلید کے مسئلہ میں بھی حضرتؒ نے اُمت کیلئے معتدل و متوازن رائے پیش فرمائی اور اپنے بھتیجے اور عزیز رسالہ "الاجتهاد ونشأة المذاهب الفقهية" میں اس رائے کو تفصیل کے ساتھ پیش فرمایا جس میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت اور افادیت پر بھی روشنی ڈالی لیکن اس کیلئے ضروری حدود و قیود بھی متعین فرمائے۔

اس خاندان کے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان سے گہرے روابط رہے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کے عالی مرتبت صاحبزادگان سے اس خاندان کے متعدد افراد نے کسب فیض کیا۔

شاہ صاحب کے سلسلۂ تصوف میں (جو حضرت مجدد صاحبؒ سے جا کر ملتا ہے) حضرت شاہ علم اللہ کا نام بھی آتا ہے (۱) اسلئے دونوں خاندانوں میں فکری

---

(۱) واضح رہے کہ شاہ عبداللہ محدث اکبر آبادیؒ نے جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سلسلہ کے مشائخ میں ہیں پہلے حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا تھا اور سلسلہ میں داخل ہوئے تھے بعد میں ان کو براہ راست حضرت آدم بنوریؒ (خلیفہ اجل حضرت مجدد صاحبؒ) سے بھی اجازت ملی۔

کی آفاقیت وابدیت پر مکمل یقین اور اس کی دعوت پر تیار ہوا تھا، خاندان کے جن بزرگوں نے مختلف زمانوں میں یہ فریضہ انجام دیا ان میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی ذات گرامی کو امتیازی شان حاصل ہوئی۔ حضرتؒ کے برادر بزرگوار سرپرست ومربی ڈاکٹر سید عبد العلی صاحبؒ کو بھی اس فکر ونظر اور ذہن ودماغ کی وسعت وآفاقیت کا بڑا حصہ ملا تھا، پورے عالم اسلام پر ان کی نظر تھی، وہ زمانہ کے تقاضوں سے پوری طرح واقف اور اس کے نبض شناس تھے، انہوں نے حضرتؒ کی اسی انداز میں تربیت کی تھی، وہ چاہتے تھے کہ حضرتؒ دُنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کے سامنے وہاں کے حالات اور تقاضوں کو سمجھ کر دعوت دین کو بہتر سے بہتر اور جدید سے جدید تر اسلوب میں پیش کریں اور اس طرح سے پورے عالم اسلام میں تجدید دین کا فریضہ انجام دیں۔

حضرتؒ کی فکر میں جو وسعت وعالمیت اور ذہن میں جو آفاقیت نظر آتی ہے اس کی بنیاد ڈاکٹر صاحبؒ کی صحبت وتربیت ہی میں پڑ گئی تھی، پھر مطالعہ کی کثرت وتنوع مختلف عالمی اصلاحی تحریکات سے ربط وتعلق اور اعدائے اسلام کی دین دشمن تحریکوں کے بھرپور جائزے کے نتیجے میں حضرتؒ کی فکر میں جو وسعت اور واقعیت وجود میں آئی وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں۔

حضرتؒ کے آفاقی ذہن سے جو فکر سامنے آئی اس میں چونکہ زمان ومکان کی رعایت کے ساتھ اسلام کے مکمل نظام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور وسعت وجامعیت کے ساتھ اس میں پوری پختگی ہے اس لئے مختلف دینی حلقوں میں اس فکر کا استقبال کیا گیا۔ مصر کے سفر وقیام میں وہاں کی دینی تحریکات اور اداروں نے اس فکر کو نہ صرف یہ کہ قبول کیا بلکہ وہ اس کے داعی وترجمان بن گئے۔ دُنیا کے اور مختلف ملکوں میں بھی اس فکر کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور قبول کیا گیا۔

حضرتؒ کے دائرۂ فکر میں عرب بھی ہے اور عجم بھی، مشرق بھی ہے اور مغرب بھی، اس میں "تیغ وتفنگ" کی ضرورت کا اظہار بھی ہے اور "پیام انسانیت"

جیسی تحریک کی اہمیت وافادیت پر یقین بھی، ان کی فکر میں دُنیائے اسلام کے مختلف اسلامی مفکرین اور داعیوں کی فکر کا ایسا حسین امتزاج نظر آتا ہے جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہی "ندوۃ العلماء" کے بانیوں کی فکر تھی جس کا بہترین قالب حضرتؒ کی شکل میں ندوہ کو عطا ہوا تھا جن کو دیکھ کر اور سُن کر اور جن کی کتابیں اور مضامین ورسائل پڑھ کر پورے عالم اسلام میں اس فکر کی جستجو پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ عالم اسلام کے ایک بڑے حصہ میں اس کا پھریرا لہرانے لگا۔

اعتدال وتوازن

اعتدال فطرت اور سلامتِ ذوق حضرتؒ کے امتیازی اوصاف میں سے ہے جو فکرونظر سے لیکر تحریر وتقریر، دعوت وتحریک یہاں تک کہ زندگی کے ہر اجتماعی اور انفرادی عمل میں نمایاں ہے۔

عام طور پر انسانی افتادِ طبع میں یہ بات داخل ہے کہ جب وہ کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے بارے میں اس کے تصورات عالم بالا تک پہنچ جاتے ہیں، اور جب کسی چیز میں اس کو عیب نظر آتا ہے تو وہ اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور وہ پہلے سے اس کا کوئی پیمانہ تیار نہیں کرپاتا، یہ چیز ایک داعی اور مفکر کے لئے سخت مضر ہے اور اس کی دعوت وفکر کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ حضرتؒ نے اپنی پوری زندگی استفادہ سے لیکر افادہ تک اس سے اپنا دامن صاف رکھا، یہی امتیازی صفت برادر بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی بھی تھی، انہوں نے ہر چیز کا ایک پیمانہ متعین کر رکھا تھا، وہ اسی پیمانہ سے اسکو ناپتے تھے؛ وہ پیمانہ مکمل دین وشریعت کا تھا جس میں زمانہ اور حالات کی ضروری رعایت کے ساتھ دین میں پورا تصلب تھا۔ انہوں نے مختلف تحریکوں کا بھی مطالعہ کیا اور مشائخ عصر کی مجالس میں بھی شرکت کی، وہ ندوہ ودیوبند کے فیض یافتہ عالم بھی تھے اور انہوں نے ایم. بی. ایس.

ایمانی بصیرت کا نتیجہ ہیں جس کو ہم "ایمانی فراست" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ارشاد نبوی ہے "إتقوا فراسة المؤمن فإنه ينظر بنور الله" (ایمان والے کی فراست سے بچو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے)۔

حضرتؒ نے اپنی ایمانی بصیرت و فراست سے اکثر مسائل میں وہ رائے قائم فرمائی جس کی صداقت کا یقین ابتدا میں بعض مرتبہ بڑے بڑے علماء و قائدین کے لئے مشکل ہوتا تھا مگر زمانے نے اس پر مہر صداقت ثبت کردی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد حقیقت ہر ایک کے سامنے واضح ہوگئی۔ ہر مسئلہ میں حضرتؒ ابتدا ہی میں جو رائے قائم فرمالیتے اکثر وہی حقیقت بن کر سامنے آجاتی۔ حضرتؒ کی زندگی میں اس کی بیسیوں مثالیں ہیں، ان میں سے چند واقعات یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

اس کی سب سے پہلی مثال کمال اتاترک کی ہے جس کے بارے میں اس دور کے اکثر علماء و قائدین یہ سمجھتے تھے کہ وہ غازیٔ اسلام اور مخلص قائد ہے جس نے انگریزی استعمار کا مقابلہ کیا۔ حضرتؒ نے اپنے پہلے سفر ترکی سے واپس ہو کر صاف صاف یہ بات فرمائی کہ انگریزوں نے اس کو اپنا آلہ کار بنایا تھا اور حقیقتاً وہ ایک بڑا دشمن اسلام اور ترکی میں اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے والا انسان ہے۔ اس وقت حضرتؒ کی اس رائے سے لوگوں میں بڑی برافروختگی پیدا ہوئی اور حضرتؒ کو اس سلسلہ میں ہدف ملامت بھی بننا پڑا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد حضرتؒ ہی کا موقف درست ثابت ہوا اور معاہدۂ لوزان کی افتاد سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

مصری صدر جمال عبد الناصر اور عراقی صدر صدام حسین اور لیبیا کے فوجی صدر کرنل معمر قذافی کے بارے میں بھی یہی صورت حال پیش آئی اور حضرتؒ نے ابتدا ہی میں برملا اپنی رائے کا اظہار فرمایا جس سے بہت سے لوگوں کو گرانی ہوئی لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں حقیقت سامنے آگئی۔

حضرتؒ کی اسی فراست و بصیرت کا اثر تھا کہ جب تقسیم ہند کے بعد بعض ہندو لیڈروں نے ہندوستانی تہذیب اختیار کرنے کا آوازہ بلند کیا اور اس سے اسلامی

تہذیب سے دوری کا خطرہ پیدا ہوا تو حضرتؒ نے فوراً اس کو محسوس کیا اور عملی اقدام شروع فرمایا، پوری قوت کیساتھ آگے بڑھ کر اس کا مقابلہ کیا۔ اس کے لیڈروں پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنانند کو خطوط لکھے اور مسلمانوں کے تحفظ وبقاء ان کے دینی تشخص کی حفاظت کے لئے لٹریچر تیار کئے اور ان کی اشاعت کی فکر فرمائی۔ دوسری طرف "پیام انسانیت" کی تحریک شروع کی جس سے ماحول میں خاطر خواہ تبدیلی رونما ہوئی۔ حضرتؒ نے ہر طرح کی لسانی، ثقافتی، نسلی اور قومی عصبیت کی مخالفت کی جس نے سلبی رنگ اختیار کرلیا ہو۔ حضرتؒ نے دینی دعوت اور تحریک اسلامی کے سلسلہ میں الگ موقف اختیار کیا، حضرتؒ کے نزدیک حضرت مجدد الف ثانیؒ کا موقف اس عصر کیلئے زیادہ مناسب تھا کہ جس میں حکام کی دشمنی کے بجائے تفہیم اور اقناع کا راستہ اختیار کیا گیا۔(۱)

حضرتؒ کی اسی بصیرت وفراست اور حقیقت رسی سے پورے عالم اسلام کو فائدہ پہنچا بہت سے مسائل الجھنے سے پہلے ہی حل ہو گئے۔ اصلاح وتجدید کے عمل میں تیزی پیدا ہوئی اور اسلامی قائدین کی بہت سی توانائیاں ضائع ہونے سے بچ گئیں۔

دردمندی ودلسوزی

اُمت کا درد و فکر اسکے لئے دلسوزی واشک ریزی حضرتؒ کی امتیازی صفات میں سے ہے جو حضرتؒ کو اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملی تھی، پھر حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی صحبت سے اس میں مزید جلا پیدا ہوئی۔ حضرتؒ کی پوری زندگی اسی درد و فکر کی تصویر تھی۔ عالم اسلام کے حالات اور پھر اعداء اسلام کی ریشہ دوانیوں کو معلوم کر کے طبیعت بے چین ہو جاتی تھی اور دن رات اسی فکر میں گزرتے تھے کہ کس طرح "اصلاح اُمت" کا کام انجام پائے اور "انقلاب حال" ہو۔

(۱) یہ مضمون عم مخدوم معظم مولانا واضح رشید ندوی صاحب مدظلہ کے مضمون "حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور عصری مسائل" شائع شدہ "تعمیر حیات مفکر اسلام نمبر" کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

احساس ان کو تڑپاتا تھا۔ پھر ہمہ دم اسی فکر میں رہتے کہ کس طرح ان خطرات کو دور کیا جاسکے، اُمت میں بیداری اور شعور پیدا ہو اور وہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرسکے، دنیا کے اخلاقی زوال وادبار کے وقت وہ اس کے لئے اخلاقی اصولوں کی چٹان ثابت ہو۔ دنیا اس سے سبق لے اور انسانیت کی کشتی ڈوبنے سے بچ جائے۔

"اسی اضطراب وبے چینی نے ان کو گرم سفر رکھا، ان کے لئے نہ سفر کی دوری مانع ہوئی نہ صحت کی کمزوری، وہ تیغ اصیل بن کر اسلامیت ومغربیت کی کشمکش میں مغرب کی بالادستی کے خلاف نبرد آزما رہے اور مشرق ومغرب ہر چہار سو چار دانگ عالم میں دین اسلام کا پیغام سنانے کے لئے اور امت کو اس کے کھوئے ہوئے مقام پر لانے کیلئے سخت تکلیفوں کے باوجود سرگرم سفر رہے اور اخیر دم تک مصروف جہاد وتجدید رہ کر داعی اجل کو لبیک کہا۔"(۱)

حمیت دینی اور جذبۂ جہاد

دینی حمیت اور ملی غیرت حضرتؒ کو خاندان سے ورثہ میں ملی تھی، ان کی رگوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا خون گردش کررہا تھا۔ اس خاندان کے مختلف بزرگوں نے اپنے اپنے دور میں فریضۂ جہاد کو زندہ کیا تھا اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ خود حضرتؒ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کو ان کی نانی یہ لوری دے کر سلاتی تھیں۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

حضرتؒ نے عین عالم شباب میں سیرت سید احمد شہیدؒ لکھ کر جذبۂ جہاد اور دینی حمیت کو فروغ دیا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ حضرتؒ کو اسلاف میں سب سے زیادہ حضرت شہیدؒ سے محبت وعقیدت تھی اور حضرتؒ کے اصلاحی وتجدیدی کارناموں

---

(۱) توسین کی عبارت معمولی تبدیلی کے ساتھ ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب ندوی کے مضمون سے ماخوذ ہے۔ از مولانا ابوالحسن علی ندوی افکار و آثار۔ ص ۳۰۸

پر سب سے زیادہ انہی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ حضرتؒ کی ساری جد و جہد اور کاوشوں کا اصل محور اسلام کی بالادستی ہے۔ وہ صاف صاف فرمایا کرتے تھے "جب تک اسلامی قانون کی بالادستی نہ ہوگی اور باقاعدہ اسلامی نظام کو قائم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک شریعت کے بڑے حصہ پر عمل ناممکن ہے" ان کے اندر حمیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، مسلمانوں کی تذلیل اور اسلام کی بدنمائی سے وہ بے چین ہو جاتے اور راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی، اسی حمیت دینی کا نتیجہ تھا کہ وہ مسلسل عربوں کو اس پر آمادہ کرتے رہے کہ مشرکین یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکالا جائے، شاہ فیصل مرحوم اور ضیاء الحق مرحوم سے ان کو بڑی امیدیں تھیں، ان دونوں کی شہادت سے حضرتؒ پر اثر پڑا جو کسی قریبی عزیز کے حادثۂ وفات سے نہ پڑا ہوگا۔ مولانا نذر الحفیظ صاحب اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"جون ۱۹۶۷ء میں عربوں کو جو شرمناک شکست ہوئی اس سے مولانا کے دل و دماغ اور پورے اعصاب پر غیر معمولی اثر ہوا، کئی دن تک ایسی فضا رہی جیسے خاندان میں کسی قریبی عزیز کا حادثہ ہو گیا ہو، اس لئے کہ عربوں ہی سے ساری آرزوئیں انہوں نے باندھ رکھی تھیں، وہ جب کسی سے سنتے کہ اس کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی ہے تو قطعاً خوش نہ ہوتے فرماتے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تو مسلمان صرف عمرہ اور حج کے لئے جاتے ہیں، یہی تصور حجاز سے وابستہ ہے، وہ سعودی عرب کے بجائے اس مقدس خطہ کو حجاز مقدسہ سے تعبیر کرتے بلکہ پورے عالم عربی کو ایسا حرم قرار دیتے تھے جہاں صرف خدائے وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی جائے، اس پورے حصے میں وہ صرف اسلام کو جاری و ساری دیکھنا چاہتے تھے، اس لئے وہ اسرائیل کے وجود کو بہت بڑا ناسور مانتے تھے، فرماتے تھے کہ عرب قیادتوں کی کمزوری سے اسرائیل کا وجود ہے، اس کا خاتمہ اس دن ہو جائے گا جس دن تمام عربوں کے اندر جہاد کی صحیح روح بیدار ہو جائے گی۔" (۱)

(۱) ماخوذ از غیر مطبوعہ مضمون۔

حضرتؒ کی سب سے پہلی تصنیف عربی میں عالم عربی سے شائع ہوئی۔(۱) اس طرح یہ عالم عربی میں حضرتؒ کی فکر و دعوت کا نقطہ آغاز تھا اور حضرت کی مقبول ترین کتاب "ماذا خسر العالم" بھی عربی ہی میں لکھی گئی اور عالم عرب سے اس کے سو سے زائد ایڈیشن شائع ہوئے، یہ کتاب عالم عربی میں حضرتؒ کے سب سے بڑے تعارف کا ذریعہ بنی، اس کے مختلف عالمی زبانوں میں تراجم شائع ہوئے اور پورے عالم اسلام میں خاص طور پر نوجوانوں میں اسلامی بیداری پیدا کرنے میں اس نے بنیادی کردار ادا کیا۔

اس مضمون میں حضرتؒ کی تصانیف کا تعارف مقصود نہیں کہ وہ اکثر و بیشتر کتاب میں جا بجا آچکا ہے اور نہ ہی اس کا احاطہ ممکن ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے اور بڑی حد تک اس کی تکمیل مولانا سعید مرتضٰی صاحب کی نگرانی میں مولوی محمد طارق زبیر ندوی صاحب نے کر دی ہے۔ اور عربی تصنیفات کی ان کی مرتب کردہ فہرست شائع ہو چکی ہے جس میں عربی تصانیف و رسائل کی تعداد ایک سو ستر تک پہنچتی ہے جبکہ ان کی اُردو کی فہرست میں پونے تین سو کتابوں اور رسائل کے نام درج ہیں۔ دوسری زبانوں میں بھی انہوں نے حضرتؒ کی تصنیفات کے تراجم کی ڈائرکٹری تیار کی ہے۔ اس مضمون کا اصل مقصود حضرتؒ کے طریقۂ تصنیف اور اس میں انہماک کی کیفیت کا تذکرہ ہے: انہماک کا کچھ حال حضرتؒ نے خود "کاروان زندگی" میں "ارکان اربعہ" کی تالیف کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"ذہن و دماغ پر کتاب کا موضوع اس طرح طاری ہو گیا کہ دوسرے اوقات میں بھی وہ ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ یہ عرصہ سے میری زندگی میں ہر اہم تصنیف کا خاصہ بن گیا ہے اور اس کے خلاف کرنا عام حالات میں اب

---

(۱) اس سے "ترجمة الامام احمد بن عرفان الشهيد" مراد ہے۔ اس کے بارے میں تفصیل کتاب میں گزر چکی ہے۔

ممکن نہیں رہا۔ یہ ایک طرح کا تصنیفی اعتکاف ہوتا ہے جس سے نکلنا اسی وقت ہوتا ہے جب کتاب کی تائے تمت ہلالِ عید بن کر نمودار ہوتی ہے۔"(۱)

یہ چیز حضرتؒ کے معمول میں داخل ہوچکی تھی کہ صبح ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر وضوء فرماکر دو رکعت ادا فرماتے، اس کے بعد کچھ دیر تلاوت فرماتے، تلاوت کے بعد تصنیف و تالیف یا اسی جیسے کسی کام میں ایسی مشغولیت ہوتی کہ پھر اس وقت کسی چیز کی طرف توجہ نہ فرماتے۔ اس دوران کسی کا ملاقات کیلئے آنا بھی سخت ناگوار ہوتا تھا۔ اسی زمانہ کا یہ دلچسپ واقعہ ہے کہ حضرتؒ رائے بریلی میں اپنی قیام گاہ پر ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر جب بیٹھنے لگے تو چودھری عبدالمنان صاحبؒ(۲) سے فرمایا کہ "چودھری صاحب ہم کام پر بیٹھتے ہیں کوئی بھی آئے تو آنے مت دیجئے گا، حضرت خضرؑ بھی آجائیں تو عرض کیجئے کہ تھوڑی دیر انتظار فرمالیں" اتفاق کی بات کہ کام پر بیٹھنے کے بعد ہی ایک صاحب آگئے۔ چودھری صاحب نے ان کو چائے وغیرہ پلائی اور روک لیا، نام پوچھنے پر انہوں نے خضر بتایا، چودھری صاحب نے ان کو حضرتؒ کی ہدایت سنائی، اور جب کام سے فراغت ہوئی تو یہ کہہ کر ملوایا کہ حضرتؒ خضر ہی آئے تھے میں نے انکو بھی ٹھہرالیا، یہ سن کر حضرت بہت محظوظ ہوئے۔

کسی بھی موضوع پر تصنیف کے وقت حضرتؒ کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے موضوع سے متعلق مواد تلاش فرماتے، اگر مراجع کی کتابیں ذاتی ہوتیں تو نشان زد کردیتے ورنہ یکجا مواد کا املا فرماتے، مواد یکجا ہوجانے کے بعد اس کی روشنی میں کتاب تصنیف فرماتے، دورانِ تصنیف بھی مراجعت فرماتے رہتے۔

---

(۱) کاروانِ زندگی دوم۔ ص ۱۸

(۲) چودھری صاحب حضرت رائے پوریؒ کے متوسلین میں سے تھے۔ حضرتؒ سے رجوع فرمالیا تھا پھر سالوں حضرتؒ کے وطن میں تکیہ پر مقیم رہے، بڑے مرنجاں مرنج طبیعت کے آدمی تھے اور بڑے ذاکر و شاغل تھے۔

کی خوشبو سے ایک عالم معطر ہوا۔

لوگ تصوف کے نام سے متوحش تھے، حضرتؒ نے اس کی حقیقت ان لوگوں کے سامنے واضح فرمائی جو نام سننے کے روادار نہ تھے، اس کی افادیت وضرورت پر زور دیا اور دوسری طرف غلط قسم کے تصوف کا پردہ چاک کیا اور ان غلط کار صوفیوں پر ضرب لگائی جو تصوف کے پردے میں دین کو بدنام کرتے ہیں۔

تصوف کی ضرورت وافادیت پر زور دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"تزکیۂ نفس وتہذیب اخلاق کا وسیع ومستحکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم اور فن کی شکل اختیار کرلی، نفس وشیطان کے مکائد کی نشاندہی، نفسانی واخلاقی بیماریوں کا علاج، تعلق مع اللہ اور نسبت باطنی کے ذرائع وطرق کی تشریح وترتیب جس کی اصل حقیقت تزکیہ واحسان کے ماثور وشرعی الفاظ میں پہلے سے موجود تھی اور جس کا عرفی واصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں "تصوف" پڑ گیا اس اجتماعی الہام کی ایک درخشاں مثال ہے۔" (۱)

تزکیہ کیا ہے۔ رسول ﷺ نے اس پر کس طرح عمل کیا اور کیا اثرات مرتب ہوئے۔ حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں:

"تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف پڑھ کر سنادینے اور سمجھا دینے پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اس تلاوت وتعلیم کا رنگ ان پر چڑھا دیتے ہیں۔ اس کتاب وتعلیم کو ان کے کانوں اور دماغوں سے گزار کر ان کے قلوب وارواح کو رنگین کرتے ہوئے ان کے اعضاء وجوارح سے جاری کردیتے ہیں۔

اسی لئے آپ دُنیا کے سب سے کامیاب ہادی ومرشد تھے، صحابہ کی حیرت انگیز روحانی، اخلاقی، ذہنی، عملی تبدیلی اور اسلام کی ابتدائی کامیابی کا یہی راز تھا، اور آج اسی کی کمی اسلامی زندگی کے ہر گوشہ میں سب سے زیادہ

---

(۱) تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک ص ۳۹

نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔"

آگے فرماتے ہیں:

"تزکیہ کرنے والے آپ کی اُمت کے وہ اہل دل اور صاحب حال بزرگ ہیں جو آپ کے انفاس وانوار کے وارث وحامل ہیں، انبیاء کی بعثت کا مقصد پورا کرنے کے لیے اور ان کی برکات پہنچانے کے لئے تزکیہ بھی اتنا ہی ضروری کام ہے جتنی کتاب وحکمت کی تعلیم۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ تعلیم ہے وہ تربیت، اور تکمیل انسانیت کے لئے دونوں کی ضرورت ہے۔

تزکیہ کی کمی اعلیٰ تعلیم کے باوجود اسی طرح محسوس ہوتی ہے جس طرح کھانے میں نمک کی کمی اور دونوں کے نتائج میں وہی فرق ہے جو اکبر مرحومؒ نے بیان کیا ہے

ع زبان گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

روز بروز یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے کہ دین جس چیز کا نام ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ دینی تعلیم سے بھی پیدا نہیں ہوتی

ع دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اہل دل نے ہمیشہ یہ ضرورت پوری کی اور اُمت کی اصلاح میں اور دین کی خدمت میں علماء کا اچھی طرح ہاتھ بٹایا، دونوں نے مل کر رسول ﷺ کی نیابت کا فرض انجام دیا۔"(۱)

فاسد العقیدہ صوفیوں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"وہ پیشہ ور اور جاہ طلب و حقیقت فروش اور الحاد شعار اور فاسد العقیدہ نام نہاد صوفی ہیں جنہوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی و بے قیدی کی تبلیغ کرنے کے لئے تصوف کو آلہ کار بنایا اور اس کے محافظ و علمبردار بن کر لوگوں کے

---

(۱) تزکیہ واحسان ص ۱۸

میں کئے اور اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ تیرے سب حکموں کو مانیں گے، تیرے رسول پاک ﷺ کی تابعداری کریں گے۔ یا اللہ تو ہماری توبہ قبول فرما، ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہمیں توفیق دے نیک عملوں کی، رسول پاک ﷺ کی تابعداری کی۔"

یہ الفاظ کہلوانے کے بعد مختصر نصیحت فرماتے: اس میں چار چیزوں کی خاص طور پر تاکید فرماتے تھے؛ سب سے پہلے تو عقیدۂ توحید پر پورے تصلب کے ساتھ ثابت قدمی کی تلقین فرماتے۔ دوسرے اتباع سنت کا اہتمام کرنے کی تلقین ہوتی۔ تیسرے منکرات سے احتراز کی تاکید ہوتی۔ اور چوتھی چیز تسبیحات سے متعلق ہوتی جس میں عموماً تین تسبیحات کا معمول اختیار کرنے کیلئے فرماتے۔ ایک تسبیح درود شریف کی، دوسری تیسرے کلمہ کی اور تیسری استغفار کی۔

اسی کو حضرتؒ نے تفصیل کے ساتھ عزیز القدر مولوی محمود حسن حسنی ندوی سلمہٗ کے رسالہ "سلاسل اربعہ" میں مسترشدین و متعسبین کی ہدایت کے طور پر تحریر فرمایا ہے جس کو نقل کرنا یہاں فائدہ سے خالی نہیں۔

"بیعت کرنا اور سلسلہ میں داخل ہونا، کوئی رسمی اور شوقیہ چیز نہیں ہے جس کے لئے کچھ ماننا اور کرنا نہ پڑے، محض برکت یا شہرت مقصود ہو۔ یہ ایک عہد و معاہدہ ہے اور ایک نئی دینی و ایمانی زندگی کا آغاز ہے جس میں زندگی میں کچھ تبدیلیاں کچھ پابندیاں اور کچھ ذمہ داریاں ہیں۔

(۱) سب سے پہلے اور ضروری بات یہ ہے کہ بیعت اور سلسلہ میں داخل ہونا کلمہ کی تجدید اور اسلامی عہد و معاہدہ اور اللہ و رسول کے حکم کے مطابق دینی و ایمانی زندگی شروع کرنے اور اسی کے مطابق زندگی گزارنے کا قصد و ارادہ اور عہد و معاہدہ سمجھا جائے۔

(۲) سب سے ضروری بات یہ ہے کہ عقیدہ درست اور پختہ کیا جائے اور اس بات کا اقرار اور اس پر ایمان ہو کہ اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں

جلانے اور مارنے، صحت اور شفا دینے، اولاد دینے، روزی دینے اور قسمت اچھی بری کرنے کا اختیار نہیں ہے اور اس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق نہیں، نہ اس کے سوا کسی کے سامنے سجدہ کیا جاسکتا ہے، نہ بندگی کی کوئی شکل اختیار کی جاسکتی ہے، نہ حاجت روائی اور مشکل کشائی کا سوال کیا جاسکتا ہے۔

(۳) سید المرسلین وخاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا آخری نبی، ذریعۂ ہدایت، وسیلۂ شفاعت اور سب سے زیادہ محبت واتباع وپیروی کا مستحق سمجھا جائے، اور زیادہ سے زیادہ آپؐ کی سنتوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے اور دینی ودنیوی زندگی میں آپؐ کی ہدایات آپؐ کے معمول اور دستور پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپؐ کی سیرت پاک کے مطالعہ کا اہتمام کیا جائے اور آپؐ کی احادیث کے مجموعوں اور سیرت کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے۔

(۴) زندگی کو اسلامی قالب میں ڈھالنے اور صحیح مقاصد زندگی معلوم کرنے کے لئے راقم کی کتاب "دستور حیات" کو مطالعہ میں رکھا جائے، نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے مواعظ وملفوظات کا مطالعہ کیا جائے۔

(۵) سب سے اہم فریضہ اور ضروری چیز نمازوں کو اپنے وقت پر پڑھنا اور اہتمام اور سنتوں کو پابندی کے ساتھ ادا کرنا ہے، اس میں غفلت اور تساہلی کی تلافی کوئی چیز نہیں کرسکتی، نمازیں جماعت کے ساتھ حتی الامکان مسجد میں ادا کی جائیں، مستورات ان نمازوں کو اپنے وقت پر پڑھنے کی کوشش کریں جو عام طور پر کاموں کی مصروفیت اور ذمہ داریوں کی وجہ سے فوت ہو جاتی ہیں یا ان کا وقت نکل جاتا ہے۔

(۶) دینی ودنیوی دونوں کاموں میں ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت کی مشق کی جائے، اخلاق ومعاملات اور زندگی کے معمولات میں بھی اس کا

فحش بات فرماتے اور نہ بازاروں میں چلاکر (خلاف وقار) باتیں کرتے، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معاف فرمادیتے تھے اور اس کا ذکر بھی نہ فرماتے تھے۔ آپ ہمیشہ خندہ پیشانی اور خوش خلقی کے ساتھ متصف رہتے تھے یعنی چہرۂ انور پر بشاشت اور تبسم کا اثر نمایاں رہتا تھا۔ آپ نرم مزاج تھے یعنی کسی بات میں لوگوں کو آپ کی موافقت کی ضرورت ہوتی تھی تو آپ سہولت سے موافق ہو جاتے تھے۔ نہ آپ سخت گو تھے اور نہ سخت دل...... نہ عیب گیر کہ دوسروں کے عیب پکڑیں نہ کسی کی مذمت فرماتے تھے، نہ کسی کو عیب لگاتے تھے۔ نہ کسی کے عیب تلاش فرماتے تھے۔"

جن لوگوں کا حضرت مولانا سے ربط و تعلق اور ملنا جلنا رہا ہے وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے کہ حضرت مولانا نے نبی اکرم ﷺ کے ان تمام اوصاف حسنہ اور صفاتِ حمیدہ کو ایسا اپنالیا تھا کہ وہ اسوۂ نبوی کی عملی تفسیر بن گئے تھے۔ اللهم ارحمه واكرم نزله وارفع درجاته وأدخله فسيح جناته." (۱)

ہر ایک کے لئے خیر خواہی حضرتؒ کے مزاج میں داخل تھی، ہر آنے والے سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے اور اس کی تواضع فرماتے۔ چھوٹوں کے ساتھ بھی وہ اخلاق برتتے کہ بعض مرتبہ خوش گمانی ہونے لگتی۔ اگر کوئی بدخواہ بھی ہوتا تو اس کے ساتھ بھی بہتر سے بہتر معاملہ فرماتے۔ وہ لوگ جنہوں نے بدکلامی کی یا ہمیشہ تنقید ہی ان کا وطیرہ رہا ان کے ساتھ بھی حسن سلوک فرماتے رہے۔ ابتدائی دور کے تعلق والوں کا خاص طور پر لحاظ فرماتے رہے، ان میں سے کوئی بدگمان بھی ہوا تو حضرتؒ کے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا، اسی طرح بلکہ کچھ بڑھ کر ہی اس کے ساتھ معاملہ کرتے رہے۔ خود ہی ملاقات کے لئے تشریف لے جاتے اور اس کے عدم التفات کو بھی درگذر فرماتے۔

---

(۱) افکار و آثار ص ۴۴۵-۴۴۶

تعلق والوں کی خبر گیری فرماتے رہتے، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے اور حالات دریافت فرماتے رہتے۔ ہر تعلق والے کو خیال ہوتا تھا کہ حضرتؒ کو اسی سے سب سے زیادہ محبت ہے۔ ہر شخص خدمت کا موقع تلاش کرتا اور اس کو اپنے لئے سعادت سمجھتا لیکن حضرتؒ اس کے ممنون ہوتے اور اس کا اظہار بھی فرمادیتے۔ اپنے مخصوص خدام کے سامنے بھی اس کو ظاہر فرمادیتے۔ اپنی ذات کے لئے کبھی کسی کو کچھ نہ کہتے، غلطی بھی ہو جاتی تو چشم پوشی فرماتے۔ حضرت انسؓ رسول اللہ علیہ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "میں نے دس سال خدمت کی جو کام میں نے غلطی سے کرلیا آپؐ نے کبھی نہیں فرمایا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ اسی طرح اگر کوئی کام رہ گیا تو آپؐ نے کبھی نہیں فرمایا کہ یہ تم نے کیوں نہیں کیا؟" رسول پاک علیہ کے ایک سچے اُمتی اور عاشق صادق کے بارے میں عاجز وناکارہ جس کو سالوں خدمت کا شرف حاصل ہوا یہ گواہی دیتا ہے کہ حضرتؒ نے کبھی کسی ایسی غلطی پر نہیں ٹوکا جو حضرتؒ کی راحت و آرام سے متعلق ہو، بیشک اگر دین کا مسئلہ ہوتا تو نکیر فرماتے اور چہرہ پر غصہ کے آثار ظاہر ہو جاتے، مگر اپنی ذات کے لئے کبھی کسی نے حضرتؒ کو غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا۔

بعض اہل قلم نے حضرتؒ پر اخبار اور رسائل میں اگر تنقید کی تو حضرتؒ نے اپنے اہل تعلق کو منع کردیا کہ اس کا جواب دیں چہ جائیکہ خود جواب دیں، اور نجی مجلس میں بھی ان پر تنقید کی اجازت نہیں دی، اگر کسی نے تعلق کی خاطر کچھ کہا تو منع فرمادیا۔

خادم خاص حاجی عبدالرزاق صاحب کی کسی شدید مشغولیت کی بنا پر یہ عاجز ہی حضرتؒ کی دواؤں کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ روزانہ رات کو سوتے وقت دوا پابندی سے دی جارہی تھی۔ ایک مرتبہ وہ ختم ہوگئی دن میں اس خادم کے ذہن سے بات نکل گئی، رات کو سوتے وقت جب دوا دینے کا وقت آیا تو اچانک یاد آیا، خادم سخت شرمندہ تھا اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اچانک

میں تحریر فرمایا ہے کہ "کسی کا دل دکھانا ان کے مذہب میں کفر تھا۔" بعینہ یہی صورتحال ان کے فرزند عالی مرتبت حضرت مولانا کی تھی۔ اس میں بنیادی حصہ حضرت کی والدہ ماجدہؒ کی تربیت و نگہداشت کا ہے جن کے بارے میں حضرتؒ نے خود ہی کاروانِ زندگی میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"دوسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور اس میں غیر معمولی محبت و شفقت حارج نہ ہوتی تھی کہ اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی، ناانصافی کرتا، حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا تو وہ نہ صرف مجھ سے معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جوڑواتیں، اس میں مجھے کتنی ہی اپنی ذلت اور خفت محسوس ہوتی مگر وہ اس کے بغیر نہ مانتیں۔ اس کا مجھے اپنی زندگی میں بہت فائدہ پہنچا، اور ظلم و تکبر و غرور سے ڈر معلوم ہونے لگا اور دل آزاری اور دوسروں کی تذلیل کو کبیرہ گناہ سمجھنے لگا، اس کی وجہ سے مجھے اپنی غلطی کا اقرار کرلینا ہمیشہ آسان معلوم ہوا۔" (۱)

حضرتؒ کا حال یہ ہو گیا تھا کہ خود چاہے دل پر بیت جائے اور کوئی بھی تکلیف پہنچے لیکن دوسروں کا غایت درجہ پاس و لحاظ تھا، ان لوگوں کے ساتھ بھی حسن سلوک فرماتے جو درپے آزار رہتے۔ بعض جلسوں یا محفلوں میں شرکت طبیعت پر بہت بار ہوتی لیکن محض دوسروں کی طیب خاطر کے لئے شرکت فرماتے۔ شدید مصروفیت اور ضعف و علالت کی زمانہ میں بھی اس کا لحاظ رہا۔ معمولی جلسوں کے لئے بعض لوگ براہ راست پروگرام طے کرلیتے اور حضرتؒ ان کی خاطر منظور فرما لیتے۔ اخیر عمر میں بعض قدیم تعلق والوں سے حضرتؒ کو بڑی اذیت پہنچی مگر کبھی بھی حضرتؒ نے کسی کے بارے میں ایک حرف زبان سے نہیں نکالا اور ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے رہے، اگر کوئی دوسرا کبھی کچھ کہہ بھی دیتا تو ناگوار ہوتا۔ ان

---

(۱) کاروانِ زندگی اوّل۔ ص ۸۱

کی مجلس حلم ووقار سے تعبیر تھی، اس میں نہ کبھی کسی کی عیب جوئی ہوتی اور نہ کسی پر تبصرہ ہوتا اگر کوئی اس طرح کا ذکر چھیڑ بھی دیتا تو گفتگو کا رُخ بدل دیتے۔

معاصرین کا بڑا پاس ولحاظ فرماتے اور ان کی دلجوئی کا خیال رکھتے، اسی طرح بزرگ زادوں کا بھی بڑا احترام تھا، ان میں سے کوئی چھوٹا بھی آجاتا تو اس کی دلداری فرماتے۔

دوسروں کی دینی وعلمی خدمات کا پورا اعتراف تھا، ہر ایک کے کام کی قدر فرماتے اور دل کھول کر داد دیتے، اس میں چھوٹے بڑے "اپنے" اور "غیر" کا کوئی فرق نہیں تھا۔

حضرتؒ کے ابتدائی دور کے شاگرد اور نصف صدی سے زائد عرصہ تک حضرت کے رفیق ومعتمد علیہ مخدومی مولانا عبداللہ عباس ندوی مدظلہ حضرتؒ کے اس وصف کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"کسی فرد یا جماعت کے خلاف سازش، لوگوں کو کسی کے خلاف ابھارنا، پارٹی بنانے اور دوسروں کی پارٹیوں کو گرانے یا بے وقعت دکھانے کی سعی تو بڑی چیز ہے کبھی اشارتاً و کنایتاً بھی اس کا دور سے یا نزدیک سے اظہار مولانا کی عقلیت سے بہت دور ہے: ایک مثال نوک قلم پر آگئی ہے اس کو اس لئے بھی لکھ رہا ہوں کہ بات کا رخ چھپا ہوا نہیں بلکہ کھلا ہوا ہے۔ کانپور سے ایک روزنامہ نکلتا ہے اس کے ایڈیٹر ومالک کہنے کو دیوبند کے فارغ تھے مگر ریش وفش سے آزاد، ایک تاجر وضع کے آدمی تھے، ان کو مولانا سے للّٰہی بغض تھا بلکہ الرجی تھی، موقع بے موقع اپنی کدورت کا اظہار کرتے رہتے تھے، ان کا انتقال ہوا تو مولانا اس وقت بمبئی میں تھے، یہ ناچیز مکہ مکرمہ میں تھا، مجھ سے فون پر گفتگو ہو رہی تھی فرمایا ------ کا انتقال ہو گیا ہے، ان کے لئے دعائے مغفرت کرنا۔

ایک اور صاحب جو مشہور صاحب قلم ہیں، ان کے زیادہ اوصاف گنانے

سلسلہ جاری تھا، شاہ فیصلؒ سے ملاقاتیں ہوئیں، شیخ عمر بن حسن آل شیخ اور دوسرے اہم علماء حضرتؒ کے گرویدہ ہوئے لیکن حضرتؒ کے استغناء کا وہی حال تھا۔ حجاز کے دوسرے سفر میں قیام معمولی رباط میں تھا اور کھانا بھی صرف ایک وقت ہوتا تھا۔

مخدومی مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی نے جو اس سفر میں رفیق بھی تھے اس زمانہ کا حال اور حضرتؒ کے استغناء کے بعض واقعات اپنی کتاب "میر کارواں" میں تحریر فرمائے ہیں، یہ ایک شب و روز کے رفیق کی شہادت ہے اس لئے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"اس زمانہ میں رباط میں جہاں بڑے لوگ عام طور سے جایا بھی نہیں کرتے، مولانا سے ملنے کے لئے امام حرم شیخ عبدالرزاق حمزہ، مشہور ادیب وصاحب قلم استاذ احمد عبدالغفور عطار، شیخ عبدالقدوس انصاری (المدیر المنہل)، سید علی حسن فدعق (مفتش مالیات) اور اسی قبیل کے لوگ آیا کرتے تھے۔ ایک روز خود شیخ عمر بن حسن بھی ناشتہ میں شریک ہوئے، اس زمانہ میں شیخ عمر کا درجہ وہی تھا جو آج کل شیخ عبدالعزیز بن باز کا ہے، ملک فیصل کے ماموں ہوتے تھے، آل شیخ میں تھے، ھیئۃ الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر کے رئیس اعلیٰ تھے، ملک سعود مرحوم کے ساتھ طواف و سعی میں ساتھ رہتے تھے، ان کا رباط میں آنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی گورنر کسی جھونپڑے میں قدم رنجہ فرمائے۔ شیخ عمر بن حسن آل شیخ نے مولانا کے چند رسائل "بين الصورة والحقيقة، بين الانسانية وأصدقائها، بين الهداية والجباية" دیکھے تھے اور إلى ممثلي البلاد العربية بھی پڑھ چکے تھے، اس وقت تک ماذا خسر مصر سے چھپ کر نہیں آئی تھی، انہوں نے ایک روز مجھ سے حرم میں فرمایا کہ صبح میرے پاس آنا، ان کے حکم کے مطابق حاضر ہوا تو ایک تھیلی سونے کی گنیوں سے بھری دی اور کہا کہ شیخ

ابوالحسن کو پہنچا دو۔ اس زمانہ میں نوٹ کا چلن نہیں ہوا تھا، یا تو چاندی کے ریال چلتے تھے یا چالیس ریال کی قیمت کی ایک طلائی گنی (جس کو جنیہ سعودی کہا جاتا تھا) میں نے ایک تھیلی سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی، اس کو لے کر ایک طرح کی خوشی کے ساتھ رباط آیا، حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کی، غالباً ۴۵ منٹ یا ایک گھنٹہ بعد مولانا نے ایک خط لکھا اور تھیلی کے ساتھ مجھے دے دیا کہ شیخ کو دے آؤ۔ اس خط میں شکریہ کے جذبات اور احترام کے اظہار کے بعد یہ لکھا تھا کہ "ہدیہ قبول ہے اور میں نے ایک گنی اپنے ذاتی خرچ کے لئے رکھ لی ہے، بقیہ واپس کر رہا ہوں"۔ (بقیہ ۳۹ گنیاں) میں یہ خط اور رقم لے کر گیا تو شیخ ظہر کے بعد آرام کر رہے تھے، ملاقات نہ ہو سکی، بعد عصر گیا تو وہاں پورا ہال بھرا تھا، قہوہ کا دور چل رہا تھا، سلام کر کے خط اور رقم کی تھیلی حاضر کی، شیخ نے پہلے خط پڑھا پھر اسے آواز سے پڑھ کر سب کو سنایا، ایک صاحب نے کہا علماء سلف کے نمونے ہر زمانہ میں مل جاتے ہیں، ایک اور صاحب بولے "لا تزال امة محمد علی خیر" (رسول اللہ ﷺ کی اُمت میں ہمیشہ خیر رہا ہے) پچاس برس پہلے کی بات ہے ان لوگوں نے نجدی لہجہ میں اور کیا کہا یاد نہیں، لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کے اس استغناء سے ہندوستان کے علماء کا وقار بڑھ گیا اور محسوس کیا گیا کہ سب یکساں نہیں ہوتے۔ میں سمجھا تھا کہ بات ختم ہو گئی مگر عرصہ دراز کے بعد شیخ عمر بن حسن کے برادر زادہ شیخ حسن بن عبداللہ آل شیخ (جو بعد میں وزیر تعلیم ہوئے اور پھر وزیر تعلیم اعلیٰ ہوئے) سے بیروت میں استاذ عبداللہ الغنیم کے مکان پر ملاقات ہوئی تو انہوں نے مولانا کی خیریت معلوم کی، اور اس واقعہ کو میری موجودگی میں عبداللہ الغنیم کو سنایا۔ اسی زمانہ کا دوسرا واقعہ امیر سعود الکبیر (بادشاہ کے چچا) کے ہدیہ کا ہے، موصوف نے مولانا اور ان کے مرافقین کی دعوت کی۔

امتیازات میں سے ہے، اس میں حضرتؒ کے زہد واستغنا، خودی اور خودداری کا بنیادی حصہ ہے، حضرتؒ نے جس زاہدانہ شان کے ساتھ دنیا برتی وہ آپ اپنی مثال ہے، عربوں سے حضرتؒ نے صرف دعوتی ربط رکھا، مدارس و دینی اداروں کے لئے بھی عربوں سے چندہ کی اپیل کرنا اور دست سوال دراز کرنا حضرتؒ کے لئے بہت شاق تھا، اسی کمال زہد کا نتیجہ تھا کہ حضرتؒ نے پوری جرأت وقوت کے ساتھ وہاں کے سربراہان مملکت کو بھی خطاب فرمایا، اور ان کی حمیت کو بیدار کرنے کی کوشش کی، صاف صاف خطرات سے آگاہ فرمایا، اور ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی فرمائی، شاہ فیصلؒ سے لے کر شاہ فہد تک ہر ایک کو حضرتؒ نے براہ راست ملاقاتوں میں بھی اور مراسلت کے ذریعہ سے بھی حقائق سے آگاہ فرمایا، اور حرمین شریفین کی تولیت کی نسبت سے ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں، دوسرے عرب فرمانرواؤں کے سامنے بھی حضرتؒ نے کھل کر گفتگو کی۔ ان مختلف واقعات کا تذکرہ کتاب میں جستہ جستہ آچکا ہے۔ اپنے ملک میں اپنے اپنے وقت کے وزراء اعظم اور اعلیٰ عہدہ داروں کے سامنے بھی حضرتؒ نے بلا کسی تردد کے حقائق واضح فرمائے۔ صدر ناصر کے خلاف جب حضرتؒ نے مسلسل لکھنا شروع کیا تو ناصر نے ہندوستانی وزیر اعظم مسٹر نہرو کو توجہ دلائی کہ وہ شیخ ابوالحسن پر پابندی لگائیں، نہرو جی نے بدرالدین طیب جی کو اس پر مامور کیا، دہلی کے ایک سفر میں طیب جی سے ملاقات ہوئی، طیب جی نے اپنا مدعا کہا اور نہرو جی کا پیغام پہونچایا، حضرتؒ نے صاف انکار کر دیا۔ ایمر جنسی کے زمانہ میں اندرا گاندھی کے سامنے حضرتؒ نے جس جرأت کے ساتھ گفتگو کی اس کا تذکرہ بھی کتاب میں آچکا ہے، پھر راجیو جی کے دور میں شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں بار بار ان سے ملاقاتیں ہوئیں، اسی دوران حضرتؒ کو معلوم ہوا کہ وہ شائد اس مسئلہ کے لئے اسلامی ملکوں میں وفود بھیجنا چاہتے ہیں، حضرت نے ان کے سامنے پوری جرأت کے ساتھ گفتگو فرمائی، پوری حکمت کے ساتھ اور مثبت پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے حضرتؒ نے ان سے فرمایا کہ "اسلامی دنیا میں

اپنے ملک کا بڑا وقار ہے، جو بات یہاں کے علماء کہتے ہیں وہ بڑی قدر کے ساتھ سنی جاتی ہے، اگر کوئی آپ سے کہے کہ اسلامی ملکوں میں اس کی نظیر تلاش کی جائے تو اگر کوئی ایک مرتبہ انکار کرتا ہے تو آپ سو مرتبہ انکار کریں کہ یہ اس ملک کی توہین ہے۔" حضرتؒ کے سامنے اصل مقصود احقاق حق ہوتا تھا، اپنی شخصیت کا اظہار اور بے جا جرأت و بیباکی کے ساتھ گفتگو حضرتؒ کو سخت ناپسند تھی۔

اس کا ایک دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو رائے عامہ کے خلاف بھی حضرتؒ نے بیان دیا۔ انہوں نے کبھی مقصد سے ذرا بھی انحراف نہیں کیا، خواہ بادشاہ وقت کے سامنے حقائق بیان کرنے ہوں، یا رائے عامہ کے خلاف آواز لگانی ہو، انہوں نے اس سے گریز نہیں فرمایا۔

جود و سخا

سخاوت اور داد و دہش حضرتؒ کے مزاج میں داخل تھی، کوئی سائل محروم نہیں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ آنے جانے والوں کو بھی عنایت فرماتے رہتے تھے۔ مخصوص تعلق والوں کو بھیجتے رہتے۔ رمضان المبارک میں تو معلوم ہوتا تھا کہ "الریح المرسلة" کا مصداق ہیں، تیز ہوا سے زیادہ ان کی سخاوت ہوتی۔ قیمتی سے قیمتی تحائف آتے، اسی وقت ان کو تقسیم فرمادیتے۔ اہلیہ محترمہؒ کی بھی یہ امتیازی خصوصیت تھی کہ کتنی ہی قیمتی چیز ہو وہ فوراً تقسیم کردیتیں، ان کی حیات میں حضرتؒ کا معمول یہی تھا کہ تکیہ پر جو تحائف آتے وہ گھر بھجوادیتے اور اہلیہ صاحبہؒ کے ذریعے انکو تقسیم کردیا جاتا۔ ان کی وفات کے بعد بڑا حصہ باہر ہی تقسیم کردیا جاتا، کچھ بڑی ہمشیرہ صاحبہ کو بھجوادیتے جس کو وہ تقسیم فرمادیتیں۔

متعدد مرتبہ مختلف لوگوں نے کاریں ہدیہ میں پیش کیں وہ سب حضرتؒ نے دارالعلوم کو عنایت فرمادیں، کبھی کوئی چیز اپنے پاس نہیں رکھی۔ خدام ضرورت سمجھ کر کبھی معمولی چیزیں روک لیا کرتے تھے جو آنے والے مہمانوں پر صرف ہوتی تھیں۔

"اس سال کی خصوصیت جس کو الطاف خداوندی میں شمار کیا جا سکتا ہے جو ایک مقبول و مخلص بندہ کی وجہ سے نصیب ہوئی یہ تھی کہ شیبی صاحب (کلید بردار خانہ کعبہ) نے جن سے پہلے سے کوئی تعلقات نہ تھے، اس سفر کے ایک ہمراہی کو خود خانہ کعبہ کے داخلہ کی دعوت دی اور اس کی اجازت دی کہ جن لوگوں اور ہمراہیوں کو وہ ساتھ لانا چاہیں لائیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت کی ضیافت تھی۔ اس صلائے عام سے پورا فائدہ اٹھایا گیا اور نہ صرف اس قافلہ کے ہمراہیوں نے بلکہ بہت سے دوسرے احباب اور غیر متعلق ساتھیوں نے بھی نہایت اطمینان کے ساتھ کسی ناجائز و مکروہ وسیلہ (بخشش وغیرہ) کو اختیار کئے یا کشمکش کے بغیر داخلہ کا شرف حاصل کیا اور اطمینان سے جوف کعبہ میں نوافل پڑھے، بعض ساتھی چونکہ رہ گئے تھے، دوسرے دن شیبی صاحب نے ازراہ کرم دوبارہ اجازت دی اور انتظام کیا اور پھر حضرت کی معیت میں دوبارہ حاضری ہوئی۔ اور اطمینان سے نوافل و دعا کا موقع ملا اور اس طرح سے ضعفاء اور نااہل بھی اس شرف سے سرفراز ہوئے۔

مور مسکیں ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد

دست برپائے کبوتر زد وناگاہ رسید"(۱)

بعض رفقائے سفر و خدام جو اس سے پہلے بھی مکہ معظمہ حاضر ہوئے تھے اور اس کے بعد بھی متعدد بار ان کو یہ شرف حاصل ہوا لیکن کبھی اس سہولت اور خوبی کے ساتھ داخلہ کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کو حضرتؒ کے اس سفر کی برکت اور اللہ تعالیٰ کا انعام خصوصی سمجھتے ہیں۔(۲)

حضرتؒ کے بعض متوسلین اپنے حالات و کیفیات اور ادراک کا تذکرہ کرتے لیکن حضرتؒ صاف صاف فرما دیتے کہ ہمیں تو احساس نہیں ہوتا۔ متعدد

---

(۱) ملاحظہ ہو سوانح حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ باب "بے نفسی و فنائیت"

(۲) حوالہ مذکورہ

مرتبہ ایسا ہوا کہ محترمی صوفی انیس صاحب انبہوٹوی مرحوم نے (۱) مجلس میں حضرتؒ ہی سے متعلق ایسی کوئی بات شروع کردی تو حضرتؒ کو ناگوار ہوا اور حضرتؒ نے فوراً ان کو منع فرمادیا۔

معاصر مشائخ و علماء کے ساتھ اسطرح معاملہ فرماتے جیسے مشائخ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان سے خاندانی نسبت رکھنے والوں اور چھوٹوں کے ساتھ بھی بڑے اکرام کا معاملہ فرماتے، خود اس ناکارہ نے مشاہدہ کیا کہ ایک معاصر شیخ کی وفات کے بعد جب ان کے صاحبزادہ حضرتؒ کی زیارت و ملاقات کے لئے آئے تو حضرتؒ نے ان کو باصرار اپنی مسند پر بٹھایا اور خود ان کے سامنے دوزانو بیٹھ گئے۔

چھوٹوں کے سامنے بھی پاؤں دراز کرنا پسند نہیں تھا، سخت تکلیف اور ضعف کے زمانہ میں بھی اس کا خیال رہتا تھا، مجبوراً اگر ایسا کرنا پڑتا تو حاضرین مجلس سے معذرت فرماتے۔

ساری عمر شاید ہی کسی نے حضرتؒ کو چہار زانو بیٹھے دیکھا ہو، چالیس چالیس سال تک خدمت کرنے والے اس کے گواہ ہیں کہ حضرت کو اس طرح نشست کے ساتھ کسی نے نہیں دیکھا۔

بزرگوں کی خدمت میں ہمیشہ دوزانو بیٹھتے، کئی کئی گھنٹہ بھی نشست ہوتی تو بھی پہلو بدلتے لوگوں نے نہیں دیکھا۔ معاصر مشائخ میں سے کوئی آجاتا تو بھی مجلس میں دوزانو ہی تشریف فرما رہتے۔ ضعف اور ٹانگوں کی تکلیف کے باوجود اخیر تک اس وضع میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اللہ جل شانہ کے دربار میں ہمیشہ اپنی عاجزی و احتیاج مستحضر رہتی اور بڑے درد کے ساتھ زبان مبارک سے "مولای انی الیٰ فضلک لفقیر" فرماتے رہتے،

---

(۱) صوفی انیس صاحب مرحوم صاحب حال بزرگ تھے۔ حضرت رائے پوریؒ سے بیعت کی تھی اور خدمت میں رہے تھے، پھر حضرت رائے پوریؒ ہی کے حکم سے حضرتؒ کے ساتھ ساری عمر گزار دی، حضرتؒ کے عاشق صادق اور فدائی تھے، حضرتؒ نے ان کو اجازت اور خلافت بھی مرحمت فرمائی تھی۔

حضرتؒ کے کاموں کو جاری فرمادیا اور لوگوں کے قلوب متوجہ فرمادیئے یہ حضرتؒ کے اخلاص کی برکت ہے۔

جامعیت

حضرت والا نور اللہ مرقدہ کی سب سے زیادہ ممتاز صفت ان کی جامعیت اور اعتدال ہے جس میں وہ اپنے اقران ہی میں نہیں بلکہ تاریخ اسلام میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اصلاح و تجدید کی تاریخ کا صرف مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کے رنگا رنگ پھولوں سے عطر کشید کر کے ایسا مجموعہ تیار فرمایا جس کی خوشبو سے ہر خاص و عام نے فائدہ اٹھایا، وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، انہوں نے زمانہ کو نیا اسلوب دیا، اسلامی فکر کو نیا قالب عطا کیا، انہوں نے وہ طریقۂ دعوت اختیار کیا جس میں ہر صاحب فکر و نظر کے لئے پیغام ہے جو دلوں کو اپیل کرنے والا اور اپنی طرف متوجہ کرنے والا ہے۔

ان کی ذات میں امام احمدؒ کی عزیمت، امام غزالیؒ کی علو ہمت، امام ابن جوزی کی حمایت سنت، شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی دردمندی اور اخلاص و تاثیر کی جھلک نظر آتی ہے، وہ ایک طرف امام ابن تیمیہؒ کی طرح توحید کے علمبردار نظر آتے ہیں تو دوسری طرف انہوں نے شیخ اکبرؒ کے علوم و معارف میں غواصی کی ہے، ان کے اندر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی حکمت، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی بصیرت و فراست، حضرت سید احمد شہیدؒ کے جذبۂ دعوت و جہاد کا ایسا حسین سنگم نظر آتا ہے جو مصلحین و مجددین کی تاریخ میں نایاب نہیں لیکن کمیاب ضرور ہے۔ وہ ایک طرف صاحب دل شیخ و مرشد بلکہ دلوں کی انجمن کے میر انجمن ہیں تو دوسری طرف پورے ایک دبستان فکر کے بانی و مؤسس ہیں۔ یہ ان کا امتیاز ہے کہ وہ دل کے ساتھ دماغ کو بھی ایمانی طاقت و حرارت سے بھرپور دیکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ بھی ان کی امتیازی صفت ہے کہ وہ دل کے راستے دماغ تک پہنچتے ہیں اور اس کو متاثر کرتے

ہیں، اور جو چیز دل کے راستے سے دماغ تک جاتی ہے اس کے نقوش گہرے اور موثر ہوتے ہیں۔ پروفیسر خو۔ شید احمد صاحب نے حضرتؒ کے اس امتیاز کو اپنے مضمون میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا علی میاں دل کے راستے سے فکر و عمل کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور روح کو تازگی فراہم کرتے ہیں۔"(۱)

حضرتؒ نے ہر طبقہ کو متاثر کیا اور ہر ایک کی تشنگی کو دور کیا، اہل صدق وصفا کو فکر و شعور کی بالیدگی عطا کی اور اہل فکر و نظر کو قلب و روح کی تازگی فراہم کی۔

یہ بھی حضرتؒ کی جامعیت ہے کہ مختلف تحریکوں، اداروں اور جماعتوں یہاں تک کہ مختلف الفکر اور مختلف الخیال افراد کو انہوں نے ایک نقطۂ وحدت دیا، اس میں حضرتؒ کی وسعت فکر، وسعت قلب، اعتدال اور سلامت ذوق کا بنیادی حصہ ہے، انہوں نے فروعی فروگذاشتوں اور جزوی اختلافات کو موضوع سخن نہیں بنایا اور ہر کام کرنے والے کی پوری قدر کی، وہ معلم بھی تھے اور مصنف بھی، تحریر و تقریر پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی تاہم ان کا اصل موضوع تصنیف و تالیف تھا، دعوت و اصلاح ان کی زندگی کا عنوان تھا لیکن اس کے ساتھ علم کی پختگی اور گہرائی اور مختلف علوم میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب اپنے بلیغ اسلوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا ابوالحسن علی ندوی کی اپنی شخصیت بھی خود ان کے اسلوب کی طرح مختلف پھولوں کا عطر مجموعہ تھی: اہل دل کے دنوں کی تپش، شبوں کا گداز، شعر و ادب کے قلم کا ساز، اہل فکر و علم کا ذوق جستجو اور مجاہدین کی روح عمل یہ سب کچھ ان کی ذات میں اس طرح جمع ہو گیا کہ ان کی اپنی شخصیت سب سے منفرد اور سب سے ممتاز ہو گئی، اس میں جامعیت بھی ہے اور اعتدال بھی ہے، جمال بھی ہے اور کمال بھی ہے، وہ بے ہمہ بھی ہے اور باہمہ

---

(۱) ماہنامہ تعمیر حیات مفکر اسلام نمبر۔ ص ۳۵۱

حضرتؒ نے اس کو نہ صرف یہ کہ محسوس فرمایا بلکہ اس کے لئے سراپا عمل بن گئے، جگہ جگہ اس کی نشستیں ہوئیں اور آہستہ آہستہ وہ اہل قلم اور ادباء جو اس الحاد کا شکار ہو رہے تھے مانوس ہونا شروع ہوئے اور عالم اسلام میں ان کی بڑی تعداد اس خطرہ سے بچ گئی۔

ملکی سطح پر حضرتؒ کا سب سے بڑا تجدیدی عمل یہ ہے کہ پوری ملت اسلامیہ ہندیہ جو خطرہ میں پڑ گئی تھی اور ملک میں اس کا تحفظ دشوار تر ہوتا جارہا تھا حضرتؒ نے اس کے تحفظ کے لئے مناسب اور ضروری اقدامات فرمائے اور اپنے رفقاء کے تعاون سے اس ملک میں تحفظ ملت کا فریضہ انجام دیا؛ تقسیم ملک کے بعد قومیت کی جب تحریک چلی تو حضرتؒ نے اس کے لئے ضروری اقدامات فرمائے، پھر حضرتؒ کی سرپرستی اور تحریک سے "دینی تعلیمی کونسل" اور "ندوۃ العلماء" کے پلیٹ فارم سے ہزاروں مکاتب قائم ہوئے، "مسلم پرسنل لابورڈ" کے صدر کی حیثیت سے شاہ بانو کیس میں حضرتؒ نے جس حکمت و بصیرت کے ساتھ جدوجہد فرمائی اس کے نتیجہ میں صرف وہ مسئلہ ہی حل نہیں ہوا بلکہ ایک خطرہ کا دروازہ بند ہوا، اخیر میں جب ریاستی حکومت کی طرف سے "وندے ماترم" اور "سرسوتی وندنا" کی تحریک چلی تو حضرتؒ اس کے لئے سینہ سپر ہوگئے، بہت کچھ سنا اور برداشت فرمایا، بالآخر حضرتؒ کے اس تاریخی بیان سے جس میں اس تحریک کو خالص اسلام مخالف تحریک قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ "اگر یہ واپس نہیں لی جاتی تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں سے نکال لیں۔" ایک ہلچل مچ گئی، حکومت نے تحریک ختم کی، وزیر کو برطرف کیا گیا اور ایک بڑے خطرہ سے نجات ملی۔

واقعہ یہ ہے کہ جب جب عالمی سطح پر اسلام کو کوئی خطرہ درپیش ہوا حضرتؒ نے اس کو اس وقت محسوس فرمالیا جب عام طور پر اس کی طرف ذہن بھی نہیں جاتا، اس کے لئے ضروری اور مناسب اقدامات فرمائے جس کے نتیجہ میں اُمت اسلامیہ بہت سے نازک موقعوں پر خطرہ سے بچ گئی، اور اس کی ناؤ منجدھار میں